أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ

# مقالاتِ راشدیہ

## جلد چہارم

از قلم محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم

سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمۃ اللہ علیہ

تقدیم پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ

اعداد الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ

- سورۂ مریم کی تفسیر اور اس کے احکام
- نماز کی مسنون دعائیں
- نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام
- علامہ مشرقی کی کتاب پر تبصرہ
- جو میں نے دیکھا
- گم شدہ جنت
- گذارش بندہ حقیر پر تقصیر مع مخلصانہ نصیحت نفیس

NOMANI

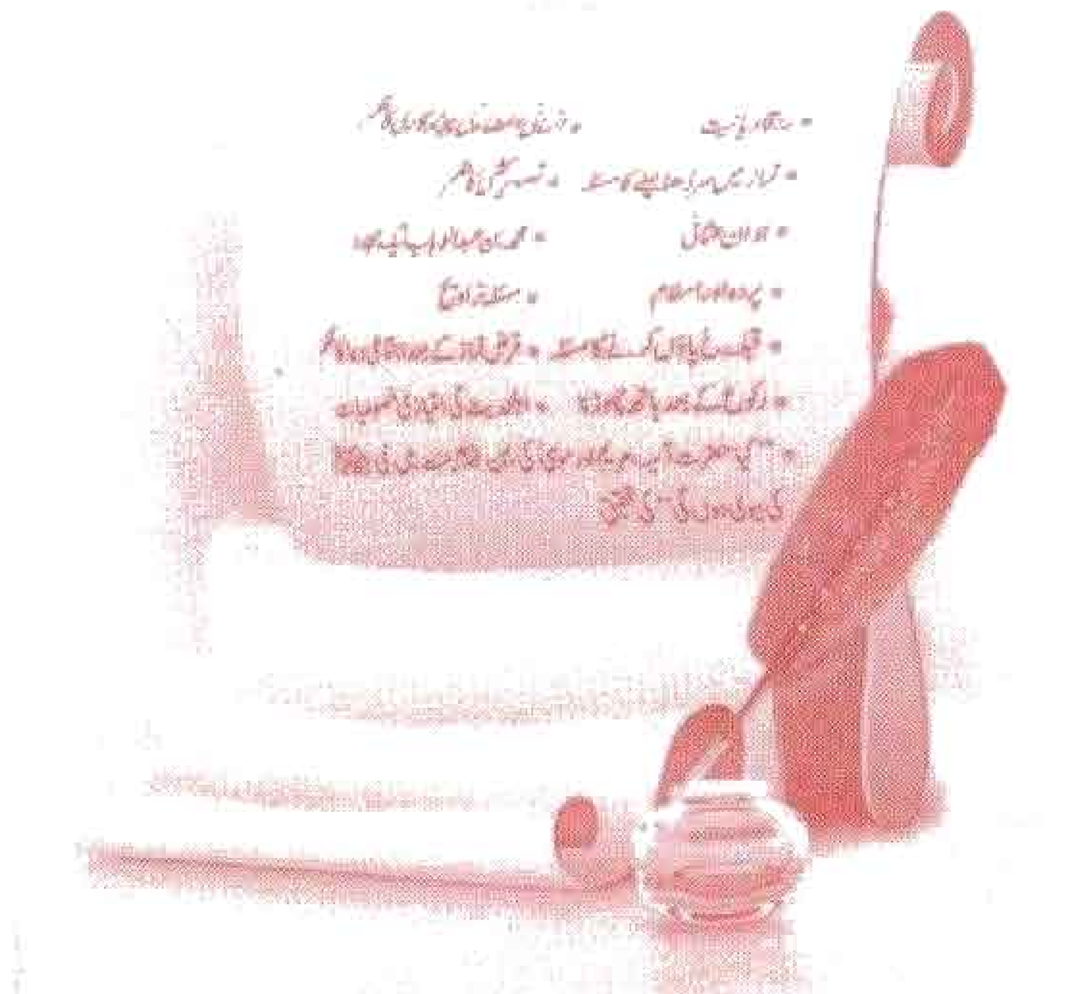

# مقالاتِ راشدیہ

جلد چہارم

محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابوالقاسم سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ

نام کتاب

# مقالاتِ راشدیہ

جلد چہارم

تالیف

محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم
سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ علیہ

تقدیم

پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ

اعداد

الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ

باہتمام

حافظ ثناء اللہ خاں (بیرانی)

تاریخ اشاعت

دسمبر 2012ء

مطبوعہ

علی آصف پرنٹرز لاہور

ناشر

نعمانی کتب خانہ

لاہور

NOMANI

e-mail: nomania2000@hotmail.com

**COPY RIGHT**

Exclusive rights by
**Al-Maktba-tul-Rashdia**
New Mirpur khas Sindh Pakistan
No part of this publication may be translated, reproduced, distributed in any form or by any means or stored in a data base retrieval system, without the prior written permission of the Author.

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر ..................

أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ

# مقالاتِ راشدیہ

## جلد چہارم


از قلم محدث العصر فضیلۃ الشیخ ابو القاسم سید محب اللہ شاہ الراشدی رحمۃ اللہ علیہ

تقدیم پروفیسر مولا بخش محمدی حفظہ اللہ

اعداد الشیخ افتخار احمد تاج الدین الازہری حفظہ اللہ


- سورہ مریم کی تفسیر اور اس کے احکام
- نماز کی مسنون دعائیں
- نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام
- علامہ مشرقی کی کتاب پر تبصرہ
- جو میں نے دیکھا
- گم شدہ جنت
- گذارش بندہ حقیر پر تقصیر مع مخلصانہ نصیحت نفس

NOMANI


نعمانی کتب خانہ

حق سٹریٹ اردو بازار لاہور 042 37321865

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے

جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

# فہرست مضامین

المقالة الأولى

## المنهج الأقوم في تفسير سورة مريم


- سورۂ مریم کی تفسیر اوراس کے احکام ____ 20
- سورۃ مریم (تاریخی پس منظر) ........ 21
- سورۃ مریم کی تفسیر اوراس کے اہم نکات ........ 22
- مناسبت قرینہ ........ 22
- آیت کریمہ کی مزید وضاحت ........ 40
- شیعہ حضرات جن اثروں سے دلائل لیتے ہیں اُن کے جوابات ........ 55
- سلام کرنے کی کیفیت اوراس کے مسائل ........ 104
- سلام کے آداب ........ 106
- بچوں پر سلام ........ 106
- چند دوسری اقوام کے سلام ........ 110
- اثبات النبوت مریم علیہا السلام ........ 127
- وضوء کا طریقہ ........ 162
- نواقض الوضو کا بیان ........ 169
- اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا ایجاب ........ 174
- مختلف فیہ مسائل ........ 177
- المسئلۃ الاولیٰ ........ 177
- الحدیث الاول ........ 178
- الحدیث الثانی ........ 178
- المسئلۃ الثانی ........ 180
- المسئلۃ الثالثۃ ........ 186
- المسئلۃ الرابعۃ ........ 187

- المسئلة الخامسة ........................ 189
- غسل جنابت کا بیان ........................ 196
- موجبات غسل ........................ 196
- انزال کے نہ ہونے سے غسل کے واجب نہ ہونے کے نسخ کے دلائل ........................ 197
- ترتیب وطریقہ غسل ........................ 198
- حالت جنابت میں قرآن مجید پڑھنے سے منع کا بیان ........................ 200
- جنبی آدمی اگر غسل کرنے سے پہلے کھانا پینا چاہے یا سونا چاہتا ہے ........................ 201
- اذان اور اقامت کا بیان ........................ 203
- سترہ کا بیان ........................ 204
- صف بندی ومسنون طریقہ نماز ........................ 205
- خلاصہ کلام ........................ 222
- آمین کا ثبوت ........................ 232
- سجدہ ........................ 248
- سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے جائیں ........................ 249
- خلاصہ کلام ........................ 252
- سجدہ کے اذکار ........................ 257
- جلسہ استراحت کے دلائل ........................ 270
- خلاصہ کلام ........................ 271
- التحیات کے صیغے ........................ 275
- التحیات کے ابتدائی الفاظ کے معانی ........................ 276
- قنوت نازلہ اور قنوت وتر کے مسائل ........................ 282
- سلام ........................ 290
- سلام کے بعد کے اذکار ........................ 293
- فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے ........................ 295
- مرد اور عورت کی نماز میں فرق نہیں ........................ 295
- نماز کے متعلق بعض فوائد کا بیان ........................ 296
- جماعت، اس کی فضیلت اور اس کی ضرورت ........................ 298
- مسئلہ ........................ 301

- سجدہ سہو کا بیان ........................ 308
- امامت کا مسئلہ ........................ 318
- امامت کا مستحق کون ہے؟ ........................ 319
- نابالغ کی امامت ........................ 320
- مفتون اور مبتدع کی امامت ........................ 323
- امام کے اوپر مقتدیوں کے لحاظ سے کیا ذمہ داری ہے؟ ........................ 323
- مستقل کے پیچھے مفترض کی نماز ........................ 327
- نماز کے لیے لباس ........................ 327
- جس اوقات میں نماز ممنوع ہے ان کا بیان ........................ 331
- نماز کے اوقات کا بیان ........................ 335
- جمع بین صلاتین ........................ 338
- صبح صادق کے متعلق معلومات ........................ 340
- سفر کی نماز کا بیان ........................ 340
- سفر میں کتنے دن تک قصر کرتا رہے؟ ........................ 342
- نماز کی مسنون دعائیں ........................ 344
- نماز کا طریقہ ........................ 346
- تکبیر تحریمہ ........................ 346
- دعاء استفتاح ........................ 346
- سورت فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ........................ 347
- فاتحہ کے بعد آمین جہراً کہنا ........................ 347
- رکوع ........................ 348
- جلسہ کی دعا ........................ 349
- تشہد ........................ 350
- درود شریف ........................ 353
- سلام، دعا قنوت ........................ 357
- نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام ........................ 367

المقالة الأولىٰ

## المنهج الأقوم في تفسير سورة مريم

❁ سورۂ مریم کی تفسیر اور اس کے احکام ........................ ۱۹

المقالة الثانية

## حياز الصلوٰة من بيان أدعية الصلوٰة

❁ نماز کی مسنون دعائیں ........................ ۳۴۴

المقالة الثالثة

## المغتريات

❁ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کا الزام اور اس کی حقیقت: ........................ ۳۵۹

المقالة الرابعة

## عون الولى الحميد فى الرد على عبدالوحيد

❁ نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام ........................ ۳۶۷

المقالة الخامسة

## اظهار الغواية الواقعة فى كتاب پيغام هداية

❁ علامہ مشرقی کی کتاب پر تبصرہ ........................ ۳۷۷

المقالة السادسة

## التبصرة على كتاب كما رائت

❁ جو میں نے دیکھا ........................ ۴۲۴

المقالة السابعة

## جنة المفقوده

❁ گم شدہ جنت ........................ ۴۳۷

المقالة الثامنة

## الدين النصيحة

❁ گذارش بندہ حقیر پر تقصیر مع مخلصانہ نصیحت نفس بجناب محترم مولانا حافظ محمد ادریس........................ ۴۵۱

# مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله الامين۔ اما بعد!

یہ وسیع وعریض کائنات اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات وحوادث یقیناً ایک مظبوط تعلم کائنات کے تحت تابع ہیں۔ جن میں بے انتہا اسرار ورموز حکمتیں پنہاں ہیں۔ جن میں کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنے خالق ومالک کی عبودیت اور فرمانبرداری کی دعوت دیتا ہے۔ جب دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو گویا کہ کرہ ارض پر اگنے والے یہ برگ وبار، غنچہ وگل، سبزہ زار سراپا عجز ونیاز اور پیغام ہدایت نظر آتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار! پس ایک سچے مسلمان کا فریضہ بنتا ہے کہ روزمرہ واقعات کے ظاہری اسباب وعلل کے ساتھ اس کے عوامل پر بھی نگاہ عمیق ڈالتے ہوئے حقیقی مسبب الاسباب کے احکام وفرامین کو ہمیشہ پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ یہ بات بھی علمی میدان میں اظہر من الشمس ہے کہ: تحقیق وتدقیق علم کی رو اور فکر ونظر میں وسعت پیدا کرتی ہے اور تنقید کا بنیاد وصف یہ ہے کہ متعین علمی وعملی سوالات کا عموماً جو جواب دیا جاتا ہے اسے علم وایمان کے بلند معیارات کی روشنی میں پرکھا جائے۔ پھر اصح ترین بات پر اعتماد کر کے دلائل کے ترازو میں سچ کو ثابت کیا جائے۔ یہ بات بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل علم وفن کے ہاں رائج رہی ہے کہ جہاں پر تقلیدی بندھنوں، ذاتی تعصّبات، مروجہ جماعتی گروہ بندیوں سے مغلوں مرعوب ہوئے بغیر صرف اور صرف کتاب وسنت کے بلند معیارات پر پرکھ کر صحیح حقائق سمجھنے کی سعی بلیغ کی جاتی ہے اور ہر اس بات سے کمال جرأت کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے جو اپنے بلند علمی معیارات، دیانتدارنہ، مجتہدانہ، بصیرت کے مطابق کمزور اور بے وزن نظر آئے۔ اس تحقیقی ضمن میں پچھلی چند صدیقین میں جن صاحب علم وکمال حضرات کے بابرکت اسمائے گرامی بڑے وثوق سے لیے جا سکتے ہیں ان میں حافظ ابن خرم، حافظ ابن قیم، امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تاریخ میں نمایاں اہمیت کی حامل شخصیات ہیں۔ جنھوں نے اپنے پر مصائب دور میں بھی اصولی اور علمی منہج کے دائرہ میں رہتے ہوئے منقولات اور تعبیرات پر نہ صرف سوالات اٹھائے بلکہ کتاب وسنت، نصوص شرعیہ کی روشنی میں متبادل تعبیرات اور تسلی بخش جوابات بھی عنایت فرما کر اصل حقائق سے عوام الناس کو روشناس کرائے کا فریضہ سرانجام دیا اسی کاروان سلف میں محدث العصر علامہ سید محبّ اللہ شاہ راشدی کی ذات گرامی بھی شامل ہے جو سندھ کے ایک عالی علمی گھرانے ''راشدی'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ محقق، مفسر،

محدث، اسلام کے ممتاز اسکالر، جدید و قدیم علوم کے سنگم، مقولات و منقولات کے علاوہ فن رجال کے امام مانے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے دور میں مروجہ معاصر علمی و مذہبی نقطہ ہائے نگاہ کی تنقید میں بعض ایسی بھی چیزیں محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک تسلسل کے ساتھ تحریر فرمائیں جنھیں علم و ایمان کے لحاظ سے اپنی نوعیت کی انفرادی تحقیق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ان کو تحقیقی میدان میں گھرائی اور گہرائی دونوں پائی جاتی ہیں، ایسی تنقیدات و تعاقب مذہبی نقطہ ہائے نگاہ سے ایک انتہائی مطلوب و محمود اور حیثیت جذبہ سے جس کے تحت اس قسم کی تحقیق آگے بڑھنے کا جذبہ اور فکر نو پیدا کرتی ہے اس مجموعہ مقالات میں بھی شاہ صاحب کی ایسی نادر تخلیقات اور تحقیات شامل اشاعت کی گئیں ہیں۔ جن میں صرف دلیل، حجت اور برہان کی بات کہی گئی ہے۔ جن میں مستند ماخذات اور مراجعات سے مزین ہونے کے ساتھ معقول استدلال اور استنباط بھی موجزن نظر آتا ہے۔

مقالات راشدی کے زیر نظر جلد میں حسب ذیل موضوعات پر مقالات علمیہ شامل اشاعت کے لیے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

① المنہج الاقوام فی تفسیر سورۃ مریم
سورۃ مریم کی بہترین تفسیر

② حیاز الصلوٰۃ من بیان ادعیۃ الصلوٰۃ
نماز کی مسنون دعاؤں کا حسین مجموعہ

③ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ...... پر اقرباء پروری کا الزام اور اس کی حقیقت

④ نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام

⑤ اظہار الغوایۃ الواقعۃ فی کتاب پیغام ہدایۃ

⑥ ''جو میں نے دیکھا'' جی ایم سید کی کتاب پر تبصرہ

⑦ ''گم شدہ جنت'' اسلام پر اعتراضات کا جواب

یہ مقالات بلاشبہ شاہ صاحب کے الباقیات الصالحات کی صورت میں صدقہ جاریہ ہیں۔ چونکہ ہمارے سلف الصالحین کے ملفوظات مواعظہ حسنہ، خطبات و محاصرات، مقالات و مراسلات، فتاوے منجملہ مواد علمی حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ﴿ و نکتب ما قدموا و آثارھم ﴾ [یٰس] کی تفسیر ہیں۔ اگر نظر عمیق سے دیکھا جائے تو ان منتشر نگارشات عالیہ اور علمی شہ پاروں میں بھی ایک منطقی ربط اور حسن نظر آئے گا، اس قسم کے دیگر مقالات بھی آئے جنھیں اشاعت پذیر ہو کر مختلف موضوعات پر مصروف و متداول انتہائی نافع ثابت ہر کو تشنگان علوم کی پیاش بجھانے میں معاونت کرتے ہیں۔ بہر حال اس مجموعہ علمی کو گوشہ گمنامی سے جستجو بسیار کے بعد موجودہ خوبصورت کتابی صورت میں اشاعت پر ہم برادر مکرم پروفیسر فضیلۃ الشیخ

افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ کے بے حد مشکور ہیں کہ آپ راشید خانوادہ سے قلبی تعلق و محبت رکھنے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ کام کرنے کا جذبہ صادق بھی رکھتے ہیں۔ اللہ کرنے زور قلم اور زیادہ

جن کی مجد بلیغ سے یہ گوہر نایات شایان شان طریقہ سے جاذب نظر ٹائیٹل، کمپیوٹرائزڈ کتابت خوبصورت ترتیب، تحقیق وتخریج اور معیاری طباعت سے مزین ہوکر تشنگان علوم کے ہاتھوں تھما۔ بلاشبہ یہ گل ہائے رنگ و رنگ، بیش بہا علمی صدق ...... سے ایک جگہ جمع کر کے ایک بڑا اہم کام سرانجام دینے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان مضامین و مقالات علمیہ میں سوز دروں اور اندر کی دینی تڑپ بھی بین السطور جھلکتی ہے۔

میں سرگزشتہ کھوئے ہوں کی جستجو ۔۔۔ میں کے مری غزل میں آتش رفتہ کا سراغ

جہاں تک شاہ صاحب کی ذات گرامی کا تعلق ہے تو مجھے اپنا بچپن قدرے جوانی ان کے درمیان گزارنے کا موقع فراہم ہوا۔ آپ ہر موقع پر انتہائی دیانتدار، روشن فکر، بلند نگاہ، حقیقت پسند ہونے کے ساتھ علم وادب کے آفتاب درشندہ نظر آئے، آپ رزم حق و باطل میں آہنی کردار، اپنوں سے ابریشم کی طرح نرم و ملائم محبت کرنے والے نظر آئے، مجھ سے ایک ادنی عقیدت کیس طالب علم کی حیثیت میں ان کی نوازشوں، شفقتوں اور دعاؤں کا سلسلہ بہت طریل تھا۔ میں نے آپ کو بے پناہ قوت استدلال سے کہیں زیادہ جذبہ صادق کا گرویدہ پایا۔ آپ حاضر جوابی میں یکتا، برجستہ گوئی میں یگانہ تھے۔ ان کی تقریر پر تاثیر میں سوز جاویداں پنہاں تھا۔ ان کے خلوص بھرے الفاظ مانند شبنم تھے، ان کے ملنے اور بغلگیری کے وقت جذبہ اپنائیت کے لیے تو الفاظ ناکافی، ان کا دل ایک ایسا آئینہ شفاف اور دلربا تھا جو صرف خلاف شرح ملحدانہ الفاظ سننے سے بھی پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ آپ انتہائی حساس طبع کے حامل تھے۔

؂ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

آپ کی عہد آفریں شخصیت میں علامہ سید احسان للہ شاہ راشدی کی اتباع سنت ،مولانا ثناء اللہ امر تسری رحمہ اللہ کی جرأت، علامہ سید بدیع الدین کی خطابت کا حسین امتزاج نظر آتا تھا۔ آپ علامہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فکر و فلسفہ کے استاد تھے۔ ان کے مزاج میں سید احمد شہید رحمہ اللہ کی حمیت ایمانی اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی بے باکی بھی نمایاں نظر آتی تھی۔

علامہ سید محبّ اللہ شاہ راشدی نے اپنی بیشتر زندگی کا حصہ وعظ ونصیحت، تبلیغ وتلقین، علمی و ادبی تخلیقی سرگرمیوں میں صرف کر دیا۔ چونکہ تحقیق وتنقید کسی بھی زبان وادب میں نہایت مشکل اور پیچیدہ فن شمار کیا جاتا ہے۔

جس میں انہماک، جستجو، مطالع، مشاہد، انصاف، یکسوئی، سچے جذبات کے ساتھ نیک نیتی اور ثابت قدمی کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں بلاشبہ شاہ صاحب نے انتہائی بلند پایہ اور علمی مقام حاصل کر لیا تھا۔ آپ حقائق کی تلاش میں کوئی بھی رکاوٹ اپنے راستہ میں برداشت نہ کرتے تھے، بلکہ ثابت قدمی، ان کا شیوہ

تھا۔ تحقیق و تدقیق کی جولان گاہ میں تعصب و اثبات، عیب جوئی، الزام تراشی اور ...... روئی کو آپ نے اپنی تنقید کا کبھی بھی جز بننے نہ دیا۔ مختصر آپ حق کو حق ثابت کرنے میں کبھی بھی کسی تامل کا شکار نہ ہوئے، انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو انتہائی اخلاص، دیانتداری اور سچائی سے ہمیشہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ ویسے بھی آپ اپنے مزاج میں انتہائی مشفق، وسیع القلب، کشادہ نظر ہونے کے ساتھ کبھی بھی ذاتی اغراض و مقاصد کو اپنے راستہ میں آنے نہ دیا۔ حتیٰ المقدور وہ کبھی بھی اپنے مقصد زندگی سے زرہ برابر بھی نہ ہٹے۔ دنیا کی دلفریبی انھیں اپنے مقصد جلیل سے زرہ برابر بھی نہ ہٹا سکی۔

ے دلا تو رسم تعلق از مدغ آبی جو کہ گوچہ بد ریاست خشک بر بر خاست

بالا آخر بقا صرف ایک ہستی لازوال کو ہے۔ شاہ صاحب جیسی ہمہ گیر علمی شخصیت بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر آسودہ خاک ہوگئی، ان کی روشن کی ہوئی شمع فروزاں مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈو جو سندھ کی تاریخ میں قدیم ترین اسلامی تربیت گاہ ہے اور دنیائے علم و ادب کتب و قرطاس کے میدان میں فقید المثال المکتب العالیہ علمیہ کا کتب خانہ، اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی اولاد صالحہ آپ بھی باب الاسلام سندھ میں باعث جوفشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

علامہ سید محبّ اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ پوری زندگی دنیاوی کسی بھی صلہ وستائش سے بے نیاز رہے۔ ان کی طبیعت وظرافت ان کے ساتھیوں اور ہمنشینوں کو تازندگی یاد آئے گی۔ مختصراً علم و ادب کی آبیاری، پرروش لوح وقلم، ان کی زندگی کا جز لاینفک تھا۔ یہ مجاہد و محقق اپنے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے کر چل بسے۔ چل چین ازل نے بزم علیم و آگہی سے مہکتا ہوا پھول تو واپس لے لیا۔ جس کی عطر بیزی گزشتہ کئی عشروں سے چمن زار و وطن کی سوکاتی رہی

آں قدح بشکست وآں ساقیانہ ماند

ان کے جدا ہونے سے علم و ادب، تحقیق و جستجو، روحانیت و معرفت کے درو دیوار حسرت و یاس میں ڈوب گئے، باقی رہے نام خدا۔

ے وما کان قیس هلکہٗ هلک واحد ولا کنہٗ نبیان قوم تهدما

اللہ تعالیٰ ان کی حسنات جمیل کو قبولیت عطا فرمائے۔ ان کے لیے باعث رع درجات بنائے۔ غفر اللہ لہٗ ونور مدقدہٗ

مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈو کی جامع مسجد کے ساتھ ملحق جب ان کی آخری آرام گاہ پر دعا کے لیے حاضر ہوتا ہوں تو زبان حال سے بے ساختہ کہہ اٹھتا ہوں۔

ے بعد او وفات تربت مادد زمین محو در سعینہ ہائے مردم مزار ماست

آخر میں ہم شیخ الجامعہ مکرم مولانا افتخار احمد الازھری ﷾ اور جامعہ کی روح رواں حاجی محمد اسماعیل میمن ایڈووکیٹ صاحب اور تمام رفقائے جامعہ کے ساتھ محترم جناب محمد ضیاء الحق صاحب مالک مکتبہ نعمانیہ لاہور کے بھی ممنوع ہیں جن کی کاوشوں سے یہ مجموعہ مقالات خوبصورت انداز میں اشاعت پذیر ہوکر تشنگان علوم کی تشنگی بجھانے کا باعث بنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاق حسنہ کے ساتھ جادہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔
آمین

پروفیسر مولا بخش محمدی
گورنمنٹ ڈگری کالج مٹھی تھرپارکر سندھ (شعبہ اسلامیات)

# پیش لفظ

## مقالات راشدیہ جلد چہارم

جامعہ بحرالعلوم السلفیہ میرپور خاص کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اور بہت بڑا اعزاز حاصل ہے کہ اس وقت صوبہ سندھ کے عظیم علمی خاندان، خاندان راشدی جو شرافت و نجابت، فضل و کمل اور علو مرتبت میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اس کی علمی کاوشوں اور محنتوں کو نعمانی کتب خانہ کے توسط سے منظر عام پر آرہا ہے۔ اب تک مقالات راشدیہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں یہ جلد چہارم ہے اس جلد میں فضیلۃ الشیخ ابو القاسم سید محبّ اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ کے تحریر کردہ آٹھ مقالات کا مجموعہ سے جو کہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ اپنے وقت کے بہت بڑے محدث مفسر، محقق مدرس، مفتی ادیب، فقاء اور مورخ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی بصیرت و بصارت نظر و فکر کی گہرائی، تحقیق و تنقیح میں باریک بینی اور ژوف نگاہی فرمائی تھی۔ مقالات راشدیہ ان باتوں کا بین ثبوت ہیں۔

جلد چہارم کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں چند ایسے مقالات شامل اشاعت ہیں جو کہ ملحد قسم کے ذہن رکھنے والے لوگوں کے اعتراض تھے جن کا علمی لحاظ سے کافی وشافی جواب اسے گئے ہے۔

اس جلد میں کل سات مقالات سے جو کہ تمام غیر مطبوع تھے۔ پہلی دفعہ طبع ہر کر منظر عام پر آرہے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

① **المقالۃ الاولیٰ:**

المنہج الاقوام فی تفسیر سوۃ مریم

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قرآن پاک کی تفسیر لکھنا شروع کی تھی جس کا نام انھوں نے ''محبّ التفاسیر'' پسند کیا اور کام بھی شروع کر دیا تھ سب سے پہلے آپ نے سورۃ مریم شروع کی اس کی وجہ آپ نے خود اپنی ''آپ بیتی'' میں تحریر کی ہے۔

1407ء میں اہل علم احباب نے مجھ پر اصرار کیا کہ میں بھی قرآن حکیم کی تفسیر لکھوں، ان کے اصرار اور تقاضا کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سورۃ مریم کی تفسیر شروع کر دی کیونکہ اس وقت نماز فجر کے بعد سورۃ مریم ہی کا درس چل رہا تھا اس لیے کسی سورۃ کے تفسیر کے لیے مجھے الگ تفاسیر دیکھنے کی زحمت نہ رہی جو تفاسیر درس

کے لیے دیکھ کر آتا وہی املاء کرا دیتا۔

تو پہلا مقالہ سورۃ مریم کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

**(۲) المقالۃ الثانیۃ :**

"حیاز الصلوٰۃ من بیان ادعیۃ الصلوٰۃ"

یہ مقالہ نماز کی مسنون دعاؤں پر مشتمل ہے۔

**(۳) المقالۃ الثالثۃ :**

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کا الزم اور اس کی حقیقت

**(۴) المقالۃ الرابعۃ :**

"عون الولی الحمید فی الرر علی عبدالوحید"

اس مقالہ میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء کا علمی و جامع ذکر کیا گیا ہے۔ نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام

**(۵) المقالۃ الخامسۃ :**

" اظہار الغوایۃ الواقعۃ فی کتاب پیغام ھدایۃ "

علامہ عنایت اللہ مشرقی تحریک "خاکسار" کے بانی نے ایک کتاب پیغام ہدایت لکھی شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ان کی تحریر کردہ کتاب میں چند ایسے نظریات نظر آئے جو اسلام کے خلاف تھے۔ اس مقالہ میں ان کا احاطہ کر کے ان کا علمی رد پیش کیا ہے۔

**(۶) المقالۃ السادسۃ :**

"جو میں نے دیکھا"

جی ایم سید صوبہ سندھ کی ایک عظیم شخصیت تھی لیکن ان کا خیالات اور نظریات اسلام کے متضاد تھے انھوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں اسلام کے خلاف تحریر کی جس کا رد شاہ صاحب نے اس مقالہ میں پیش کیا۔

**(۷) المقالۃ السابعۃ :**

"گم شدہ جنت"

اس کتاب میں بھی کسی خاتون نے اسلام کے خلاف چند اوراق سیاہ کیے تھے اس مقالہ میں شاہ صاحب نے اس کا دندان شکن جواب تحریر کیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی شاہ صاحب رحمہ اللہ کے کافی مقالات غیر مطبوع سے ان شاء اللہ العزیز آئندہ آنے والی جلدوں میں تمام غیر مطبوع مقالات کو جمع کر کے جلد شائع کیا جائے گا۔

آخر میں میں اپنے تمام دوست و احباب کا شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے اس جلد کی تیاری میں میرے

ساتھ عرق فشاں سے کام سرانجام دیا۔ خصوصاً ثناء اللہ صاحب کا جنھوں نے بار بار پروف پڑھا تاکہ غلطی نہ آئے لیکن غلطی کی گنجائش تو باقی ہے امید ہے قارئین مطلع فرمائیں گے جس کا آزالہ آئندہ اشاعت میں کرلیا جائے گا۔ آخر میں میں اپنے مخلص دوست پروفیسر مولا بخش محمدی صاحب کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اس کتاب پر ایک جامع اور بہترین مقدمہ تحریر کیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین حنیف کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

افتخار احمد الازہری
شیخ الحدیث جامعہ بحر العلوم السّلفیہ
میرپورخاص
0332-2819002

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# صاحب مقالات اور مقالات راشدیہ

از ابوخبیب حافظ ثناء اللہ خاں تبسم
فاضل جامعہ بحر العلوم السّلفیہ

انسان وہ ذات ہے جس کو رب کائنات نے اپنی عبادت اور بندگی کے لیے پیدا فرمایا اور اسی ذات کی راہنمائی کے لیے انھی میں سے رسولوں، پیغمبروں اور نبیوں کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یہ رسول، نبی ہر دور میں مختلف صحائف اور کتابیں لے کر اپنی قوموں کی ہدایت کا سرچشمہ بنتے رہے۔ یقیناً اس سلسلہ کی ایک کڑی ہمارے پاک پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہیں۔ آپ پر ایمان لانا اور آپ کی ہدایت کردہ تعلیمات کی تصدیق کرنا ایمان کا لازمی جز ہے اور جو اس صادق اعظم کی تعلیمات کا منکر اور ان سے منحرف ہے اور ان کا اپنی عقل سے رد کرتا ہے بلاشبہ وہ شخص جاہل، اجہل اور اس کا ایمان نامکمل ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ آج تک جس جس بدبخت و نامراد شخص نے ان مقدس تعلیمات کو نہ مانا، اس کے مقدر میں رسوائی کے سوا کچھ نہ آیا۔ دنیا میں بھی خاب وخسر کا مصداق ٹھہرا اور آخرت میں عذاب الٰہی سے دو چار ہو گا۔

جناب محمد کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعارف کروایا۔ اس کے رب ہونے کا یقین دلوایا۔ فرشتوں کو رب کی مخلوق بتایا۔ قرآن کریم کی صورت میں نوع انسانیت کے لیے کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا اور پھر جس جس نے اس کی تصدیق کی، چاہے وہ عرب کی لق و دق صحراء کا بدوی تھا یا یمن و شام کے علاقہ میں رہنے والا تاجر، چاہے قبیلے کا سردار تھا یا ایک بکریاں چرانے والا غلام کو اس قرآن کے فرمودات عالیہ پر آمنا و صدقنا کہنے کی بنا پر مسلمان اور مومن کے لقب سے نوازا گیا۔

جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ایمان کی دولت ان کے دل میں سرایت کر گئی۔ اور پر انھی مقدس ہستیوں نے اپنی جان و مال کے نذرانے پیش کرنے میں ذرا برابر بھی جھجک محسوس نہ کی۔

اس دوران بیگانے تو بیگانے ٹھہرے لیکن اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

جلا وطنی اختیار کرنا پڑی، مال و دولت کو چھوڑنا پڑا، اولاد سے دور ہو گئے، ماں باپ سے قطع تعلقی کو اپنانا پڑا، اپنے پیارے دیس اور وہاں کے لوگوں کو خیر باد کہنا پڑا۔ صرف کس لیے؟ اس دین اسلام کے لیے جو محمد پاک پر نازل ہوا اور اس سب کے بدلے ان پاک باز لوگوں کو در بدر ہو کر زمانے کی ٹھوکریں کھا کر مدینے میں

پناہ گزیں ہوئے۔ صحابہ کے لقب سے نوازا گیا۔ ان جان بازوں اور اسلام کے شہسواروں نے تبلیغ اسلام کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لیا۔ یہ لوگ تعلیم اسلام کو سیکھنے اور پھر مدینہ کے گلی کوچوں، بازاروں اور قرب و جوار میں جا جا کر درس و تدریس کا کام کرتے۔ بالآخر یہ کام چلتا رہا۔ فاقے کاٹنا پڑے، گھروں سے نکل کر صفہ میں راتیں گزاریں، مسجد نبوی کو مسکن بنایا ابھی یہ کام جاری و ساری تھا اور اسلام جہاد اور تبلیغ کے ذریعے ملک عرب میں پھیل رہا تھا کہ اس دوران ہادی عالم، قائد المجاہدین، سرور کونین، شفیع المذنبین، سید الاولین والآخرین، قائد غرالمحجلین، ساقی حوض کوثر، سید ولد آدم، عبداللہ و آمنہ کے لخت جگر، فاطمہ کے ابا حضور، حسن و حسین کے پیارے نانا، ہمارے پیارے پیغمبر جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

دین اسلام مکمل ہو چکا تھا۔ تعلیمات اسلامیہ صحابہ نے حاصل کر لیں تھیں۔ ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ آیات کا علم صحابہ کو میسر آ چکا تھا۔

اب یہ علم ہر سو پھیلنے لگا۔ قرآن کریم کی تدوین کا بابرکت کا شروع ہوا۔ پھر احادیث رسول کو محفوظ کیا گیا اور صحابہ کے بعد تابعین پھر تبع تابعین اور پھر محدثین، فقہاء اور علماء نے اس کو اپنا منشور بنا لیا اور پھر کئی علوم و فنون نے جنم لیا۔ کتب التواریخ پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ اسماء الرجال کا ایک انوکھا علم متعارف کروایا گیا۔ ضعیف و صحیح احادیث کی چھان بین ہونے لگی۔ دارالقضاء قائم ہوئے، فتاویٰ جاری ہونے لگے، لوگ اپنے مشکل حالات و مسائل علماء دین سے حل کروانے اور سیکھنے لگے۔

بالآخر ایک دور ایسا بھی آیا کہ لوگ دین سے دور ہونے لگے، نمازوں کو چھوڑ دیا، غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے، قرآن و سنت کو پس پشت ڈال دیا، غلامی ان کا مقدر بنی۔ انگریز اور کفار نے ان پر حکومت شروع کر دی۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا جانے لگا۔ خاندان منتشر ہو گئے، قبیلوں کے افراد ہجرت کرنے لگے، پاکستان کے ہندوستان اور ہندوستان کے پاکستان میں آباد ہو گئے۔ انگریزوں نے مجموعی طور پر تمام مذاہب کے لوگوں پر حکومت جمالی تھی کہ اس دوران محمد بن قاسم نامی نوجوان مسلمانوں کی زندگی کا مسیحا بن کر انگریزوں اور کافروں سے آزادی دلانے آئے۔ تب انھوں نے سندھ کا بیشتر حصہ اور ملتان تک جہاد کے ذریعے غلامی سے آزاد کروایا اور سندھ کا نام باب الاسلام رکھتے ہوئے واپس چلا۔

ابھی جہالت کلی طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، لوگوں میں فاسد عقائد جڑ پکڑے ہوئے تھے۔ ان کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ ان کے دلوں کو قرآن و سنت سے منور کرنا اہم فریضہ تھا، جس کے لیے مختلف ادوار میں علماء سندھ نے اپنا کردار ادا کیا۔ اور داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنا سفر پورا کر گئے۔ انھی نامور اور کارِ خیر کو اپنا فریضہ سمجھنے والے بھلے لوگوں میں ایک نام ہمارے ممدوح جناب الشیخ سید ابوالقاسم، سید محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کا بھی آتا ہے کہ جنھوں نے اپنی عمر کا تمام وقت اللہ کے دین کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ میں گزارا۔ سندھ میں

بالخصوص تھر پارکر جہاں ریت ہی ریت اڑتی دکھائی دیتی ہے، جب وہاں دور دور تک پانی کے کنویں تک کا انتظام نہ تھا اور لوگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ آباد تھے، رخت سفر باندھا اور دین اسلام کی دعوت اور لوگوں کے استفسار کو حل کرنے کے لیے نکلے۔

بسا اوقات لوگ دعوت خطاب دیتے تو آپ اپنے اللہ کے فضل سے علم کی روشنی میں ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور بعض اوقات دیگر مسالک کے مولویوں کی طرف سے چیلنج کیا جاتا تو آپ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے بلا جھجک بے آب و گیاہ میں نکل پڑتے اور کبھی کوئی مقلد یا فتنہ انکار حدیث سے تعلق رکھنے والا کوئی قرآن وسنت کے خلاف کتاب لکھتا تو پتا چلتے ہی آپ کی طبیعت بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتی اور جب تک اس کتاب کو اپنی قلم کے نوک سے چھید نہ ڈال دیتے سکون نہ آتا۔ یہی نہیں بلکہ اگر کوئی مسلک اہلحدیث سے تعلق رکھنے والا کوئی عالم دین کسی موقف کا اظہار کرتا اور وہ موقف آپ کے موقف کے خلاف ہوتا تو بھی آپ اس کا ٹھیک ٹھاک نقد کرتے اور کئی کئی صفحات آپ کی علمی بحث کے سامنے عاجز آجاتے، جس کی واضح دلیل مقالات راشدیہ جلد اول ہے۔

بہر کیف قارئین کرام! ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، یعنی ''مقالات راشدیہ'' جلد چہارم۔ یہ جلد آٹھ مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ اپنی خصوصیات اور علمیت کے لحاظ سے انوکھا اور گراں قدر معلوم ہوتا ہے۔

## المقالۃ الاولیٰ

### المنہج الاقوم فی تفسیر سورۃ المریم:

یہ مقالہ سورۂ مریم کی تفسیر پر مشتمل ہے جو کہ شاہ صاحب نے معتقدین کے اصرار پر بیان فرمائی تھی۔ اصل میں سندھی زبان میں تھی لیکن آپ کے صاجزادے اور جناب صبغت اللہ صاحب نے اردو دان طبقے کے لیے سندھی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس میں حضرت مریم علیہا السلام کے بے گناہ ہونے اور قوم کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب تحریر فرمایا لیکن سب سے اہم بات شاہ صاحب نے سورۂ مریم کی آیت نمبر ۳۱: ﴿ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا﴾ کے تحت مکمل نماز نبوی دلائل کے ساتھ ذکر فرما دی۔ نماز کے اول یعنی تکبیر تحریمہ سے، پھر رفع الیدین کے دلائل اور نہ کرنے والوں کا رد اور پھر سورۂ فاتحہ نماز کا حصہ ہونے کا تذکرہ بالتفصیل کیا۔

علاوہ ازیں وضو کے طریقے میں آپ نے اس قدر وضاحت کی ہے کہ کلی کرتے وقت الگ الگ چلو سے ناک میں پانی چڑھانا درست نہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی بھی ذخیرہ احادیث میں ایسی صحیح حدیث

نہیں جس میں الگ الگ پانی لینے کا ذکر ہو۔ ہاں! البتہ ایک روایت سنن ابی داوٗد میں مروی ہے جو کہ ضعیف ہے۔

اس کے بعد آمین بالجہر کے دلائل پیش کیے اور جو اس کے قائل نہیں ان کا بھرپور رد کیا ہے اور اس دوران آپ نے عطاء بن ابی رباح کا قول ذکر کیا جو کہ سنن کبریٰ میں حسن سند کے ساتھ مروی ہے کہ جناب عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ میں نے ۲۰۰ صحابہ کو آمین بالجہر کہتے ہوئے پایا۔

سبحان اللہ! شاہ صاحب کے کثیر المطالعہ اور پختگی علم کی دلیل ہے کہ آپ نے جو بھی روایت ذکر کی ہے اس کے بعد اس کی تصحیح وضعیف کا ذکر کیا۔

پھر اس کے بعد آج کل ایک اور مختلف فیہ مسئلہ تشہد میں انگلی کو حرکت دینے کے بارہ میں ہے۔

اس کے بارہ میں الشیخ مفتی مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ کا موقف ہے کہ تشہد میں انگلی کو حرکت دینی چاہیے اور یہ سنت ہے۔ جس کے بارہ میں آپ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی ہے۔ سنن نسائی کے حوالے سے کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلی کو حرکت دیتے اور دعا کرتے تھے۔ پھر دو صفحوں پر مشتمل احناف علماء اور امام البانی کا قول ذکر کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے (احکام ومسائل از مبشر ربانی : جلد ۱/۲۹۲)

جبکہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اشارہ کرنا درست ہے اور حرکت دینا غلط ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ذخیرہ احادیث میں اشارے کا ذکر ہے حرکت کا نہیں اور جو حرکت دینے کے بارہ میں روایت آئی ہے وہ بھی شاذ ہے۔

شاہ صاحب دلیل پیش کرتے ہوئے سنن ابی داوٗد کی بسند حسن روایت ذکر کرتے ہیں کہ: (( ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یشیر با صبعه اذا دعا ولا یحر کھا))

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کیا کرتے تھے۔ جب دعا کرتے اور حرکت نہیں کرتے تھے اور فرمایا کہ علامہ البانی کی تعلیق شدہ مقالہ میں امام البانی فرماتے ہیں کہ اس پر کوئی بھی صحیح حدیث موجود نہیں اور احناف کو موقف کہ أشھد ان لا اله الا الله پر انگلی کو حرکت دینا یہ بے بنیاد ہے۔ نیز راقم نے مفتی عبدالرحمٰن عابد حفظہ اللہ کا عمل ملاحظہ کیا، کہ وہ بھی تشہد کے شروع سے لے کر سلام تک انگلی کو حرکت دیتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد سلام تک، پھر نماز کے بعد کے اذکار اور دیگر اہم باتوں کا ذکر فرمایا اور ساتھ ایک ایسا مؤقف سامنے آیا کہ جس نے مجھے حیران کر دیا شاہ صاحب کے عقلی اور نقلی دلائل کو دیکھ کر میں انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم نبیہ تھیں اور بے شمار دلائل قرآنی ذکر فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند

ایک کا ذکر کرتا ہوں۔

لکھتے ہیں: جناب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس وحی آئی اور آئے بھی جبریل کے ذریعے تو جس کے پاس جبریل وحی لائے وہ نبی ہوتا ہے۔ پھر سورۂ مائدہ کی آیت کا ذکر کیا کہ: ﴿ کان امه صدیقه﴾ کہ اس ماں صدیقہ تھیں: کہتے ہیں اس صدیقہ کہنے سے ان کے نبیہ ہونے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ: (( یوسف ایھا الصدیق )) بھی تو اللہ نے فرمایا ہے۔ یوسف بھی نبی تھے۔ مزید برآں فرماتے ہیں کہ جو آیت سورۂ انبیاء میں ہے کہ: ﴿ وما ارسلنا من قبلك من رسول اِلاَّ نُوحِیْ ﴾ یعنی ہم نے صرف مرد ہی رسول بھیجے کے بابت فرماتے ہیں کہ ہم بھی کہتے ہیں کہ رسول بلاشبہ مرد ہی آئے لیکن آپ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر رسول تو نبی ہوسکتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ مزید تفصیل اور دلائل آپ مقالہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ جبکہ دوسری جانب حال ہی میں استاذ الاساتذہ مترجم ومفسر قرآن جناب الشیخ عبدالسلام بن محمد ﷾ کی تفسیر پر کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

تفسیر القرآن الکریم جلد ۲/۸۰۷ پر آیت ﴿وما جعلنهم جسداً﴾ سورۂ انبیاء کی آیت ۸ کے تحت لکھتے ہیں (بتصرف) کہ مشرکین جو کہتے تھے کہ کیا ہے رسول کو جو کھانا پینا اور بازاروں میں چلتا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا پھر فرمایا کہ (( هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ )) یہ تمھارے جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔

جواب دیا کہ اس سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے تمام بشر تھے، فرشتے نہ تھے، مرد تھے عورتیں نہ تھے، اس طرح وہ بے جان وجسم نہ تھے!! بہر کیف دونوں محقق علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا علم ہے اور اپنی تحقیق لہٰذا قاری خود فیصلہ کرے۔

مزید تفصیل کے لیے مقالہ تفسیر سورۂ مریم ملاحظہ فرمائیں!!

## المقالۃ الثانیہ

**نماز کی مسنون دعائیں:**

شاہ صاحب نے اہل سندھ بلکہ تمام امت مسلمہ کے لیے آسان پیرائے میں پہلے نماز کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد نماز کی دعاؤں کا بالتفصیل بیان فرمایا جو کہ تمام احادیث صحیحہ پر مشتمل ہے۔

## المقالۃ الثالثہ

**المغتربات:**

اس مقالہ میں آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنے والوں کا دندان شکن جواب دیا ہے۔ حالانکہ خلیفۂ ثالث جناب عثمان رضی اللہ عنہ بڑے ہی مظلوم تھے۔ انھوں نے کبھی اقرباء پروری کو نہیں سہارا اور جس نے یہ

سب کہا اس کو شاہ صاحب نے غلط ثابت کیا ہے۔

اس کے علاوہ ہم تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ایک اہم مقالے کا ذکر کر کے اپنی بات کو مکمل کرنا چاہیں گے۔

## المقالۃ الخامسۃ

علامہ عنایت اللہ مشرقی کی کتاب: ''پیغام ہدایت'' پر تبصرہ:

علامہ مشرقی نے بہت سی کتب تصنیف کیں، جن میں پیغام ہدایت بھی ہے۔ اس کے علاوہ حال ہی راقم کو علامہ مشرقی کی تفسیر تذکرہ جو کہ ٦ جلدوں پر مشتمل ہے، پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے افکار، نظریات اور باطل عقائد اور انکار حدیث کی بو ان میں واضح نظر آتی ہے، ان کے نظریات کلی طور پر اسلام کے خلاف ہیں، جن کا تذکرہ شاہ صاحب نے اپنے مقالہ میں کیا ہے اور ان کا بڑا اچھے اور سہل انداز میں رد کیا ہے۔

قارئین سے التماس ہے کہ اس مقالہ کو ضرور بغور پڑھیں۔

آخر میں اس کتاب کی تیاری اور آپ تک یہ عظیم گم شدہ ثمرہ جس شخصیت نے پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے وہ میرے محترم اور مشفق استاذ اور مربی جناب الشیخ افتخار احمد الأزھری صاحب ہیں کہ جن کی رات دن کی ان تھک کوششوں کے بعد یہ ذخیرہ علم محفوظ ہوا۔ آپ نے مدرسہ کی مصروفیات کے باوجود اس قدر اس بیڑے کو اٹھایا ہوا ہے کہ ان شاء اللہ ''مقالات راشدیہ'' جلد پنجم بھی قارئین کو جلد میسر آئے گی۔

ان مقالات کو جمع کرنا، پھر ان کے تراجم کرنے اور کروانے اور پھر ان کی نظر ثانی کرنا، بلاشبہ ایک بہت بڑا کام ہے لیکن ہر موقع پر اللہ کی مدد شامل حال رہی اور بالآخر یہ کتاب اپنی منزل تک پہنچی۔ رب پاک اسے ہم سب اور جن رفقائے کرام بالخصوص اساتذہ جامعہ بحر العلوم السلفیہ اور آل شاہ محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کے لیے نجات کا ذریعہ بنائے۔ نیز اس کتاب کی کمپوزنگ بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے جناب ابوبکر صدیق اور خلیل الرحمٰن صاحبان نے کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے مشفق اور محترم بھائی مدیر نعمانی کتب خانہ ضیاء الحق نعمانی کا ذکر نہ کروں کہ جنھوں نے مقالات راشدیہ اور فتاویٰ راشدیہ کو اپنے ذوق کے مطابق شائع کر کے عوام کے لیے بحر ذخار محفوظ اور جمع کرنے میں تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال اور کاوش قبول فرمائے اور ادارہ کو ترقی عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

❀❀❀❀

المقالة الأولى

المنهج الأقوم في تفسير سورة مريم
ملقب به

# محبّ التفاسير

## سورۂ مریم کی تفسیر اور اس کے احکام

1407ء ہجری کو شاہ صاحب کے عقیدت مندوں نے آپ سے اصرار کیا کہ آپ ایک سندھی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر لکھیں جو ہمارے لیے مشعل راہ ہو۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فجر نماز کے بعد روزانہ درس قرآن ارشاد فرمایا تھا۔ جب لوگوں نے اصرار کیا تو اس وقت سورۂ مریم کی تفسیر جاری تھی تو آپ نے ہیں سے سورۂ مریم کی تفسیر املاء کرانا شروع کر دی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کہیں اختصار اور کہیں تفصیل سے تفسیر کی ہے۔ یہ تفسیر سندھی زبان میں تھی، اس کی ابتدائی آیات کو شاہ صاحب کے بیٹے جناب سید ابو الاحسان قاسم شاہ راشدی نے اردو میں منتقل کیا اور باقی جامعہ کے استاد مولانا صبغت اللہ صاحب نے منتقل کیا۔ (الازہری)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# المنهج الأقوم في تفسير سورة مريم
## ملقب به
# محبّ التفاسير
# سورۂ مریم کی تفسیر اور اس کے احکام

الحمد لله و كفى والصلاة والسلام علىٰ سيدنا المصطفىٰ وآله واصحابه الذين اكتالوا باتباع السنة المقيال اوفاء۔

اس سورۂ مبارکہ کا نام اس کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ غالباً اس لیے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا تذکرہ اس میں ہے۔ ایک لحاظ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرح سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہود ونصاریٰ کی افراط اور تفریط کی وجہ سے کچھ غلط تصورات اور بے بنیاد عقیدے سے عوام اور خواص کے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ ان کی تردید ہو جاتی ہے اور اصل حقیقت کی کما حقہ نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ غلط تصورات کی تردید اور اصل حقائق کو نمایاں کرنا بھی قرآن کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سورۂ مبارکہ کا نام سورۂ مریم رکھا گیا ہے۔

### سورۂ مبارکہ کا زمانہ نزول:

غالباً اس سورت مبارکہ کا نزول سن نبوت کے چوتھے سال کے آخر اور پانچویں سن کی ابتدا میں ہوا ہوگا، اس لیے کہ نبوت کے پانچویں سن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی جن میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے اور اسی صحابی نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے سامنے اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات تلاوت کی تھی جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

❁❁❁

## تاریخی پس منظر

کفارِ مکہ نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو دھمکانے اور طرح طرح کی لالچ دینے سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو وہ ان پر ظلم اور بیجا ستم پر در آئے اور اس سلسلے میں انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ظلم و ستم بھی کیے۔ جس کا مفصل بیان حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ وہ بھی اس قدر کہ اب ان کا مکہ مکرمہ میں رہ کر اپنے دین پر آزادی سے چلنا اور اپنے جان و مال کی حفاظت کرنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا اس لیے چند صحابہ کو بارگاہ رسالت سے ارشاد ہوا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کریں وہاں کا بادشاہ انصاف پسند اور اپنے ملک میں بسنے والوں پر مہربان ہے، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کتنے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے چلے گئے اور ان میں حضرت جعفر بن ابی طالب بھی تھے۔ اور یہ سورۂ مبارکہ اس واقعہ سے کچھ عرصہ قبل (پہلے) نازل ہو چکی تھی۔ اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بھی تھی چونکہ حبشہ کا بادشاہ مذہباً عیسائی تھا اس لیے اس سورۃ مبارکہ کا نزول بالکل عین موقع پر تھا کیونکہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح حقیقت پیش کی گئی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ بی بی مریم علیہا السلام کے بارے میں یہودیوں نے جو بہتان طرازیاں اور افتراء پردازیاں کی تھیں ان کا بھی قلع قمع کیا گیا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ مشرکین کا وفد جس میں عمرو بن العاص عبداللہ بن ابی رافع ابوجہل کا اخیافی (ماں کا شریک) بھائی بھی شریک تھے، انہوں نے حبشہ کے بادشاہ کے پاس آ کر ان مہاجرین کے خلاف کئی شکایات کیں اور کہا اے بادشاہ! ان کو ہمارے حوالے کر دے تا کہ ہم ان کو مکہ مکرمہ لے جائیں مگر بادشاہ نے کہا کہ میں ان سے حقیقت معلوم کرنے کے بعد حوالے کروں گا بغیر حقیقت جانے ایسے حوالے نہیں کروں گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان مہاجرین کو طلب کیا اور آتے ہی ان سے یہ سوال کیا کہ آپ نے اپنا آبائی مذہب کیوں چھوڑا اور ہمارے مذہب کو بھی اختیار نہیں کیا اور دنیا کے دوسرے مذاہب میں سے بھی کسی کو اختیار نہ کیا آخر کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں حضرت جعفر بن ابی طالب نے اچھی خاصی تقریر کی اور یہ وضاحت کی کہ ہم اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے لہٰذا ہم میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک انسان کو مبعوث کیا جو حسب نسب کے لحاظ سے بھی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے اخلاق اور کردار اور صداقت و امانت معروف ہے ہم بخوبی واقف ہیں اس نے ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کا حکم فرمایا کفر اور شرک سے اس نے ہمیں باہر نکالا، ہمیں صلہ رحمی اور پاکدامنی کا حکم فرمایا، نماز اور دوسری عبادات کا حکم فرمایا اس وجہ سے یہ ہمارے دشمن بن گئے ہم پر ظلم اور تشدد کی انتہا کر دی اور اس طرح ہم لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہاں آپ کے اس ملک میں اے بادشاہ اس لیے آئے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ آپ کسی سے بھی بے انصافی نہیں کرتے اور اپنے ملک میں رہنے والوں پر شفقت سے پیش آتے ہو۔ پھر ہم یہاں چلے آئے تا کہ تمہارے ملک میں رہ کر ہم لوگ آزادی سے اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس پر

بادشاہ نے کہا کہ آپ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو نازل ہوا ہے اس میں سے کچھ سنائیں۔ اس پر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے وہ آیات مبارکہ تلاوت فرمائیں جن میں بی بی مریم علیہا السلام کا ذکر اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کا ذکر (اول سے آخر تک) ہے تلاوت سننے کے بعد اس بادشاہ اور ان کے وزراء پر اتنا اثر ہوا کہ نجاشی نے وفد مشرکین مکہ کو جواب دیا میں ان کو آپ کے حوالے نہیں کروں گا اور آپ چلے جائیں اور جو قیمتی تحائف اپنے ساتھ لائے تھے بادشاہ نے اس کا بھی کوئی خیال نہیں کیا تو وفد نے دوسرا حربہ استعمال کیا اور کہا کہ اے بادشاہ! یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق غلط عقائد رکھتے ہیں، اس پر بادشاہ نے پھر ان سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ان کا کیا خیال ہے تو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"ھو عبداللہ و رسولہ و روحہ و کلمتہ القاھا الیٰ مریم"

یہ سن کر بادشاہ نے زمین سے تنکا اٹھایا اور فرمایا کہ صحیح حقیقت بالکل یہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس حقیقت سے اوپر کچھ نہیں تھے، تنکا جتنا بھی تفاوت نہیں ہے۔

بہر حال مشرکین کا وفد ناامید و نامراد واپس لوٹ آیا۔ یہ روایت بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جو ہجرت کے وقت حبشہ میں تھی اور یہ روایت حدیث وسیرت کی کتابوں میں صحیح وجید سند کے ساتھ مذکور ہے۔

## سورۂ مبارکہ کے مضامین

مکی سورتوں میں احکام اور فروعی مسائل کم ہیں البتہ بنیادی اور اصولی باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلام کی بنیاد عقائد ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت انبیاء علیہم السلام کی رسالت قیامت اور آخرت مکی سورتوں میں ان باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ سورۃ مریم بھی مکی ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی توحید اور شرک کی تردید اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت جزا اور سزا اور بعث بعد الموت کو انبیاء علیہم السلام کے احوالوں اور عقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔

## سورۂ کہف اور سورۂ مریم کی مناسبت

اس سورۂ مبارکہ کی سورۂ کہف سے مناسبت بعیدہ ہے یعنی جس طرح سورۂ کہف میں عجیب قصے بیان فرمائے گئے ہیں اسی طرح اس سورۂ مبارکہ میں بھی نہایت عجیب وغریب وخارق العادات احوال کا بیان ہے۔

مناسبت قریبہ:

اس طرح سے ہے کہ سورۂ کہف کے آخر میں ہے کہ جس کسی کو بھی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین اور امید ہے تو اس کو چاہیے کہ نیک اعمال کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے تو اس سورۂ مبارکہ میں اول سے لے کر جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے وہ سب نیک اور موحد اور باعمل اور آخرت پر یقین رکھنے والے تھے

اور سورۂ کہف کے آخر میں جو یہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کہلوایا گیا کہ آخرت کی نجات عمل صالح اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید پر ہے بعینہ دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی یہی تعلیم دی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ سورۂ کہف میں جو دعویٰ تھا اس کی صداقت کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سورۂ مبارکہ میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے احوال اوران کی تعلیمات کو بطور دلیل پیش کیا۔ یعنی آپ ﷺ نے جو کچھ پیش کیا تو دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی وہی تعلیم پیش کی تھی اور آپ ﷺ نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی بلکہ وہی کچھ پیش کیا جو اس سے قبل دوسرے انبیاء علیہم السلام پیش کر چکے تھے۔ جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۂ احقاف میں فرمایا ہے۔

﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا ﴾ [الاحقاف : ۹]

''اے نبی ﷺ آپ کہہ دیجیے کہ میں نے پہلے رسولوں سے کوئی مختلف بات نہیں کہی۔''

اسی طرح قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں اگر پہلے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں تو ان میں سے بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر شروع سے لے کر خاتم النبیین ﷺ تک کوئی بھی فریق نہیں اور جس طرح سورۂ کہف میں یہودیوں کے سوال پر چند واقعات بیان کئے گئے اوران سے نبی ﷺ کی صداقت نمایاں ہوئی اور یہودیوں کو بھی اس پر یقین کرنا پڑا اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں سے کوئی بھی غلطی نہ نکال سکے، اسی طرح سورۂ مریم میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق صحیح حقائق بیان کر کے نصاریٰ پر حجت قائم کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ نجاشی بادشاہ کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جب سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ تلاوت فرمایا تو بادشاہ سمیت اس کے سب امراء وزراء بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اوران کو ماننا پڑا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق جو کچھ قرآن نے بیان فرمایا ہے اس میں اصل حقیقت سے ذرہ بھر بھی تفاوت نہیں ہے جیسا کہ یہ بات اوپر گزر چکی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## کٓھٰیٰعٓصٓ [1] :

اس قسم کے حروف چند سورتوں کے شروع میں آئے ہوئے ہیں ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق متقدمین سے متاخرین تک اختلاف ہوتا آیا ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ حروف متشابہات میں سے ہیں جن کا علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں اور ہمیں ان پر محض ایمان رکھنا ہے۔ اور معانی میں پڑ کر ان میں تدبر وتفکر نہیں کرنا مختصراً ان کے بارے میں کہنا ہے کہ: '' الله اعلم بمراده بذالك'' مگران کے مقابلہ میں دوسروں کا کہنا ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآن کریم میں نازل فرمایا ہے، ان کے متعلق خود قرآن مجید

[1] تفسیر قرطبی ص ۱۵٦ ج ۱۔ زاد المسیر ص ۲۱ ج ۱

نے بھی تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [ ص : ۲۹]

''یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم اس کی آیات میں غور و فکر کرو اور صاحب عقل اس سے نصیحت لیں۔''

ظاہر ہے کہ الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ طٰسٓمٓ۔ طٰسٓ یہ سب آیات ہیں اور مذکورہ آیت مبارکہ میں ان سب آیات کے متعلق غور و فکر کی دعوت ہے اور قرآن وحدیث میں جیسا کہ کہیں بھی وارد نہیں کہ ان حروف (مقطعات) کے بارے میں غور و فکر نہ کرو اور ان پر محض ایمان لے آؤ۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم نے اپنے مقابل آنے والوں سب کو چیلنج دیا ہے کہ وہ اس قرآن مجید میں سے ایک آیت کے مثل کوئی آیت بنا کے دکھادیں۔ لہٰذا اگر ان حروف مقطعات کی معانی عرب کے لوگوں کو معلوم نہ ہوتے اور اس قسم کا اسلوب و انداز مروج نہ ہوتا تو فوراً اس پر اعتراض کرتے کہ تو ہمیں مقابلہ کا اعلان بھی ایسے کلام سے کر رہے ہو جس کے معانی کا بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں اور یہ اسلوب اور انداز پورے عالم عرب میں کہیں بھی مروج نہیں تو ایسے کلام کا اب ہم مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں ہمیں چیلنج تو ایسے کلام سے کرو جو ہماری زبان میں رائج ہو۔ باقی رہا یہ کہنا کہ اس پر صرف ایمان لانا ہے تو یہ بات صرف اس آدمی سے کہنی ہے جو قرآن کریم پر پہلے ہی ایمان لا چکا ہو مگر ایک کافر جو قرآن حکیم کو مانتا نہیں اس سے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان پر صرف ایمان لانا ہے حالانکہ قرآن مجید بغیر تفریق کے ایک ہی وقت میں مسلم اور کافر دونوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ خصوصاً مکی سورتیں جن میں یہ حروف مقطعات اکثر طور پر آئے ہیں۔ صرف سورۂ بقرۃ اور سورۂ آل عمران کے علاوہ باقی سب سورتیں جن میں یہ حروف وارد ہیں مکی ہیں اور ان میں اکثر خطاب کفار اور معاندین کو کیا گیا ہے لہٰذا ان معاندین پر ایسا خطاب کرنا تب ہی پورا اترتا ہے جب وہ ان حروف کے معانی و مطالب کو پوری طرح سمجھ سکتے ہوں اس لیے ہمیں ان علماء و مفسرین کی رائے مضبوط اور قرین قیاس نظر آتی ہیں۔ جو اس بات کے قائل ہیں کہ ان حروف مقطعات کے معانی و مطالب ہیں جن میں غور و فکر کرنے کا ہمیں حکم ہے۔ اس کے بعد جو لوگ ان کے معانی کے قائل ہیں ان میں بھی معانی و مطالب بیان کرنے میں باہم اختلاف ہے۔ ہم یہاں سب کے سب اقوال ذکر نہیں کرتے بلکہ ان اقوال میں سے حبر الامۃ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ان حروف مقطعات کے بارے میں ہمیں زیادہ صحیح اور مناسب نظر آتا ہے جن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی تاویل اور تفسیر کے سمجھنے کی دعا فرمائی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ ان حروف مقطعات میں سے ہر ایک حرف پورا کلمہ ہے جس کو اختصار کیا گیا ہے اس سورۂ مبارکہ میں بھی حروف مقطعات ہیں اور اس بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے

قول کو نقل کریں، اس سے پہلے مناسب یہی ہے کہ اس جگہ پر عرب کے نثر و نظم میں سے کچھ اقتباسات پیش کریں تا کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حروف تہجی میں سے ایک حرف کو ذکر کر کے اس میں سے پورا کلمہ یا جملہ مراد لینا عرب میں عام طرح مروج تھا پہلے چند شعر لکھتے ہیں:

① ایک شاعر ولید بن عقبہ کہتا ہے:

قلنا لها قفى فقالت قاف ولا تحسبى انا نسينا الايجاف

[تفسیر قرطبی ص ۱۰۰ ج ۱ طبری ص ۹۰ ج ۱ زاد المسیر ص ۲۱ ج ۱ ابن کثیر ص ۳۷ ج ۱]

شعر کے پہلے مصرع میں (قاف) اختصار ہے "وقفیت سے"

② زہیر شاعر کہتا ہے:

بالخير خيرات وان شراًفا ولا اريد الشرالاان تا

[قرطبی ص ۱۰۰ ج ۱ زاد المسیر ص ۲۱ ج ۱ ابن کثیر ص ۳۷ ج ۱]

اول مصرع میں فاء ہے اس سے مراد ہے "شرافشر" دوسری مصرع میں ہے: "الا ان تا" اس سے مراد ہے: "الا ان تشاء"

③ ایک شاعر کہتا ہے:

نادوهم الا الجموا ألاتا قالوا جميعا كلهم الافا

اول مصرع میں ہے: "ألا تا" اس سے مراد ہے: "الا ترکبون" دوسری مصرع میں ہے: "الافا" اس سے مراد ہے: "الافارکبوا"

④ راجز شاعر کہتا ہے:

ما للظليم عال كيف لايا ينقد عنه جلده اذايا

اول مصرع میں ہے: "لایا" اس سے مراد ہے: "لا یفعل" اور دوسرے مصرع میں ہے: "اذایا" اس سے مراد ہے: "اذا یفعل" ❶

ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس کسی نے کسی مسلم کے قتل کرنے میں صرف آدھے کلمے کی بھی اعانت کی۔ الحدیث۔ مذکورہ حدیث کا راوی شفیق فرماتے ہیں کہ: "اقتل" کی جگہ اگر صرف "اق" کہا تب بھی وہ جرم میں شریک ہو گیا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"کفیٰ بالسیف شا"❷

یہاں پر "شا" سے مراد ہے: "شافیاً" اور بعض نے "شاهدا" بھی مراد لیا ہے۔

---

❶ طبری ص ۹۱ ج ۱۔ ابن کثیر ص ۳۷ ج ۱۔

❷ قرطبی ص ۱۵۶ ج ۱

## دوسری مثال:

(( حدثنی یعقوب بن ابراهیم، قال : حدثنا ابن علیه، عن ایوب وابن عون ، (هو عبدالله بن عون البصری) عن محمد (هو ابن سیرین) قال : لما مات یزید بن معاویة قال لی عبدة : (هوا بن ابی لبابة) ان لا أراها الا کائنة فتنة فافزع من ضیعتك، وألحق بأهلك، قلت : فماتأمرنی؟ قال: احب الی لك ان تا۔ قال ایوب وابن عون، بیده تحت خده الایمن یصف الاضطجاع حتی تریٰ أمرا تعرفه )) ❶

مذکورہ اثر میں "تا" سے اس مراد ہے: (تضطجع) "تم لیٹ جانا۔" جب اس سے ثابت ہوا کہ اہل عرب اپنے نظم ونثر میں حروف تہجی میں سے کسی ایک حرف کو لاکر اس سے پورا جملہ یا کلمہ مراد لیتے تھے تو پھر اس بات پر بھی تعجب کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ قرآن کریم نے بھی عرب کے اس اسلوب و انداز کو مد نظر رکھ کر کچھ سورتوں کی ابتدا میں حروف مقطعات کا استعمال کیا اور ان سے کوئی خاص جملہ یا کلمہ مراد ہیں۔ آپ ﷺ کی ایک حدیث مبارک سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف مقطعات مستقل حروف نہیں ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام بخاری اپنی تاریخ کبیر میں اور امام ترمذی اپنی سنن ترمذی میں مع تصحیح اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کی ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

(( قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حسنة والحسنة بعشر أمثالها لا أقول الٓمٓ حرف ولكن الف حرف لام حرف و ميم حرف ))

"آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے قرآن مجید میں سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے اس کے بدلے میں ایک نیکی ہے۔ اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف حرف ہے اور لام حرف ہے اور میم حرف ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دوسرے بھی کئی طرق سے مروی ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے تھے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مقطعات کے مطالب و معانی ہم وہ ذکر کریں گے۔ جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح طور پر مروی ہیں۔ اگر چہ اس سلسلہ میں تابعین کرام نے بھی کچھ معانی بیان کیے ہیں لیکن ہمیں صحابی رضی اللہ عنہ کی تفسیر خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

---

❶ طبری ص ۹۱ ج ۱۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشاد موجب اس سورۂ مبارکہ میں جو حروف مقطعات آئے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ کا اختصار ہیں۔

مثلاً: (کاف) سے مراد ہے :اسم کبیر یا کریم یا کافی۔ "ھا" سے مراد ہے :ہادی۔ "یا" سے مراد ہے: یمین۔ مشہور تابعی ربیع بن انس کے کہنے کے مطابق "یا" (یجیر و لا یجار) سے اختصار ہے۔

"ع" سے مراد ہے: علیم یا عزیز۔

"ص" سے مراد ہے: صادق۔

لہٰذا تقدیر عبارت اس طرح ہو گی:

"أنا الكريم والهادى واليمين والعليم والعالم والصادق"

یا تقدیری عبارت اس طرح ہو گی: "هوا الكبير الخ"

دوسرے اسماء کے معانی تو ظاہر ہیں اسم "یمین" کے متعلق کچھ وضاحت خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

یمین ماخوذ ہے یُمن سے یمن کے معانی ہیں برکت اور قوت۔ تو یمین کے معانی مبارک اور برکت والا اور برکت کے معانی میں نہایت وسعت ہے۔ یعنی رفعت وعظمت افزائش فراوانی دوام اور ثبات کثرت خیرات اور حسنات۔ اس کا معنی ہو گا وہ ہستی جو رفیع الشان صاحب عظمت کبھی ختم نہ ہونے والے خزانوں کی مالک ساری بھلائیوں اور خیرات کا سرچشمہ جو ہمیشہ اپنی خوبیوں اور کمالات میں قائم ودائم ہو، اس کو اس سلسلہ میں زوال کا تصور ہی ناممکن ہے۔

"کاف" کے تینوں معانی بواسطہ مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر کے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ [1]

ہم یہاں پر تفسیر طبری لابن جریر سے ہر ایک حرف کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول پیش کرتے ہیں۔

"کاف" حدثنی ابو حصين عبدالله بن احمد بن يونس (ثقة) قال: ثنا عبثر (ثقة) قال: ثنا حصين (ثقة) بن اسماعيل بن راشد (وثقة ابن حبان) عن سعيد بن جبير عن ابن عباس فى هذه الآية (كهيعص) قال: كبير يعنى بالكبير: الكاف من (كهيعص)

"هاء" بمعنى هادى: حدثنا ابو حصين قال: ثنا عبثر قال: ثنا حصين عن اسماعيل بن راشد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: كان يقول فى الهاء

---

[1] زاد المسير ص ۲۰۵ ج ۵ .

من (كهيعص) هاء۔

"ياء" بمعنى يمين: حدثنى ابو حصين قال: ثنا عبثر قال: ثنا حصين عن اسماعيل بن راشد سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: "ياء "من (كهيعص) ياء: يمين۔

"عين"بمعنى عالم و عزيز: حدثنا ابو كريب (هو محمد بن العلاء ثقة)قال: ثنا ابن ادريس (هو عبدالله بن ادريس الكوفى ثقة) قال: اخبرنا حصين عن اسماعيل بن راشد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس (كهيعص) قال: عين من عالم۔

حدثنى ابو حصين قال: ثنا عبثر قال: ثنا حصين عن اسماعيل بن راشد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس (كهيعص) عين: عزيز۔

"ص"بمعنى صادق: حدثنا ابو كريب قال: ثنا ابن ادريس قال: اخبرنا حصين عن اسماعيل بن راشد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال: كان يقول فى (كهيعص) صاد: صادق۔ [1]

یہی روایات بعینہ تفسیر درمنثور اور تفسیر زاد المسیر میں بھی ہیں لیکن سند کے بغیر۔

اس آیت کریمہ کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کریم ہے ذات صفات کے لحاظ سے بڑا ہے اپنے بندوں پر اور ان کی مشکلات کو حل کرنے والا ہے، کافی ہے، وہی بابرکت ہستی، وہی رہنمائی کرنے والا ہے وہی ہر بات کو جاننے والا ہے۔

درحقیقت یہ آیت کریمہ اس سورۂ مبارکہ میں جو مضامین ومطالب بیان کیے ہوئے ہیں ان کے لیے علم البلاغت کی اصطلاح کے لحاظ سے براۃ الاستہلال کا کام دیتی ہے، براۃ الاستہلال کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب یا مضمون کے شروع میں ایسے چند جملے یا فقرے استعمال کیے جائیں جن سے اندازہ لگایا جائے کہ اس کتاب یا اس مضمون میں کیا بیان ہونے والا ہے۔ جیسا کہ اس سورۂ مبارکہ میں توحید کا بیان اور شرک کی تردید اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے چند انبیاء علیہم السلام کے احوال پیش کیے گئے ہیں جن سے خوب اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ کس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ان بہترین بندوں پر اپنی نوازشات کی بارشیں برسائیں ان کو صراط مستقیم پر چلایا اور مشکلات میں ان کی کس طرح مدد کی اور جو جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح علم کے مطابق بیان کیے گئے ہیں ان میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات صادق اور سچی ہے۔

---

[1] تفسیر طبری لابن جریر ص ٤١ تا ٤٤ ج ١٦.

اس شروع والی آیت مبارکہ کو خیال میں رکھ کر اس سورۂ مبارکہ کے مضامین پر مختصر طور پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

اس آیت مبارکہ کے بعد دوسری آیت ہے۔

﴿ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ﴾ [مریم : ۲]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے اپنے نیک بندے پر کتنی بڑی رحمت اور مہربانی کی کیونکہ وہ کریم ہے اپنے فضل وکرم سے اپنے ایک صالح بندے کی دعا قبول فرمائی اس کو ایسے وقت ایک عالی مرتبہ فرزند عطا کیا جب اس کا بندہ پیرانہ سالی کی انتہائی منزل کو پہنچ چکا تھا اس طرح پھر بی بی مریم علیہا السلام کا قصہ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بی بی صاحبہ علیہا السلام پر کتنا بڑا انعام کیا اور مشکلات اور پریشانی کے وقت کس طرح اس کی دستگیری فرمائی اور اس سنگین معاملہ کا سامنا کرنے کے لیے کس طرح اس کی صحیح راہ نمائی کی۔ اس کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو افراط وتفریط کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں پر غلط تصورات قائم ہو چکے تھے ان کی تردید کر کے صحیح حقائق سے آگاہ کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس طرح اور انبیاء علیہم السلام کے احوال ذکر فرمائے ان کے بارے میں بھی قارئین کرام ہماری پیش کردہ حقیقت کی روشنی میں ان سب احوال کا ربط اس پہلی آیت مبارکہ سے بخوبی معلوم کر لیں گے۔

مختصر الفاظ میں اس سورۂ مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نیک بندوں پر جو احسانات کیے ان کی مشکلات کو دور کیا ان کی دعائیں قبول فرمائیں ان کو سیدھا راستہ دکھایا صحیح علم کی روشنی میں شرک والحاد کی تردید کی گئی اس سارے بیان میں صداقت ہی صداقت ہے کیونکہ یہ کلام اس بابرکت ہستی جل وعلا کی طرف سے نازل کردہ ہے جو صادق وسچا ہے۔ سورۂ نساء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴾ [النساء : ۸۷]

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے زیادہ اور کوئی سچا نہیں ہے۔"

اس لیے جو بھی حقیقت ہے وہ مالک عزوجل کی طرف سے نازل کردہ ہے وہی صداقت کا سرچشمہ ہے۔ میں قارئین کرام سے عرض داشت ہوں کہ اس آیت کریمہ کے مطلب پر طائرانہ نظر ڈالیں اور اس کا مطلب تھوڑے لفظوں میں ذہن میں رکھیں۔

"کاف" اس سے مراد ہے "کافی" یا "کریم" اس سے یہ اشارہ مراد ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں پر کرم وفضل کا بیان کیا ہے اور ان کی مشکلات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عنایت کا بیان ہے۔

"ھاء" اس سے یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ ان کو یہ سیدھا راستہ توحید والا اور اپنی عبادت کی رہنمائی اس

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ھادی بننے کی۔

"یاء" اس سے یہ سمجھایا گیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مبارکہ ہستی ہے جس کے خزانوں میں اتنے احسانات وعنایات کرنے کے باوجود کوئی کمی نہیں آئی۔ قرآن مجید میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ﴾ [الحجر: ۲۱]

"اور ہمارے یہاں ہر چیز کے کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔"

اور آپ ﷺ سے ایک حدیث قدسی ہے جو صحیح مسلم میں مروی ہے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے اس میں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"اے میرے بندو! تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے جن اور انسان ایک میدان میں کھڑے ہوکر مجھ سے اپنے لیے جو کچھ مانگیں اور سوال کریں میں ان کے سب سوالوں کو پورا کروں اور جو بھی مانگیں وہ سب ان کو دوں پھر بھی میرے خزانے میں صرف اتنی کمی آئے گی جیسے ایک سوئی کو سمندر میں ڈال کر پھر نکالا جائے تو اس سے سمندر میں کیا کمی آئے گی مطلب یہ کہ کوئی کمی نہیں آئے گی۔"

ربیع بن انس کے کہنے کے موجب "یاء" کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات وہ ہے جو ہر مصیبت و پریشانی سے بچائے اور پناہ میں رکھے اور جس کی وہ گرفت کرے کوئی اس کو پناہ نہیں دے سکتا۔

"ع" عالم کی صفت ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ یہ سب واقعات اور مضامین ایک علیم ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہیں جن میں ذرہ بھر بھی غلطی اور خطا کا امکان نہیں کیونکہ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

"ص" اس سے یہ بات سمجھائی گئی کہ جس ذات نے اس کتاب کو نازل کیا ہے وہ صادق اور سچی ہے، اس لیے اس کی طرف دروغ گوئی اور جھوٹ کی نسبت کا تصور ہی ناممکن ہے۔

﴿ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّآ ﴾ [مریم: ۲]

عبارت کی تقدیر اس طرح ہوگی۔

"یہ ہے تیرے رب کی رحمت کا بیان جو اس نے اپنے بندے حضرت زکریا علیہ السلام پر کی۔"

جب آیت کریمہ کے شروع میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم کا بیان آچکا تو اس آیت کریمہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ان چند نیک بندوں کا ذکر ہورہا ہے جن پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کچھ خاص مہربانیاں اور رحمتیں کیں دراصل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی بھی بندہ خواہ وہ کتنا ہی اونچے مقام ومرتبہ پر فائز ہو، تب بھی وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خاص رحمت کے سوائے نجات نہیں پاسکتا۔ اور نہ ہی وہ اپنے لیے کسی خیر وبرکت کی طاقت رکھتا ہے یعنی اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے کسی بندے پر کوئی مہربانی کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بندہ اسی مہربانی یا نعمت کا ہی مستحق ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اس کے لیے مہربانی یا نعمت کرنا واجب یا لازم ہوگیا بلکہ بندہ کتنا ہی

نیک ہو لیکن وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بے شمار مہربانیوں اور احسانات وعنایات کا صرف شکر ہی ادا کر سکتا ہے نہ کہ وہ اس بات کا مستحق ہی ہو گیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اس پر احسان کرنا فرض یا واجب ہو گیا بلکہ جس بندے پر بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کوئی مہربانی یا احسان کرتا ہے تو یہ محض اس کا فضل وکرم اور اس کی شان ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کوئی بھی آدمی اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پا سکتا بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم اور رحمت سے اس کی نجات ہو گی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟ آپ نے جواب دیا ہاں میں بھی نہیں، مگر جب اس کی رحمت مجھے گھیر لے گی تو نجات حاصل ہو گی۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ ایک شخص کسی جزیرہ میں رہتا تھا وہاں ہی اس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رزق بھی ملتا تھا اس نے پانچ سو ۵۰۰ برس عبادت کی تھی اور اس نے یہ دعا مانگی کہ میری موت بھی اسی حالت میں ہو یعنی عبادت میں اور یہ دعا بھی اس کی قبول ہوئی قیامت کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے فرمائے گا اے میرے بندے! ((ادخل جنتی برحمتی)) یعنی تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ بندہ جواب دیے گا: "ای رب وبعملی" یعنی میرے رب میرے اعمال بھی جو میں نے پانچ سو سال عبادت کی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمائے گا نہیں میرے بندے میرے رحمت سے داخل ہو جا جنت میں، وہ بندہ دوبارہ بھی وہی جواب دے گا۔ پھر تیسری مرتبہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ پہلے کی طرح فرمائے گا اور جب وہ شخص تیسری مرتبہ بھی وہی جواب دے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری عدل کی تقاضا ہے لہٰذا ہم بھی پورا حساب لیں گے۔ تم پر جو میری نعمتیں ہیں ان کو بھی وزن کیا جائے گا اور تمہاری ساری عمر کے اعمال بھی وزن کیے جائیں گے پس اگر میری نعمتوں سے تمہارے اعمال بڑھ گئے تو پھر جنت میں جانا۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس کی صرف آنکھ کا وزن کیا جائے گا تو وہ بندے کے ساری عمر کے اعمال سے بھاری ہو جائے گی لہٰذا اسے کہا جائے گا یہ تو دوزخ میں جاؤ یہیں پر اسے احساس ہو گا کہ میں نہایت غلطی پر تھا۔ دراصل یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانی ہے جو فرماتا ہے کہ یہ کام کرو میں تمہیں جنت میں داخل کروں گا۔ ورنہ ان اعمال کی وجہ سے وہ جنت کا حقدار نہیں بنتا کہ لازماً جنت میں داخل کیا جائے۔ اس احساس کے بعد وہ بندہ عرض کرے گا اے اللہ سبحانہ وتعالیٰ! تو مجھے اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرما اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے! اب جب کہ تو میری رحمت کا طلبگار ہے تو جاؤ جنت میں۔ [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یہ مہربانی اور فضل جو یہاں سے شروع ہوتا ہے وہ محض اس کا فضل تھا اس لیے ابتدا ہی اسی نمونہ سے ہوئی کہ اللہ سبحانہ

---

[1] صحیح بخاری عن ابی هریره رضی الله عنه۔ فتح الباری ص ۲۹٤ ج ۱۱.

[2] المستدرك للحاكم وغيره عن جابر بن عبدالله

وتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام پر جو رحم اور مہربانی کی اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس کے بعد آیت کریمہ میں لفظ ''عبد'' ہے، یہ قابل غور ہے درحقیقت سارے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کا شرف اور شان و مرتبہ و مقام رفعت وعظمت ان کی عبودیت و بندگی میں پوشیدہ (مضمر) ہے جو بھی انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی میں جس قدر بھی زیادہ سرگرم ہوتا ہے اس قدر اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور جس قدر جو انسان اس کی بندگی سے پہلوتہی کرتا ہے اتنا ہی وہ اس سے دور ہوتا جاتا ہے۔ سورۂ نساء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ [النساء : ١٧٢]

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ملائکہ اللہ کے بندہ ہونے کا ہرگز انکار نہیں کرتے۔''

تھوڑا آگے چل کر پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [النساء : ١٧٣]

''جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی سے انکار کرتے ہیں اور تکبر اختیار کرتے ہیں ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ دردناک عذاب کرے گا۔''

قرآن مجید کو جب ہم بنظر غائر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ پر ہمارے نبی کریم ﷺ پر کسی بڑی نعمت کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر عبد کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کے نزول کا ذکر آتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ﴾ [کہف : ١]

''ساری تعریفیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر کتاب نازل کی۔''

﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا ﴾ [البقرۃ : ٢٣]

''اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔''

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ [فرقان : ١]

''برکت والی ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا۔''

حضرت جبریل علیہ السلام کا آپ ﷺ کو تعلیم دینا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وحی بھیجنے کا بیان آیا تو وہاں بھی فرمایا: ﴿ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ﴾ [النجم : ١٠]

سورۂ اسراء میں معراج کا بیان آیا تو وہاں بھی فرمایا:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بنی اسرائیل : ١]

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا عبدیت میں کمال ان نعمتوں کا عظیم سبب بنا ہمیں حکم ہے کہ ہم پہلے نبی اکرم ﷺ کی عبدیت کا اقرار کریں اور گواہی دیں اس کے

بعد آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیں جیسا کہ ہم تشہد (التحیات) میں پڑھتے ہیں:

(( اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله ))

دراصل یہ عبد کا لقب حضرت رسول اللہ ﷺ کی ذات پر مکمل طور پر سجتا ہے اور آپ کے شایان شان ہے، ہم دوسرے لوگ تو صرف نام کے عبد ہیں صحیح معنی میں عبدیت (بندگی) کا حق صرف آپ ﷺ کی ذات نے ہی ادا کیا۔ آپ ﷺ کی مشہور حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا:

(( لاتطروانی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ ابن مریم إنما انا عبده فقولوا عبدالله ورسوله )) ❶

"میری تعریف میں اتنا غلو اور مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ غلو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ نے کیا کہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خود ذات یا اس کا بیٹا قرار دے دیا میں صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بندہ ہوں لہٰذا تم اس طرح کہو کہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

مگر افسوس! آج ہم نام نہاد مسلمانوں میں ایسے بھی موجود ہیں جو آپ ﷺ کے اس فرمان واجب الاذعان کو نظر انداز کر کے نصاریٰ کے نقش قدم پر چل کر آپ ﷺ کے بارے میں کچھ اس قسم کے اشعار بھی کہہ چکے ہیں جن سے پوری طرح نصاریٰ کی ترجمانی ہوتی ہے جیسا کہ کسی صاحب نے کہا ہے:

جو تھا مستوی عرش پر ۔۔۔ اتر پڑا مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اور ان لوگوں کے سامنے اگر کبھی آپ کی عبدیت کا ذکر ہوتا ہے تو سخت غصہ میں بھر جاتے ہیں اور اس بات پر بہت برہم ہوتے ان کے خیال میں نبی اکرم ﷺ کو عبد (بندہ) کہنا آپ کے شان میں انتہائی بے ادبی اور گستاخی ہے یعنی وہ لقب جس سے آپ ﷺ کے کمال اور خوبی کا ظہور ہو رہا ہے یہ لوگ اسے آپ کے اعلیٰ شان کے منافی سمجھتے ہیں اور گستاخی تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ہر نماز کے اندر آپ ﷺ کی عبدیت (بندگی) اور رسالت کی گواہی بھی دے رہے ہیں مگر کوئی شخص نماز کے علاوہ اگر آپ ﷺ کو عبد کہے تو سمجھتے ہیں جیسے اس نے کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہو، معلوم نہیں یہ لوگ قرآن کریم کے بے شمار مقامات پر جہاں آپ ﷺ کو عبد کے لقب سے یاد کیا گیا ہے کس طرح ترجمہ کرتے ہیں؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو عبد کہہ سکتے ہیں لیکن ہم نہیں کہہ سکتے، حالانکہ ہم بھی تو آپ ﷺ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہی عبد کہتے ہیں کسی اور کا تو نہیں کہتے؟ بہرحال کسی بھی انسان کی رفعت شان

---

❶ اخرجه الحمیدی فی مسنده (رقم ٢٧) والبخاری فی صحیحه (رقم ٣٤٤٥) و (٦٨٣٠) واحمد فی مسنده ص ٢٣۔ ٢٤۔ ٤٧۔ ٥٥ والدارمی ص ٣٢٠ ج٢ ومصنف عبد الرزاق (رقم ٢٠٥٢٤) وابو یعلیٰ (رقم ١٠٣) والطیالسی (رقم ٢٤) والبزار (رقم ١٩٤) والبیهقی فی الدلائل ص ٤٩٨ ج٥

کے لیے یہی ایک بات ضروری ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبدیت (بندگی) میں اپنا اعلیٰ مقام پیدا کرے جو بھی انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں آئے ان سب نے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ ساری مخلوقات کا خالق و مالک اور معبود صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہیں، ہم سب اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں، کسی بھی نبی علیہ السلام یا کسی صالح بندے نے کبھی بھی صرف اشارۃً بھی اپنی بندگی کے لیے لوگوں کو نہیں کہا۔ سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں قیامت کے دن کا ذکر ہے، اس میں یہ بیان ہے کہ اس دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [المائدة : ١١٦]

''اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوائے مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا؟''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے: اے میرے رب! تو پاک ہے شرک وغیرہ سے، میرے لیے یہ کہاں جائز ہے کہ میں ایک ایسی بات کہوں جو میرا حق ہی نہیں میں جب تک ان میں رہا تب تک ان کو یہی تعلیم دیتا رہا اور تلقین کرتا رہا کہ اس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت (بندگی) کرو اور اسی کو معبود مانو جو میرا اور آپ سب کا رب ہے۔ لہٰذا جب تک میں ان میں رہا اس حقیقت پر گواہ رہا اور جب تو نے مجھے اپنے پاس بلا لیا تو تمہاری ان پر نظر تھی (یعنی مجھے خبر نہیں) کہ انہوں نے میری تعلیمات صحیحہ کو کس طرح بگاڑا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام نے واضح الفاظ میں اپنی عبدیت (بندہ ہونے) کا اعتراف کیا اور اسی کا امر کیا اور ہر قسم کے شرکیہ امور اور توحید کے منافی اصولوں کی اچھی طرح سے تردید کی، اس لیے کسی بھی نبی علیہ السلام کو عبد (بندہ) کہلوانے میں کبھی کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی اور نہ اس سے ان کی شان میں کوئی گستاخی ہے۔

## حضرت زکریا علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

بنی اسرائیل نے فلسطین پر قابض ہونے کے بعد ساری حکومت کے انتظامی امور اور انصرام حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے بارہ ۱۲ قبیلوں میں تقسیم کر دیے۔ باقی تیرھواں ۱۳ قبیلہ جو لاوی بن یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں سے تھا۔ مذہبی امور اور ہیکل (بیت المقدس) کے متعلق خدمات وغیرہ کو اس کے سپرد کیا اور یہ قبیلہ ان کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی لاوی میں سے تھے اس لیے یہ منصب

وعہدہ بھی حضرت ہارون علیہ السلام اور اس کی اولاد کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کے چوبیس ۲۴ خاندانوں میں سے ایک خاندان ابیاہ نام کا بھی تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام اس خاندان میں سے تھے اس لیے اپنے خاندان کا نمائندہ ہونے کی حیثیت میں نبوت کے ساتھ مذہبی امور کی بجا آوری کے لیے جوان میں خاص عہدہ تھا وہ بھی ان کے پاس رہا:

﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا﴾ [ مریم : ۳ ]

یعنی یہ تمہارے رب کی رحمت کا اپنے بندے زکریا علیہ السلام پر کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا اور پکارا بھی مخفی یعنی اس نبی علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو مخفی اور تنہائی میں پکارا اور اس کے حضور نہایت اخلاص اور عاجزی سے دعا مانگی۔

## حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا پس منظر

سورۂ آل عمران میں یہ بیان آچکا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں آئی تو اس زمانے میں حضرت زکریا علیہ السلام جب بھی حضرت بی بی مریم علیہا السلام کے پاس آتے تھے تو کوئی نہ کوئی رزق (کھانے والی چیز) اس کے پاس موجود پاتے تھے۔ مفسرین رحمہم اللہ نے کچھ روایات کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ وہ رزق غیر موسمی میوہ جات وغیرہ تھے۔ یعنی سردی کے میواجات گرمیوں میں اور گرمیوں کے میواجات سردیوں میں اور یہ بات ان کی صحیح ہو یا نہ ہو لیکن وہ رزق بہر حال بی بی صاحبہ مریم علیہا السلام کو دستوری وسائل وذرائع کے طور پر بالکل میسر نہ تھا بلکہ معجزانہ طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا۔ اس لیے کہ اگر وسائل وذرائع کی بنیاد پر وہ رزق آپ کو ملتا ہوتا تو اس کی خبر ضرور حضرت زکریا علیہ السلام کو ہوتی، کیونکہ بی بی مریم علیہا السلام آپ ہی کی کفالت میں تھی۔ بہر حال حضرت زکریا علیہ السلام نے جب یہ رزق دیکھا تو بی بی مریم علیہا السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ رزق کہاں سے آیا ہے بی بی مریم علیہا السلام نے جواب دیا کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بیشک اللہ سبحانہ وتعالیٰ جسے ہیں بغیر کسی گمان کے رزق عطا فرماتا ہے۔ یہ ذکر سورۂ آل عمران کے چوتھے رکوع میں ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے بی بی صاحبہ کے ہاں جب یہ بے موسمی پھل یا بے گمان رزق دیکھا تو سوچا کہ جو مالک جل وعلیٰ اس طرح بغیر وسائل وذرائع کے رزق دیتا ہے۔ وہ بے شک اس بات پر بھی قادر ہے کہ مجھے بھی بے موسمی اولاد عطا فرمائے میں اگرچہ پیرسنی کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے نہ اس میں بعد ہے اور نہ غرابت اس لیے اپنی عبادت گاہ میں آکر تنہائی میں نہایت خشوع وخضوع اور پورے اخلاص سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور دعا مانگی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

تنہائی میں دعا مانگنے کی بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً: اگر دوسرے لوگوں کے سامنے آکر یہ دعا مانگتا تو

ہوسکتا ہے وہ اس پر ہنستے کیونکہ اکثر عوام کی سوچ سطحی ہوتی ہے ان کی سوچ اتنی اعلیٰ نہیں ہوتی کہ وہ وسائل وذرائع سے ہٹ کر بھی سوچیں کیونکہ مسبب الاسباب تک ان کی پہنچ اکثر نہیں ہوتی اس لیے ہوسکتا ہے وہ لوگ کہتے بھائی دیکھو عمر کتنی ہے اور آرزوئیں کیسی کرتا ہے۔ خاص طرح بنی اسرائیل کی جہالت اور ان کے بے سلیقہ اور ناشائستہ سوالات (جن کا بیان قرآن کریم میں مذکور ہے) کی روش میں ان سے یہ بات بعید بھی نہیں تھی۔ اور وہ اس دعا کی وجہ سے نبی علیہ السلام پر طعن زنی کرنے سے بھی نہ چوکتے لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جو اخلاص اور خشوع وخضوع اور عاجزی دعا کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے اس کے لیے گوشہ نشین اور تنہائی ہی موزوں ہے جن سعادت مند انسانوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اندھیری رات کی تنہائی میں مناجات کا لطف حاصل کر کے دیکھا ہے ان کو اس بات کا صحیح طور پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایسی اخلاص بھری دعا کے لیے موزوں وقت کون سا ہے جلوت (ظاہر) میں ریاء یا دوسروں کو دکھاوے کا بھی اندیشہ رہتا ہے لیکن خلوت (تنہائی) میں اس قسم کا کوئی بھی خطرہ نہیں رہتا ہے اس حالت میں زبان سے جو بھی دعائیہ کلمات نکلتے ان سے دل کا بھی ساتھ ہوتا لہٰذا جب کوئی الفاظ دل سے ہی نکل کر زبان کی نوک پر آتے ہیں تو انہیں شرف قبولیت حاصل ہونے کی بڑی امید ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

(( انا عند ظن عبدی بی ))

یعنی بندہ مجھ میں جیسا بھی گمان رکھے گا مجھے ویسا ہی پائے گا۔ اس لیے جب بندہ دل میں یقین کامل رکھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے اور نہایت عاجزی سے اس کی بارگاہ میں عرضداشت ہوتا ہے تو بارگاہ الٰہی میں بھی فوراً اس کی پکار کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے۔ مگر اخلاص کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ اس سلسلہ میں جلدبازی سے کام نہ لے اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرے اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ اس تاخیر اور دیر سویر میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ دعا کی قبولیت میں تاخیر کی وجہ سے جو لوگ عجلت اور جلدبازی سے کام لیتے ہیں وہ بیزار ہو کر دعا مانگنا چھوڑ دیتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ اور یقین نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿ وَ عَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [ال بقرة : ٢١٦]

”ہوسکتا ہے ایک چیز کو آپ ناپسند کرتے ہوں مگر اس میں آپ کے لیے بھلائی ہو اور ایک چیز کو آپ پسند کرتے ہو مگر اس میں آپ کے لیے شر (برائی) ہو اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

﴿ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ﴾ [ نساء : ١٩]

''ہوسکتا ہے ایک چیز کو آپ ناپسند رکھتے ہوں لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس میں آپ کے لیے خیر کثیر رکھے۔''

اس لیے اگر ہماری دعا کی قبولیت میں کچھ ٹائم لگے تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ [1] اور نہ تنگ ہو کر دعا کو چھوڑنا چاہیے بلکہ وہ یقین رکھے کہ اس تاخیر (دیر) میں میرے لیے بہتری ہے۔

دعا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دعا ہدایات شرعیہ کے برخلاف نہ ہو اور اس دعا کے الفاظ میں پوری طرح عاجزی وانکساری ہونا چاہیے۔ یعنی بندہ اس طرح عرض کرے کہ اے میرے رب! میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا جس طرح بھی چاہو میرے عرض کو قبول فرما میں پیچھے ہٹنے والا نہیں اگر اس عرض اور دعا کے مناسب وموافق اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات میں سے کوئی صفت یاد ہو تو اسے اس صفت سے پکارے اور اپنے عجز وانکساری اور نیاز کا اظہار کرے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی دعا کو ضرور قبولیت کا شرف بخشا جائے گا۔

دعا ایک عبادت ہے دعا مانگنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ نہ کسی سے مانگے اور نہ کسی کو پکارے وہ پکاری ہوئی ذات ملک مقرب یا نبی مرسل کیوں نہ ہو۔

یا کوئی دوسرا ولی اللہ ہو ہر حال میں صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اقدس کو پکارا جائے کسی دوسرے کو نہ پکارا جائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴾ [احقاف : ٥]

''اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو ایسی ہستیوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دعا کو قبول نہیں کر سکتے اور وہ تو ان کی دعاؤں سے بھی بے خبر ہیں۔''

﴿ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الاحقاف : ٦]

''اور جب سب لوگ روز قیامت اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ سب لوگ (جن کو پکارا جاتا ہے) ان کے (جو پکارتے ہیں) دشمن بن جائیں گے اور وہ ان کی عبادت کا ہی انکار کریں گے۔''

---

[1] دراصل بندہ کی دعا مقبول تو اسی وقت ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کے اثر ظاہر ہونے میں کچھ تاخیر ہو تو جلد بازی نہیں کرنی چاہیے جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ بندہ جو دعا مانگتا ہے وہ مقبول ہے لیکن تین طرح سے ایک تو یہ کہ جس طرح دعا مانگی وہ اسی طرح مقبول ہوئی دوسرا یہ کہ اس دعا کے بدلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پر آنے والی مصیبت جس کا اس سے علم ہی نہیں وہ ٹال دیتا ہے تیسرا یہ کہ اس دعا کا اجر اسے آخرت میں ملے بہر حال یہ بات حتمی ہے کہ اس کی دعا ماجور مقبول ہے جب تک وہ خود ہی ناامید نہ ہو اس کی دعا ضائع نہیں جاتی تینوں صورتوں میں سے جو بھی صورت اس کے لیے موزوں ہو گی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسی صورت میں اس دعا کو شرف قبولیت ضرور بخشیں گے۔ ابن محب اللہ الراشدی عفی اللہ عنہ

یعنی کہیں گے کہ یہ لوگ جو ہمیں پکارتے تھے ہمیں اس کی کچھ خبر نہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دعا یا پکارنے کو عبادت سے تعبیر کیا ہے یعنی اس کو عبادت کہا ہے اور عبادت یا بندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ کسی کو لائق ہے اور نہ کسی کا حق ہے۔ اس لیے غیر اللہ کو پکارنے والے شرک جیسے عظیم ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں اور مشرک لوگ قرآنی نص (حکم) کے مطابق کافر ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ﴾

[التوبة : ١٧]

”مشرکین کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مساجدوں کو بھی آباد کرنے کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ شرک کے مرتکب ہو کر وہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دے رہے ہیں۔“

اور کافروں کی دعائیں تو ویسے ہی بیکار جاتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴾ [الرعد : ٥٠]

”منکرین حق کی دعا بالکل ہی بیکار جاتی ہے۔“

یہ سوال نہ کیا جائے کہ بت پرستوں کی بھی دعائیں پوری ہوتی ہیں یہ اس لیے کہ ان کو قدرت کی طرف سے مہلت اور ڈھیل دی جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [آل عمران : ١٧٨]

”یعنی کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے جو ان کو ڈھیل دی ہوئی ہوتی ہے ان کے لیے اس میں کوئی خیر و بھلائی ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں میں اور بڑھ جائیں اور ان کے لیے تو ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“

یہ مہلت اور ڈھیل ان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کس طرح دی جاتی ہے، اس کا ذکر اس طرح ہے:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ [الانعام : ٤٤]

”جب انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نصیحت سے روگردانی (منہ موڑنا) کی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے (اور وہ اسے اپنی جہالت اور غفلت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کا راستہ اور ان کے اعمال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہاں مقبول نہیں اسی لیے تو اس نے ہم پر ہر طرح سے آسانی کردی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب وہ اس غفلت کی مدہوشی میں محو ہو جاتے ہیں) اور جب

وہ اس پر جو کچھ ہم نے ان کو دیا خوش ہونے لگتے ہیں جو ہم ان کی اچانک پکڑ کرتے ہیں تو ان کی ساری امیدیں اور خوشیاں مایوسی میں بدل جاتی ہیں۔"

بہر کیف منکرین حق کی اگر کسی وقت کچھ دعائیں مقبول بھی ہو جاتی ہیں تو اس سے یہ اندازہ لگانا سراسر غلط ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان سے راضی ہو کر ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے بلکہ یہ ان کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مہلت اور ڈھیل اس کی ناراضگی کا سبب ہے اور آنے والے عذاب کے لیے پیش خیمہ ہے۔

حاصل کلام یہ کہ دعا مانگنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی مشکلات کی حل کے لیے اپنی پکار یا دعا کو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے مخصوص رکھے کیونکہ یہ پکار یا دعا ایک عبادت ہے اور عبادت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کسی کو بھی شریک نہیں کرنا۔

دعا کی فضیلت قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں بہت سے مقام پر وارد ہے ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے: بندہ جب میرے حضور آ کر میرے سامنے اپنے ہاتھوں کو اٹھاتا ہے تو مجھے اسے خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے حیا آتی ہے۔[مسلم]

درحقیقت یہ اس کی بے پایاں رحمت کا نتیجہ ہے ورنہ انسان تو کیا اسے کسی بھی چیز کی کوئی پرواہ نہیں۔

اس طرح دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾

[کہف: ۱۱۰]

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴾ [المومن: ٦٠]

"تمہارا رب فرماتا ہے مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کرتا ہوں جو لوگ مجھ سے دعا مانگنے میں تکبر اختیار کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جلد ہی ذلیل وخوار ہو کر داخل جہنم ہوں گے۔"

یاد رہے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دعا کو عبادت کہا ہے۔

ایک انسان اگر دوسرے انسان سے کثرت سے سوال کرے تو وہ اس پر اور زیادہ ناراض ہوتا ہے اس کے برعکس اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس بندہ سے زیادہ راضی وخوش ہوتا ہے جو اس سے زیادہ سوال کرے اور زیادہ مانگے اور التجا کرے جیسا کہ اس آیت مبارک سے نمایاں ہے کہ جو اس سے نہیں مانگتا اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

احادیث میں دعا کو "مخ العبادة" [1] بھی کہا گیا ہے۔ یعنی دعا عبادت کا مغز، دماغ، بھیجا اور گودا ہے۔

قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

[1] رواہ الترمذی.

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ ﴾[النمل : ٦٢]

''کون ہے جو لاچار مجبور کی دعا کو قبول کرے اور اس کی مصیبت و پریشان کو دور کرے۔''

آگے پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ﴾ [النمل : ٦٠]

کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟(جو یہ کام کر سکے اور اس کی مشکل کشائی کر سکے)

بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہی وہ وحدہ لاشریک لہ ہستی ہے جو ہر وقت دن ہو یا رات اپنے بندوں کی پکاروں کو سن کر ان کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے اور مشکل اوقات میں ان کی مشکل کشائی اور دستگیری فرماتا ہے اور بار بار پکارنے پر یا سوال کرنے پر تنگ یا بیزار نہیں ہوتا جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ وہ خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے کہ تم بھوکے ہو آؤ میں تمہیں کھلاؤں تمہیں رزق دوں تم ننگے ہو آؤ میں تمہاری ستر پوشی کروں میری ہدایت کے بغیر تم سب گمراہ ہو آؤ مجھ سے ہدایت کا راستہ مانگو میں تمہیں ہدایت دوں، تم رات دن گناہ اور میری نافرمانیاں کرتے ہو میں ہی بخشنے والا ہوں، آؤ مجھ سے استغفار کرو بخشش مانگو میں تمہیں بخشش سے نوازوں۔ [1]

اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اس طرح اپنے بندوں کو پکارنا خصوصاً رات کے پچھلے پہر میں ہوتا ہے، پھر وہ وقت جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کو خود پکار رہا ہو اور کوئی سعادت مند انسان اس وقت اٹھ کر اپنے پیارے مالک کے حضور اپنی جھولی کو پھیلائے تو اس کی پکار کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں کتنی بڑی رسائی حاصل ہوگی اور اس کی حالت زار پر بارگاہ الٰہی سے جو نظر عنایات پڑے گی اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ:(( الدعا سلاح المؤمن ))''دعا مؤمن کا ہتھیار ہے۔'' ایک مؤمن جو کوئی بات یا چیز وسائل و ذرائع کی کمی کی وجہ سے حاصل کرنے سے قاصر ہے وہ مطلب ایک سچا مؤمن اپنی پرخلوص دعا کی وجہ سے حاصل کر سکتا ہوں۔

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴾ [مریم : ٤]

''کہا اے میرے پروردگار اس میں کوئی شک نہیں کہ میری ہڈیاں تک کمزور ہوگئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے اور میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔''

## آیت کریمہ کی مزید وضاحت:

العظم سے مراد ہڈیوں کی جنس ہے اور اشتعال آگ کے بھڑک اٹھنے کو کہا جاتا ہے اس آیت کریمہ میں

---

[1] صحیح مسلم عن ابی ذر غفاری.

بیان ہے پکارنے کا جس کی پہلی آیت میں وضاحت ہو چکی۔ یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنا مدعیٰ (عرض) پیش کیا اور اسے پیش کرنے سے پہلے تمہیدی طور پر اس دعا کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہا۔ فرمایا: اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں گھل چکی ہیں چونکہ (العظم) میں الف لام یعنی ال۔ تعریف کا جنس کے لیے ہے، مطلب یہ کہ میری جنس ہی کمزور ہو چکی ہے جسم کی پوری ہڈیاں یعنی جسم میں جو بھی ہڈیاں ہیں وہ سب کی سب کمزور اور ضعیف ہو چکی ہیں انسان کے جسم میں گوشت کے بنسبت ہڈیاں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، جب ان میں ہی کمزوری غالب آجائے تو گوشت کا کیا حال ہوگا۔ زکریا علیہ السلام کا یہ مقصد تھا کہ میرا پورا جسم ضعیفی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے آگے پھر: "اشتعل الرأس شیبا" میں بڑھاپے کا سارے بالوں میں پھیل جانا اور اس کے کسی بھی حصے کو نہ چھوڑنا اس کو بھڑک اٹھنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور عربی زبان کی بات چیت کے عرف میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ کسی معنی کو جو کسی شے کے ظرف میں ہو وہ ظرف خواہ زمان ہو یا مکان، اس کی طرف نسبت کی جائے جس سے مراد وہ مظروف ہو اور مظروف اسی معنی سے متصف ہو تو اس صورت میں اس معانی میں عموم و شمول پیدا ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ میں یعنی اشتعل الراس میں اصل عبارت اس طرح ہے: "اشتعل الشیب رأسی" "میرا بڑھاپا بھڑک اٹھا۔" لیکن ایسی صورت میں اس میں سے عموم نہ سمجھا جاتا ہے بلکہ سر کے کسی بھی حصے میں سفیدی آگئی تو یہ جملہ اس پر صادق آجاتا ہے۔ لیکن جب اس جملہ کی صورت تبدیل کر کے اشتعال کی نسبت بڑھاپے کی بجائے اس کی سر کی طرف کی گئی جو ظرف ہے اس کا یعنی "شیب" کا اور "شیبا" بڑھاپا کو تمیز کر کے لایا گیا۔ اب اس کے معانی یہ ہوگا کہ سر کا ایک ذرہ بھی نہیں بچا جہاں بڑھاپا نہ پہنچا ہو۔ اس کی وضاحت کے لیے دو مثال پیش کی جاتی ہیں:

## مثال اول:

اگر کہا جائے "اشتعل نار البیت" یعنی گھر کی آگ بھڑک اٹھی تو یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھر کے کسی حصہ میں آگ بھڑک اٹھی ہو لیکن اس کے بجائے اگر کہا جائے کہ "اشتعل البیت نارا" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پورا گھر اور جو کچھ اس میں ہے سب کا سب آگ کی لپیٹ میں آگیا۔

## مثال ثانی:

قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام والے طوفان کے سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا ﴾

"اور پھوٹ پڑی زمین چشموں سے۔"

اگر اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ: "وفجرنا عیون الارض" تو اس سے معانی میں اتنا شمول و عموم پیدا نہ ہوتا یعنی نوح علیہ الصلاۃ والسلام کی قوم کو زمین کے کسی حصہ میں بھی پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے تب بھی اس جملہ کا

مطلب ومعانی صحیح ہو جاتا مگر جو کلام قرآن مجید میں وارد ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی زمین کا سارا حصہ پانی کے چشموں سے بھر گیا۔ جگہ جگہ سے چشمے پھوٹ نکلے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کا اس جملہ سے بھی یہی مطلب تھا کہ میرے سر کے بالوں میں سے کوئی ایک بال بھی نہیں بچا جہاں بڑھاپا اثر انداز نہ ہوا ہو۔ آگے پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کو اس ہی کی عنایت واحسانات کے ذکر سے جوش دلانے کے خاطر یہ عرض کیا کہ اے میرے رب مجھے اپنے گذشتہ زمانے میں کوئی ایسا وقت یاد نہیں پڑتا جس میں تو نے میری دعا کو قبولیت کا شرف نہ بخشا ہو اور تو نے اپنے فضل وکرم سے ہمیشہ میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے، اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس وقت تک تو نے جو بھی نوازشات مجھ پر کی ہیں وہ بھی مجھے یاد ہیں اور مجھے ان کا احساس ہے۔

اور پھر جب بندہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں واحسانات کو ہر وقت اپنے ذہن میں رکھتا ہے اور ہر وقت ان کو یاد کرتا رہتا ہے تو اس زبان میں سے فوراً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ثنا وحمد اور اس کے انعامات کی وجہ سے شکریہ کے الفاظ نکل پڑتے ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وعدہ ہے کہ:

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ﴾ [ابراهيم : ٧]

''اگر میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔''

لہٰذا جب بندہ اس طرح دل کی گہرائیوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ بجالاتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس پر اپنی مزید نعمتوں اور احسانات وعنایات کی بارش کرتا ہے۔ تفاسیر میں ایک قصہ آتا ہے۔ بعض نے اس کی نسبت حاتم طائی کی طرف کی ہے اور بعض نے معن بن زائدہ کی طرف کی ہے۔

ایک محتاج آدمی اس کا کوئی خاص کام تھا وہ اس کے لیے مذکور بالا آدمی کے پاس حاضر ہوا اور اپنی حاجت بیان کی تو اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس پر اس نے کہا میں وہ ہوں جس پر تو نے فلاں فلاں اوقات میں احسان کیے تھے تو اس نے کہا: ''مرحبا بمن توسل بنا الینا'' خوش آمدید ہے اس کے لیے جس نے ہماری ذات کو ہماری طرف وسیلہ بنایا اور سائل کی حاجت کو پورا کیا۔

اب جب کہ انسان کی فیاضی کا بھی یہ حال ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس کی نعمتوں اور فیاضیوں کا کوئی شمار نہیں کوئی انتہا نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ﴾ [ابراهيم: ٣٤]

''اگر تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرو گے تو نہ کر سکو گے۔''

تو وہ اپنے عاجز بندے کو جو صرف اس کی بارگاہ میں اپنی جھولی پھیلائے ہوئے ہو کس طرح اپنی نظر کرم سے محروم رکھے گا جس کے دل کا ہر گوشہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانیوں کے احساس سے معمور (بھرا ہوا) ہو اور

زبان حال سے اس کو بیان کر کے تشکرانہ انداز میں اپنے رب جل واعلیٰ سے مزید عنایات اور کرم نوازیوں کا طالب ہو۔

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنا ہی فلاح وکامیابی کا سبب ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرمایا:

﴿ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [الاعراف : ٦٨]

''پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔''

وہ اس لیے کہ آدمی جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے رب کی اس پر کتنی بڑی مہربانیاں ہیں اور احسانات ہیں اور ان کے بدلے اس نے تو اپنے رب کی بندگی کا بھی حق ادا نہیں کیا نہ اسے یہ طاقت ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانیوں کا پوری طرح شکر بجالا سکے اور پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانیوں کے مقابلہ میں اپنی روش دیکھ کر اس کا سر ندامت کے احساس سے جھک جاتا ہے جب بندہ اپنے آپ کو تہہ دل سے قصور وار سمجھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے گناہ گار ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اور نہایت عاجزی وانکساری سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی طلب کرتا ہے اور اسے اپنی وسیع (کشادہ) رحمت کا واسطہ دے کر اس کی مہربانیوں وعنایات کا طالب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی ایسے بندے محبوب ہیں جو غرور وتکبر سے بالکل خالی ہوں اور ان کو اپنے قصور وار ہونے کا احساس واقرار ہو جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو جب مچھلی نے اپنے پیٹ میں نگل لیا تب اسے دعا میں یہ الفاظ کہے:

﴿ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الانبیاء : ٨٧]

''اے میرے رب! تیرے سوا دوسرا کوئی معبود نہیں تو ہر عیب اور خامیوں سے پاک ہے بے شک میں ہی ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے خود پر ظلم کیا۔''

مطلب یہ کہ نبی ﷺ نے نبوت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت اور کبریاء وجلال وجبروت کے سامنے اپنی گردن کو جھکاتے ہوئے کھلے لفظوں میں اقرار کیا کہ میں ہی قصور وار ہوں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی بغیر تاخیر کے اس کی دعا قبولیت کا شرف بخشا جیسا کہ اس دعا کے بعد ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـــْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الانبیاء : ٧٦]

''ہم نے اس کی دعا قبول فرما کر اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں۔''

خلاصہ کلام کہ بندہ جب بار بار اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ تصور پختہ ہو جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مجھ پر اتنی مہربانیاں اور انعامات وعنایات ہیں کہ شکر کرنا تو دور کی بات ہے میں

تو ان کو شمار بھی نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی خیال آتا ہے ان انعامات کے مقابلہ میں تو میں اس کی بندگی بجا لانے میں بھی کافی حد تک قاصر رہا ہوں اس لیے اپنے قصور وار ہونے کی ندامت اور اس احساس سے اپنی گردن کو جھکا کر نہایت عجز وانکساری سے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوتا ہے کہ اسے میرے رب جل وعلا! تمہاری نعمتیں تو مجھ پر بیشمار ہیں لیکن میں ہی گناہ گار عیب دار اور قصور وار ہوں جب کہ اس سے پہلے اس کے باوجود بھی تم نے مجھے ایسے نالائق کو ہر دفعہ نوازا ہے۔ تمہاری وسیع اور بے پایاں رحمت میں امید رکھ کر تمہارے ہی حضور عرض گذاشت ہوں کہ تو اپنی اس کشادہ رحمت سے جو ہر چیز سے بڑھ گئی ہے کہ میری دعا کو شرف قبولیت بخش! تو ان شاء اللہ العزیز اس کی دعا مقبول ہوگی یہ جو کچھ ہم تحریر کر آئے ہیں اس میں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے الفاظ: ﴿ولم اکن بدعائك رب شقیا﴾ ان میں کیا کیا جذبات مضمر (پوشیدہ) ہیں اور کیسی عاجزی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے انعامات کا طالب ہوا ہے اور کیسے لطف انداز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پہلی نعمتوں اور عنایات کا ذکر کر کے اس سے مزید انعامات کے لیے درخواست گزار ہے۔

﴿ وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ﴾

[ مریم : ۵ ]

موالی کے معانی ہیں عزیز قریب بھائی بندے۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ﴾ [ النساء : ۳۳ ]

عاقر "بانجھ" اور ولی کے معانی ہونگی "وارث"

مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کا (یعنی ان کی برائیوں کا) خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے پس مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے۔

پہلی آیت کریمہ میں حضرت زکریا علیہ السلام نے اس بات کا اظہار فرمایا کہ میں پیرانہ سالی کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہوں اس لیے جو دعا مانگ رہا ہوں وہ بظاہر تو بے وقت، بے موقع محل ہے لیکن اے میرے پروردگار! میں پھر بھی جیسا کہ تو ہمیشہ میری دعاؤں کو قبول کرتا آیا ہے تیری بے پایاں رحمت میں امید رکھ کر تیری ہی بارگاہ میں سوالی بن کر آیا ہوں۔

اور اس آیت کریمہ میں حضرت زکریا علیہ السلام اس دعاء کا جو اہم سبب ہے وہ بیان فرما رہے ہیں کہ اس گذارش کے پیش کرنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے سارے خاندان میں کوئی بھی ایسا فرد موجود نہیں جو میرے بعد میری جانشینی کا پوری طرح حق ادا کر سکے۔ کیونکہ آپ کے خاندانی افراد میں دینی اور

اخلاقی لحاظ سے بہت کمی تھی کوئی بھی ایسا لائق وفائق شخص نہ تھا کہ جس سے یہ امید کی جاسکتی ہو کہ وآگے چل کر اپنی بھی اصلاح کرے گا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں میں بھی تزکیہ وتربیت وہدایت اور رہنمائی کا انتظام کرے گا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے اولین مقصد سب سے اہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دین کی حفاظت اور اس کے بندوں کو صراط مستقیم دکھانا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا اور اس کو توحید کا علم بلند کرنا تھا اور ان سب باتوں کا خواہ آپ کی زندگی میں یا وفات کے بعد جاری رہنا اہم ہوتا ہے جیسا کہ عام انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ میرے بعد میری اولاد میں سے کوئی ایسا ہو جو میری گدی کو سنبھال سکے یا میرے کاروبار اور مال وملکیت کی حفاظت کرلے اور اس کو احسن طریقہ سے چلا سکے اس کے برعکس انبیاء علیہم السلام کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بعد (وفات) کوئی ایسا جانشین ہو جو اکے اس دینی سلسلہ کو قائم ودائم رکھتا آئے اس لیے ان کو اپنے ذاتی معاملات یا دنیاوی امور کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ ان کو ہر وقت اپنی امت کی ہدایت اور ان کی اصلاح اور دنیا وآخرت کی بہتری اور آخرت کے عذاب سے نجات کا ہی خیال دامن گیر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی امت کے خیر خواہاں ہوتے ہیں انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر اپنی امت کا اور کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا اس لیے ان کو ہر وقت یہی خیال رہتا ہے ان کی امت کی اصلاح ورہنمائی ہمیشہ ہوتی رہے اور ان کے سامنے کوئی بھی رکاوٹ حائل نہ ہو جس کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو جائے۔

آگے اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کا ذکر بعد میں کیا پہلے اس دعا کی وجہ (سبب) بیان کی اس لیے کہ اس کا تعلق پہلی آیت کریمہ میں:

﴿ وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴾ [مریم: ٤]

سے تھا دراصل اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندے کی ہر بات ہر امر اور ہر دعاء کی نیت وغیرہ کو جانتا ہے مگر اسے یہ بات پسند ہے بندہ میرے سامنے آکر مجھ سے اپنی حاجات طلب کرے ورنہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو اپنی مخلوقات کی تمام ضروریات ومشکلات وتکالیف ومصائب کو خود جانتا ہے اور چاہے تو بندے کی بغیر سوال کیے سب ضروریات کو پورا کردے لیکن یہ ابتدا اور امتحان وآزمائش کا مقام ہے اس لیے کسی بات کا صرف دل میں ہونا اس کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کا نتیجہ نکلتا ہے بعینہ اسی طرح ایک انسان اپنے دل میں خود کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف محتاج سمجھتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ میری اس ضرورت کو پورا کرنے یا اس مشکل کو حل کرنے پر وہ قادر ہے تو اس کا یہ راسخ (پکا) عقیدہ اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ایک دم ہی اس کی مشکل حل کردے بلکہ جب وہ اپنے اس دل کے عقیدہ اور ایمان وایقان اور جذبہ وخیال کو عملی صورت میں لاکر خشوع وخضوع سے اپنی زبان سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے عرض کرتا ہے تو وہ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے کیونکہ اسے یہ بات پسند ہے کہ بندے مجھ سے مانگیں اور میرے حضور دست دراز ہوں جیسا کہ احادیث میں آتا ہے

کہ اگر آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مانگو اور دعا کے متعلق جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ وہ عبادت ہے اس لیے بندہ پر یہ لازم اور واجب ہے کہ وہ اپنی دعا کے ذریعہ سے اپنی بندگی بجالائے ''وكانت امرأتي عاقرا'' میں نبی علیہ السلام نے یہ حقیقت بیان کی کہ جیسا کہ میں پیرانہ سالی کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہوں اس طرح اس کی بیوی میں بھی اولاد نہیں ہوتی۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ امور عادیہ اور دنیاوی اسباب کے لحاظ سے مجھے اولاد ہونے کی کوئی امید نہیں انسان جب جوان ہوتا ہے اور اس کی عورت بانجھ نہیں ہوتی تو اس کو یہ امید رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی مجھے اولاد ہو جائے گی۔ مگر جب یہ دونوں باتیں نہ رہیں نہ جوانی رہی نہ عورت میں اولاد ہونے کی صلاحیت تو اس صورت میں ظاہر اسباب پر نظر رکھ کر انسان واقعی مایوس ہو جاتا ہے اس لیے حضرت زکریا علیہ السلام نے ''من لدنك'' کے الفاظ فرمائے یعنی ظاہری حالات بالکل نا مساعد ہیں اور اولاد ہونے کے عادی اسباب موجود نہیں مگر تو ہر چیز پر قادر ہے تجھ سے کچھ بھی بعید نہیں اس لیے محض اپنے فضل وکرم اور اپنی قدرت کاملہ سے فرزند عطاء فرما۔

''ولی'' سے مراد اپنا یا پرایا نہیں بلکہ اس سے مراد خاص اپنا فرزند ہے۔قرآن کریم کی تفسیر کے لیے تشریح ہے۔

لفظ ''ولی'' کے لیے سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۴ میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ان الفاظ میں وارد ہے:

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴾ [آل عمران: ۳۸]

''اے میرے رب! مجھے اپنی طرف سے پاک اولاد عطا فرما بیشک تو ہی دعا سننے والا ہے۔''

اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کچھ لوگوں نے لفظ ''ولی'' سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا مقصد اس سے یہ تھا کہ اسے ایک صالح ولائق جانشین مرحمت فرمایا جائے خواہ وہ اس کو پشت سے ہو یا اس کے خاندان یا قوم کے افراد میں سے ہو۔

ایک سطحی ذہن رکھنے والا انسان کبھی سوچتا ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو صرف ایک صالح اولاد کی ضرورت تھی جو اس کو جانشین کا حق صحیح طریقہ پر ادا کر سکے تو اس کے لیے تو یہ الفاظ ہی کافی تھے کہ اے میرے رب! مجھے پسندیدہ خصائل والا فرزند عطا فرما پھر اس طوالت کی کیا ضرورت تھی کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے وغیرہ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حقیقت کو وہی آدمی زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کے اپنے دل پسند محبوب سے ہم کلامی کا موقع ملا ہو۔

لذت این شراب ندانی بخدا تا نہ چشی

یہ حال تو دنیاوی محبت والوں کا ہے مگر جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبت ہے ان کو جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مناجات کا موقع ملتا ہے تب ان کے دل دماغ اور روح کا کیا عالم ہوتا ہے یہ ہما شما کے تصور سے بہت دور ہے کسی شاعر نے کہا ہے:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم     چنانچہ حرف عصا گفت اندر طور

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿ وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَٰمُوسَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ۱۷]

''اے موسیٰ علیہ السلام تیرے سیدھے ہاتھ میں کیا ہے؟''

اس کا جواب تو صرف یہ تھا کہ ''ھی عصای'' یہ میری لاٹھی ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے بعد اتنا لطف اور قرار آیا کہ اس نے چاہا کہ اس ذات پاک جل وعلا سے مناجات کرنے میں جتنا بھی موقع زیادہ ملے اچھا ہے اس لیے اس مختصر جواب کے بجائے اس نے فرمایا:

﴿ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ﴾ [طٰہٰ: ۱۸]

''یہ میری لاٹھی ہے جس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں۔''

جس کو جس سے محبت ہوتی ہے اس سے ملاقات کے وقت اس کا یہی خیال ہوتا ہے کہ اپنے پیارے سے جتنا ہو سکے زیادہ کی مجلس کرے اس سے مناجات کرے اور اپنی دلی محبت کا لفظوں کی صورت میں اظہار کرے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھی یہ بات پسند ہے کہ بندہ اس سے اپنی مناجات میں دل کی گہرائیوں سے اپنے دل کا حال پیش کرے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ ))

''بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا (کہ یہ خوبصورت ہیں یا بد صورت یا مالدار ہیں یا مفلس) بلکہ وہ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے۔'' [صحیح مسلم]

کہ تمہارے دلوں کو اور اعمال اس کو رضا کے موافق ہیں یا نہیں لہٰذا جس کے دل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت ہوگی تو جب بھی اسے کوئی ایسا خلوت کا موقع مل گیا تو وہ اپنی بے انتہا محبت کے اظہار اور اپنے احتیاج کو زبان سے ظاہر کرنے کے سوائے رہ ہی نہیں سکتا اس مناجات میں کتنا بھی وقت گزر جائے لیکن اسے ملال یا بوریت بالکل نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ان گھڑیوں (وقت) کو ساری دنیا ومافیہا سے زیادہ بہتر اور پیارا سمجھتا ہے اور اپنے لیے ان لمحات کو سعادت مندی تصور کرتا ہے اس کو تو یہی خیال رہتا ہے کہ معلوم نہیں ایسے مبارک لمحات پھر نصیب ہوں گے بھی یا نہیں۔

خلاصہ کلام کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سچے بندے اس کی سچی محبت میں سرشار ہوتے ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مناجات سے بڑھ کر ان کے یہاں کوئی محبوب چیز نہیں ہوتی، اس لیے اپنی مناجات میں اپنے لیے دعا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حمد وثناء بیان کرنے اور اس کی طرف اپنی ہر طرح کی عاجزی محتاجی کے ذکر میں کافی وقت

صرف کرتے ہیں تا کہ جتنا ہو سکے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ہم کلامی کی سعادت ان کو زیادہ سے زیادہ نصیب ہو اور جب وہ مالک جل وعلا سبحانہ وتعالیٰ دیکھتا ہے کہ بندے کو میری طرف اتنی رغبت وچاہت ہے اس کا دل میری محبت سے معمور ہے اور میری مناجات سے اسے لطف اور لذت حاصل ہو رہی ہے تو وہ لامتناہی رحمت کا مالک اپنے بندے کی دعا میں عجز و نیاز کا عنصر غالب (اکثر) ہونا چاہیے اور کسی بھی طرح اپنی بڑائی یا فخر وخود پسندی کا ہرگز شکار نہ ہو کیونکہ یہ مقام ادب و تعظیم اور عجز و نیاز اور انکساری کا ہے بندہ جتنا بھی خود کو کمترا اور ذلیل اور عاجز تصور کرے گا اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس قدر اس کو مقام ومرتبہ میں بلند کرے گا اور جو فخر اور بڑائی میں مبتلا ہو گا وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نظر سے گر جائے گا۔

مطلب یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام سے اس آیت کریمہ تک یہ بیان فرمایا کہ میں پیرانہ سالی کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے ظاہری اسباب بالکل مفقود (ختم) ہو چکے ہیں اور اپنے پیچھے (بعد وفات) کوئی ایسا جانشین بھی نہیں دیکھتا جو دین کی تبلیغ کا فریضہ اور سلسلہ تحریم وارشاد کو جاری رکھتا آئے اس لیے مجھے ایک وارث یعنی فرزند مبارک عطا کیا جائے۔ آگے چل کر پھر اس چھٹی آیت کریمہ میں اس وارث کے متعلق کچھ صفات کا بیان آ رہا ہے۔

﴿ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴾ [مریم : ٥]

"رضیا" بمعنی مرضی۔ یعنی پسندیدہ خصال وعادات۔ وہ شخص جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پسندیدہ ہو اور اس کے بندوں میں اپنے اخلاق حسنہ کی وجہ سے پسندیدہ شخصیت ہو۔ ترجمہ اس طرح سے ہوگا۔

(ایسا وارث مجھے عطا فرما) جو میرا وارث بنے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد اور خاندان کا بھی واث بنے اور میرے رب اس کو ایسا بنا جو تیرا پسندیدہ ہو۔ اور اس جگہ پر "رضیا" وارد ہے اور اس کو سورۂ آل عمران میں "طیبۃ" کر کے ذکر کیا گیا ہے یعنی پاکیزہ خصال اور ہر طرح کی مادی ومعنوی گندگی سے پاک ہو اس آیت کریمہ میں یہ جو حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے فرزند کے بارے میں اپنی وراثت اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی وراثت کے بارے میں عرض کیا ہے اس میں سے دینی وراثت نبوت اور علم کی وراثت مراد ہے نہ کہ دنیاوی مال وملکیت جس کی چند وجوہات ہیں:

## 1۔ پہلی وجہ:

یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام کوئی اتنے بڑے مالدار نہ تھے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نجار (بڑھی) تھے جو آدمی اس طرح سے اپنے روزگار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اس کے پاس اتنی ملکیت کہاں اکٹھی (جمع) ہو سکتی ہے جو اس کی دیکھ بھال وغیرہ کے لیے اپنا وارث طلب کرے۔

## 2۔ دوسری وجہ:

انبیاء کرام علیہم السلام کی نظر میں مال ملکیت اور دھن و دولت کی کوئی بھی قدر و قیمت نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ دنیاوی مال اسباب میں اسقدر مشغول ہوتے ہیں بلکہ وہ ضروریات زندگی کی حد تک کیونکہ یہ ایک فانی زندگی کی ناگزیز ضرورت ہے توجہ دیتے ہیں تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑے اس سے زیادہ کی نہ ان کو تمنا ہوتی ہے نہ اس طرف توجہ دیتے ہیں ایسے میں ایک نبی علیہ السلام اس دنیا کے مال و اسباب کی دیکھ بھال و نگرانی کے لیے کس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ایک فرزند کی تمنا کرسکتا ہے یہ ان کی شان سے بہت بعید ہے ان کی نظر میں اہمیت والی چیز صرف اخروی زندگی اور اس کو بہتری کے لیے اپنی اور اپنی امت کی اصلاح ہوتی ہے ان کے ہاں اس چیز کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے کہ وہ میرے بعد میری جانشین کا پورا حق ادانہیں کرسکیں گے۔ اس لیے کہ وہ صالح نہ تھے اس سے یہ بات واضح ہے کہ اسے ایک ایسے وارث کی طلب تھی جو اس کے علم و دین کا وارث بن سکے اور آپ کا صحیح جانشین بنے اور اللہ کے سلسلے کو جاری رکھتا آئے۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی آپس میں موافقت نہیں ہوتی یعنی اسے ڈر اور خوف تو ہے اپنے غیر صالح پیچھے والوں کا اور طلب کر رہا ہے اولاد اپنے مال وملکیت کے لیے یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے چنانچہ جیسا کہ اس میں ظاہر ہے کہ وراثت سے مراد علم دین کی وراثت تھی نہ کہ مال واسباب کی۔

## 3۔ تیسری وجہ:

حضرت زکریا علیہ السلام نے اس مقام پر اسی اپنے فرزند کے بارے میں یہ بھی عرض کیا کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا وارث بنے۔ کیا حضرت زکریا علیہ السلام کے دوسرے رشتہ دار وغیرہ نہیں تھے جو اس خاندانی مال و دولت کے وارث بنتے بلکہ کتابوں میں تو مذکور ہے کہ آپ کے چچازاد بھائی وغیرہ بھی تھے، اس لیے آل یعقوب کا مال و دولت کے اعتبار سے صرف حضرت زکریا علیہ السلام کا فرزند ہی وارث بنے یہ بات بعید از مفہوم ہے۔ ہاں اگر اس وراثت سے مراد علم اور دین لیا جائے تو پھر معنی صحیح ہے کیونکہ آل یعقوب اور خاندان میں کوئی ایسا لائق وفائق فرد نہ رہا تھا جو اس وراثت کو سنبھال سکے۔ لہٰذا حضرت زکریا علیہ السلام کو فرزند پیدا ہو تو وہ اس علم اور دین کا وارث بن سکتا ہے۔

## ۴۔ چوتھی وجہ:

قرآن کریم میں بھی اس علم اور دین کی وراثت کے لیے دوسری مثال اس کی تائید میں ملتی ہے۔

﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ ﴾ [النمل: ١٦]

''اور سلیمان داؤد کا وارث بنا۔''

ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دوسرے بھی بھائی تھے اگر وراثت سے مراد مال و دولت کی وراثت ہوتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس طرح کیسے فرماتے کیونکہ مال و دولت میں تو سب اولاد حصے دار ہوتی ہے لیکن چونکہ اس جگہ پر وراثت سے مراد نبوت اور علم کی میراث تھی اس لیے اس کا وارث صرف اس کا بیٹا حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا، کوئی دوسرا بھائی نہیں۔

**⑤۔ پانچویں وجہ:**

کتنی ہی صحیح احادیث وارد ہیں جن میں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مال وملکیت کے اعتبار سے ورثہ ترکہ نہیں ہوتا وہ صرف علم دین کا ورثہ چھوڑتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لا نورث ماتركنا محفوصدقة )) [صحيح البخاري ومسلم]

یعنی ہم انبیاء علیہم السلام کا مال و دولت کے اعتبار سے کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ بھی اپنے پیچھے چھوڑتے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں صدقہ وخیرات ہو جاتا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عباس بنی عبدالمطلب رضی اللہ عنہم فرمایا کہ میں آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں کہ کیا آپ سب کو اس بات کا علم ہے کہ بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا کوئی ورثہ ترکہ نہیں ہوتا اور جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑتے ہیں وہ صدقہ اور خیرات ہوتا ہے تو سب نے جواب دیا ہاں۔ [متفق عليه]

بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفات پائی تو آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے ارادہ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجیں تاکہ اس سے ان کا حق وراثت طلب کرے، تب بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ ہم جو بھی اپنے پیچھے مال وملکیت چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ [متفق عليه] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری وراثت میں دینار وغیرہ تقسیم نہیں ہوتے جو کچھ میں نے چھوڑا وہ میری ازواج مطہرات کے نفقہ اور میرے اہل کی ضرورت کے بعد جو کچھ بچے گا وہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں صدقہ ہے۔'' [متفق علیہ]

امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں ایک روایت لائے ہیں اس کے الفاظ ہیں:

''میرے وارث میرے درہم اور دینار تقسیم نہیں کریں گے الخ۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شک حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب آپ انتقال (وفات) کریں گے تو آپ کا وارث کون ہوگا؟ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میری اولاد اور میرا اہل اس پر بی بی صاحبہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پھر کیا سبب ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث نہیں بنائے جاتے حضرت ابو بکر الصدیق نے جواب دیا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا آپ نے فرمایا کہ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نبی کی اس کی وراثت نہیں ہوتی، البتہ میں ان سب کی عیالداری (دیکھ بھال) کروں گا۔ جن کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور ان پر خرچ کروں گا جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ [رواہ احمد فی مسندہ والترمذی فی جامعہ وصححہ]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( انا معاشر الانبیاء لا نورث )) [رواہ النسائی]

"ہم انبیاء علیہم السلام کی پوری جماعت وارث نہیں بنائی جاتی یعنی ان کا کوئی ورثہ ترکہ نہیں ہوتا۔"

حافظ الدنیا ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ فتح الباری کے کتاب الفرائض میں فرماتے ہیں: مندرجہ بالا حدیث (یعنی اوپر والی حدیث) ہیثم بن کلیب اپنی مسند میں حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں۔ اس طرح طبرانی بھی دارقطنی رحمہ اللہ اپنی علل میں بی بی ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت لائے ہیں اور وہ بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں اور وہ حضرت ابو الصدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہیں:

(( ان الانبیاء لا یورثون ما ترکوا فهو صدقة )) [العلل للدارقطنی ص ۲۳۱ ج۱]

"بے شک انبیاء کرام علیہم السلام وارث نہیں بنائے جاتے۔ انتہیٰ کلام الحافظ ابن حجر"

ان احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا مال ودولت اور درہم ودینار کے لحاظ سے ورثہ ترکہ نہیں ہوتا اور وہ جو کچھ بھی اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں صدقہ خیرات ہو جاتا ہے۔

شیعہ حضرات اس مسئلے کو بہت ہی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ ﴿یرثنی ویرث من آل یعقوب﴾ سے مراد مال وملکیت کا ورثہ ہے، کیونکہ لغت کے اعتبار سے اس کے یہی معانی ہیں یعنی حقیقی معنی یہی ہے کیونکہ اس مقام پر کوئی ایسا صارف موجود نہیں کہ ہم حقیقی معانی کو چھوڑ کر مجازی معنی کو لیں اس کا جواب یہی ہے کہ شیعہ حضرات کی اس سلسلہ میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ عرب لغت کے اماموں اور محققین نے یہ تصریح کی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی (ص ۶۰ ج ۱۶) میں تصریح کی ہے کہ ورثہ کا لفظ مال ملکیت ہو یا علم دین وغیرہ مادی اور معنوی دونوں معانی میں حقیقتاً مستعمل ہے نہ کہ مجازاً ہم کتاب وسنت سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ وراثت کا اطلاق علم ودین وغیرہ پر بھی آتا ہے۔

## مثال نمبر ا:

﴿ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ﴾ [ فاطر : ٣٢]

''پھر وارث بنایا ہم نے اس کتاب کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔''

یہاں کتاب کی وراثت سے مراد علم ہے۔

## مثال نمبر ۲:

﴿ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ﴾ [ الشوریٰ : ١٤]

''اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔''

## مثال نمبر ۳:

﴿ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡهُدٰى وَاَوۡرَثۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡكِتٰبَ. هُدًى وَّذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴾ [ المومن : ٥٣، ٥٤]

''اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایات و نصیحت تھی۔''

یہ سب مثالیں کلام اللہ تھیں اب احادیث نبویہ ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( ان الانبیاء لم یورِثو دیناراً ولا درهماً وإنما ورثوا العلم )) [رواہ احمد وابوداوٗد والترمذی وغیرہ]

اور ابن حبان وحاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک انبیاء علیہم السلام ورثہ میں دینار یا درہم نہیں چھوڑتے وہ صرف علم ورثہ میں چھوڑتے ہیں۔''

اور دیلمی نے اپنی مسند میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت کی ہے:

(( العلماء ورثة الانبیاء )) [ کشف الخفاء ومزیل الالباس]

''انبیاء علیہم السلام کے وارث علماء ہیں۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام ورثہ میں صرف علم چھوڑتے ہیں اور ان کے وارث بھی صرف علماء ہی ہوتے ہیں اور ان کے مال وملکیت کا کوئی ورثہ ترکہ نہیں ہوتا۔

علامہ آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی ص ٦٠ ج ١٦ میں مشہور شیعہ عالم کلینی کی مشہور کتاب کافی سے نقل کرتا

ہے وہ ابوالبختری سے روایت کرتا ہے، وہ ابوعبیداللہ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ بیشک اس نے فرمایا:

(( ان العلماء ورثة الانبياء وذالك ان الانبياء لم يورِثوا درهما ولا دينارا وإنما ورثوا احاديث من احاديثهم فمن اخذ بشيء منها فقد اخذ بحظ وافر ))

[الاصول من الكافی للكلینی ص ۳۲ ج ۱]

''حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ (یہ شیعہ حضرات کے بارہ اماموں سے ایک امام ہیں) فرماتے ہیں کہ بیشک علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں (وہ اس لیے کہ) وہ ورثہ میں درہم اور دینار نہیں چھوڑتے وہ ورثہ میں احادیث (یعنی علم) چھوڑتے ہیں پھر جس نے ان میں سے کچھ حاصل کیا تو اس نے ایک بڑا حصہ حاصل کیا۔''

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے احادیث کے ورثہ کے سلسلے میں لفظ ''إنما'' کا استعمال کیا ہے، جو حصر کے لیے ہے اور یہ بات شیعہ حضرات کے ہاں بھی مسلم ہے تو اب امام صاحب کے کہنے کا یہ مطلب ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ صرف اور صرف علم اور ان کی احادیث ہیں نہ کہ کوئی دوسری چیز باقی ان کا یہ اعتراض کہ اگر ورثہ کا لفظ حقیقی معنی میں علم کے لیے بھی مستعمل ہوتا تو فقہاء اپنی کتابوں میں صرف مال کی توریث کے ذکر تک خود کو محدود نہ کرتے یہ ان کا اعتراض صحیح نہیں کیونکہ فقہاء اپنی کتابوں میں صرف ان مسائل پر بحث کرتے ہیں جن کا تعلق فقہیات سے ہو اس لیے وہ عبادات و معاملات جن میں بیع وشراء اور نکاح وطلاق وعتاق اور مال وملکیت کے ورثہ وترکہ اور وصیت وغیرہ کا بیان ہو اس پر بحث کرتے ہیں باقی علم کا ورثہ تو یہ موضوع ان کے بحث سے خارج ہے کیونکہ اس کا فقہی ابواب سے کوئی تعلق نہیں اس لیے انہوں نے توریث سے وہی معانی مراد لیے جو ان کا موضوع بحث تھا، اس لیے ان کا دوسرے معانی کو اپنا موضوع بحث نہ ہونے کی وجہ سے بیان کرنا اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ یہ معانی اس کی حقیقی معانی نہیں۔ اگر بالفرض (ان کے کہنے کے مطابق) وراثت کا اطلاق حقیقتاً صرف مال ودولت کی وراثت پر ہوتا ہے، تب بھی شیعہ حضرات کا یہ کہنا کہ یہاں پر حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کی طرف جانے کے لیے کوئی واضح قرینہ صاف اور دلیل نہیں ہے یہ بات بھی ان کی صحیح نہیں کیونکہ ایک طرف تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث موجود ہیں جن سے واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی مال وملکیت کے اعتبار سے وراثت نہیں ہوتی دوسری طرف شیعہ حضرات کے بارہ اماموں میں سے حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی روایت جو پہلے گزر چکی کہ اس نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام صرف علم ہی وراثت میں چھوڑتے ہیں اور شیعہ حضرات کے عقیدے کے موجب سب امام معصوم ہیں اگر اس مقام پر وراثت سے مراد مال وملکیت کی وراثت لی جائے گی تو ان کے امام معصوم کی تکذیب لازم آئے گی اس لیے معصوم کے قول کو کذب

(جھوٹ) سے محفوظ رکھنا بڑا قرینہ صارفہ ہے اس لیے اس مقام پر مال ودولت کا ورثہ مراد نہیں۔

اسی طرح امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت بھی آئی ہوئی ہے وہ بھی مشہور مصنف شیعہ عالم محمد بن یعقوب کلینی کی کتاب کافی میں ہے جس کو علامہ آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں نقل کرتے ہیں:

"قال: (جعفر صادق) ان سليمان عليه السلام ورث داوٗد وان محمد صلى الله عليه وسلم ورث سليمان عليه السلام" [الاصول من الكافى للكلينى ص ٢٢٥ ج١]

"امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داوٗد علیہ السلام کے وارث بنے اور بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان کے وارث بنے۔"

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سلیمان علیہ السلام کا وارث بننا بحیثیت علم کے ہی ہے نہ کہ مال ودولت کے اعتبار سے، کیونکہ اس جگہ پر مال وملکیت کے وارث بننے کا تصور بھی محال وناممکن ہے۔

## شیعہ حضرات جن اثروں سے دلائل لیتے ہیں اُن کے جوابات:

### ① پہلا اثر:

((قال عبدالرزاق أخبرنا معمر عن قتاده عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: رحم الله زكريا ما كان عليه من وراثة ماله)) [الحديث]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت زکریا علیہ السلام پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ رحم کرے اس کو جو اپنے مال کی وراثت کا خیال ہوا۔"

### الجواب:

یہ روایت مرسل ہے کیونکہ قتادہ تابعین میں سے ہے نہ کہ صحابی اور مرسل رویات محدثانہ حیثیت میں اور اصول حدیث کے لحاظ سے ضعیف کے اقسام میں سے ہے، کیونکہ کچھ خبر نہیں کہ یہاں جو تابعی ہے اس کے بعد بیچ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک دوسرا بھی کوئی تابعی ہی ہے یا صحابی رضی اللہ عنہ اگر تابعی ہے تو پھر بھی احتمال رہتا ہے کہ وہ بھی کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے یا کسی دوسرے تابعی سے اور محدثین کرام رحمہم اللہ نے ایسی مثال دی ہیں جن میں تابعی صحابی کو ذکر نہیں کرتا اور جب اس کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس تابعی نے یہ روایت کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی بلکہ ایک دوسرے تابعی سے سنی اور اس نے کسی تیسرے سے اس طرح یہ تعداد سات تابعین تک بھی پہنچ جاتی ہے اور پھر تابعین میں یہ بھی احتمال رہتا ہے کہ وہ ثقہ تھے یا نا قابل اعتماد؟ لہٰذا اس جہالت کی وجہ اسے محدثین رحمہم اللہ سے اسے (یعنی مرسل حدیث کو) ضعیف کی اقسام میں سے شمار کیا ہے اور جو حضرات مرسل حدیث کو حجت قرار دیتے ہیں ان کے ہاں بھی ایسی مرسل روایت حجت نہیں جو متصل اور صحیح احادیث کے خلاف ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرسل روایت بھی ان احادیث صحیحہ کی مخالف ہے جو ہم

پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

**② دوسرا اثر:**

اس کو علامہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لائے ہیں:

”حدثنا ابو کریب یعنی محمد ابن العلاء حدثنا جابر بن نوح عن مبارك هوابن فضالة عن الحسن هوا لبصری قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم رحم الله اخی زکریا ما کان علیه من وراثة ماله حین قال هب لی من لدنك ولیا یرثنی ویرث من آل یعقوب“

**جواب:**

یہ روایت بھی مرسل ہونے کے علاوہ دوسری دو وجوہات کے سبب ضعیف ہے۔ ایک یہ کہ اس کی سند میں جابر بن نوح ہے جو کہ راوی ضعیف ہے، دیکھو تقریب التہذیب لابن حجر وغیرہ۔ دوسری وجہ یہ کہ اس میں دوسرا راوی مبارک بن فضالۃ مدلس ہے اور اس کی تدلیس تیسری مرتبہ کی ہے اور ایسے راویوں کی روایت ہے جب تک وہ اپنے شیخ سے سماع کی تصریح نہ کریں قبول نہیں کی جاتی، دیکھیے طبقات المدلسین للحافظ ابن حجرؒ۔

یہاں پر مبارک نے حسن بصری سے اس حدیث کے سماع کی تصریح نہیں کی اور ”عن الحسن“ کہتا ہے۔

بہر حال اس جیسی ضعیف روایتوں سے دلیل لے کر اس جگہ پر مال کی وراثت مراد لینا قطعاً صحیح نہ ہوگا۔

خود امام حسن بصری سے تفسیر ابن جریر میں حسن سند سے یہ روایت وارد ہے کہ وہ صاحب ”یرثنی ویرث من آل یعقوب“ کے بارے میں کہتے تھے کہ اس سے مراد نبوت وعلم ہے۔ [1]

اور یہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس کوئی صحیح اور مرفوع حدیث ہوتی تو وہ اس کو چھوڑ کر اس کے معانی نبوت وعلم سے نہ کرتے اس سے معلوم ہوا کہ وہ اثر جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے (جس میں ارسال ہے) وہ اس سے صحیح طور پر ثابت نہیں۔

بہر حال اس آیت کریمہ میں وراثت سے مال وملکیت مراد لینے کے لیے شیعہ حضرات کے پاس آثار میں سے کوئی بھی ایسا صحیح اثر موجود نہیں جو معرض استدلال میں پیش کیا جا سکے کبھی کبھی وہ بخاری شریف کی ایک

---

① یہ روایت تفسیر حسن بصری میں اس طرح ہے: حدثنا عبدالرزاق قال اخبرنا معمر عن قتادة عن الحسن فی قوله (یرثنی ویرث من آل یعقوب) الآیۃ ٦۔ قال: نبوت وعلمه، تفسیر حسن البصری ص ٦٧ ج ٤ اور تفسیر میں ان دو روایتوں کے علاوہ اور کوئی تیسری روایت مذکور نہیں اب دونوں روایتوں کا تقابل کیا جائے تو پہلی روایت میں ارسال کے علاوہ بھی دو ضعف کی وجوہات ہیں ایک راوی کا ضعیف ہونا اور دوسرا تدلیس اور دوسری روایت میں صرف قتادۃ کی تدلیس ہے اس لیے دوسری روایت صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہے اور قابل استدلال ہے اور اس میں حسن بصری رحمہ اللہ اپنی رائے پیش کرتا ہے کہ اس کے نزدیک بھی وراثت سے مراد علم اور نبوت ہے واللہ اعلم بالصواب۔ ابن محب اللہ الراشدی عفا اللہ عنہما۔ کذالك قال ابو بکر الرازی فی تفسیر ص ٣١٢ ج ٢ و کذالك قال عبد

حدیث میں سے جس میں حضرت فاطمہ الزہرہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مذکور ہے کہ "فغضبت" اور کہیں یہ الفاظ ہیں۔

(( ولم تتكلم حتى ماتت ))

یعنی اس بات پر بی بی صاحبہ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور پھر اپنی وفات تک بات نہ کی۔ شیعہ حضرات حدیث کے اس ٹکڑے کو پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی بتائی ہوئی حدیث جس میں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مال وملکیت کا ورثہ نہیں ہوتا کہ صحیح نہ جانا اس لیے اس پر ناراض ہو کر اسے اپنی وفات تک بات نہ کی لیکن ان کا یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں کیونکہ بی بی صاحبہ کے ناراض ہونے کا یہ سبب نہ تھا کہ آپ نے مذکورہ حدیث کو صحیح نہ جانا کیونکہ ہم پہلے ایک حدیث امام دارقطنی کی کتاب العلل سے نقل کر آئے ہیں جس میں یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہے اور بی بی صاحبہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: (( ان الانبياء لايورثون ))

یعنی انبیاء علیہم السلام کا مال ودولت کے اعتبار سے ورثہ نہیں ہوتا اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا اس روایت کو صحیح نہیں سمجھتی تھی تو پھر یہ روایت (حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ والی) حضرت بی بی ام ہانی رضی اللہ عنہا کو کیوں سنا رہی تھی کیونکہ جس روایت کو بی بی صاحبہ خود صحیح نہیں جانتی وہ دوسروں کو کس طرح سنا سکتی ہے۔ ہاں اگر بی بی صاحبہ کو اس کو تردید کرنی ہوتی تو یہ روایت سنانے کے بعد حضرت امی ھانی رضی اللہ عنہا کو فرماتی کہ اگرچہ یہ روایت حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائی ہے مگر یہ صحیح نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا، باقی اس طرح روایت بیان کر کے اس پر سکوت اختیار کرنے سے یہ سمجھنا کہ بی بی صاحبہ اس کو صحیح نہیں جانتی تھی یہ غلط ہے کیونکہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کا مقام مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ بی بی صاحبہ ایک بات کو صحیح نہ سمجھے اور اس پر خاموش رہے ایسے مقامات پر حق پرست انسان کبھی خاموش نہیں رہتے لہٰذا آپ کی خاموشی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بی بی صاحبہ کو پہلے اس روایت کا علم نہ تھا لیکن جب حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی کا علم ہوا تو اس کو صحیح جانا اور دل وجان سے تسلیم کیا اور بوقت ضرورت دوسروں کو بتا بھی دیا۔ باقی ناراضگی کا صحیح سبب یہ ہے کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا دکھ ہوا اور صدمہ پہنچا کہ میں اگرچہ اہل بیت میں سے ہوں مگر اس کے باوجود بھی مجھے اس حدیث مبارک کا علم نہ ہوا اور میں عدم علم کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی کے برخلاف ورثہ کی طلب کی اور یہ نہ ہونا چاہیے تھا باقی اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے کوئی اپنی طرف سے بات نہیں کی تھی۔ بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی پیش کیا تھا اور سید النساء اہل الجنۃ سے بڑھ کر کون ہے جو آپ کے ارشاد عالی کو تسلیم کر کے آپ کے ارشاد عالی پر بی بی صاحبہ کی طرف سے ناراضگی کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا باقی رہی یہ بات کہ بی بی صاحبہ نے پھر

بات نہ کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر ورثہ ترکہ کے بارے میں بی بی صاحبہ نے بات نہ کی تو اس کا مطلب یہ لینا کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر الصدیق سے بات کرنا چھوڑ دی قطعاً غلط ہے، کیونکہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کا کوئی محرم تو تھا نہیں جو پہلے تو اس کے ساتھ باتیں وغیرہ کرتی تھی اور اب اس معاملہ کے بعد باتیں کرنا چھوڑ دیں سچی بات تو یہ ہے کہ شیعہ حضرات کی اہل بیت سے محبت کے دعویٰ کی قلعی تو اس ہی بات سے ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے کہنے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ بی بی صاحبہ پہلے اس سے بات چیت وغیرہ کرتی تھی حالانکہ ایک پاکدامن عورت کبھی یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ وہ ایک غیر محرم مرد سے بغیر ضرورت کلام کرتی رہے اور ایسے ہی اس کے ساتھ بات چیت کرتی رہے جب کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((سيدة نساء اهل الجنة))

جنت کی عورتوں کی سردار ہے، وہ کیسے اپنے ایک غیر محرم مرد سے بغیر ضرورت بات چیت کرتی رہی؟ پہلی رتبہ جب بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس ورثہ کی طلب کے لیے آئی، تب واقعی یہ اس کی روررت تھی کہ اس سے بات کرے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی آپ کو معلوم نہ تھا مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی بی بی صاحبہ کے علم میں آ گیا تو پھر زیادہ بات کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔

خلاصہ کلام کہ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی کا علم ہوا تو اس نے ورثہ کی طلب کے بارے میں بات کرنا چھوڑ دی، باقی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے نہ پہلے کوئی بات چیت یا مجلس ہوتی تھی نہ اس کے بعد کہ بات چیت بند کرنے کا سوال پیدا ہو۔

﴿ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴾

[مریم: ۷]

یہاں پر کلام میں کچھ حذف ہوا ہے اس کی تقدیر یہ ہوگی۔

"فاجاب الله دعائه فنودی"

"پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی پھر پکارا گیا۔"

اور یہ جو کچھ آپ کو کہا گیا وہ ملائکہ کی طرف سے آپ کو خوش خبری دی، جیسا کہ سورۂ آل عمران میں اس طرح مذکور ہے:

﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى ﴾

[العمران : ۳۹]

"پھر اس کو ملائکہ نے پکارا جب کہ وہ اپنے حجرے میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو

یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دیتا ہے۔"

مفسرین کرام کا کہنا ہے کہ یہاں پر ملائکہ سے مراد اگرچہ عموم ہے مگر مراد اس سے خصوص ہے اور اس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہے اور اس عموم سے خصوص مراد لینے کی مثالیں قرآن مجید میں دوسرے مقام پر بھی موجود ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جمع کا صیغہ اپنی حقیقت پر ہو اگرچہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ بشارت تو حضرت جبریل نے ہی دی مگر اس کے ساتھ ملائکہ کی ایک جماعت بھی یعنی پیشوا اس کا حضرت جبریل ہو اور دوسرے ملائکہ ان کی ماتحتی میں ان کے ساتھ تھے۔

اس آیت کریمہ میں ایک لفظ "سمیا" ہے جس کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ عربی لغت میں "سمیّ" کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے ایک ہم نام جیسے کہا جاتا ہے: "فلان سمی فلان" یعنی فلاں فلاں کا ہم نام ہے جب دو کے ایک جیسے نام ہوں تو اس میں سے ہر ایک کو کہا جاتا ہے کہ وہ دوسرے کا سمی ہے اور دوسرا اطلاق یہ ہے کہ سمیّ بروزن فعیل بمعنی مفاعل کے ہے، عربی زبان میں فعیل بمعنی مفاعل کے کثیر مستعمل ہوتا ہے جیسے قعید و جلیس بمعنی مقاعد و مجالس یعنی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے یا مجلس کرنے والے اور اکیل و شریب بمعنی ایک دوسرے کے ساتھ کھانے والے اور پینے والے اس معانی کے اعتبار سے سمیّ کا معنی ہوگا مسامی یعنی مماثل اور نظیر جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو جاننا چاہیے کہ اس جگہ پر اگرچہ بعض مفسرین نے سمی سے دوسرا معنی مراد لیا ہے یعنی اس کا کوئی بھی مشابہ و نظیر ہم نے نہیں بنایا اور وہ اس معنی پر اس سے دلیل لیتے ہیں کہ اسی ہی سورت کے آخری رکوع میں ہے کہ: ﴿هل تعلم له سمياً﴾ کیا تجھے کوئی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی نظیر یا مثل معلوم ہوتا ہے یعنی اس کی کوئی بھی نظیر نہیں لیکن ان حضرات کی یہ بات صحیح نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض اس کی صحت کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش جس طریقہ پر ہوئی اس کی مثال پہلے کوئی نہیں ملتی اگرچہ حضرت ابرہیم علیہ السلام کو اپنی پہلی بیوی سے اولاد پیرانہ سالی یعنی بڑھاپے میں ہوئی تھی مگر اس کی بیوی بانجھ نہ تھی بلکہ دونوں بہت ہی بوڑھے ہو چکے تھے جیسا کہ حضرت بی بی سارہ علیہا السلام کو جب اولاد دی گئی تو اس نے فرمایا:

﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴾

[ هود : ٧٢]

"بی بی صاحبہ بولی ہائے! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہوگئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے ہیں یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔"

لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد حضرت زکریا علیہ السلام اگرچہ عمر کے لحاظ سے بہت بڑے ہو چکے تھے، مگر ان کی بیوی یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام کی والدہ بانجھ تھی اور اس میں جوانی میں بھی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہ تھی

اس وجہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تولد (پیدائش) ایک ایسی مثال ہے جو پہلے موجود نہیں۔

لیکن یہ حضرات اس بات کو بھلا بیٹھے ہیں کہ حضرت سارہ علیہا السلام کے متعلق قرآن کریم میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں:

﴿ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ﴾ [الذاریات : ۲۹]

''(یہ سن کر) اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی میں بوڑھی بانجھ ہوگئی ہوں (یہ کس طرح ہوگا)۔''

یعنی پیرانہ سالی کے ساتھ بانجھ بھی ہوں مجھ میں اولاد ہونے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں۔

معلوم ہوا کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا تولد (پیدائش) ایسے والدین میں سے ہوا جو دونوں بوڑھے بھی تھے اور خصوصاً ان کی والدہ محترمہ علیہا السلام بانجھ بھی، تھی لہٰذا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت بے نظیر نہیں ہوئی، ہم پھر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان حضرات سے یہ سوال کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بے نظیر ہونا ذاتی اعتبار سے ہے یا صفاتی؟ ذاتی اعتبار سے بے نظیر ہونا تو ظاہراً غلط ہے کیونکہ ذاتی اعتبار سے بے نظیر صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہے اور انسان انسانیت کے اعتبار سے سب ایک دوسرے کے مثل ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ [کهف : ۱۱۰]

''اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے کہ (انسانی اعتبار سے) اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ میں بھی آپ جیسا انسان ہوں۔''

تفسیر کا اس جگہ موقع نہیں، باقی رہا صفاتی اعتبار سے بے نظیر ہونا تو اس کا مطلب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام میں کچھ ایسی خوبیاں اور کمالات تھے جو پہلے کسی میں بھی نہ ہوئے تھے حتیٰ کہ کسی نبی میں بھی نہیں یا عالی مرتبہ ورفعت کے اعتبار سے وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے لیکن یہ دونوں احتمال صحیح نہیں ہو سکتے، دوسرا احتمال اس لیے صحیح نہیں ہوسکتا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم وحضرت موسیٰ وحضرت نوح علیہم السلام یقیناً حضرت یحییٰ علیہ السلام سے افضل تھے۔ رہا پہلا احتمال تو جو خصوصیات وصفات وخوبیاں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں:

''حَصُوْرًا'' یعنی پاکدامن اور یہ صفت بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام سے خاص نہیں بلکہ سارے انبیاء پاک دامن ہوتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

(( انه لاینبغی لنبی ان تکون له خائنة الاعین ))

[رواہ ابو داؤد فی کتاب الحدود عن سعد بن ابی وقاص]

''یعنی کسی بھی نبی کے لیے یہ لائق نہیں کہ اس کی آنکھوں میں خیانت ہو۔'' جب خیانت کا تصور ان کی

آنکھوں سے بھی دور رہے تو برائی تک پہنچنے کا تصور کس طرح کیا جا سکتا ہے، یہ مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام سے تعلق رکھتا ہے جس کے بیان کی یہ جگہ نہیں۔

**دوسری صفت:**

قرآن کریم نے یہ بتائی کہ وہ ''نبی'' تھا اس صفت میں بھی سب انبیاء علیہم السلام شریک ہیں۔

**تیسری صفت:**

یہ بیان فرمائی کہ وہ ''صالحین'' میں سے تھا قرآن حکیم کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام پر بھی صالحین کا اطلاق کیا گیا ہے۔

**چوتھی صفت:**

یہ کہ اسے بچپن میں حکمت عطا ہوئی یعنی بچپن میں ہی اسے نبوت سے نوازا گیا یہ بھی اس کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام جب چھوٹے تھے اور ان کے بھائی انھیں ایک کنویں میں پھینک گئے تو اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس وحی آئی:

﴿ وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴾ [یوسف : ١٥]

''اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا حالانکہ ان کو کچھ معلوم نہ ہوگا۔''

**پانچویں صفت:**

یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اس کے دل میں اپنی طرف سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں پر شفقت اور رحمت داخل کریں گے لیکن یہ بھی صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں پر بے انتہا شفیق اور رحیم ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سورۂ ہود میں اور کچھ دوسری سورتوں میں بھی یہ بیان مذکور ہے کہ جب ملائکہ نے آپ کو یہ خبر دی کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جا رہے ہیں، تب بار بار اس سے اس بات پر مقابلہ کرنے لگا کہ کسی طرح ملائکہ اس قوم کو برباد کرنے کا خیال ترک کر کے (چھوڑ کر) واپس چلے جائیں، یعنی ایسی خبیث قوم پر بھی اسے رحم آ گیا اور کوشش کی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب کسی طرح ٹل جائے اور وہ قوم بربادی وتباہی سے بچ جائے آپ کی اس نرم دلی اور بربادی کی شہادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سورۂ میں دی، جیسا کہ فرمایا:

﴿ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ﴾ [هود : ٧٥]

لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ملائکہ نے جواب دیا کہ اے ابراہیم علیہ السلام بیشک ان کے عذاب کے متعلق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا امر آ چکا ہے اور یہ عذاب ان سے کسی بھی طرح نہیں ٹل سکتا، بہر حال قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی

اپنی امتوں پر رحمت اور شفقت کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جن سے معلوم ہوسکتا ہے وہ اپنی امت کی جاہلانہ روش اور دوسری ناشائستہ حرکتوں سے کس طرح عفو اور درگزر سے کام لیتے تھے اور جلد باز ہوکر ان پر بددعا بھی نہ کرتے تھے، اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں پر شفقت اور رحمت حضرت یحییٰ علیہ السلام سے مخصوص نہ تھی۔

## چھٹی صفت:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو طہارت اور پاکیزگی بھی عطا فرمائی اور یہ خوبی بھی صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام سے خاص نہیں کیونکہ سب انبیاء علیہم السلام مادی اور معنوی گندگیوں سے خود کو پاک و صاف رکھنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں اور ہر وقت طہارت و پاکی کا ان کو سب سے زیادہ خیال رہتا تھا۔

## ساتویں صفت:

متقی ہے یعنی دل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف ہو اور اس وجہ سے ان سب باتوں سے اجتناب و پرہیز کرنے والا ہو جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنیں یعنی پرہیزگاری سب انبیاء علیہم السلام میں تھی اور وہ تقویٰ کی چوٹی پر فائز تھے اور یہ خوبی بھی صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام سے خاص نہیں تقویٰ کے معنی کی تفسیر آگے آئے گی۔

## آٹھویں صفت:

اپنے والدین سے نیکی کرنے والا اور ان کا ادب و تعظیم کرنے والا تھا۔ اس خوبی میں بھی سب انبیاء علیہ السلام اس کے شریک ہیں، اسی سورت مبارکہ کے تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ذکر فرمایا گیا ہے اس کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نبی علیہ السلام اپنے والد کو حق کی تبلیغ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید کے متعلق سمجھانے اور شرک و بت پرستی سے متنفر کرنے کے لیے کس قدر ادب و تعظیم کے دامن کو پکڑ کر سمجھانے کی کوشش کرتے رہے، جب ان کے والدین اس توحید کی تبلیغ پر ناراض ہوکر اسے سخت الفاظ میں اس طرح کہا کہ اے ابراہیم علیہ السلام کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے اگر تو اب بھی اپنی اس تبلیغ سے باز نہ آیا تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور تو مجھے چھوڑ کر چلا جا اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو فرمایا:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ﴾ [مریم : ٤٧]

''تم پر سلامتی ہو تم سدا خوش رہو میں تمہارے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا مانگوں گا۔''

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے لیے اس کی موت تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مغفرت کی طلب اور ہدایت کی دعا مانگتے رہے جب اس کا خاتمہ شرک کی زندگی پر ہوا تو پھر اس سے بیزار ہوگئے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی اپنے والد سے نیکی کرنے اور اس کے ادب واحترام کے خیال کرنے کی کوئی دوسری مثال مل سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس صفت میں بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام منفرد نہیں آخر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں دو سلبی صفات بیان فرمائیں:

﴿ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴾ [مریم : ١٤]

''وہ سرکش اور نافرمان نہ تھے نہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نہ اپنے والدین کے۔''

اس صفت میں بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام منفرد نہیں بلکہ سب انبیاء علیہم السلام ان دونوں باتوں سے پاک تھے اور ان میں انتہائی عاجزی وانکساری ہوتی تھی اور جان بوجھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی کرنا یہ بھی نبوت کی شان سے کئی مراحل بعید ہے رہا والدین کی نافرمانی نہ کرنا تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے والد نے کہا کہ تو مجھے چھوڑ کر چلا جا تو وہ اس کے کہنے پر اسے چھوڑ کر چلے گئے، جیسا کہ اس سورۂ مبارکہ کے تیسرے رکوع میں:

﴿ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [مریم : ٤٨]

کے الفاظ اس پر شاہد ہیں اس طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جب اس کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب تیرا کیا خیال ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [الصافات : ١٠٢]

''اے میرے بابا جو تجھے (اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے) حکم کیا گیا ہے وہ کر گزر اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پاؤ گے۔''

یعنی بغیر پس وپیش کے اپنے والد کے ارشاد کے سامنے اپنی گردن کو جھکا دیا اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿فلما اسلما﴾ یعنی باپ بیٹا دونوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے امر کے سامنے جھک گئے۔

خلاصہ کلام کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوبیاں اور کمالات جو بھی قرآن مجید میں وارد ہیں وہ سب کے سب دوسرے انبیاء علیہم السلام میں بھی موجود تھے اس لیے کچھ مخصوص صفات کی وجہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام بے مثال تھے۔ اس لیے اس مقام پر ''سمی'' کے معانی وہی صحیح ہیں جو اکثر مفسرین اپنی تفاسیر میں بیان کرتے ہیں، یعنی یہ کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ہم نام پہلے کوئی نہیں گزرا مطلب یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو بوجہ اتم قبولیت کا شرف بخشتے ہوئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کی بڑی منقبت ظاہر ہو رہی ہے۔ [1]

﴿ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴾

[مریم : ٨]

"انّي" بمعنی ''کیف'' یعنی کیسے؟ عتیٌّ۔ عتا یعتو عتوا۔ یعنی کسی بات یا کسی معاملے کا حد سے تجاوز کر جانا۔

"عتیاً" اصل میں عتووا تھا دو ضمہ اور دو واؤ اکٹھے واقع ہونے کی وجہ سے کلمہ میں ثقل پیدا ہو گیا اس لیے تاء کو زیر دے دی جب واؤ ساکن اور ماقبل مکسور ہوا تو صرفی قاعدوں کے مطابق پہلے واؤ کو یاء سے بدل دیا

[1] اور نویں صفت جو کہ سورۂ آل عمران میں ہے وہ ہے "سیداً"

اب پھر کلمہ میں یاء اور واؤ ساتھ ہو گئے پہلا اس میں ساکن ہے اس لیے قانون کے مطابق دوسرے واؤ کو یاء سے بدل دیا اور یاء کو یاء میں ادغام کر دیا تو عتیٌّ ہوا پھر عین کو تاء کے تابع کر کے زیر دے دی تو عِتیٌّ ہو گیا اور اس کا معنی ہوگا "مجاوزۃ الحد" یعنی حد سے تجاوز کرنا۔ آیت کریمہ کا ترجمہ اس طرح ہوگا:

حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب مجھے کس طرح اولاد ہوگی حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ چکا ہوں، یعنی بڑھاپے کی مروج حدود سے گزر چکا ہوں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ سوال کرنا اس لیے نہ تھا کہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ میں کوئی شک تھا کیونکہ جس وقت وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا اس وقت بھی اسے علم تھا کہ وہ اب پیرانہ سالی کی آخری منزل پر ہے جیسا کہ دعا کے شروع میں یہ الفاظ: ﴿رب انی وهن العظم منی﴾ اس پر شاہد ہیں۔ اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت میں اسے شک ہوتا تو اس قسم کا سوال ہی نہ کرتا اور نہ اس طرح کہتا کہ:

﴿رب هب لی من لدنك ولیاً الخ﴾

یعنی ظاہری اسباب کے لحاظ سے میں مایوس ہو چکا ہوں مگر میرے رب تو اپنی قدرت سے مجھے وارث عطا فرما بعض حضرات اس کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس بشارت کی آواز کو حضرت زکریا علیہ السلام نے کسی "ہاتف" کی زبان سے سنا، اس لیے اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطانی القاء ہے، اس لیے دوبارہ تحقیق کی غرض سے یہ سوال کر کے یقین حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اس سوال کے جواب کے بعد دوبارہ علامت کا سوال کیا۔ مگر ہم ان مفسرین کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے اس لیے کہ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ سورۂ آل عمران میں صراحت سے مذکور ہے کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ملائکہ ہی لائے تھے جو حضرت زکریا علیہ السلام کو نماز کی حالت میں دی گئی اس صورت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نبی علیہ السلام جس کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وحی آتی رہتی ہے اور وہ وحی بھی ملائکہ لاتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ اس میں شک کرے کہ یہ پیغام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے یہ شیطان کی طرف سے؟ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے:

﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِۦ رَصَدًا﴾

[الجن: ٢٧]

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب کسی نبی کو غیب کی خبر بتانا چاہتا ہے تو اس پیغام رساں کے آگے پیچھے اس کی حفاظت کا بھی بندوبست کرتا ہے تاکہ شیطان اس میں اپنی طرف سے القاء نہ کر سکے، اس طرح اولاد ہونے کی بشارت بھی غیب کے باب میں سے ہے اس لیے کہ نہ تو حضرت زکریا علیہ السلام کو خبر تھی نہ کسی دوسرے کو کہ اسے ایک فرزند پیدا ہونے والا ہے، اس وجہ سے جب وہ وحی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرشتے لے کر آئے تو اس کی

حفاظت کا بھی اس نے بندوبست کیا ہوگا اور اسی حقیقت سے حضرت زکریا علیہ السلام جو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ایک نبی تھے کس طرح بے خبر رہ سکتے تھے اگر اس کے باوجود بھی یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اتنے انتظام کے ہوتے ہوئے بھی کسی نبی کو وحی کے بارے میں شک ہوسکتا تھا کہ آیا یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی طرف سے تو پھر وحی پر سے بالکل اعتماد اٹھ جائے گا۔ حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب کسی انسان کو نبی بناتا ہے تو خود اس کے دل میں بھی یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ نبی ہے اور جو کچھ ملائکہ پیغام لاتے ہیں اس پر بھی اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ دوسری صورت میں وحی کی پوری عمارت نیست ونابود ہو جائے گی۔ کیونکہ ہر وحی پر یہ گمان ہوگا کہ معلوم نہیں یہ رحمانی ہے یا شیطانی۔ معلوم نہیں یہ حضرات اس بشارت کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کے پاس جو وحی آتی تھی اس میں اور اس میں کیا فرق کرتے ہیں کہ دوسری باتیں جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہیں ان کو نبی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے وحی سمجھے اور اس بشارت کی وحی پر شک میں پڑ جائے حالانکہ وحی کے نزول میں اس میں یا اس میں کوئی خاص فرق نہیں، پھر اس پر یقین اور اس میں شک یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے بہرحال ہمارے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اس بشارت کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ یا تردد بالکل نہ تھا کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی کارستانی۔ ہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر کس لیے سوال کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "انی" اس جگہ پر کیف کے معنی میں ہے، یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے اس فرزند کے تولد کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا اس لیے اپنی بیوی کے بانجھ پن اور اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا کہ آیا میری بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے گی یا مجھے کوئی دوسری شادی کرنی پڑے گی اس طرح میں دوبارہ جوان ہو جاؤں گا یا اسی حالت میں مجھے فرزند عطا ہوگا؟ اکثر مفسرین نے بھی اس کے یہی معانی کیے ہیں جو ہم نے پیش کیے ہیں کہ جب سوال فرزند کی کیفیت کا ہے تو شک وتردد کا سوال پیدا نہیں کر سکتا۔

﴿ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴾

[مریم : ۹]

"(جواب ملا) فرشتے نے کہا، ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے اور تحقیق اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا۔"

یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کے استفسار پر اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے فرمایا: اسی حالت میں ایسے ہی اولاد ہوگی۔ یعنی پیرانہ سالی حالت میں ہی تجھے اولاد ہوگی اس لیے کہ تیرا رب فرماتا ہے یہ بات میرے لیے آسان ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ [ آل عمران : ٤٠ ]

یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو کرنا چاہتا ہے اس طرح کرتا ہے۔ وہ ظاہری اسباب کی طرف محتاج نہیں، اس کی قدرت کے بارے میں جوانی یا بڑھاپے کی کوئی قید نہیں۔ [1] اس مقام پر مزید فرمایا کہ تو اگر خود اپنی پیدائش پر غور وفکر کرے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ اس وجود میں آنے سے پہلے تو ایک پانی کے قطرہ کے علاوہ کچھ نہ تھا مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ تجھے ﴿ولم تك شيئا﴾ سے وجود میں لایا اور یہی مثال اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسی سورت کے رکوع نمبر ۵ کے اول میں بھی ذکر فرمائی:

﴿ وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴾ [ مريم : ٦٦۔٦٧ ]

”جو انسان حیات بعد الممات کا انکار کرتا ہے اس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یاد دہانی کراتا ہے کہ تو اپنے آپ کو غور کر کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے تم کیا تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے۔“

مگر اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تجھے یہ وجود بخشا اور تو ایک مکمل انسان بن کر زمین پر چلنے لگا کیا وہ ہستی جل وعلیٰ جو تجھے غیر موجود سے وجود میں لائی اسے یہ قدرت نہیں کہ مرنے کے بعد تجھے دوبارہ زندگی بخشے، بعض ملحد لوگ کہتے ہیں کہ انسان کے مادہ منویہ میں ایسے جراثیم موجود ہیں جو باہم مل کر انسان کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں مگر ایسے نادان لوگوں کے جواب میں!

**اولاً:**

تو یہ گذارش ہے کہ یہ انسانی سلسلہ تناسل آخر کسی ایک انسان پر ختم ہوگا کیونکہ کائنات کی ہر چیز غیر متناہی تسلسل بالبداہت جملہ عقلاء کے ہاں باطل ہے، کسی مخلوق کی پیدائش کی ابتدا کتنی ہی ماضی بعید سے شروع کریں یعنی یہ سلسلہ تناسل آخر کار اس حد کو پہنچے گا کہ اس سے پہلے یہ سلسلہ نسل وتناسل بالکل نہ تھا۔ لہٰذا ان لوگوں سے بجا طور پر یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ پہلا انسان یا جس طرح وہ ملحد کہتے ہیں کہ کچھ انسان وہ آخر کس طرح وجود میں آئے؟

کیونکہ وہ اس مادہ منویہ کی پیدائش نہ تھے اور ان سوالوں کا جواب ان کے پاس کچھ نہیں سوائے اس کے کہ ہمیں کچھ علم نہیں کہ وہ پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا، یعنی وہ بجائے اس کے کہ اس بات کا اعتراف کر کے اس پہلے انسان کے وجود میں آنے کا باعث اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت وقدرت کو قرار دیں اور اس ہستی جل واعلیٰ کا اقرار کریں اپنے آپ کو عاجز پاکر محض یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کا ہمیں کچھ علم نہیں حالانکہ تجربہ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ اس دنیا کا ذرہ ذرہ بھی کسی صانع (کاریگر) کے بغیر ہرگز وجود میں نہیں آسکتا۔

---

[1] جیسے فرمایا: یهب لمن یشاء اناثا ویهب لمن یشاء الذکور اویزوجهم ذکرانا واناثا ویجعل من یشاء عقیما.

**ثانیاً:**

اس مادہ منویہ میں اگر یہ قدرت ہوتی کہ وہ کسی دوسرے انسان کو جنم دے سکے تو کسی مقام پر بھی اس کی کارکردگی میں فرق نہ آتا اور ہر جگہ پر اس کی کمالیت برقرار رہتی، حالانکہ یہ مشاہدہ ہے کہ کتنے ہی نوجوان جوڑے جن کے بارے میں ماہر ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بھی یہ فیصلہ دیا کہ ان میں کوئی بھی جسمانی نقص نہیں جو اولاد ہونے کو مانع ہو پھر کیا سبب ہے کہ ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی حالانکہ اس جگہ پر مادہ منویہ بھی موجود ہے اور جوڑا بھی نوجوان ہے، تب بھی ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، اس سے ثابت ہوا کہ مادہ منویہ کوئی اس جاندار چیز کی پیدائش کا اصلی اور حتمی سبب نہیں ورنہ ہر جگہ پر وہ اپنی کارکردگی سے نہ رکتا اور ہر جگہ پر اس کی کارکردگی یکساں ہوتی اور اس میں کوئی فرق نہ آتا۔ [1]

معلوم ہوا کہ ہر جاندار کی پیدائش کا اصل سبب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت وقدرت ہے وہ چاہے تو بزرگی کی عمر میں بھی اولاد سے نوازے اگر نہ دے تو نوجوانی میں بھی نہ دے۔

اصل بات یہ کہ واقعی یہ عالم اسباب ہے اور ہر بات میں قدرت نے کوئی نہ کوئی سبب بنایا ہے اور یہ مادہ منویہ بھی ان اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ مگر ان سب کا مؤثر ہونا اور ان اسباب کے حصول کے بعد اس میں سے مطلوبہ نتیجہ کا نکلنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مشیت وقدرت پر منحصر ہے جیسے تالا چابی سے کھلتا ہے مگر کوئی بھی چابی کسی ہاتھ کے بغیر نہیں گھومتی، اس طرح یہ سب ظاہری اسباب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان صرف کوشش کرتا ہے مگر اس کا نتیجہ قطعاً اس کے اختیار میں نہیں درحقیقت ان ملحدان دین کی نظر صرف چابی پر ہوتی ہے اور اس کو گھمانے والا ہاتھ ان کو نظر نہیں آتا۔

یہ تو تھا حضرت زکریا علیہ السلام کی اس بات کا جواب کہ وہ جب پیرانہ سالی کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے تو اس صورت میں اس سے کس طرح اولاد ہوگی باقی رہا ان کی گھر والی کا بانجھ ہونا تو اس کے بارے میں اگرچہ اس جگہ پر کوئی صراحت نہیں آئی اور محض اجمالی طرح سمجھایا گیا کہ یہ بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے آسان ہے لیکن دوسری جگہ پر اس کی وضاحت کی گئی کہ:

﴿وَ اَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ﴾ [الانبياء : ٩٠]

یعنی اس کی گھر والی سے بانجھ پن کا نقص دور کر کے اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔

مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو پیرانہ سالی میں اپنی قدرت کاملہ سے اولاد جیسی نعمت سے نوازا اور اس کی گھر والی سے بغیر کسی ظاہری علاج و معالجہ کے اس کے بانجھ پن کو دور کیا اور دونوں

---

[1] دوسری بات یہ کہ اگر سب باتوں کو تسلیم کرلیں پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ پانی کہاں سے آیا اور اس میں یہ قوت کس نے رکھی۔
﴿أأنتم تخلقونه أم نحن الخالقون﴾ ابن محب الله الراشدی عفاالله عنهما

صاحب اولاد ہو گئے۔

﴿ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴾

[مریم : ۱۰]

اس جگہ پر " آیۃ" کے معانی علامت اور نشانی ہے۔سویًا کے معنی ہے خلقت کا سوئی مزاج اور طبیعت کا سلیم یعنی تجھے کوئی گونگے پن وغیرہ کی بیماری نہ ہو گی اور سویًا حال ہے تکلم کی ضمیرانت سے تقدیر اس طرح ہو گی:

"اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا "حضرت زکریا نے کہا پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرمادے۔

فرمایا: (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے) تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو بغیر کسی وجہ کے (یعنی نہ تو تجھے کوئی بیماری ہو گی اور نہ کوئی دوسرا عارضہ لاحق ہوگا) لوگوں سے تین راتیں کلام نہ کر سکے گا۔

یعنی تجھے کوئی بیماری وغیرہ بھی نہ ہو گی کہ تو اس کی وجہ سے کلام نہ کر سکے بلکہ تو صحیح وسالم اور اچھا بھلا ہو گا اور تیری زبان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور اس کے ذکر واذکار میں چلتی رہے گی، مگر لوگوں سے عام طور پر کلام نہ کر سکے گا بلکہ اشاروں سے بات کرے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ بشارت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر اس کے لیے نشانی کا مانگنا اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب علماء نے دو طرح دیا ہے۔

**اولاً:**

انسانی فطرت میں ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس کی کھوج میں لگا رہتا ہے کہ اس کی حقیقت کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرے اگرچہ فی الجملۃ اس حقیقت کے بارے میں اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ حقیقت یقیناً وجود میں آئے گی مگر بعض مرتبہ اس کے وجود میں آنے کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے یا وہ حقیقت کس وقت وجود میں آئے گی تاکہ اس کا شایان شان استقبال کیا جا سکے انبیاء کرام کے اس قسم کے سوالات بے یقینی کے سبب ہرگز نہیں ہوتے مگر محض زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے ایسے سوالات کبھی کبھی بارگاہ الٰہی میں کرتے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے قلب مبارک میں (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) یہ تڑپ تھی کہ یہ خوش خبری کب سے شروع ہو رہی ہے جیسا کہ انسان کو جب کسی خوش کن اور خیر وبھلائی کی توقع ہوتی ہے تب وہ بے صبری سے اس کا انتظار کرنے لگتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ کب اس مبارک گھڑی کا وقت آتا ہے اور وہ اشتیاق سے اس کی راہیں تکتا رہتا ہے اور یہ انسانی

فطرت ہے اور انبیاء علیہم السلام بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور بشری تقاضائے اور انسانی مزاج کی خصوصیات ان کے ساتھ بھی وابستہ ہوتی ہیں جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ کو توقع تھی کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا جائے گا تو آپ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے کہ کب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے تحویل قبلہ کا حکم آتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ﴾ [البقرة : ١٤٤]

"ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بار بار آسمان کی طرف اپنے منہ مبارک کو اٹھاتے ہیں پس ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف حکم کریں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔"

مطلب یہ کہ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ ہمارے لیے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا جائے اور کچھ آثار میں سے آپ کو واثق امید تھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ضرور ایسا کریں گے اس لیے بار بار منہ مبارک کو آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔

خلاصہ کلام کہ حضرت زکریا علیہ السلام یہ یقینی بشارت سن کر بے حد شدید منتظر ہوئے کہ یہ بشارت کب ظہور میں آتی ہے۔ اسی قسم کی مزید دو مثالیں ہم نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

**مثال اول:**

ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ﴾ [البقرة : ٢٦٠]

"(وہ وقت یاد کرو) جب حضرت ابرہیم علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے کہا اے میرے مالک تو مردہ کو کس طرح زندہ کرتا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کیا تجھے اس پر ایمان نہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں مجھے ایمان ہے مگر میرے دل میں اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی جو تڑپ ہے اور مردہ سے زندہ ہونے کی جو کیفیت ہے۔ اس کو معلوم کرنے کی جستجو ہے اس کو اطمینان اور قرار آجائے۔"

اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال بے یقینی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اسے اس بات پر مکمل یقین تھا لیکن چاہتے تھے کہ مردہ سے زندہ ہونے کی کیفیت کو آنکھوں سے دیکھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان باتوں اور حقائق کا جن پر امت کے افراد کو بالغیب (ان دیکھے) ایمان لانا ہوتا ہے، انبیاء علیہم السلام کو آنکھوں سے مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴾

[الانعام : ٧٥]

''اور اسی طرح دکھاتے تھے ہم ابراہیم علیہ السلام کو زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔''

یعنی انبیاء علیہم السلام کو ان مغیبات کا مشاہدہ کرانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی اپنی امت کو علیٰ وجہ البصیرۃ سمجھا سکیں کہ جن حقائق پر ہم آپ کو ایمان لانے کا حکم دے رہے ہیں وہ صرف سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جو دیکھے بھالے ہیں اور یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

''لیس الخبر کا لمعائنۃ''

''یعنی سنی سنائی بات دیکھی بھالی حقیقت کے برابر نہیں ہو سکتی۔''

ایک آدمی دوسرے کو یقین تب دلا سکتا ہے جب وہ خود اس کا مشاہدہ کر کے آیا ہو اس طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ کی معراج والی حقیقت اور دوسرے کئی مواقع پر بھی جنت و دوزخ اور عالم کے دوسرے حقائق کا مشاہدہ کرایا گیا حضرت جبریل علیہ السلام کو خود حضرت محمد ﷺ نے دو دفعہ اس کی اصلی صورت میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ نبوت کے اوائل (شروعات) میں زمین پر اور دوسری مرتبہ شب معراج کو ساتوں آسمانوں سے اوپر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔

بہر حال جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال بے یقینی کے سبب نہ تھا تب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی اس کے اس سوال کو قبول فرما کر اسے حکم دیا کہ چار پرندے لے کر ان کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑے مختلف پہاڑوں پر رکھے اور ان کو اپنی طرف بلائے تو وہ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ علم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں ایمان ہے تو اس کا کیا مقصد کہ کیا تجھے ایمان نہیں؟

اس کا جواب (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو تو یقیناً اس کا علم تھا لیکن اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے نہ پوچھتا تو امت کے افراد میں سے کوئی کم فہم انسان یہ سمجھ بیٹھتا کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مردہ کے زندہ ہونے پر یقین نہ تھا تبھی تو اس نے عرض کیا کہ اے میرے مالک مجھے دکھا دے کہ تو مردہ کو کس طرح زندہ کرتا ہے حالانکہ: ﴿کیف تحی الموتیٰ﴾ کے الفاظ اس پر واضح دلیل تھے کہ سوال مردہ سے زندہ ہونے کی کیفیت کا ہے کہ کس نمونہ پر وہ زندہ ہوتا ہے اس کی کیا صورت ہے اور کیفیت کے دیکھنے کا سوال اس کو مستلزم نہیں کہ اصل مسئلہ جو مردہ سے زندہ ہونے پر ایمان رکھنے کا ہے وہ منفی ہو گیا۔ ہر ایک سچا مؤمن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات پاک پر ایمان بالغیب رکھتا ہے مگر اسے یہ شوق بھی رہتا ہے کہ میں اس ہستی جل وعلیٰ کو دیکھوں اور اسی آرزو میں وہ اپنی ساری زندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت میں بسر کرتا ہے۔ تاکہ آخرت میں اس کے دیدار سے مشرف ہو سکے لیکن یہ حقائق اس آدمی کی سمجھ سے بہت

دور ہیں جو غبی العقل اور حقائق کو سمجھنے سے عاجز ہے وہ تو اس سوال سے یہ غلط اندازہ لگا بیٹھتا کہ ایسے جلیل القدر پیغمبر کو بھی مردہ کے زندہ ہونے پر پورا یقین نہ تھا لیکن جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سے پوچھا اور نبی علیہ السلام نے اس کا جواب دیا تو اس ظن اور وہم کا خاتمہ ہو گیا۔ مطلب یہ کہ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال محض مردہ کے زندہ ہونے کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا تھا تاکہ وہ اپنی امت کو یہ بتا سکے کہ مردہ سے زندہ ہونے کا میں نے خود اپنی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے۔

## مثال ثانی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے وقت پر طور سینا پہاڑ پر حاضر ہوئے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام سننے سے وہ بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی کہ ایک دم یہ سوال کر بیٹھے:

﴿ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

"اے میرے مالک مجھے اپنا آپ دکھا دے کہ میں تجھے دیکھوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال محض تعنت اور معاذ اللہ بے ایمانی کے سبب نہ تھا بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام سننے کے بعد جو اس میں سے اسے لطف و سرور حاصل ہوا تو بے خود ہو کر دیدار کی درخواست کر بیٹھے، اس لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے یہ فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام تو مجھے اس دنیا میں بالکل نہ دیکھ سکے گا۔ لیکن جب تو نے یہ سوال اندر کے بے پناہ شوق اور دلی جذبۂ صادق کے باعث کیا ہے تو اب تو اس پہاڑ کی طرف دیکھ جس پر تو کھڑا ہے اگر یہ میری تجلی کی تاب لا کر اپنی جگہ پر کھڑا رہا تو پھر آپ مجھے دیکھ سکو گے۔ الی آخرہ قصہ مشہور ہے۔ حالانکہ یہی سوال بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تو ان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا غضب نازل ہوا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴾ [البقرة: ۵۵]

"(یعنی یاد کرو) جب تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم ہرگز تمہاری بات پر ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ظاہر ظہور نہ دیکھ لیں پھر تمہیں بجلی اور کڑک (عذاب) نے آلیا اس حال میں کہ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کو دیکھ رہے تھے۔"

ان واقعات میں فرق ظاہر ہے یعنی بنی اسرائیل کا سوال محض ضد اور عناد و سرکشی پر مبنی تھا۔ جس پر ان کے یہ الفاظ شاہد ہیں کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہم تمہاری بات پر ہرگز یقین نہیں کریں گے اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست میں اس قسم کا اشارہ تک نہیں بلکہ یہ درخواست محض دلی شوق کے جذبہ سے مجبور ہو کر بارگاہ الٰہی میں عرض رکھی اس لیے دونوں سوال کرنے والوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جواب بھی مختلف ملا۔

خلاصہ کلام کہ انبیاء علیہم السلام کے اس طرح کے سوالات کسی طرح بھی بے یقینی اور محض ضد و تعنت پر مبنی ہرگز نہیں ہوتے بلکہ یا تو کسی مہربانی کے انتظار میں اس کے وقت کے متعلق سوال ہوتا ہے یا تو کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس کے متعلق ہر پہلو سے باخبر ہونے کے لیے درخواست کرتے ہیں، جس سے کبھی اس چیز کی کیفیت اور صورت حال کے متعلق سوال ہوتا ہے یا دلی شوق اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت سے سرشار ہو کر سوال کر بیٹھتے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ سوال بھی اس لیے تھا کہ اس نعمت کے ظہور کا وقت معلوم ہو تو اس کے شایان شان استقبال کیا جائے اور شروع سے ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ بجالانے کی خاطر اس کی تسبیح و تحمید میں زیادہ وقت مشغول ہو جیسا کہ آنے والی آیت کریمہ میں بھی آرہا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے حجرہ سے نکل کر اپنی قوم کو صبح و شام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح میں خوب مشغول رہنے کی تلقین فرمائی اور صالحین کا ہمیشہ یہ طرز عمل رہا ہے کہ ان پر جب کوئی تازہ نعمت ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ کے معمول سے بھی زیادہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح و تحمید اور اس کے ذکر و عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قیام کے دوران (نماز میں) اس قدر زیادہ دیر کھڑے رہتے کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے اور ان پر ورم آجاتا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ کیوں اس قدر عبادت کرتے ہیں جب کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو آپ کی اگلی پچھلی خطائیں سب معاف فرمادی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اشارہ سورۂ فتح کی اس آیت کی طرف تھا جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ يَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ [الفتح:٢]

اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

(( اَفَلَا اکون عبداً شکوراً ))

”جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مجھ پر اتنا بڑا فضل ہوا ہے کہ میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟“ [البخاری]

مطلب یہ ہوا کہ یہ مزید عبادت محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس بڑے کرم و فضل اور احسان کے شکر بجالانے کے لیے ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اور قرآن کریم میں جو ان کے واقعات بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان کی معلومات رکھنے والوں پر یہ بات مخفی (چھپی ہوئی) نہیں ہے کہ یہ قوم مصر کی غلامی کے دور کے بعد اس قدر پست ہمت اور کاہل اور سست اور عیاشی کی دلدادہ بن گئی تھی کہ جب ان کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی کوئی فرمان لاتا تھا تو یہ اس کی تعمیل سے پہلوتہی کرنے کی خاطر بار بار بے تکے اور غیر متعلقہ

سوالات شروع کر دیتے تھے گویا کہ ان کو یہ یقین ہی نہ تھا کہ نبی ہمیں جو حکم بتا رہے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہی ہے جیسا کہ ان کے کسی قتل کے معاملے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا مگر انہوں نے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم ہم پر استہزاء (ٹوک بازی) کرتے ہو بھلا قتل کے معلوم کرنے کے لیے بھی کبھی گائے کو ذبح کیا جاتا ہے یعنی ان کو یہ یقین ہی نہ آیا کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے امر ہے لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سنجیدگی سے سمجھایا کہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے امر ہے تب بھی وہ اس ارشاد کی تعمیل کے لیے تیار نہ ہوئے بلکہ دو تین مرتبہ مزید فضول قسم کے سوالات کیے تاکہ کسی طرح اس فرمان الٰہی کی تعمیل سے آزادی مل جائے آخر جب دیکھا کہ کسی طرح بھی جان چھوٹتی نظر نہیں آتی اور مزید سوالات کی وجہ سے اور بھی زیادہ پابندیوں میں جکڑتے جا رہے ہیں تو مجبور اور بے بس ہو کر ناچار گائے کو ذبح کیا۔ اسی طرح یہ آیت کریمہ بھی گزر چکی ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تمہاری بات کا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کو ظاہر ظہور نہیں دکھاؤ گے ان کی اس ناگفتہ حالت کو دیکھ کر ہر صاحب عقل بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر حضرت زکریا علیہ السلام ان کو اپنے فرزند کے تولد کی خبر سناتا تو وہ اس کی اس خبر کو مضحکہ اور اپنے ٹھٹھول پن سے تمسخر اڑاتے اور کہتے کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے تیری عقل بھی چلی گئی ہے بھلا کبھی ایسے بوڑھے کو جس کی ساری جسمانی قوتیں بھی ختم ہو چکی ہوں اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بھی نہ ہو، اولاد ہو سکتی ہے؟ ظاہر بین نظروں کی ظاہری اسباب سے اوپر نظر جاتی ہی نہیں جس چیز کے حصول کے لیے اسباب مساعدہ نہیں ہوتے اس چیز کا حصول ان کے ہاں مشکل ومحال ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظر مسبب الاسباب تک پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے طوفان سے بچنے کے لیے ایک بہت بڑی کشتی تیار کر رہے ہیں اور اس کی قوم کے بڑے مالدار کا اس سے گزر ہوتا ہے تو اس پر ٹھٹھول بازی اور تمسخر کرتے ہیں کہ اس کی مت ماری گئی ہے کبھی خشکی پر بھی کشتی چلتی ہے کہ یہ کشتی بنا رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کے ذہن اس حقیقت کو سمجھنے سے بہت دور تھے کہ اس کشتی کے بنانے کا حکم اس ذات جل وعلیٰ کی طرف سے ہے جو پلک جھپکنے میں پوری زمین کو پانی سے پر کر سکتا ہے حضرت نوح علیہ السلام کا یہ بیان سورۂ ہود پ ۱۲ ع ۴ میں ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی اس وجہ سے اس بشارت کے وقت ایسی خارق العادت نشانی کی درخواست کی، تاکہ اپنی قوم کے ان کم فہم اور نادانوں کو یقین دلا سکے کہ یہ بشارت یقیناً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کا ہر حال میں ظہور ہوگا۔

اس سورت کی اس آیت میں ﴿ثلاث لیال﴾ کے الفاظ ہیں۔ یعنی تین راتیں اور سورت آل عمران

میں پ ۳ ع ۴ میں ﴿ثلاث لیال﴾ ایام کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی تین دن مطلب یہ ہوا کہ تین دن اور تین راتیں مسلسل حضرت زکریا علیہ السلام لوگوں سے بات نہ کر سکیں گے۔ ہاں ہاتھوں اور لبوں وغیرہ کی اشارات وکنایات کے ذریعے وہ لوگوں سے کلام کر سکے گا۔ جیسا کہ اشارہ کی استثناء سورۂ آل عمران کے اسی رکوع میں ان الفاظ سے وارد ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ﴾

[آل عمران : ۳]

رمز کے معانی اشارہ ہے ہاتھوں سے یا کسی دوسرے عضو سے۔ بعض علماء نے اس جگہ پر ایک لطیفہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس سورت میں الفاظ ہیں: ﴿ثلاث لیال﴾ اور آل عمران میں ﴿ثلاث ایام﴾ وارد ہے یہ کس لیے؟

یہ نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عرب میں مہینوں کا حساب چاند کی تاریخوں پر ہوتا تھا اور اسلام نے بھی عبادات وغیرہ کے لیے قمری مہینوں کے حساب کو برقرار رکھا اور قمری (چاند کا) مہینے جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ رات سے شرع ہوتے ہیں یعنی ہر مہینہ کی شروعات رات سے ہوتی ہے دن بعد میں آتا ہے چونکہ یہ سورت مبارکہ مکی ہے اور سورت آل عمران سے بہت پہلے نازل ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کے نزول کے موافق جو سورت پہلے نازل ہوئی اس میں اس کا ذکر کیا گیا جو تاریخی حساب سے پہلے آتی ہے یعنی رات اور جو سورت بعد میں نازل ہوئی اس میں اس کو ذکر کیا گیا جو رات کے بعد آتا ہے یعنی دن۔ رات سے شروع ہوا اور تیسرے دن کے آخر تک یہ بندش رہی اور اس طرح تین راتیں اور تین دن پورے ہوئے۔

"سویّا" کے معنی پہلے ذکر کر آئے ہیں لیکن بعض مفسرین اس کے معانی "پے در پے" کرتے ہیں یعنی "مسلسل" تین راتیں مگر ان کا یہ کہنا صحیح نظر نہیں آتا اور کتنے ہی محققین نے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے اس کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر "سویّا" کے معانی پے در پے اور مسلسل ہوتے تو اس صورت میں وہ ﴿ثلاث لیال﴾ کی صفت بنتا اور اگر صفت بنتا تو پھر "سویّا" علاوہ ازیں تین راتیں ایک دوسرے کے پے در پے اور مسلسل ہو بھی کس طرح سکتی ہیں جب کہ ہر دو راتوں کے بیچ میں ایک دن حائل ہوتا ہے لہٰذا صحیح معنی وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

﴿ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴾

[مریم : ۱۱]

"پھر حضرت زکریا علیہ السلام اپنے عبادت کے حجرہ سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا، پھر ان کو اشارہ سے ہدایت کی کہ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صبح وشام تسبیح پڑھتے رہو۔"

"محراب" سے مراد وہ کمرہ یا حجرہ ہے جو اصل عبادت گاہ کے متصل زمین کی سطح سے کافی بلندی پر بنایا جاتا تھا اس میں عبادت گاہ کے مجاور اور خادم رہتے تھے اس میں اعتکاف وغیرہ جیسی عبادات بجا لاتے تھے اور حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان حجروں میں سے ایک میں رہتے تھے۔

"اوحی" کا مادہ ہے "وحی" اس کا اطلاق القاء پر بھی ہوتا ہے جو سرعۃ (تیزی) سے اور مخفی طرح سے ہو اسی طرح مخلوقت کے فطری الہام پر بھی "ایحاء" کا اطلاق قرآن کریم میں وارد ہوا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ﴾ [النحل : ٦٨]

اور اشارہ پر بھی وحی کا اطلاق آتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے پاس جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے پیغام آتا تھا اس پر بھی وحی کا اطلاق ہے اور ان سب میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان سب میں جو القاء ہے اس میں سرعت اور اخفاء دونوں ہیں، اس آیت مبارکہ میں اکثر مفسرین کے کہنے کے مطابق اشارہ کی معنی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، بعض مفسرین نے اس کے معانی کتابت یا لکھنا کیا ہے، عربی لغت میں وحی کا اطلاق کتابت پر عربوں کے نظم ونثر دونوں میں وارد ہے مگر اس مقام پر ہم نے اس کے معانی ''اشارہ کرنا'' ہی اختیار کیا ہے کیونکہ سورۂ آل عمران میں ہے کہ:

﴿ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ﴾ [آل عمران : ٣٠]

''فرمایا تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے بات نہ کر سکو گے مگر اشاروں سے۔''

قرآن کریم کی بہترین تفسیر وہی ہے جو خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر بیان کر کے بتائی ہے لہٰذا جب کہ دوسرے مقام پر وارد ہے کہ حضرت زکریا اشاروں سے بات کر سکے گا تو اس مقام پر بھی وہی معنی کرنا مناسب ہوگا کہ اس نے اپنی قوم کو اشاروں سے سمجھایا "ان سبحوا" میں "ان" مصدریہ بھی ہو سکتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ اسے تفسیر یہ بنایا جائے "بکرۃ وعشیاً" کے معانی ہیں صبح وشام۔

سورۂ آل عمران سے یہ معلوم ہوا کہ اس تسبیح وغیرہ کا حکم حضرت زکریا علیہ السلام کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴾ [آل عمران: ٤١]

''صبح وشام اپنے رب کو بہت یاد کرتا رہ اور اس کی تسبیح پڑھتا رہ۔''

صبح وشام اس معاملے میں خاص طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کے حکم کے بارے میں بعض علماء نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انسان جب کوئی عجیب بات دیکھتا ہے یا کسی خارق العادت امر کا مشاہدہ کرتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان میں سے سبحان اللہ کے الفاظ نکل آتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہی شان ہے اور اسی ہی کی قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے جو ہر عیب ونقص سے پاک ہے یعنی یہ معاملہ عادتاً وجود میں ہرگز نہ آسکتا تھا لیکن اس کا وجود میں آنا محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بے نقص و بے عیب قدرت کاملہ سے ہی ہوا ہے، اس معاملے میں بھی ظاہر ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام پیرانہ سالی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور اس کی زوجہ محترمہ علیہا السلام اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہے تو ان حالات میں اولاد کا ہونا یہ محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ و معجزہ ہی ہے، ورنہ عادتاً (عام طرح) اس طرح نہیں ہوتا اس لیے آپ کو اور آپ کی قوم کو خاص طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تسبیح اور پاکی بیان کرنے کا امر ہوا۔ اس جگہ پر تسبیح وتحمید کے متعلق کچھ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

کسی کی مدح (تعریف) وثناء کے لیے دو باتوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ اس سے نقص وعیب اور خامیوں کی نفی کی جاتی ہے مثلاً: فلاں شخص اندھا نہیں لولا لنگڑا نہیں بد صورت نہیں بزدل وغیرہ نہیں مگر اس قسم کی نفی سے ہی کسی شخص کو اس کے بارے میں تسلی بخش معلومات حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ ہر سننے والا چاہتا ہے اس آدمی میں یہ بھی عیب نہیں یہ بھی نہیں وغیرہ وغیرہ لیکن اس میں کچھ ہے بھی؟ یعنی اس میں خوبیاں اور کمال ہے یا نہیں اس لیے جب تک اس کے لیے ثبوت صفات کا اثبات نہ کیا جائے گا تب تک اس کی تعریف نا تمام (ناقص) رہے گی لیکن جب اس طرح کہا جائے گا کہ وہ ان عیوب اور نقائص سے پاک ہونے کے ساتھ عادل بھی ہے رحم والا بھی ہے سخی بھی ہے فیاض بھی ہے وغیرہ وغیرہ، تب سننے والے کو اطمینان ہوگا۔ اس لیے تسبیح میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا سب عیوب ونقائص سے منزہ اور پاک ہونے کا مفہوم ہے اور حمد کے معانی ہیں تعریف اور ثناء و مدح اور مدح وثناء خوبیوں اور کمالات پر ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ قرآن کریم میں اکثر مواضع (جگہوں) پر تسبیح اور تحمید ساتھ مذکور ہوتی ہے مثلاً:

﴿ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ ﴾ [البقرة : ٣٠]

﴿ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ [نصر: ٨٨]

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ [الشورىٰ: ٥]

جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہر عیب ونقص سے پاک ہے، اسی طرح اس کی ذات میں صفات حمیدہ ثبوتیہ اور سب خوبیاں وکمالات ہیں۔ اب تسبیح صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہی ہوسکتی ہے کیونکہ کوئی بھی مخلوق میں سے نقائص اور عیوب سے پاک نہیں ہوسکتا اور ان میں جو خوبیاں اور محمودہ صفات ہوتی ہیں ان میں بھی نقص ہوتا ہے باقی حمد اور تعریف خوبیوں کے اعتبار سے وہ مخلوق کی بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [بنی اسرائیل : ٧٩]

''بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کرے۔'' یعنی تمہیں اس مرتبہ ومقام تک پہنچائے گا جس کی ہر طرح سے تعریف ہوگی۔

اکثر مفسرین اور محدثین وغیرہم نے اس مقام کو شفاعت کبریٰ پر محمول کیا ہے تفسیر کا یہ محل نہیں۔ عرب میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ: ''عندالصباح یحمدالقوم السری''

جیسا کہ عرب کا اکثر علاقہ بے آب بیابان وریگستان اور درخت وغیرہ سے خالی ہے، اس لیے ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے رات بھر میں ہی کافی سفر نکل جائے۔ اب اس مقولہ کا یہ مطلب ہوا کہ وہ قافلے والے جب ٹھنڈی رات میں کافی سفر کر لیتے ہیں تو ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے سورج کی تمازت اور گرمی سے پہلے ہی کافی سفر کرلیا ہے تو دن کے وقت گرمی کی وجہ سے اس زمانہ میں سفر کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا اس لیے صبح کو رات والے سفر کی تعریف کرتے تھے یعنی رات کی جدوجہد اور جانفشانی نہایت اچھے نتیجے کا باعث بنی۔

مطلب یہ کہ حمد وتعریف مخلوق کے لیے بھی کی جاتی ہے اب اس میں غلو اور اسراف مذموم بلکہ ناجائز ہے، اس آیت کریمہ میں صرف تسبیح کا ذکر ہے اس لیے اس واقعہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اثبات ہے اگر کسی آدمی کے سب اعضاء صحیح وسالم ہوں اور اس کے اعضاء میں کسی خاص کام کے انجام دینے کی قدرت وطاقت بھی ہو اور اس کے لیے جن آلات اور وسائل وذرائع کی ضرورت ہو، وہ بھی سب اس کے پاس موجود ہوں تب ہی وہ آدمی اس کام کو تب پایہ تکمیل تک پہنچا سکے گا۔ جب اس کام کرنے کا اسے علم اور مہارت وکاریگری بھی ہو مثلاً کوئی جگہ بنانا چاہتا ہو یا کسی مشینری کا کام کرنا چاہتا ہو وہ اگرچہ صحیح وسالم بھی ہو اور اس کے ہاتھ پاؤں میں طاقت بھی ہو اس کے پاس کام کرنے کے سب آلات وغیرہ بھی موجود ہوں لیکن اگر اس کے پاس اس کی کاری گری اور علم نہیں کہ کس طرح اس جگہ کو بنایا جائے یا اس مشین کو کسی طرح چلایا جائے تو وہ کبھی بھی اپنے کام کو انجام دینے میں کامیابی نہ حاصل کر سکے گا۔ یعنی طاقت کے ساتھ علم کا ہونا بھی ضروری ہے علم کے بغیر طاقت اور قوت کسی کام کی نہیں اور اس واقعہ میں جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو پیرانہ سالی میں فرزند عطا کیا تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اسے اس امر پر قدرت کے ساتھ اس کا علم بھی ہے کہ یہ کام کس طرح ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے ایسی قدرت رکھنے والی ہستی علیم ہونے کے ساتھ سمیع وبصیر وغیرہما صفات سے بھی علیٰ وجہ الکمال متصف ہو، مقصد یہ کہ اس مقام پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک واقعہ بیان ہوا تو اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دیکھنے اور سننے والا بھی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو سنا اور اس کی حالت کو دیکھا پھر اس پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول کیا۔ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور اسے ایک فرزند عطا کیا یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کو دوسری صفات جیسا کہ علام وغیرہ بھی لازم ہے اس لیے اس کی

قدرت کاملہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد ہوا کہ اس کی تسبیح بیان کرو کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت ہی ہر عیب و نقص سے منزہ (پاک) ہے ہم انسانوں میں کوئی آدمی کتنا ہی صاحب قوت و طاقت ہو لیکن پھر بھی اس کی وہ طاقت اور قوت چل کر ایک جگہ ختم ہوگی اور اسے احساس ہوگا کہ اس امر کے انجام دینے سے وہ عاجز ہے اس لیے مخلوقات کی قدرت وطاقت نقص اور عیب سے خالی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس مقام پر تسبیح کے حکم پر اس لیے اکتفاء کی گئی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت وقوت کا بے عیب ہونا دوسری ثبوتی صفات کو مستلزم ہے یعنی اس جگہ پر بندے نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے ساتھ اس کی صفات حمیدہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

صبح اور شام کی تسبیح وتحمید کا بیان قرآن مجید میں بہت مقامات پر وارد ہوا ہے۔ دن کی شروعات اور اس کی انتہا بھی انسانی زندگی سے کسی حد تک مشابہ ہے انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ بالکل چھوٹا بچہ اور کمزور وضعیف ہوتا ہے، پھر آگے چل کر وہ طاقت اور جوانی کو پہنچتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی جوانی ڈھلنے لگتی ہے اور وہ آخر پیرانہ سالی کی حد کو پہنچ جاتا ہے اور اس حالت میں اس کی سب قوتیں جواب دے جاتی ہیں۔ بعینہ اس طرح صبح کا وقت بچے کی حالت کی طرح ہے اس طرح دوپہر کو وہ اپنے پورے جوبن پر ہوتا ہے اور پھر اس کا جوبن ڈھلنا شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ اپنی پہلی حالت کو پہنچ جاتا ہے اور پھر غروب ہو جاتا ہے جیسے انسان بھی ایک دن اس دارالفنا کو چھوڑ کا دارالبقا کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، یہ انسانی زندگی کے سب مظاہر اور اس طرح کائنات کے دوسرے سب مظاہر کی رفتار وغیرہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ومن آياته الليل والنهار والشمس والقمر﴾ [سورۃ حٰم سجدہ پ ٢٤ ع٥]

اسی طرح انسانی زندگی کے بارے میں فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ﴾ [الروم : ٥٤]

"اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمھاری پیدائش کی ابتدا کی پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی (یعنی جوانی) پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا۔"

بہر حال صبح کا وقت ہر انسان کو اپنے بچپن کی یاد دلاتا ہے اور شام کا وقت بڑھاپے اور ناتوانی کی حالت کو سامنے لاتا ہے اور ان دونوں اوقات میں تسبیح بیان کرنے کا حکم (اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب) انسان کے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے ہے کہ اے انسان تمہارے بچپن کا چلبلا نالاابالی پن اور شوخیاں ہمیشہ رہنے والی نہیں بلکہ وہ وقت آنے والا ہے کہ تم کمزور اور ضعیف وناتواں بن جاؤ گے اور تمہاری جوانی کی ساری شوخیاں کافور ہو جائیں گی جس طرح دن بھی صبح سے شروع ہو کر آخر میں انسانی نظروں سے غائب ہو جاتا

ہے بہرحال انسان نقائص اور خامیوں اور عیب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مطلب یہ کہ ان دونوں اوقات میں تسبیح انسان کو اپنی خامیوں اور عیوب اور اپنے قصوروار ہونے کا احساس دلاتی ہے اور اس کے ذہن پر یہ یقین کامل ثبت کرتی ہے کہ بے عیب و بے نقص اور خامیوں سے پاک صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات والا صفات ہی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب:

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴾ [مریم: ١٢]

''اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوط تھام لے اور ہم نے بچپن ہی میں اسے حکم سے نوازا۔''

''الکتاب'' سے مراد جمہور مفسرین کے ہاں توراۃ ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے جنس کتاب مراد لی ہے یعنی ان کو کتاب ملی یا جو جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کو کتابیں ملیں، مگر جمہور کی رائے زیادہ مناسب نظر آتی ہے اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو بھی انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں آئے وہ سب اوامر نواہی، حلال وحرام اور جملہ احکام شرعیہ کے اعتبار سے توراۃ کے ہی متبع ہوتے تھے۔ اگر کسی کو کتاب ملی بھی تو اس میں احکام کا عنصر بہت کم ہوتا تھا ان میں اکثر مواعظ ونصائح اور اخلاق وعادات اور پیشین گوئی کا اکثر حصہ ہوتا تھا اس لیے آیت کریمہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو کتاب کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہورہا ہے اس کا مطلب ہے کہ اس پر پورے اجتہاد اور کوشش سے عمل کیا جائے اور اس سے مراد احکام شریعہ کا اتباع ہی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی احکام شریعہ کے لحاظ سے توراۃ کے ہی متبع تھے۔

''قوۃ'' کے معانی ہیں مضبوطی اجتہاد کوشش سنجیدگی سے عمل کرنا اور احکام الٰہی کی پوری طرح اطاعت کرنا۔

''الحکم'' کے معانی ہیں قوۃ فیصلہ قوۃ اجتہاد تفقہ فی الدین معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار حکم ودانائی صحیح علم فہم وفراست یہ سب معانی حکم کے لفظ میں شامل ہیں لفظ حکم کے اصل معانی ہیں روکنا یا منع کرنا۔ چونکہ صحیح علم سے ہی حکمت ودانائی آتی ہے اس لیے صحیح علم اور حکمت پر بھی حکم کا اطلاق آتا ہے۔

اب آیت کریمہ کا ترجمہ اس طرح ہوگا۔

اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے اور ہم نے یحییٰ کو صحیح علم اور حکمت ودانائی اور دانش مندی اور فہم وفراست سے بچپن میں ہی نوازا۔

اس آیت کریمہ اور اس سے پہلی آیت کریمہ کے درمیان کچھ کلام مقدر ہے، تقدیر اس کی اس طرح ہو گی۔ پس برحق بشارت کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو فرزند پیدا ہوا پھر جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ''قلنا له یحییٰ الیٰ الخ'' ''پھر ہم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے یحییٰ تو کتاب کو مضبوطی سے تھام لے۔ کتاب کو لینے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر و اس میں

سے جو علم حاصل ہو اس کے مطابق سنجیدگی سے خود بھی اس پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی اس پر عمل کرانے کے لیے پوری کوشش کرو یعنی توراۃ میں جو باتیں عقائد کے باب سے ہیں اپنے عقائد کو بھی اس کے مطابق بنایا جائے جن باتوں اور چیزوں کو اس میں حلال کیا گیا ہے ان کو حلال سمجھا جائے اور جن کو حرام کیا گیا ہے ان کو حرام سمجھا جائے اور جو ان میں آداب وغیرہ ہیں ان سے خود کو مزین کیا جائے اور جو ان میں مواعظ ونصائح ہیں ان سے نصیحت حاصل کی جائے۔ مطلب یہ کہ اعتقاداً وعملاً قول اور فعل میں ہر لحاظ سے توراۃ پر عمل کیا جائے، اس کے بعد فرمایا ہم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی علم وحکمت عطا کی قرآن کریم میں حکم یا حکمت کا لفظ اکثر طور پر انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہی بولا گیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان کی یہ دعا مذکور ہے:

﴿ رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴾ [الشعراء : ۸۳]

اسی سورۂ کے دوسرے رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ذکر کیا گیا ہے کہ:

﴿ فَوَهَبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ [الشعراء : ۲۱]

حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿ وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ [الانبیاء : ۷۴]

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ﴾ [الانبیاء ۷۹]

سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ معاملات میں صحیح رائے قائم کرنا فہم وفراست یہ سب انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اس لیے یہ نعمت عظمیٰ ہر ایک نبی علیہ السلام کو عطا کی گئی ہے باقی اس مقام پر مزید یہ بات کہ یہ نعمت حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی عطا کی گئی تھی۔

خیر یا شر کے اعتبار سے بعض بچوں میں سے بچپن میں ہی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کچھ بچوں کا صغرسنی میں اچھے ماحول یا بگڑے ہوئے ماحول سے واسطہ پڑتا ہے اور ان میں سے ماحول کے اثرات سے متاثر ہونے کی غیر معمولی استعداد اور قابلیت ہوتی ہے۔ اس لیے جس کو اچھا اور بہترین ماحول ملا وہ فلاح اور بہتر زندگی کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور جس کو بگڑا ہوا ماحول ملا وہ بدترین اخلاق کا مجسمہ بن جاتا ہے، بعض بچوں میں والدین کے غلط جذبات یا دوسرے احساسات سرایت کر جاتے ہیں یہ وہ حقائق ہیں جو صحیح تجربات سے مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَخَشِیْنَاۤ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ﴾ [ کهف : ۸۰]

یعنی جب خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر میں ایک لڑکے کو قتل کیا اور اس کا سبب یہ بیان

کیا کہ اس کی طبیعت اس قدر بگڑی ہوئی ہے کہ ابھی تو یہ بچہ ہے لیکن جب بڑا ہو گا تو اس کے بگاڑ اور فساد طبیعت میں اور زیادتی آجاتی اور یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ اس کے والدین جو مؤمنین میں سے تھے وہ بھی اس وجہ سے اس کے رنگ میں رنگ جاتے اور اس کا کفر وعدوان اور سرکشی وطغیان اس کے والدین کی طرف سرایت کر جاتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے والدین پر ظلم وستم کرتا اور ان کے ساتھ بے واجبی اور زیادتی کا سلوک کرتا اس طرح کے دوسری بھی کئی اُمثلہ موجود ہیں، بہر حال حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی بچپن میں ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکمت ودانائی عطا کی اور فہم وفراست کی وہ غیر معمولی قوت عطا کی کہ وہ صغر سنی میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب توراۃ کو سمجھ کر اس پر کما حقہ عمل پیرا ہو سکتا تھا۔ علامہ ابن جریر اپنی تفسیر میں اپنی سند سے اور دوسرے مفسرین اپنی تفاسیر میں مشہور محدث معمر بن راشد سے روایت لاتے ہیں کہ اس نے فرمایا مجھے یہ بات پہنچی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں کچھ دوسرے بچوں نے کہا کہ ''اذهب بنا نلعب'' یعنی آؤ کچھ کھیلیں۔ اس پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''ما للعب خلقت'' تفسیر طبری ص ۵۵ ج ۱۶ یعنی میں کھیل کود وغیرہ کے لیے نہیں پیدا کیا گیا یعنی ہمارا اصل مقصد زندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرنا ہے نہ کہ کھیل کود۔

﴿ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً وَ كَانَ تَقِيًّا ﴾ [مریم : ۱۳]

''حنانا'' کے معانی ہیں شفقت، رحمت اور نرم دلی۔

''زكٰوة'' کے معانی ہیں طہارت پاکیزگی یعنی مادی اور معنوی نجاستوں سے پاکیزگی۔

''تقیا'' کے معانی ہیں: پرہیز گار اور یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے اب معانی ہوں گے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرنے والا صاحب تقویٰ پرہیز گار تقویٰ کے بارے میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد ص ۳۰۸ ج ۱ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ کانٹوں کے راستے پر نہیں چلے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اثبات میں جواب دیا، اس پر حضرت ابی بن کعب نے فرمایا: تو اس راستے پر آپ کیا نمونہ اختیار کرتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''شمرت واجتهدت'' میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں، اس پر آپ نے فرمایا:

''فذالك التقوىٰ''

''یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔''

یعنی تقوی یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے سارے راستوں اور شعبوں میں کام کرنے سے پہلے (کانٹوں پر چلنے والے راستے کی طرح) اچھی طرح سمجھے اور سوچے اور یہ دیکھے کہ میرا اس طرح کرنا اللہ تعالیٰ کی

ناراضگی کا تو سبب نہیں بنے گا اور تقویٰ و پرہیز گاری کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف جس کے دل میں اس کا خوف ہوگا وہ ہر معاملہ میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا جیسا کہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ: " راس الحکمة مخافة الله" یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف ہی دانائی وحکمت کی بنیاد ہے۔ مطلب کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کو تقویٰ لازم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے اور فرمایا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾

[النازعات ۴۰،۴۱]

اور نفسانی خواہشات سے خود کو روکنا یہی تقویٰ ہے۔

آیت کریمہ کے ترجمہ سے پہلے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ " وحنانا" کا عطف " اتینهٗ" پر ہے اس طرح "زکوٰة" کا بھی۔

"اور دی ہم نے اسے اپنی طرف سے نرم دلی شفقت اور طہارت و پاکیزگی اور وہ تھا پرہیز گار۔"

انسان کے دل میں رحمت اور شفقت کا جذبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ حضرت محمد ﷺ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ [آل عمران: ۱۵۹]

"آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے امت پر رحیم وشفیق ہو اور اگر آپ زبان اور دل کے سخت ہوتے تو آپ کے گرد جو جماعت ہے اس کے سب افراد آپ سے دور بھاگ جاتے۔"

رحمة میں یہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور جو شخص اس صفت سے متصف ہے اللہ تعالیٰ اس پر ہی رحم کرتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ:

(( اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ ))

[ أبو داوٗد و الترمذی عن عبدالله بن عمرو]

"جو لوگ دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔ رحمٰن بھی ان پر رحم کرتا ہے تم زمین کی مخلوق پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"

اسی طرح مسند احمد وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ: "اِرْحَمُوْا تُرْحَمُوْا" تم دوسروں پر رحم کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر رحم کیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں پر اس قدر (رحیم وشفیق ہوتے ہیں کہ ان کے والدین بھی ان پر اتنے رحیم وشفیق نہیں ہوتے جتنا رحمت کا جذبہ انبیاء علیہم السلام کے دل میں اپنی امت کے لیے ہوتا ہے، اتنا کسی اور کے دل میں نہیں ہوتا حضرت نوح علیہ السلام کے

بارے میں فرمایا گیا کہ:

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [عنکبوت : ۱٤]

”حضرت نوح نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی وحی پہنچی کہ:

﴿ وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴾ [ ہود : ٣٦]

حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں بس وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے کرتوتوں پر غم نہ کرو۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی علیہ السلام اتنا طویل عرصہ اپنی قوم کو تبلیغ دین کرتا رہا اور ان کے اعراض (روگردانی) کے باوجود مایوس اور بددل نہ ہوا، حالانکہ اتنا عرصہ تبلیغ کرنے کے باوجود نہایت تھوڑے لوگ ہی ایمان لائے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴾ [ ہود : ٤٠]

مطلب یہ کہ جب دیکھا کہ میری تبلیغ میں سے کوئی معقول فائدہ نہیں نکل رہا، تب بھی اپنی تبلیغ وغیرہا سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ حتیٰ کہ بارگاہ الٰہی میں سے فرمان آتا ہے کہ اب اس سے زیادہ ایمان لانے والا کوئی نہیں تب وہ اپنی قوم سے مایوس ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا یہی سبب ہے کہ اس کے دل میں اپنی قوم کے لیے رحمت اور شفقت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر وقت یہی سوچ و فکر تھی کہ کس طرح میری قوم ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کے ابدی عذاب سے بچ جائے لیکن ان کی ازلی شقاوت نے نبی علیہ السلام کی آرزو پوری ہونے نہیں دی۔

ایک مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ” سَمِیًّا “ کے معانی کی تحقیق میں گزر چکی۔ دوسری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کتنے ہی بے ڈھنگے اور بے سلیقہ سوالات کیے تھے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو کوئی اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچاتے تھے تو وہ اس کی تعمیل سے پہلو تہی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے اور بسا اوقات اسے تکالیف بھی پہنچاتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی ﴾ [الاحزاب : ٦٩]

”اے ایمان والو ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیتیں دی تھیں۔“

جب فرعون غرق ہوا اور بنی اسرائیل دریائے نیل سے نکل کر دوسری طرف پہنچے تو وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا جو اپنے بتوں کے سامنے عبادت کرنے کی مثل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے کہا کہ ہمیں بھی ایک ایسا معبود بنا کر دو جیسے کہ ان کے معبود ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ تم تو جاہل نظر آتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو تمھیں بڑی فضیلت بخشی ہے اور تمھارا دشمن جو تمھارے بیٹوں کو قتل کراتا تھا اس کو غرق کر کے تمھیں اس سے نجات دی۔ [الاعراف : ع ١٦]

اس طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جبل طور سینا پر تورات حاصل کرنے کے لیے گئے تو پیچھے انھوں نے گائے کے بچھڑے کو معبود بنا کر اس کی عبادت کرنی شروع کر دی۔ اس طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فرمایا کہ تم اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو تمھارے لیے ہے تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم اس میں داخل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہاں سرکش لوگ رہتے ہیں جب تک وہ وہاں سے نکلیں گے نہیں ہم داخل نہیں ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں بہت ہی سمجھایا اور دوسرے صالح لوگوں نے بھی ان کو بہت سمجھایا لیکن انھوں نے آخری جواب جو دیا وہ یہ تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام جب تک وہ لوگ وہاں پر موجود ہوں گے ہم داخل نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تو اور تیرا رب جا کر ان سے لڑو ہم ادھر ہی بیٹھے ہیں۔ سورۂ مائدہ: ع ۴

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے رب میرے اختیار میں کوئی نہیں۔ مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی لہٰذا تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا تو اب اس مقدس زمین میں ان کا داخلہ چالیس سال تک حرام ہے یہ زمین میں بھٹکتے رہیں گے۔ لہٰذا تو ایسے فاسقوں کا کوئی غم نہ کر۔ ان کی ان ناشائستہ اور بے سلیقہ حرکات کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نہ چھوڑا اور ان کے ساتھ اس تیھ کے میدان میں بیٹھے رہے اور ان کی اصلاح وغیرہ کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرتے رہے تا آنکہ ان کی وفات کا وقت قریب آگیا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کو عرض کی کہ مجھے بیت المقدس کے قریب کر کے روح قبض کی جائے۔ بنی اسرائیل کی یہ سب بدعنوانیاں اور ناشائستہ حرکات حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت کرتے رہے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے دل میں اپنی قوم کے لیے بے حد رحمت و شفقت کا جذبہ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیوقوفی کی وجہ سے وہ ان کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ دوسری مثال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قلب اطہر میں اپنی امت کے لیے جو رافت اور رحمت و شفقت اور پیار و محبت تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [توبة : ١٢٨]

تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی سے ہے۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے تمھاری فلاح و کامیابی کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے تو وہ خاص طرح شفیق اور مہربان ہے۔

امت پر رحمت اور شفقت کے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بہت واقعات ملتے ہیں لیکن ہم اس جگہ

پر صرف ایک واقعہ کو ذکر کرتے ہیں۔ جو مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ بخاری و مسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا احد کے دن سے بھی (جس دن آپ زخمی ہوئے تھے) کوئی دن زیادہ سخت آپ پر گزرا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نے تیری قوم کی طرف سے جو جو تکلیفیں اٹھائی ہیں، میرا ہی دل جانتا ہے۔ سب سے زیادہ سخت دن مجھ پر عقبہ کا دن گزرا ہے جس دن میں نے اپنے تئیں ابن عبدیالیل بن کلال پر پیش کیا (جو طائف کا رئیس تھا) اس نے میرا کہنا نہ مانا (یعنی اسلام نہ لایا) میں رنجیدہ منہ کے ساتھ چلتا ہوا وہاں سے لوٹا (ہوش ہی نہ تھا کہ کدھر جا رہا ہوں) جب قرن ثعالب میں (ایک مقام کا نام ہے) پہنچا تو ذرا ہوش آیا میں نے اوپر سر اٹھایا دیکھا تو ابر کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ کیے ہوئے ہے اور اس میں حضرت جبریل علیہ السلام موجود ہیں۔ انھوں نے مجھ کو پکارا کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے وہ سن لیا جو تمھاری قوم نے تم سے کہا تم کو جواب دیا۔

اب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو تمھارے پاس بھیجا ہے تم جو چاہو اس سے کام لے سکتے ہو، اتنے میں اس فرشتے نے مجھ کو سلام کیا اور کہنے لگا اے محمد! اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھ کو تمہارے پاس بھیجا ہے تم جو کہو میں کر ڈالوں اگر کہو تو میں مکہ والوں پر مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا دوں (سب چکنا چور ہو جائیں) آپ نے فرمایا: (نہیں ایسا مت کر) مجھ کو امید ہے (اگر یہ لوگ راہ پر نہ آئے تو خیر ہے) ان کی اولاد میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اکیلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کریں گے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اس مقام پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

**سوال ①**: کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ یہ پیش کش آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبول نہیں کریں گے؟

**سوال ②**: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں امت کے لیے رحمت وشفقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بھی زیادہ تھی کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو فرشتہ بھیجا کہ اگر آپ کہیں تو آپ کی قوم کو ہلاک و برباد کیا جائے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات قبول نہ کی؟

ان سوالوں کے جوابات یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو علم تھا اور اس کی رحمت بھی نہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ساری دنیا سے بھی بڑھ کر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ساری دنیا سے بھی بڑھ کر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں بھی اپنی امت کے لیے جو رحمت اور شفقت تھی وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ و حصہ ہے جیسا کہ پہلے آیت کریمہ:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ [آل عمران: ١٥٩]

گزر چکی ہے لیکن ایسی پیش کش کرنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ دنیا کے سامنے اس بات کا اظہار کرنا تھا کہ

واقعتاً نبی اکرم ﷺ کے قلب اطہر میں امت کے لیے اس قدر بے پناہ رحمت اور شفقت کا جذبہ موجود ہے کہ خود پر تو ہر مصیبت و تکلیف برداشت کرتا ہے لیکن اپنی امت پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب یا ہلاک اور بربادی آپ ﷺ کے لیے ناقابل برداشت ہے اور اگر آپ کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ پیش کش نہ آتی تو کوئی کہنے والا اس طرح بھی کہہ سکتا تھا کہ آپ ﷺ کا اپنی امت کی طرف سے تکلیف دینے پر صبر کرنا محض اضطراری سبب تھا یعنی اس سلسلہ میں آپ کی کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور نہ آپ کے پاس کوئی طاقت تھی کہ جس کے ذریعے ان سے انتقام لیتے، یعنی برداشت کرنے کی وجہ محض بے بسی اور لاچاری تھی، اس لیے ناچار صبر کرنا پڑا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا مگر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ پیش کش آئی تو اس وقت آپ کو یقیناً موقع ملا کہ چاہتے تو چند منٹوں کے اندر آپ کے دشمن ماضی کی یاد بن جاتے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے نے آپ کو بتا دیا تھا کہ آپ کی قوم کے بارے میں آپ جو بھی امر فرمائیں گے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے امر کے مطابق وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر اس مقام پر کوئی تنگ دل یا تنگ ظرف آدمی ہوتا تو فوراً کہتا کہ ان کو مت چھوڑو ابھی ایک دم ان کو تباہ و برباد کر دو کیونکہ یہ واقعتاً آپ کے لیے بہت بڑا معاملہ تھا جیسا کہ آپ خود اپنی زبانی بیان فرما رہے ہیں، لیکن یہ معاملہ اس بابرکت ہستی ﷺ سے تھا جس کو بارگاہ الٰہی سے ''رحمۃ للعالمین'' کا خطاب ملا تھا، جس کو قرآن مجید میں:

﴿ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ [الانفال: ۱۲۸]

ـــ یا گیا، ایسی مہربان اور شفیق ہستی کے سامنے اپنی تکالیف اور مصائب اور دکھ درد وغیرہ اور آپ کی شان میں گستاخی کا اتنا وزن نہیں تھا، جتنا امت کی بقاء اور اس کی اصلاح کے بارے میں تھا، آپ کے سامنے سب سے اہم بات امت کی اصلاح اور عذاب الٰہی سے نجات تھی، اس لیے آئے ہوئے فرشتے سے فرمایا نہیں میں اپنی قوم کی ہلاکت و بربادی کا خواہاں نہیں، مجھے امید ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان میں سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو میری دعوت کو قبول کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت و بندگی کریں گے اور اس کے ساتھ کس کو شریک نہیں کریں گے اس قسم کی فیاضی اور رحمت و حلم اور بردباری کی مثال تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے بہر حال یہ مثالیں اس لیے پیش کی گئیں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات رہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں اپنی قوم و امت کے لیے جو بے پناہ رحمت و شفقت کا جذبہ تھا، وہ دوسرے عام انسانوں میں ملنا بہت مشکل ہے اور ان کی ہر بات اور ہر کام میں امت کی خیر خواہی اور اصلاح و بہبودی مطلوب ہوتی تھی۔ ایسی ہستیوں کو اپنی قوم اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہوتی تھی۔ اس آیت کریمہ میں بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے یہی خوبی ثابت کی گئی ہے، یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ہم نے اپنی طرف سے اپنی قوم کے لیے غیر معمولی رحمت اور شفقت کا جذبہ عطا فرمایا۔

آیت کریمہ میں دوسرا لفظ "زکوٰۃ" ہے جس کے معانی طہارت اور پاکیزگی ہم پہلے ذکر کرآئے ہیں اس کا عطف بھی "حنانا" پر ہے یعنی ہم نے اسے اپنی طرف سے طہارت اور پاکیزگی عطا فرمائی، یعنی ظاہری اور معنوی نجاستوں سے پاکیزگی عطا فرمائی۔ سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۴ میں "حصوراً" کا لفظ آیا ہے، یعنی عصمت کی حفاظت کرنے والا پاکدامن رہنے والا تھا۔

ہمارے خیال میں "زکوٰۃ" اور "حصوراً" معانی کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام باوجود مردانگی میں کامل ہونے کے عورتوں کے قریب نہ جاتے تھے اور ان باتوں سے کلی انقطاع اور تبتل اختیار کر کے ہر وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اس قسم کا تبتل اختیار کرنا اور نکاح نہ کرنا پہلی امتوں میں جائز تھا مگر دین اسلام جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دین کامل ہے اس میں اس قسم کا تبتل اختیار کرنا جائز نہیں، قرآن مجید میں بھی حکم ہے کہ:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ۳۲]

آپ میں سے جو مرد یا عورتیں مجرد (اکیلے) ہوں ان کے نکاح کردو حتیٰ کہ سورۂ نساء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [النساء: ۲۵]

"اور جو شخص تم میں سے اتنی طاقت نہ رکھتا ہو آزاد عورتوں سے نکاح کر سکے اسے چاہیے کہ تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرلے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔"

مطلب یہ کہ تجرد اختیار کرنے کی اجازت اس امت میں نہیں اور اس کے متعلق صحیح کتابوں میں بیشمار احادیث مذکور ہیں جن میں تاکید کی گئی ہے کہ جس کو قدرت وطاقت ہو وہ نکاح کرلے اور یہی فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان کے علاوہ دوسرا کوئی بھی اگر تجرد اختیار کرلے اور پاکدامن بھی رہے یہ اگرچہ ناممکن نہیں لیکن انتہائی مشکل ضرور ہے ہمارا دین کامل ہمیں اس طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جس سے ہم ہر طرح کی معنوی اور مادی گندگیوں سے پاک رہیں۔ بعض علماء نے "حصوراً" کا ترجمہ "عنین" وغیرہ کیا ہے (یعنی مرد ہونے میں کامل نہ تھا) اس سلسلہ میں کچھ مرفوع روایات بھی پیش کی جاتی ہیں جن کو محققین اور مفسرین نے رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے یہ روایات ضعیف اور منکر ہیں روایتی اصول کے موجب تو یہ روایات برابر ضعیف ہیں لیکن درایۃً بھی یہ روایات یا ان پر بنیاد رکھ کر حصوراً کے یہ معانی کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ اس سورت مبارکہ میں یا سورت آل عمران میں یہ صفات حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح اور ثناء میں وارد ہیں اور ان سے مقصود آپ کی خوبیوں اور کمالات کو واضح کرنا ہے، لہٰذا اگر معاذ اللہ! حضرت یحییٰ علیہ السلام کو

عورتوں کے قریب جانے کی طاقت نہ تھی یا اس قابل نہ تھا کہ عورت کے قریب جا سکتا تو اس سورت میں اس کی پاک دامنی اور ایسی گندگیوں سے خود کو محفوظ رکھنے والی خوبی بالکل بے معنی ہے، ایک آدمی کے ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور وہ چوری وغیرہ نہیں کرتا تو کوئی معقول آدمی اس کی تعریف نہیں کرے گا کہ وہ دوسرے کے مال وملکیت کے قریب بھی نہیں جاتا اس طرح ایک آدمی اندھا اور نابینا ہو تو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ نظر میں پاک ہے بالکل مہمل (بے معنی) بات ہے، جس کی آنکھیں صحیح وسلامت ہوں پھر وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے نظروں کو نیچے رکھے اور پاک رکھے تو ایسے آدمی کے لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے وہ نظر کا پاک ہے بہر حال جس آدمی میں کسی برائی کے کرنے طاقت ہی نہیں اور کسی غلط راستے پر چلنے سے عاجز ہے تو ایسے آدمی کا برائی سے بچنا اور غلط راستے پر نہ چلنا نہ کوئی خوبی ہے اور نہ کوئی کمال دراصل انسان کا امتحان وابتلاء بھی تب ہو سکتا ہے جب اس کو نیکی اور برائی کرنے کی قدرت وطاقت ہو یہی وجہ ہے کہ ملائکہ اس قسم کے امتحان وابتلاء میں ڈالے ہی نہیں گئے، اس لیے کہ ان میں برائی کرنے کی قوت ہی نہیں رکھی گئی۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا ٱلْمُخْلَصِينَ ﴾ [یوسف: ۲٤]

''درحقیقت وہ (یوسف علیہ السلام) ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔''

وہ اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو ہر اس جسمانی عیب سے محفوظ رکھتا ہے جو عام انسانوں میں عیب شمار کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام مردانگی میں بھی کامل تھے اور دوسری جانب گناہ کی دعوت دینے والی بھی وہ عورت تھی جو صاحب منصب وثروت وجمال تھی اور نبی کو اندر بلا کر دروازہ بھی اچھی طرح بند کر دیا اور پھر اسے اپنی طرف بلایا ہر انسان سوچ سکتا ہے کہ یہ ایسا وقت تھا کہ ایسی آزمائش میں ایک عام انسان ہوتا تو وہ ہرگز گناہ میں ملوث ہونے سے نہ بچ سکتا مگر اس بابرکت ہستی نے اس عورت کی گناہ کی دعوت اور پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے یہ الفاظ کہے ''معاذ اللہ'' یعنی میں اس کام سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور ایسی ہی ہستیوں کے بارے میں احادیث میں آتا ہے قیامت کے دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں سات قسم کے لوگ ہوں گے جن کو فرمائے گا کہ آپ آکر میرے عرش عظیم کے سائے کے نیچے بیٹھو۔ ان سات قسم کے لوگوں میں سے ایک قسم ان لوگوں کی بھی ہے جس کو کوئی صاحب منصب وجمال عورت اپنی طرف گناہ کے لیے بلائے مگر وہ جواب دے کہ مجھ سے یہ کام نہ ہو گا کیونکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور ظاہر ہے کہ اس آدمی کو گناہ میں ملوث ہونے کی قدرت تھی مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔

مگر اس کے برعکس اگر کسی میں برائی کرنے کی قدرت اور طاقت کا نہ ہونا ہی خوبی اور کمال ہوتا تو پھر

قیامت کے دن اللہ سبحانہ وتعالیٰ خنثیٰ (ہیجڑوں) کو عرش کے سائے میں بٹھاتا۔ بہر حال انسان کی عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ معاذ اللہ حضرت یحییٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی تھی ہی نہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات کو خوبی قرار دے کر اس کی تردید کی ہے بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نبی علیہ السلام مردانگی میں بھی کامل تھے اور اگر نکاح کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن وہ اس دنیاوی لذات اور مادی لطف اندوزیوں سے زیادہ اللہ کی محبت میں سرشار ہیں اور اس کی عبادت میں مستغرق ہیں اور یہی ان کا کمال تھا جس کی قرآن حکیم تعریف کر رہا ہے۔

"تقیاً" کے معانی ہیں پرہیزگاری خدا ترسی۔ تقویٰ کے معانی پہلے ذکر کر آئے ہیں، تقویٰ کا مرکز انسان کا دل ہے جیسا کہ نبی ﷺ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک طویل روایت کرتے ہیں جو صحیح مسلم میں مذکور ہے جس کے الفاظ ہیں:

(( التقویٰ ھھنا یشیر الیٰ صدرہ ثلاث مرات ))

"آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اور اشارہ کیا سینہ مبارک کی طرف تین مرتبہ کہ تقویٰ اس جگہ پر ہے۔"

اور انسان کا دل بھی اسی سینہ میں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴾ [الحج : ٤٦]

"ان کی گمراہی کا سبب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں بلکہ ان کے دل جو سینہ میں ہیں وہ اندھے ہوگئے ہیں۔"

(یعنی سمجھتے نہیں) مطلب یہ کہ جس کے دل میں تقویٰ ہوگا تو اس کے جسم کے دوسرے اعضاء میں بھی تقویٰ کا اثر ظاہر ہوگا جیسا کہ صحیحین کی وہ حدیث جو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب ))

"یعنی خبردار انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جس کے سدھرنے سے انسان کا سارا جسم سدھر جاتا ہے اور اس کے بگڑنے سے انسان کا سارا جسم بگڑ جاتا ہے خبردار وہ دل ہے۔"

یعنی انسان کے سدھرنے اور بگڑنے کا سارا دارومدار دل پر ہے اس لیے جس دل میں خیر و بھلائی ہے تو اس کے جسم کے سب اعضاء میں سے بھی نیکی اور بھلائی کے کام ظہور پذیر ہوں گے اور جس کے دل میں بیماری گندگی ہوگی تو اس کے جسم کے سب اعضاء میں سے بھی گندے اور برے اعمال کا ظہور ہوگا یعنی دل کی روحانیت اور صحت اور روحانی مرض کا دوسرے جسمانی اعضاء پر روحانی صحت اور مرض کا اثر پڑتا ہے۔ دوسرے معنوں میں اس طرح کہیں کہ جسمانی اعضاء کی روحانی صلاحیت کا دارومدار اپنے دل کے پاک ہونے

پر منحصر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [یونس : ۵۷]

”یہ قرآن کریم دل کی سب روحانی بیماریوں کا بہت بڑا علاج ہے اس پر عمل کرنے سے دل کی سب بیماریاں اور مرض دفع ہو جائیں گے۔“

اس آیت کریمہ میں یہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ صاحب تقویٰ تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مذکورہ خوبیاں شفقت ورحمت عصمت اور پاکیزگی وغیرہ یہ سب اس کے پاک دل کی تقویٰ کا نتیجہ ہیں، یعنی اس سب خوبیوں کا یہ سبب نہیں تھا کہ لوگوں پر اپنی پارسائی کا سکہ جمائے اور نہ ہی کوئی ایسی دوسری فاسد غرض تھی بلکہ اس کا سبب یہی تھا کہ اس کے دل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا خوف تھا اور اس کے دل کا ہر گوشہ تقویٰ سے معمور تھا۔

دلوں میں تقویٰ کے ہونے کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ [الحج : ۳۲]

”جو لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ ان کے دل کے تقویٰ کی نشانی ہے۔“

شعائر کے معنی اس جگہ پر بیان نہیں کرتے کسی مناسب موقع پر عرض رکھیں گے۔

﴿ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴾ [مریم: ۱۴]

”اور وہ والدین کے ساتھ نیکی (حسن سلوک) کرنے والا تھا اور نہ وہ جبار (سرکش) تھا اور نہ والدین کا نافرمان۔“

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم کتاب اور سنت میں بہت آیا ہے، مثلاً:

﴿ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴾

[بنی اسرائیل : ۲۳]

”تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کی حالت کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام اور نرمی کے ساتھ بات کرو۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴾ [لقمان : ۱۴]

"(ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔"

اور آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ﴾ [لقمان: ۱۵]

"اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو شرک کر تو ان کی بات ہرگز نہ مان اور دنیا میں ان سے نیک برتاؤ کے ساتھ رہ۔"

یعنی معاذ اللہ کسی کے والدین مشرک ہوں تو شرک کی بات اور شرکیہ کام میں ان کا کہنا نہیں ماننا، مگر دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کا امر ہے کہ ان سے حسن سلوک کیا جائے۔

قرآن کریم میں اور بھی بہت آیات وارد ہیں جن میں والدین کے ساتھ دنیاوی معاملات میں اطاعت اور فرماں برداری کرنے اور حسن سلوک کرنے کا امر ہے اور دکھ و اذیت پہنچانے کو سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، ذیل میں ہم اس سلسلہ میں چند احادیث نقل کرتے ہیں:

① (( عن ابی هريره رضی الله عنه قال قال رجل یا رسول الله من احق بحسن صحابتی قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال ابوك )) [متفق علیه]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری اچھی صحبت (حسن سلوک) کا سب سے زیادہ کون حقدار ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہاری والدہ اس طرح آپ نے تین مرتبہ اس کے پوچھنے پر فرمایا کہ تمہاری والدہ زیادہ حقدار ہے اور چوتھی مرتبہ پوچھنے پر فرمایا تمہارے والد صاحب۔" [بخاری و مسلم]

② (( عن ابی هريره رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم رغم انفه رغم انفه رغم انفه قیل من یارسول الله؟ قال من ادرك والدیه عند الکبر احدهما او کلاهما ثم لم یدخل الجنة )) [رواه مسلم]

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ناک خاک آلود ہو یہ الفاظ مبارک تین مرتبہ کہے کہا گیا کس کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا وہ شخص جس نے بڑھاپے کی حالت میں والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو پایا اور وہ ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔"

③ (( عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من

الکبائر شتم الرجل والدیه قالوا یا رسول الله وهل یشتم الرجل والدیه قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباه ویسب امه فیسب امه )) [بخاری و مسلم]

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی بکے لوگوں نے کہا کیا کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا ہاں یہ کسی دوسرے کے باپ کو گالی بکے گا تو اس کے باپ کو گالی بکے گا یہ اس کی ماں کو گالی بکے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی بکے گا۔''

④(( عن عبدالله بن عمرو قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد )) [رواه الترمذی]

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا رب کی رضا باپ کی رضا میں (پوشیدہ) ہے اور رب کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں (پوشیدہ) ہے۔''

⑤(( عن معاویة بن جاهمة ان جاهمة جاء الیٰ النبی صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله اردت ان اغزو وقد جئت استشیرك فقال هل لك من ام فقال نعم قال فالزمها فان الجنة عند رجلها ))

[ رواه احمد والنسائی والبیهقی فی شعب الایمان]

''ایک صحابی جاہمہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہاری والدہ ہے کہا ہاں فرمایا جا اور اس کی خدمت کر کیونکہ جنت اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔''

والدین کی ناراضگی خصوصاً ماں کی ناراضگی کے متعلق دو تین احادیث اور بھی پیش خدمت ہیں۔

⑥(( عن ابن عمر قال کانت تحتی امرأة احبها وکان عمر یکرهها فقال لی طلقها وابیت فاتی عمر رسول الله صلی الله علیه وسلم فذکر ذالك له فقال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم طلقها )) [رواه الترمذی وابو داوٗد]

''حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری بیوی تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا اور میرا باپ عمر رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کرتا تھا پھر مجھے فرمایا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے لیکن میں نے انکار کیا تو وہ نبی ﷺ کے پاس آئے اور ان سے یہ ذکر کیا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ اسے طلاق دیدے۔''

⑦(( عن ابی هریره عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: لم یتکلم فی المهد

الا۔ ثلاثة: عيسىٰ و كان فى بنى اسرائيل رجل يقال له جريج كان يصلى فجائتُ امه فدعته فقال : اجيبها اوْ اصلى؟ فقالت: اللهم لاتمته حتىٰ تريه وجوه المومسات و كان جريج فى صومعته فتعرضت له امرأة و كلمته فابىٰ فاتت راعيافأمكنته من نفسها فولدت غلامافقالت: من جريج فاتوه فكسروا صومعته وانزلوه وسبوه فتوضا وصلى ثم اتى الغلام فقال من ابوك يا غلام؟ قال: الراعى قالوا: نبنى صومعتك من ذهب؟ قال: لا الا من طين...... الخ الحديث )) [رواه البخارى فى كتاب الانبياء فتح البارى ص ٤٧٦ ج ٦]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بات کی جھولے میں مگر تین بچوں نے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے (دوسرے بچے کا قصہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا) بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس کا نام تھا جریج وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں آئی اور آکر اس کو پکارا اس پر جریج نے دل میں خیال کیا کہ ماں کو جواب دوں یا نماز پڑھوں (لیکن وہ نماز پڑھنے میں لگا رہا) جب اس نے جواب نہ دیا تو اس کی ماں نے کہا اے اللہ اس کو تب تک نہ مارنا جب تک یہ فاحشہ عورت کے منہ نہ پڑے۔ ایک دن وہ اپنی عبادت گاہ میں بیٹھا تھا کہ ایک فاحشہ عورت نے آکر اسے گناہ کی دعوت دی لیکن اس نے انکار کردیا وہ فاحشہ اس سے مایوس ہوکر باہر آئی اور ایک چرواہے سے آکر منہ کالا کیا اور اسے حمل ہوگیا اس کے بعد اسے ایک بیٹا پیدا ہوا لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ جریج سے ہے لوگ جریج کے پاس آئے اور اس کی عبادت گاہ کو توڑ کر ختم کردیا اور اسے باہر کھینچ لائے اس کے بعد جریج نے وضو کیا اور نماز پڑھی اور اس نومولود کے پاس آیا اور اس سے آکر پوچھا کہ تمہارا باپ کون ہے اے لڑکے؟ پھر اس نومولود نے جواب دیا کہ میرا باپ چرواہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ماں کی بددعا کتنی جلدی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے کہا کہ ہم تمہیں سونے کی عبادت گاہ بنادیتے ہیں لیکن اس نے کہا نہیں صرف مٹی کی بنادو۔''

⑧(( عن عبدالله بن ابى اوفى رضى الله عنه قال: كنا عند النبى صلى الله عليه وسلم فاتاه أت فقال: شاب يجود بنفسه فقيل له: قل لااله الاالله فلم يستطع فقال: كان يصلى؟فقال نعم فنهض رسول الله صلى الله عليه وسلم ونهضنا معه فدخل على الشاب فقال له قل لااله الا الله فقال لااستطيع قال: لم؟ قال كان يعق والدته قال النبى صلى الله عليه وسلم أحية والدته قالوانعم

قال ادعوها فدعوها فجاء ت فقال: هذا ابنك؟ فقالت: نعم فقال لها أرايت لو أجحت نارضخمة فقيل لك: ان شفعت له خليلنا عنه والاحرقناه بهذه النار أ كنت تشفعين له؟ قالت يا رسول الله اذاً اشفع له قال: فاشهدى الله واشهد ينى قد رضيت عنه قالت: اللهم انى اشهدك واشهد رسولك انى قدرضيت عن ابنى فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم يا غلام قل لااله الا الله وحده لاشريك له واشهد ان محمد عبده ورسوله فقالها فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحمدلله الذى انقذه بى من النار))

[رواه الطبرانی واحمد مختصرا]

''حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ ایک شخص ہے جو بستر مرگ پر ہے جب اسے کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ کہو تو اس کو اس کی قدرت نہیں ہوتی (یعنی کلمہ مبارک زبان پرنہیں آتا) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا نماز پڑھتا تھا کہا ہاں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ہم بھی اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جوان پر داخل ہوئے پھر اسے فرمایا کہ کہو لا الہ الا اللہ تو اس نے کہا مجھے قدرت نہیں ہے آپ کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ والدہ کا نافرمان تھا آپ نے پوچھا کیا اس کی والدہ زندہ ہے؟ کہا گیا ہاں، فرمایا بلاؤ پھر جب وہ آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارا بیٹا ہے کہا ہاں فرمایا بتاؤ اگر بہت بڑی آگ جلائی جائے اور تمہیں کہا جائے کہ اگر تم سفارش کرو تو اس کو چھوڑ دیں ورنہ اس کو آگ میں جلا دیں گے بتاؤ تم اس صورت میں سفارش کرو گی، کہا یا رسول اللہ! ہاں میں کروں گی اس پر آپ نے فرمایا کہ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو بھی گواہ بنا اور مجھے بھی گواہ بنا کر کہہ کہ میں اپنے بیٹے سے راضی ہوگئی، اس پر اس نے کہا کہ اے اللہ میں تمہیں گواہ بناتی ہوں اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی گواہ بناتی ہوں کہ بیشک میں اپنے بیٹے سے راضی ہوئی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جوان سے فرمایا، اے جوان تو کہہ (( لا اله الا الله وحده لاشريك له واشهد ان محمد عبده ورسوله)) پھر اس جوان نے ان الفاظ کو کہا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الحمدللہ کہ اس نے میرے ذریعے اس کو دوزخ کی آگ سے آزاد کیا۔''

[یہ روایت علامہ منذری اپنی کتاب الترغیب والترھیب میں لائی ھے۔ ص ۳۳۱ ج ۳]

اس سے معلوم ہوا کہ والدہ کی ناراضگی کس قدر ہولناک انجام کا باعث بنتی ہے۔ بہرکیف وہ اولاد سعادت مند ہے جو اپنے والدین کو ہر طرح راضی رکھتی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بھی رضا اسی میں ہے۔

اس آیت کریمہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ بھی ایک خاص طرح کی خوبی بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے

والدین سے نیکی کرنے والا تھا۔ انبیاء علیہم السلام تو اپنے مشرک والد کو بھی اللہ کی توحید کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں جس کی ایک روشن مثال ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے، سورت لقمان کی پہلے آیت مبارکہ گزر چکی ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ اولاد کو چاہیے کہ اپنے مشرک والدین سے بھی دنیا میں حسن سلوک کرے اور ان کی خدمت بجا لاتا رہے، البتہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی میں ان کا کہنا نہ مانے، اس آیت مبارکہ میں ایک لفظ ''جبار'' آتا ہے جس کے معانی ہیں سرکش زبردست اور اپنی طاقت دکھانے والا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام سرکش بھی نہ تھے انسان میں میں سرکشی تکبر یا غرور کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس غرور یا تکبر کی وجہ اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دوسرے بندوں کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے اور اپنے لیے فوقیت اور بڑائی ثابت کرتا ہے اور بسا اوقات دوسروں پر ظلم وتعدی اور زیادتی و ناشائستہ سلوک کرتا ہے ایسے شخص کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ حق کی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس معانی کی وضاحت حدیث شریف سے ہوتی ہے:

(( عن عبدالله بن مسعود عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر قال رجل ان الرجل یحب ان یکون ثوبه حسنا ونعله حسنة قال ان الله جمیل یحب الجمال الکبر بطر الحق وغمط الناس)) [رواه مسلم کتاب الایمان باب تحریم الکبر ص ۸۹ ج ۲]

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، ایک شخص نے کہا کہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کی جوتی اچھی ہو (یعنی کیا یہ بھی تکبر ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک اللہ سبحانہ وتعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ کبر تو یہ ہے کہ آدمی حق کو چھپائے اور دوسرے لوگوں کو خود سے کمتر سمجھے۔''

آپ کے فرمان موجب متکبر آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ابلیس ملعون نے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے انحرافی اسی تکبر کی وجہ سے کی تھی لہٰذا جو شخص تکبر اختیار کرتا ہے، وہ ابلیس ملعون کی پیروی کرتا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ [البقرة: ۱۶۸]

''شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

دوسرے مقام پر اس کی عداوت کا بیان ہے کہ وہ کس طرح انسان سے عداوت رکھتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَیْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ یُضِلُّهٗ وَ یَهْدِیْهِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴾ [الحج: ۴]

''اس (شیطان) کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا اسے وہ گمراہ کر کے

چھوڑے گا اور عذاب جہنم کا راستہ دکھائے گا۔"

ذیل میں سرکش انسانوں کے بارے میں کچھ احادیث ذکر کی جاتی ہیں:

① ((عن حارثة بن وهب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا اخبركم باهل النار كل عتل جواظ مستكبر)) [متفق علیه]

"حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو جہنم رہنے والوں کے متعلق نہ بتاؤں؟ (پھر فرمایا) ہر سرکش بد خلق دل کا سخت تکبر کرنے والا۔"

② ((عن ابی موسیٰ الاشعری رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال ان فی جهنم وادیا یقاله هبهب حقا علیٰ الله ان یسکنه کل جبار))

[رواه ابو یعلیٰ فی مسنده ص ۳۸۹ ج٤ والحاکم فی المستدرك ص ٥٩٧ ج ٤]

"حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: بیشک جہنم میں ایک وادی ہے جس کو ہیبب کہا جاتا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر حق ہے کہ ہر زبردستی کرنے والے سرکش کو اس میں ٹھہرائے گا۔"

قرآن کریم میں پچھلی قوموں کے احوال پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ ہر قوم کے رؤساء اور بڑے اپنی ظاہری شان وشوکت اور مال وملکیت اور اپنی حیثیت کے بل بوتے اور طاقت کے گھمنڈ پر انبیاء علیہم السلام پر استہزاء اور مسخریاں کرتے تھے۔ اکثر طرح ان کے متبعین مساکین اور کمزور ضعیف ہوتے تھے اور وہ رؤساء ان کو کمتر سمجھ کر ان پر استہزاء کرتے تھے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم نے جواب دیا:

﴿ قَالُوٓا اَنُؤۡمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ ﴾ [الشعراء: ۱۱۱]

"کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ تیری پیروی رزیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے۔"

یعنی ان کو اپنی ظاہری شان وشوکت اور طاقت حق کو قبول کرنے میں مانع تھی اس طرح ہر نبی علیہ السلام کی قوم کے رؤساء نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور جواب ہی یہ دیتے کہ:

﴿ قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِيۡنَ ﴾ [الشعراء: ۱۳۶] [1]

"تو نصیحت کر یا نہ کر ہمارے لیے سب یکساں ہے یہ باتیں اور قصے تو ہمیشہ سے یونہی ہوتے چلے آئے ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔"

ہمارے رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی کئی ایسے سرکش اور متکبر آدمی تھے جو حق کو قبول کرنے میں عار محسوس کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

﴿ اَهٰذَا الَّذِىۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا ﴾ [الفرقان: ٤١]

[1] قلت: فیه زهر بن سنان القرشی وهو ضعیف۔ ابن محب الله الراشدی عفاالله عنهما

(یعنی استہزاء کرتے ہوئے کہتے تھے) کیا اس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اس کے علاوہ کوئی رسول ملا ہی نہیں)۔

کبھی اس طرح کہتے کہ:

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ [زخرف: ٣١]

''کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف) بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟''

ایسے سرکش لوگوں کو جب حق کی بات بتائی جاتی ہے تو ان کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے اور پیچ وتاب کھانے لگتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایک شخص کا ذکر ہے جو نہایت فسادی تھا چوپایوں اور فصلوں کو تباہ وبرباد کرتا تھا اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾

[البقرة: ٢٠٦]

''اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرو (یہ گناہ کے کام مت کرو) تو اپنے وقار اور عزت کا خیال اسے اور بھی گناہ پر جما دیتا ہے ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔''

یعنی اس قسم کے آدمی اپنے ذہن پر اس قسم کا تصور جما لیتے ہیں کہ ان کو صحیح بات کہنے کا کسی کو حق نہیں، خود کو اس مقام پر فائز سمجھتے ہیں جہاں کوئی دوسرا ان کی برابری نہیں کر سکتا لہٰذا کوئی بھی ان کو حق نہیں کہہ سکتا۔

بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پہلے یہ خوبی بیان فرمائی کہ ہم نے اس کے دل میں اپنی طرف سے رحمت اور شفقت ڈالی اور اس کے برخلاف جو زبردستی سرکشی اور سختی اور زیادتی کی صفت ہے، اس کی اس سے نفی کی یعنی وہ نبی علیہ السلام بے رحم سرکش اور ظالم اور حق کی بات کو قبول کرنے سے تکبر کرنے والا ہرگز نہ تھا اور آخر میں اس کی یہ خوبی بیان کی کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اور اپنے والدین کا نافرمان بھی نہ تھا۔ والدین کی نافرمانی کے متعلق پہلے کچھ عرض کر آئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام تو دوسروں کو ہر وقت یہی تلقین کرتے رہتے تھے کہ اپنے والدین کو ہر وقت راضی اور خوش رکھو اور ان کے فرماں بردار ہو کر رہو۔ بشرطیکہ ان کی فرمانبرداری میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی نہ ہو یعنی اللہ کے حکم کے برخلاف نہ ہو اور انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ مبارک رہا ہے کہ جس بات کی وہ دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اس بات پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے ہیں اور اس نصیحت کا وہ مثالی نمونہ ہوتے ہیں۔ باقی رہی بات اللہ سبحانہ

وتعالیٰ کی نافرمانی کی تو انسان بیشک خطا کا پتلا ہے، بلا شبہ اس گناہ اور خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر ایک مؤمن کی یہ شان نہیں کہ وہ گناہ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی پر اصرار (ہمیشگی) کرے اور اس پر کمر بستہ ہو جائے بلکہ جب بھی بموجب تقاضا ہے بشریت اس سے کوئی قصور سرزد ہوتا ہے تو فوراً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں تائب ہو کر صدق دل سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتا ہے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں متقین کی چند صفات بیان کر کے فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ۳۵]

''اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو فوراً انہیں اللہ یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔''

یہ تو عام مؤمنین کی حالت بیان ہوئی مگر انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں گناہ اسے کہا جاتا ہے کہ ہر وہ کام یا بات جس کے گناہ ہونے کا علم ہو پھر بھی جان بوجھ کر وہ کام کیا جائے لیکن اگر کسی آدمی نے بے علمی یا غلطی یا بھول اور نسیان کی وجہ سے ایسا کام کیا جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنے تو اسے خطا یا ذلت کہا جاتا ہے نہ کہ گناہ اور انبیاء علیہم السلام پہلی صورت سے بالکلیہ معصوم ہوتے ہیں باقی دوسری صورت (یعنی خطا اور ذلت) کا صدور کبھی کبھی ان پاک ہستیوں سے بھی ہو جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نافرمانی پر انسان اگر اصرار اور ہمیشگی کرتا ہے تو اس غلطی کا نتیجہ نہایت خطرناک ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جامع ترمذی میں مروی ہے جس کے بارے میں خود امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے پس جب وہ اس سے تائب ہو جاتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ ختم ہو جاتا ہے اور دل صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر اپنے گناہ پر تائب نہیں ہوتا اور ایک کے بعد دوسرا گناہ کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے تو آگے چل کر وہ اس منزل پر پہنچتا ہے کہ اس کا پورا دل کالا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے توفیق اور رہنمائی حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی ہے وہ ران یعنی زنگ جس کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [المطففين: ١٤]

''ہرگز نہیں، بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔''

درحقیقت ایک خدا ترس ایمان والے کو یہ بات لائق ہے کہ وہ گناہ کے متعلق یہ نہ سوچے کہ یہ گناہ چھوٹا ہے یا بڑا بلکہ یہ سوچے کہ یہ نافرمانی کس ہستی کی ہے، اگر اس نہج پر سوچے گا تو ہر وقت ہر بے فرمانی سے خود کو بچانے کی کوشش کرے گا کیونکہ جو ہستی جس قدر بھی ارفع واعلیٰ شان والی ہوگی اس کی نافرمانی کرنی بھی اس قدر بڑی بات ہوگی اگرچہ وہ بات چھوٹی ہی کیوں نہ نظر آئے ظاہر ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے بڑھ کر ارفع واعلیٰ اور کوئی ہستی نہیں، اس لیے اس کی ہر قسم کی نافرمانی سے ہر سچے مؤمن کو پرہیز کرنا چاہیے ویسے بھی مثل مشہور ہے کہ قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے اس لیے اگر گناہ صغیرہ پر اصرار کیا جائے تو وہ بھی کبیرہ کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے انسان کو کبھی بھی بے پرواہ اور غافل نہ ہونا چاہیے اگر وہ اپنی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کو کوئی اہمیت نہ دے گا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ پناہ میں رکھے ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ اس کو تو تائب ہونے کی بھی توفیق نہ ملے اور ان کی تلافی اور تدارک کا موقع ہی نہ ملے، اللہ اپنے ایسے بندوں سے محبت رکھتا ہے جو اپنی کوتاہیوں کی بار بار معافی مانگتے رہتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے رہتے ہیں اور خود کو پاک رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

بہرحال سعادت مند انسان کی یہی علامت ہے کہ وہ ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہے اور اگر کوئی قصور وغیرہ نظر آئے تو فوراً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع ہو کر اس سے مغفرت طلب کرے۔

(( اللهم وفقنا لما تحب وترضىٰ ))

﴿ وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ﴾ [مریم: ١٥]

سلام کے معانی ہیں امان یا سلامتی۔ ہر اس بات سے جو انسان کو ناپسند ہو یا اس کے لیے باعث تکلیف ہو۔

اور سلام اس پر ہو جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ وفات پائے اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

سلام کو نکرہ کر کے لایا گیا ہے اور اس مقام پر نکرہ کر کے لانا غالباً اس میں تقلیل کے معانی پیدا کرنا مقصود ہے، چونکہ یہ سلامتی اور امن وامان کی خوش خبری اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود بیان فرما رہا ہے، اس لیے اس کی طرف سے تھوڑی مہربانی بھی انسان کے دونوں جہانوں کی بھلائی اور فلاح کے لیے کافی ہو سکتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة: ٧٢]

اس کے متعلق مفسرین رحمہم اللہ اور علم البلاغۃ کے ماہرین بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ''رضوان'' میں تنکیر تقلیل کے لیے ہے، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تھوڑی رضا بھی بہت بڑی بات ہے، اس لیے ہم انسانوں میں جب کسی عالی مرتبہ ومقام والی ہستی کو مہربانی کرنے کی اپیل کی جاتی ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ آپ کی ایک نظر کرم بھی ہماری ہر تکلیف کی نجات کے لیے کافی ہے۔

درحقیقت اس کو نکرہ کر کے لانے میں یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ یہ چیز یا یہ امر (یعنی جس کو نکرہ کر کے لایا گیا ہے) اس کو تعریف اور تحدید کی قیود میں نہیں لایا جا سکتا اس مقام پر بھی یہی مطلب ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر سلامتی کسی خاص قسم یا نوع کی نہیں یا کسی خاص چیز مکروہ سے امان نہیں بلکہ ہر قسم کی۔ [1]

مکروہات سے ہر قسم کی سلامتی اسے مرحمت فرمائی گئی۔اس مقام پر ''سلام'' کو نکرہ کر کے لانے کے بارے میں پوری تحقیق تب ہو گی جب اس جملہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آگے آنے والے بعینہ اس طرح کے جملے سے موازنہ کیا جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ''سلام'' وارد ہوا ہے، یعنی معرفہ کر کے لایا گیا ہے، اس لیے کہ وہاں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود ہی اپنے اور پر دعائیہ کلمات کہہ رہے ہیں۔اس وجہ سے اس پر الف ولام داخل کر کے اس میں استغراق اور شمول کا معنی پیدا کیا گیا ہے اور اس مقام پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کہہ رہے ہیں اور اس کی تھوڑی مہربانی بھی انسان کے وہم اور گمان اور تصور سے بہت کشادہ ہے، اس لیے اس میں استغراق یا شمول کے معنی پیدا کرنے لیے حرف تعریف یعنی الف ولام داخل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔اس آیت کریمہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے تین اوقات پر سلامتی کا پیغام آیا ہے ایک پیدا ہونے کے وقت دوسرا وفات پانے کے وقت اور تیسرا جب وہ قیامت کے روز زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اس وقت پیدا ہوتا ہے وہ وقت اس کے لیے اول وقت ہے جس میں وہ دنیا کے سامنے آتا ہے اور بچہ پیدا ہوتے ہیں ہی شیطان اس پر اپنا اثر چلانے کے لیے کوشاں ہے، جیسا کہ حدیث مبارک میں وارد ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے پنی انگلی سے چوک لگاتا ہے اور اس وجہ سے وہ بچہ چیختا ہے۔(صحیح البخاری ومسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اس وقت حضرت یحییٰ علیہ السلام کو امن وسلامتی حاصل تھی اور شیطان اس پر اپنا اثر نہ چلا سکا۔یہی سبب ہے کہ بچپن میں ہی آپ کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی گئی دوسرا وقت جب انسان دنیا کو چھوڑتا ہے وہ وقت بھی نہایت ہولناک ہے کیونکہ اس وقت انسان کی زندگی کی کتاب بند ہونے والی ہے اور وہ ایک دوسرے عالم میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے جو آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے اور اس کے سامنے وہی کچھ نتیجہ آئے گا جو اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] میرے خیال میں یہ معنی زیادہ موزوں ہے یعنی جو انسان کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ابن محب اللہ الراشدی عفا اللہ عنہما۔

(( مارأيت منظراقط الا و القبر أفظع )) [رواه الترمذی و ابن ماجه عن عثمان بن عفان رضی الله عنه]

یعنی آپ ﷺ نے فرمایا: جو بھی منظر میں نے دیکھے ہیں ان سب میں قبر کا منظر زیادہ خوفناک ہے اور اس وقت انسان کی حالت کیا ہوگی اس کا اس دنیا میں تصور ہی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سب صالح بندے حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس موقع کا سخت خوف رکھتے تھے، دو تین واقعات ذکر کیے جاتے ہیں۔

① حضرت عثمان بن عفان خلیفۃ المسلمین رضی اللہ عنہ جب قبر کے پاس بیٹھتے تھے تو تب اتنا روتے تھے کہ آپ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی اور جب آپ سے اس کا سبب پوچھا گیا کہ آپ قبر پر اتنا کیوں روتے ہو؟ تو فرمایا میں نے آپ ﷺ سے سنا تھا آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے اور جس نے یہاں نجات پا لی تو آگے بھی اس سے آسانی ہوگی اور جو یہاں ہی پھنس گیا اور اس کی نجات نہیں ہوئی تو آگے اور بھی مشکلات کا سامنا ہے تو کچھ خبر نہیں کہ میرا اس پہلی منزل میں کیا حال ہوگا۔

حالانکہ آپ ان دس صحابہ میں سے ہیں جن کو دنیا میں ہی بارگاہ رسالت میں سے جنت کی خوش خبری ملی ہوئی تھی۔ [رواہ الترمذی وابن ماجہ عن عثمان رضی اللہ عنہ]

② مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خنجر مارا گیا اور وہ درد کا اظہار کر رہے تھے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کو فرمایا: (اس لیے کہ وہ آپ کی پریشانی دور کرنا چاہتا تھا): اے امیر المؤمنین ایسی کوئی بات نہیں بیشک آپ نے حضرت رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل کی پھر آپ کی صحبت کا اچھا حق ادا کیا اور پھر آپ ﷺ ہم سے جدا ہوئے، اس حال میں کہ وہ آپ سے راضی تھے اس کے بعد آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے صحبت حاصل کی اور اچھی صحبت کی اور پھر جب وہ آپ سے جدا ہوئے تو وہ بھی آپ سے راضی تھے، اس کے بعد آپ نے مسلمانوں سے صحبت کی اور ان کی صحبت کا آپ نے اچھا حق ادا کیا اور جب آپ ان سے جدا ہو رہے ہیں اس حال میں کہ وہ بھی آپ سے راضی ہوں گے۔ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جو آپ نے آپ ﷺ کی صحبت اور آپ کا مجھ سے راضی ہونے کا ذکر کیا ہے یہ مجھ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا احسان ہے جو اس نے مجھ پر کیا اور جو آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اس کی صحبت اور اس کے راضی ہونے کا ذکر کیا ہے یہ بھی مجھ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان ہے جو اس نے مجھ پر کیے ہیں باقی یہ جو تم میری پریشانی دیکھ رہے ہو وہ تمہارے اور تمہارے اصحاب کی وجہ سے ہے (یعنی میں نے آپ کا اور آپ کے اصحاب کا حق ادا کیا یا نہیں؟) اور آپ کی خیر خواہی جو مجھ پر لازم تھی وہ بھی میں نے کما حقہ ادا کی یا نہیں؟ اس کے بعد آپ نے فرمایا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ

کی قسم اگر پوری زمین جتنا بھرا ہوا سونا میرے قبضہ میں ہوتا تو میں وہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب کو دیکھنے سے پہلے اس سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دیتا۔ [مشکوٰۃ بحوالہ بخاری]

سوچنے کی بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اولاً تو ان دس اصحاب میں سے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی، ثانیاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے جا رہے ہیں تب بھی آپ سے راضی ہیں ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ کو کتنا خوف دامن گیر ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب سے نجات پانے کے لیے یہ آرزو کر رہے ہیں کہ ساری زمین جتنا بھرا ہوا سونا میرے پاس ہوتا تو وہ بھی اس کے عذاب سے بچنے کی خاطر فدیہ میں دے دیتا۔ دراصل یہ وہ ہستیاں تھیں جن کو اس ہولناک منظر کا صحیح اندازہ تھا اور بالآخر فتحیاب بھی وہی لوگ ہوں گے جو اتنی بزرگی کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے رہے۔

③ ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب بیمار ہوئیں تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کے پاس آنے کی اجازت چاہی تو بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب گھر کے لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ اس کو آنے کی اجازت دیں کیونکہ وہ آپ کے نیک اولاد میں سے ہے تو بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ مجھے چھوڑ دیں کیونکہ وہ آ کر میری پاکی بیان کریں گے بالآخر بے حد اصرار پر آپ نے اسے آنے کی اجازت دے دی جب وہ آپ کے پاس داخل ہوئے تو فرمایا کہ آپ کو ام المؤمنین کا لقب ملا اس لیے کہ آپ نیک بخت ہوں اور تمہارے پیدا ہونے سے پہلے یہ نام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں تھا اور بیشک آپ نبی علیہ السلام کی ازواج مطہرات میں آپ کو سب سے زیادہ پیاری تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاک چیز کے علاوہ کسی سے پیار نہ کرتے تھے اور نہیں ہے تیرے اور تیرے پیاروں کے بیچ کوئی چیز مگر یہ کہ جدا ہو تیری روح تیرے جسم سے اور بیشک تیرے گلے کا ہار ابواء کے مقام پر گر گیا تھا اور پھر اس واقعہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بھلائی رکھی۔ تیمم کی آیت نازل ہوئی اور تمہارے بارے میں سورۂ نور کی آیات نازل ہوئیں اور پھر نہیں ہے کوئی مسجد مسلمانوں کی مساجد میں سے مگر اس میں پڑھی جاتی ہیں یہ آیات مبارکہ رات اور دن دونوں اوقات میں اس پر بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میرے تزکیہ کی بات کو چھوڑ دے اے ابن عباس! مجھے تو اس وقت یہ بات پسند ہے کہ کاش میں ایسی حقیر چیز ہوتی جو بہت پہلے ختم ہو چکی ہوتی اور بھولائی گئی ہوتی۔ [رواہ الحاکم فی المستدرک ج ٤۔ وقال اسنادہ صحیح ووافقہ الذھبی]

حاصل کلام ان واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد جو منظر انسان کے سامنے آتا ہے وہ کس قدر ہولناک ہے، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ

اسے اس منظر کی شدت اور ہولنا کی سے بھی امن وسلامتی حاصل ہے۔

تیسرا مشکل ترین وہ مرحلہ ہے جب تمام انسان قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جس روز اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کا سارا نقشہ واضح ہو جائے گا اور اس کے اچھے برے اعمال سب اس کے سامنے آجائیں گے ہر انسان کو صرف اپنی ذات کی فکر ہوگی کہ معلوم نہیں مجھ سے کیا معاملہ ہوگا جنت اور دوزخ سامنے لائے جائیں گے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ۸،۷]

''ہر اچھا کام اور برا کام اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اگرچہ ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ○ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴾ [الحج ۲،۱]

''اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے جس روز تم اسے دیکھو گے، حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی اور ہر حاملہ اپنے حمل کو گرا دے گی اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔''

اس آخری اور کٹھن مرحلہ کی ہولنا کیوں سے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو سلامتی کی خوش خبری دی۔ سلام کے اصل معانی ہیں ہر ناپسندیدہ اور مکروہ اور دکھ دینے والی چیز سے امن سلامتی۔ کسی کو السلام علیکم کہا جاتا ہے تو اس سے دعا مقصود ہوتی ہے کہ تو، تیرا اہل و عیال، دوست احباب عزیز و رشتہ دار اور خاندان والے ہر آفت و مصیبت اور ہر دکھ بھری چیز دنیاوی اور اخروی عذاب سے محفوظ و مأمون رہیں ا س لیے اگرچہ سلام تو ایک پر کیا جاتا ہے لیکن وہاں بھی صیغہ جمع کا استعمال کیا جاتا ہے، پہلے مرحلہ میں ہی سلام کہنے والا اپنے مخاطب کو یہ تأثر دینا چاہتا ہے کہ میں تمھارا خیر خواہ اور تمہاری بہتری اور بہبودی کا خواہاں ہوں تمھارے اور تمارے متعلقین کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوں اس سے مخاطب کو یہ یقین ہو جائے گا کہ میرے سامنے میرا بدخواہ اور دشمن نہیں بلکہ دوست اور خیر خواہ ہے اسلام کے اندر سلام کو خاص طرح مشروع کیا گیا ہے اور اس کو پھیلانے کا خاص طرح امر کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم ان جگہ پر پہلے چند آیات قرآن کریم کی اور کچھ احادیث سلام کی فضیلت کے متعلق تحریر کریں گے اس کے بعد سلام کے متعلق چند مسائل پیش کیے جائیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

① ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النور: ۲۷]

''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں سے اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔''

② ﴿ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ﴾ [النور: ٦١]

''پھر جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے آپ پر اور اہل عیال پر سلام کیا کرو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف پاکیزہ اور بابرکت تحفہ ہے۔''

③ ﴿ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ﴾ [النساء: ٨٦]

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو۔

④ ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ ﴾ [الذاريات: ٢٤،٢٥]

''اے نبی ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے اس نے کہا آپ لوگوں کو بھی سلام ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سلام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کا بھی ہمیشہ شیوہ رہا ہے۔

**حدیث نمبر ا:**

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے ایک شخص نے سوال کیا کون سا اسلام سب سے زیادہ اچھا ہے، آپ نے فرمایا: لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور ہر اس شخص پر سلام کہو جس کو تم جانتے ہو یا نہیں جانتے۔ [بخاری ومسلم]

**حدیث نمبر ۲:**

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو اسے فرمایا کہ جاؤ اور ملائکہ کی جماعت پر سلام کہو، پھر سنو کونسا جواب دیتے ہیں اور وہ جو بھی جواب دیں وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے، اس کے بعد حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے ان پر السلام علیکم کہا تو انہوں نے جواب میں کہا: السلام علیك و رحمة الله۔ انہوں نے ورحمۃ اللہ کے الفاظ زیادہ کہے۔ [بخاری و مسلم]

## حدیث نمبر۳:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیں سات باتوں کا امر فرمایا: بیمار پرسی کرنا جنازہ کے پیچھے چلنا [1] اور جو چھینک دے کر الحمد للہ کہے اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا، جس بات پر قسم اٹھائے اس کو پورا کرنا مظلوم کی مدد کرنا کوئی دعوت دے مثلا ولیمہ وغیرہ تو اس کو قبول کرنا اور سلام کو پھیلانا۔

## حدیث نمبر۴:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ جب تک ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں داخل نہ ہو گے اور تب تک تم مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں جو تم کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے (وہ ہے) سلام کو پھیلاؤ یعنی ایک دوسرے پر سلام بہت کرو۔ [رواہ مسلم]

## حدیث نمبر۵:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے سنا، فرما رہے تھے اے انسانو! سلام کو پھیلاؤ اور لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور آپس میں صلہ رحمی کرو اور جب لوگ سو رہے ہوں تو تم اٹھ کر نماز پڑھو تو جنت میں داخل ہو گے سلامتی سے۔

# سلام کرنے کی کیفیت اور اس کے مسائل

یہ بات مستحب ہے کہ شروع میں جو سلام کرے وہ کہے: السلام علیکم ورحمة الله وبركاته، اگرچہ جس پر سلام کیا جا رہا ہے وہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی صیغہ جمع کا استعمال کرنا چاہیے یعنی علیکم۔ اور جواب دینے والا اس طرح کہے: وعلیکم السلام ورحمة الله وبركاته۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت میں آیا اور کہا السلام علیکم آپ ﷺ نے اس کو سلام کا جواب دیا پھر وہ شخص بیٹھ گیا اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: دس نیکیاں ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ اس کو بھی آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا پھر وہ بھی بیٹھ گیا اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا بیس نیکیاں ہیں، اس کے بعد تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ ﷺ نے اس کو بھی سلام کا جواب دیا اور پھر وہ بھی بیٹھ گیا اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں ہیں۔ [رواہ ابوداؤد رواہ الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح]

---

[1] یعنی جنازہ میں شریک ہونا۔ ابن محب اللہ الراشدی عفا اللہ عنہما۔

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی روایت وارد ہے لیکن اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: اس کے بعد چوتھا شخص آیا اور اس نے آکر کہا السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ومغفرته اس کو بھی آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا اس کے لیے چالیس نیکیاں ہیں اور فرمایا اسی طرح ہوا کرتی ہیں نیکیاں اور اعمال کی فضیلتیں۔ [رواہ ابو داؤد] [1]

❀❀❀❀

[1] جس روایت میں ومغفرتہ کے الفاظ ہیں اس کے متعلق منذری فرماتے ہیں: فی اسناده ابو مرحوم عبدالرحمن بن میمون وسهل بن معاذ لا یحتج بها اس لیے میرے خیال میں صرف وبرکاتہ تک کہنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ابن محب الله الراشدی عفا الله عنهما۔

# سلام کے آداب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو سواری پر ہو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کہے اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ پر سلام کریں۔[بخاری ومسلم]

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ چھوٹا بڑے پر سلام کرے اگر بار بار ملاقات ہو تب بھی مستحب یہی ہے کہ ہر دفعہ سلام کہے جیسا کہ کوئی شخص نکل جائے، پھر داخل ہو پھر نکل جائے، پھر داخل ہو تو ہر دفعہ سلام کرے یا اگر دو شخص ساتھ جا رہے ہوں اور درمیان میں کوئی درخت یا دیوار حائل ہو جائے اس کے بعد جب دوبارہ ملیں تو ایک دوسرے پر سلام کہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اس کے بعد آپ ﷺ کے پاس آیا اور آکر سلام کہا آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا جا اور جا کر نماز پڑھ۔ تم نے نماز نہیں پڑھی، پھر اس نے واپس جا کر دوبارہ نماز پڑھی اور پھر واپس آکر سلام کیا اس طرح اس نے تین مرتبہ کیا۔[رواہ البخاری ومسلم]

ایک دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب آپ میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو اس پر سلام کہے اس کے بعد اگر ان دونوں کے درمیان کوئی پتھر یا درخت یا دیوار حائل ہو جائے اور اس کے بعد پھر ملیں تو پھر سلام کرے۔[رواہ ابوداؤد وقال الالبانی سندہ صحیح]

اگر اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کہنا مستحب ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً ﴾

[النور: ٦١]

ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ سبحانہ وتعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: اے بیٹے! جب تم اپنے اہل پر داخل ہو تو سلام کہو، یہ سلام تم پر اور تمھارے اہل پر باعث برکت ہوگا۔

[رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح]

## بچوں پر سلام:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کا چھوٹے بچوں پر گزر ہوا تو ان پر سلام کیا اور فرمایا کہ آپ ﷺ ہوتے تھے تو وہ بھی اس طرح کرتے تھے۔ [رواہ البخاری و مسلم]

مرد کا اپنی بیوی پر سلام اور اپنی محرمات عورتوں پر سلام اور اجنبی عورتوں پر سلام بشرطیکہ فساد کا خوف نہ ہو۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں ایک بوڑھی عورت ہوتی تھی جو پالک کی جڑوں کا ساگ بناتی تھی اور اس کو دیگچی میں ڈالتی تھی اور کچھ دانے جو کے پیستی تھی، پھر جب ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر آتے تھے تو اس پر سلام کہتے تھے، پھر وہ عورت کھانا اٹھا کر ہمارے سامنے رکھتی تھی۔ [رواہ البخاری]

بی بی اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''نبی علیہ السلام ہمارے پاس سے گزرے تو ہم پر سلام کیا۔''

[رواہ ابوداوٗد]

اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مسجد میں سے گزرے تو ایک عورتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی تو آپ نے اپنے ہاتھ مبارک سے ان پر سلام کیا۔ وقال الترمذی ھذا حدیث حسن۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ بوقتِ ضرورت ہاتھ سے سلام کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جس پر سلام کیا جائے وہ تھوڑا دور ہے اور زبان سے سلام نہیں سن سکتا تو ہاتھ کے اشارے سے سلام کرے۔ اس کے متعلق بھی ایک حدیث وارد ہے جو معجم کبیر للطبرانی جز اول میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قباء کی طرف نکلے پس انصار آئے اور آپ پر سلام کہہ رہے تھے۔ پھر میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا سلام کا جواب کس طرح دے رہے تھے؟ اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس طرح ہاتھ مبارک کے اشارے سے۔ اس مقام پر چونکہ انصار زیادہ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے تھے لہٰذا ہر ایک کو زبان سے جواب دینا قدرے مشکل تھا اس لیے ہاتھ کے اشارے پر اکتفاء کیا گیا۔ ❶

بہرحال بغیر کسی معقول عذر کے سلام میں ہاتھ کا اٹھانا صحیح نہیں۔ البتہ کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی دوسرا آ کر اس پر سلام کرے تو اس صورت میں سلام کو جواب دینا چار صورتوں میں وارد ہے:

① شہادت کی انگلی سے جیسا کہ ابوداوٗد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور صہیب سے مروی ہے۔

② کبھی ہاتھ کی تلی سے جیسا کہ ابوداوٗد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

③ کبھی پورے ہاتھ سے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

④ کبھی سر کے اشارے سے جیسا کہ السنن الکبریٰ للبیہقی میں وارد ہے۔

اگر کوئی آدمی کسی دوسرے شخص کی طرف سے آ کر سلام پہنچائے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تم پر سلام بھیجا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ یہ جبریل علیہ السلام کھڑے ہیں اور تم پر سلام کہہ رہا ہے۔ بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ۔ [متفق علیہ] اور صحیحین کی بعض روایات میں

---

❶ یہ روایت طبرانی ص ٣٢٤ ج ١ پر اس طرح ہے: حدثنا ابراھیم بن دحیم الدمشقی ثنا ابن ابی فدیك۔

وبرکاتہ کے الفاظ بھی زیادہ آئے ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے سلام دے تو قبول کرنا چاہیے اور اس کا جواب بھی دینا چاہیے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ ہم آپ ﷺ کے لیے دودھ کا حصہ الگ کر کے رکھ دیتے تھے۔ پس جب آپ ﷺ رات کو آتے تھے تو سلام کرتے تھے اور سلام بھی اس طرح کرتے تھے کہ جو جاگ رہا ہو وہ سن لے اور جو نیند میں ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ پڑے یعنی وہ نیند سے بیدار نہ ہو۔ [رواہ مسلم کتاب الاشربۃ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ایسی جگہ پر جانا ہو جہاں کچھ لوگ سو رہے ہیں تو اس طرح سلام کرنا چاہیے کہ سوئے ہوئے لوگوں کو نیند میں خلل واقع نہ ہو۔

غیر مسلم اور کافر پر خود ہی سلام کی شروعات کرنا منع ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں ایک روایت ہے کہ تحقیق آپ ﷺ نے فرمایا: یہود اور نصاریٰ پر سلام کی شروعات مت کرو لیکن اگر وہ خود ہی سلام کریں تو اس کے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب اہل کتاب کے لوگ آپ پر سلام کہیں تو آپ صرف وعلیکم (یعنی اور آپ پر) کہو۔ [رواہ البخاری و مسلم]

اگر کسی ایسی مجلس میں آنا ہو جہاں مسلم اور کافر دونوں طرح کے لوگ موجود ہوں تو ان پر سلام کہا جا سکتا ہے۔ اس نیت سے کہ یہ سلام مسلمانوں پر ہے جیسا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی ﷺ کا ایک مجلس پر گزرنا ہوا جس میں مسلمان اور مشرک بتوں کے پجاری اور یہودی وغیرہ سب موجود تھے۔ پھر آپ ﷺ نے ان پر سلام کیا۔ [متفق علیہ]

جب کوئی مجلس سے اٹھ کر جانا چاہے تب بھی سلام کر کے جانا مستحب ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب کوئی تم میں سے کسی مجلس میں آئے تو اس کو سلام کرنا چاہیے۔ پھر جب اٹھنے کا ارادہ کرے تو بھی سلام کرے کیونکہ پہلا سلام پچھلے سلام سے زیادہ حق دار نہیں، یعنی دونوں ہی حق اور سنت ہیں۔

[رواہ ابو داوٗد و الترمذی وقال الترمذی حدیث حسن]

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک (یعنی اس کی رحمت کے قریب) تم میں سے بہتر وہ ہے جو ان پر سلام سے شروعات کرے۔ [رواہ ابو داوٗد] [1]

اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں ہے کہ: آپ ﷺ سے کہا گیا کہ یا رسول اللہ اگر دو آدمی آپس میں ملیں تو ان میں سے سلام کی شروعات کون کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

---

[1] ایک دوسرا اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ دو ملنے والوں میں سے جو سب سے پہلے سلام کرے جیسا طیبی نے فرمایا ہے۔ ابن محب اللہ الراشدی عفی اللہ عنھما۔

دونوں میں سے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے زیادہ قریب ہو وہ سلام کرے (یعنی سلام کی شروعات کرنا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قرب کی علامت ہے)۔ [رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن]

ابو جری الجہیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آکر کہا علیک السلام یا رسول اللہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیک السلام مت کہو کیونکہ علیک السلام مردوں (وفات کیے ہوئے) کا سلام ہے۔ یعنی السلام پہلے کہو علیکم بعد میں کہو۔ [رواه ابو داود و الترمذی وقال الترمذی حديث حسن صحيح]

اگر بہت سے لوگ (یعنی جماعت) اکٹھے گزر رہے ہوں تو ان میں سے کسی ایک نے بھی سلام کہا تو وہ بھی کافی ہے۔ اس طرح ان میں سے اگر کسی ایک نے بھی جواب دیا تو سب کی طرف سے ادا ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ [ رواه ابو داود و البيهقی فی شعب الايمان وقال الالبانی حديث حسن ]

حضرت کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے صفوان بن امیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دودھ اور کھیرا جو ایک قسم کا پھل ❶ (ہدیۃ) دے کر بھیجا، جب میں داخل ہوا تو میں نے سلام نہیں کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واپس جاؤ پہلے السلام علیک کہو۔

قبرستان میں جانا ہو تو: (( اَلسَّلَامُ عَلَيكُم دَارَ قَومٍ مُؤمِنِينَ وَاِنَّا اِنشَاءَ اللّٰهُ بِكُم لَاحِقُونَ )) کہنا چاہیے۔ [رواه مسلم]

جو کچھ ہم ذکر کر آئے ہیں اس سے پڑھنے والوں کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے جو ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کا طور طریقہ سکھایا ہے وہ ایک بہترین اور مثالی طریقہ ہے۔ السلام علیکم کہنے والا اپنے مخاطب کو ان دو الفاظ میں یہ پیغام دیتا ہے کہ میں تمھاری اور تمھارے سب متعلقین کی بھلائی کو خواہاں ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ تم اپنے سب متعلقین کے ساتھ ہر مصیبت اور تکلیف اور نقصان اور بیماریوں دنیوی خواہ اخروی عذاب سے سلامت رہو اور پھر سلام کا جواب دینے والا بھی اپنے جواب سے اس طرح اسی جذبہ سے خیر خواہ ہونے اور دعا گو ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ مختلف اقوام میں ہر قوم کے سلام کرنے کا اپنا طریقہ ہے مگر کسی کے بھی سلام کرنے کے طریقے میں نہ وہ جامعیت ہے نہ اس خیر خواہی کے جذبہ کا کائی نام ونشان موجود ہے اور نہ ہی ان کے سلام کرنے میں مخاطب کے لیے کوئی دعا ہے جو اسلامی طریقہ سلام میں ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم اسلام کے کچھ طریقے پیش کر کے یہ واضح کریں گے کہ اسلام کے بتائے ہوئے سلام کا پروگرام بہرحال برتر و اعلیٰ ہے مگر افسوس کہ آج ہم مسلمانوں نے بھی اسلام کے بتائے ہوئے سلام کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر ایسے طریقے اور ایسے الفاظ اختیار کیے ہیں جن میں سے کوئی بھی نہ صحیح مطلب نکلتا ہے اور نہ ہی کوئی معنیٰ و مفہوم

---

❶ اس کو سندھی زبان میں چبھڑ کہا جاتا ہے۔ منجد عربی اردو میں اس نے کوئی نام نہیں لکھا صرف ایک قسم کی گھاس کہا ہے۔ ابن محب اللہ الراشدی عفی اللہ عنھما۔

نکلتا ہے۔ انگریز کے دور میں اس کو دیکھ کر ہم میں سے کتنے ہی مسلمان آج بھی وہی رسم و رواج اختیار کیے ہوئے ہیں یعنی صرف ہاتھ کا اشارہ ہی کافی جانتے ہیں۔ اس طرح عوام میں یہ بھی طریقہ مروج ہو گیا ہے۔ جب کسی بڑے آدمی پر یا کسی بڑی شخصیت کو سلام کرتے ہیں تو یا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کا اظہار کرتے ہیں یا سر کو جھکا کر سلام بجا لاتے ہیں۔ حالانکہ اس طریقہ میں سے کوئی خاص مفہوم تو بالکل نہیں نکلتا بلکہ جس کو اس طرح سے سلام کیا جائے وہ تکبر اور غرور میں بھر جاتا ہے اور جواب میں صرف سر یا ہاتھ ہلکے سے ہلاتا ہے لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس نے کیا کہا اور اس نے کیا جواب دیا اور کچھ لوگ سلام کی جگہ بسم اللہ بسم اللہ کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔ بسم اللہ اگرچہ بابرکت کلمہ ہے لیکن اس جگہ اور اس موقع سے اس کی کوئی بھی مطابقت نظر نہیں آتی۔ کچھ لوگ شیعہ حضرات سے متاثر ہو کر یا علی مدد کہتے رہتے ہیں اور اس کے جواب میں پیر مولیٰ علی مدد کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ شرکیہ ہونے کے ساتھ اس محل و موقع سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے دوسرے بھی کئی اقسام سلام کرنے کے رواج پذیر ہیں لیکن جو طریقہ سلام کا اسلام نے ہمیں سکھایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں، اس کے مقابل جو دوسرے طریقے ایجاد کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز اس کی جگہ نہیں لے سکتے اور آج کل ہم مسلمانوں نے جو صحیح طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے سلام کا اصل مقصد تو کچھ بھی حاصل نہیں لیکن سلام کی برکات سے بھی انسان محروم رہ گیا ہے۔

### چند دوسری اقوام کے سلام:

انگریز قوم میں اکثر ہاتھ سے اشارہ کیا جاتا ہے مگر کچھ مخصوص اوقات کے لیے بھی ان کے پاس چند الفاظ مروج ہیں۔ مثلاً رات کے وقت گڈ نائٹ (Good Night) یعنی اچھی رات اور صبح کے وقت گڈ مارننگ (Good Morning) یعنی اچھی صبح اور دوپہر کے وقت گڈ ڈے (Good Day) یعنی اچھا دن، پڑھنے والے مہربان الفاظ کے معانی اور اسلام کے بتائے ہوئے سلام کے معانی جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کے درمیان موازنہ کریں گے تو ان کو زمین اور آسمان کا تفاوت نظر آئے گا۔ اسلام کے بتائے ہوئے سلام میں جو مخاطب کو دعا کی جاتی ہے اس میں سے سلام کرنے والے کے جس جذبہ اور محبت اور خیر خواہی و بہبودی کا اظہار ہوتا ہے وہ ان اقوام کے مروجہ الفاظ میں بالکل مفقود ہے۔

چین اور جاپان میں بھی کچھ سلام کے طور طریقے رائج ہیں جن میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ جو آ کر سلام کرتا ہے وہ اپنی تھوڑی زبان باہر نکالتا ہے اور جواب دینے والا اپنی پوری زبان باہر نکالتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جو آ کر سلام کرتا ہے وہ اپنے بوٹ یا جوتی سے زمین پر زور سے ٹھپکا کرتا ہے جس طرح فوجی سلوٹ کرتے ہیں لیکن ہاتھ نہیں اٹھاتا صرف پاؤں ہی زمین پر مارتا ہے اور جواب دینے والا اپنا بوٹ یا جوتی ہاتھ میں اٹھا کر اس کو دکھاتا ہے۔ اب پڑھنے والے غور کریں کہ ان طریقوں میں سے آخر کا معنیٰ نکلتا ہے؟

اس میں سے کوئی بھی مفہوم نہیں نکلتا، لہٰذا بہتر اور احسان یہی ہے کہ اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کا احیاء کیا جائے اور حضرت نبی اکرم ﷺ کی سنت مطہرہ کو عام جام پھیلا کر اس میں سے وہ خیرات اور برکات حاصل کی جائیں جو درحقیقت اس میں پوشیدہ ہیں۔

اب اس سے آگے حضرت مریم علیہاالسلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کا بیان شروع ہو رہا ہے اور اس کا حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصہ سے اس طرح تعلق ہے کہ پہلے قصہ میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید اور کمال وقدرت کا بیان تھا اور اس میں بھی اس کی توحید اور قدرت کاملہ کا بیان ہو رہا ہے جس طرح اس قصہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو قبول فرما کر اسے انتہائی پیرانہ سالی کی حالت میں فرزند عطا کیا گیا تو اس قصہ میں بھی حضرت مریم علیہاالسلام کی والدہ کی دعا کو قبول کرتے ہوئے مریم علیہاالسلام کو اپنی طرف سے اسے اور اس کی اولاد کو شیطان سے بالکلیہ محفوظ رکھا جیسا کہ اس کا بیان تفسیر میں آگے آرہا ہے اور اس قصہ میں شرک کی بھی علیٰ اتم الوجوہ تردید کی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو باتیں یہود ونصاریٰ کے درمیان افراط وتفریط کی صورت میں رواج پذیر تھیں ان کا بھی پوری طرح قلع قمع کیا گیا، اس قصہ کی پہلی آیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت مریم علیہاالسلام بیت المقدس کی ہیکل اور عبادت گاہ میں کس طرح اور کیوں آئیں۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران کے رکوع ۴ میں وضاحت سے وارد ہے، بنی اسرائیل میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنی اولاد کو بیت المقدس کی خدمت اور وہاں پر عبادت وغیرہ کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ سورۂ آل عمران میں اس کا بیان اس طرح ہے کہ عمران کی بیوی جو فی الوقت حاملہ تھی، اس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں یہ نذر مانی کہ اے میرے رب جو میرے پیٹ (شکم) میں ہے (اور اسے یہ توقع تھی کہ لڑکا ہوگا) قبول فرما تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (بی بی مریم) پیدا ہوئی تو اس نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے میرے رب یہ تو لڑکی ہے اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہے اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں (یعنی جیسا کہ میں نے نذر مانی تھی تو یہ لڑکی بھی ہیکل کے لیے وقف (رہے گی) پھر اس (بی بی مریم) کو اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا۔

بی بی صاحبہ علیہاالسلام کی کفالت وتربیت وغیرہ کے لیے بنی اسرائیل میں اختلاف پیدا ہوا مگر قرعہ اندازی میں حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکلا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی بی بی مریم کی بہن تھی، اس لیے کفالت کا سارا بوجھ اور ذمہ داری حضرت زکریا علیہ السلام پر آن پڑی۔ یہ بیان سورۂ آل عمران کے رکوع ۴۔۵ میں مذکورہ ہے۔ جس زمانے میں بی بی مریم علیہاالسلام کی کرامات کا ظہور ہوا ان کا کچھ ذکر پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں کر آئے ہیں اس پیش منظر کو سمجھنے کے بعد اب اس سلسلہ کی پہلی آیت مبارکہ ذکر کی جاتی ہے:

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴾ [مریم: ١٦]

الکتب سے مراد قرآن کریم ہے۔ انتبذت کے معانی ہیں الگ یا جدائی۔

''اور اے محمد ﷺ اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔''

اور یہ بات ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے اسے ہیکل (بیت المقدس) عبادت کے لیے مخصوص کیا تھا اور اس سے پہلے لفظ محراب کے معانی بھی ذکر کر آئے ہیں کہ اس سے مراد حجرہ ہے جو ہیکل سے متصل ہی زمین کے سب سے بلندی والے حصے پر بنایا جاتا تھا۔ جس میں ہیکل کے مجاور اور اعتکاف وغیرہ میں بیٹھنے والے لوگ رہائش پذیر ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے اس قسم کے حجرے الگ ہوتے تھے اور وہ ہیکل کے شرقی جانب ہوتے تھے۔ حضرت مریم علیہا السلام کا ایسے محراب یا حجرہ میں رہنے کا ذکر بیان سورۂ آل عمران میں بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ﴾ [آل عمران: ٣٧]

''زکریا علیہ السلام جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتے تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتے۔''

یہ کھانے پینے کی چیزیں بے موسی ہوا کرتیں یعنی سردی کے موسم میں ہونے والی چیزیں موسم گرما میں اور موسم گرما کی چیزیں موسم سرما میں۔

هكذا قال ابن جرير في تفسيره عن عبدالله بن عباس بسند حسن لغيره و مجاهيل وقتاده مروى بسند جيد

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بیت المقدس کے جو نقشے آج ہمارے سامنے آئے ہیں ان میں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے اعتکاف کے حجرے ہیکل کی شرقی جانب بنائے گئے تھے۔ اب زیر تفسیر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت مریم علیہا السلام جب لائق ہوئیں تو اس ہیکل کی شرقی جانب اپنے حجرہ میں دوسرے سب لوگوں سے جدا اور دور ہو کر معتکف ہو گئی اور اس حالت میں اس کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حضرت جبریل علیہ السلام پیغام لائے جس کا بیان آئندہ آیت مبارکہ میں ان شاء اللہ العزیز آئے گا۔

﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾

[مریم: ١٧]

''پھر پردہ ڈال کر ان سے چھپ بیٹھی تھی پھر (اس حالت میں) ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو

(یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔''

یعنی جب حضرت مریم علیہا السلام ہیکل کی شرقی جانب اپنے حجرے کے اندر معتکف ہوئی تو اس نے لوگوں کی نظر سے محفوظ رہنے کی خاطر اپنے سامنے ایک پردہ ڈال دیا اور اس وقت اعتکاف میں بیٹھنے والوں کا یہی دستور ہوتا تھا کہ اپنے حجرہ کے سامنے پردہ کرنے کی وجہ سے کپڑا لٹکا دیتے تھے۔

اس مقام پر روح سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کی خبر دینے کے لیے ملائکہ کے آنے کا بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ﴾ [آل عمران: ٤٥]

تو یہ خبر دینے والے ملائکہ تھے اور عموماً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے خبر لانے کا یہ کہنا ہے کہ جبریل مقرر ہوتے تھے اس لیے اکثر مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ اس مقام پر اگرچہ صیغہ جمع کا استعمال کیا تھا، لیکن مراد اس سے حضرت جبریل ہی ہیں اور وہ اس قسم کی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں جن میں اطلاق جمع کا ہے مگر مراد خبر واحد ہے لیکن اگر اس کو جمع کے ہی معانی پر رکھا جائے تب بھی اس کے معانی صحیح ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگرچہ خبر لانے والے حضرت جبریل ہی تھے لیکن ساتھ ملائکہ کی جماعت بھی تھی اور وہ خود ان کے سربراہ تھے، اس لیے سب کو ملا کر ملائکہ کا اطلاق کیا گیا۔ بہرحال یہ بات تو ثابت شدہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس یہ خبر لانے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرشتہ ہی تھا۔ باقی حضرت جبریل کی تعیین تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اس مقام پر اسے روح کہا گیا ہے اور اس روح کا بیان دوسرے کئی مقامات پر اس طرح وارد ہے:

﴿ قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ﴾ [النحل: ١٠٢]

''اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو جائے۔''

(تاکہ تو لوگوں کا ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کر سکے)۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید لانے والے کو روح الامین اور روح القدس کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید میں روح الامین اور روح القدس کس کو کہا گیا ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٩٧]

''ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہے (وہ گویا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے عداوت رکھتا ہے) کیونکہ اس نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن مجید آپ کے قلب اطہر پر نازل کیا ہے۔''

پہلے ہم جو لکھ آئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ روح القدس یا روح الامین ہی نے آپ ﷺ کے قلب اطہر

پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اذن سے قرآن مجید کو نازل کیا اور اس آیت مبارکہ میں فرمایا گیا کہ حضرت جبریل نے آپ کے قلب اطہر پر قرآن مجید کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے نازل کیا۔ یعنی جبریل یا روح القدس یا الروح الامین ایک ہی ہستی ہے اور اسی الروح الامین کو کسی مقام پر اضافت سے (جیسا کہ زیر بحث آیۃ کریمہ میں ہے) اور کسی مقام پر (بغیر اضافت) صرف روح کہہ کر اس پر الف و لام عہد داخل کر کے جبریل امین کی طرف اشارہ کیا گیا۔ جیسا کہ سورۃ القدر میں فرمایا گیا:

﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴾ [القدر: ٤]

یعنی اس قدر کی بابرکت رات میں بے شمار ملائکہ بمع روح الامین یعنی جبریل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکام کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں۔

خلاصہ کلام کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں "رُوْحَنَا" سے مراد حضرت جبریل ہی ہے۔

اس مقام پر روح کی ضمیر جمع متکلم کی طرف اضافت تشریف اور تعظیم کی ہے۔ یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد مسعود کی خبر لانے والی کوئی معمولی ہستی نہیں بلکہ وہ ہستی پیغام لے کر آئی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مقرب بندوں میں سے تھی اور اس کو روح الامین کے خطاب سے نواز کر سب انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجا گیا۔ مطلب یہ کہ وہ بابرکت ہستی جو سب انبیاء کی طرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حکم لاتی تھی وہی ہستی حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پیغام لے کر آئی، اس سے حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت و علو مرتبت اور بلند مقام کا اظہار ہو رہا ہے۔

" فتمثل لها الخ" سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت جبریل بی بی صاحبہ علیہا السلام کے پاس ایک کامل انسان کی صورت وشکل میں نمودار ہوا۔ کیونکہ ان میں اصل صورت میں دیکھنے کی قوت برداشت نہیں۔ ہمارے پیغمبر نبی ﷺ نے ان کی اپنی اصل صورت میں صرف دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ زمین پر اور دوسری مرتبہ شب معراج سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ پہلی دفعہ دیکھنے سے آپ کو اتنا خوف لاحق ہوا کہ گھر آ کر اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ مجھ پر چادر ڈالو مجھ پر چادر ڈالو۔ [صحیح البخاری و غیرہ]

یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرت جبریل نبی ﷺ کے پاس انسانی صورت میں آتے تھے۔ بہر حال اس انسانی صورت میں آنے کی وجہ سے وہ بی بی صاحبہ علیہا السلام سے آسانی سے ہمکلام ہو سکتے تھے۔

دوسری وجہ یہ کہ اس طرح ایک لحاظ سے بی بی صاحبہ علیہا السلام کی آزمائش بھی ہو جاتی ہے یعنی ایسے وقت میں ایک عورت کے پاس اس کے خلوت کدہ میں اگر کوئی حسین جمیل و کامل مرد بے اختیار آ جائے تو اس عورت کے اس آنے والے مرد کے متعلق اس کی اندرونی حالت کے بموجب تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بدکار یا غیر پاکدامن عورت ہوتی ہے تو وہ ایسے مرد کے آنے پر ذرہ بھر بھی خوف زدہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے سفلی

جذبات کے بموجب اس کی جانب مائل نظر آتی ہے اور اپنے سب ہتھیار ڈال کر اس سے ایسے لب ولہجہ میں بات کرنی شروع کرتی ہے جیسے آنے والا مرد کوئی اس کا محرم یا شوہر ہو۔ لیکن ایک باعصمت اور پاکدامن عورت تنہائی میں ایک غیر مرد کے اچانک آجانے سے ایک دم گھبرا جاتی ہے۔ سب سے زیادہ اسے اپنی عصمت کا خیال لاحق ہوتا ہے۔ اس لیے فوراً وہ وسائل اور ذرائع جو اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں ان کا کام میں لانا شروع کر دیتی ہے تاکہ اس کی پاکدامنی اور عزت پر کوئی حرف نہ آئے اور یہی حال حضرت مریم علیہا السلام کا حضرت جبریل کے آنے پر ہوا (یعنی انسانی صورت میں آنے پر ہوا) اور اپنی زبان سے کچھ کہا اس کا بیان آنے والی آیت کریمہ میں ان شاء اللہ آئے گا۔ بی بی صاحبہ علیہا السلام کی پاکدامنی کی شہادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان الفاظ مبارک سے پیش فرمائی ہے:

﴿ وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ [الانبیاء: ۹۱]

یعنی اس کا ذکر خیر جس نے اپنی عصمت کی پوری پوری حفاظت کی اس آیت کریمہ میں سے یہ معلوم ہوا کہ ملائکہ انسانی شکل اختیار کر کے بھی آتے رہتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں ملائکہ کا انسانی صورت اختیار کرنے کے متعلق کوئی بیان نہیں ان کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔ ملائکہ کے انسانی صورت میں آنے کی دوسری مثال بھی قرآن مجید میں موجود ہے جو بعد میں ذکر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ!

یہ لوگ ملائکہ کے بارے میں ان کے وجود ہونے کے متعلق (جو کہ جمیع اہل اسلام کا عقیدہ ہے) اس کے برخلاف وہ ان ہستیوں کے وجود کے ہی منکر ہیں اور قرآن کریم میں جس مقام پر ملائکہ کا ذکر آتا ہے وہ لوگ ان سے قوتیں مراد لیتے ہیں، یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات میں جو بھی چیزیں موجود ہیں اور ان میں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ انھیں قوتیں دکھائی ہیں ان قوتوں کو وہ ملائکہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملائکہ کی ایک مستقل ہستی ہونے کا ان کے پاس کوئی تصور نہیں اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ اس مقام پر ہم قرآن کریم کی روشنی میں دلائل سے واضح کریں کہ ملائکہ بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ایک مستقل مخلوق ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان کو امر ہوتا ہے۔ ان میں نافرمانی کرنے کا مادہ ہی نہیں ہے۔

اہل اسلام کا یہ متفق علیہ عقیدہ ہے کہ ملائکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ایک مستقل مخلوق ہے اور ان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ انسان وغیرہ کی شکل وصورت اختیار کر سکتے ہیں اور ان میں نافرمانی کرنے کا کوئی مادہ نہیں ہے وہ وہی کرتے ہیں جس کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان کو امر ہوتا ہے۔ اس کے امر کی تعمیل میں وہ ذرہ بھر بھی مخالفت نہیں کرتے لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے ملک میں ہیں جو پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اگرچہ خود کو مسلمان کہلواتے ہیں مگر ملائکہ کے رسول کی احادیث کو تو وہ مانتے نہیں۔ اس لیے اس مقام پر ہم قرآن کریم سے دلائل پیش کرتے ہیں جن کو ملاحظہ کرنے کے بعد ہر منصف مزاج غیر

متعصب انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سلسلہ میں حق بات وہی ہے جو اہل اسلام خیر القرون سے لے کر اس وقت تک ملائکہ کے متعلق عقیدہ رکھتے آئے ہیں۔

① قرآن کریم میں مومنوں کے ایمان کے بارے میں بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے ملائکہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ کے آخر میں فرمایا گیا:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ [البقرة : ۲۸۲]

یعنی مومنین ایمان لاتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر اور اس کے رسولوں ملائکہ پر اور جو کچھ رسولوں پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو شخص ان کا انکار کرتا ہے اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ایک بہت بڑی گمراہی میں ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ [النساء : ۱۳۶]

ظاہر ہے کہ اگر ملائکہ سے مراد ان کم عقل انسانوں کے کہنے کے مطابق کائناتی قوتیں ہیں تو ان پر ایمان لانے کا آخر کیا مطلب نکلتا ہے۔ اس کائنات میں جو بھی چیزیں ہم دیکھتے ہیں اور ان میں جو قوتیں ہیں یا خاصیتیں ہیں ان کو ہر آدمی خواہ مسلمان ہو یا کافر ملحد ہو یا زندیق یا دہریہ ہر ایک ان کو جانتا ہے اور ان پر یقین رکھتا ہے کہ ان میں سے یہ فائدے اور اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً سورج کی روشنی اور اس کی حرارت کا اثر جو حیوانات اور نباتات پر پڑتا ہے وہ ہر انسان (صاحب علم) جانتا ہے۔ اس بات کے لیے ایمان والوں کو مکلف بنانا کہ اس بات پر ایمان رکھو کہ سورج میں حرارت اور قوت کی روشنی ہے اس قسم کی بات عقل سلیم سے بعید ہے۔ ان کے کہنے کے موجب معاذ اللہ! اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو آدمی سورج وغیرہ میں جو قوتیں ہیں ان کا انکار کرے گا وہ بڑی دور کی گمراہی میں ہے۔ جب کہ کائناتی اشیاء کی قوتوں کا کوئی منکر ہے ہی نہیں۔ اس لیے ایمان اور کفر کی بات بالکل بے معنی ہے اس کے علاوہ ملائکہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اس کے رسولوں کی طرح کچھ مقدس ہستیاں ہیں جن پر ایمان لانے کا حکم ملتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ہماری نظر سے غائب ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فرمان کے موجب مومنوں کے لیے ایمان بالغیب بھی ضروری ہے۔ یعنی ان سب اشیاء یا حقیقتوں پر ایمان لانا جو اگرچہ ہمارے حواس کی پہنچ سے دور ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا ہے۔ باقی اگر جو چیز دیکھنے میں نہیں آتی یا مشاہدہ میں نہیں آسکتی اس کا انکار کرنا چاہیے تو پھر ان لوگوں کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی

ذات پاک سے ہی انکار کرنا چاہیے کیونکہ ہماری نظریں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا مشاہدہ تو اس دنیا میں کر نہیں سکتیں۔ اسی طرح ان کو قیامت کے دن کا بھی انکار کرنا چاہیے کیونکہ وہ بھی غیب کے امور میں سے ہے۔ اگر ان حقائق پر غیب میں سے ہونے کے باوجود ان کا ایمان لانا ضروری ہے تو پھر ملائکہ کے وجود کا اس لیے انکار کرنا کہ ہم ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتے سراسر جہالت ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴾ [الحج : ۷۵]

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ ملائکہ اور انسانوں میں سے رسول چنتا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ بڑا سننے اور جاننے والا ہے۔''

ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ کائناتی اشیاء کی قوتوں کو رسول بنانا ایک مہمل بات ہے۔ جس کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔ جس طرح انسانوں میں سے رسول ان کو کہا جاتا ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے وحی کے ذریعے جو کچھ حاصل کریں وہ اس کے بندوں تک پہنچائیں۔ اس طرح ملائکہ کے رسول ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ حکم ملے اس کا ان افراد کے پاس پہنچائیں جن کو اس نے رسالت کے لیے چنا ہے اور وہ تب ہی ہوسکتا ہے جب ملائکہ بھی ایک مستقل بااختیار اور چلنے پھرنے والی مخلوق ہو۔

③ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ﴾ [الزخرف : ۱۹]

''ان کافروں نے ملائکہ کو جو رحمٰن (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ) کے بندے ہیں ان کو عورتیں بنا دیا (یعنی ان کو مؤنث سمجھنے لگے)۔''

اور یہ بات واضح ہے کہ ذوالعقول زندہ اشیاء کے علاوہ دوسری جو بھی اشیاء اس کائنات میں موجود ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق تو کہا جا سکتا ہے لیکن ان کو بندہ کہنے کی کوئی معانی نہیں بنتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بندہ وغیرہ کا اطلاق صرف انسانوں یا جنوں یا ملائکہ پر کیا گیا ہے باقی سورج، چاند، ستاروں وغیرہ کے لیے قرآن کریم میں کہیں بھی بندہ کا لفظ نہیں آیا بلکہ ہر مقام پر یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ بہر حال اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی انسانوں کی طرح ایک چلتی پھرتی بااختیار (عبادت کرنی والی) مخلوق ہے۔

④ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ﴾ [فاطر : ۱]

''تمام تعریف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا بنانے والا اور فرشتوں کو

پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے۔ (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر ہیں اور اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہیں جن میں سے کسی کو دو دو کسی کو تین تین اور کسی کو چار چار کسی کو اس سے بھی زیادہ پر ہیں۔ اگر ان سے کائناتی اشیاء کی قوتیں مراد ہوتیں تو ان کے لیے پروں کا اثبات سراسر بے معنی ہے۔

⑤ ایک اور مقام پر وارد ہے:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ [الم السجدہ : ۱۱]

''اے نبی! آپ کہہ دیجیے تمھاری روح موت کا فرشتہ قبض کرے گا جس کو تمھاری روح قبض کرنے کا منصب سونپا گیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ میں سے کوئی فرشتہ ایسا ہے جس کو جاندار اشیاء کی روح قبض کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور وہ فرشتہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ایک خاص بندہ ہے جو ہر جاندار کی روح کو قبض کرتا رہتا ہے اور ارواح کی روح قبض کرنے کی نسبت کائناتی قوتوں کی طرف کرنے سے کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اس سے بھی زیادہ واضح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ [الانفال : ۵۰]

''اگر تم اس حالت کو دیکھتے جب فرشتے کافروں کی روحیں قبض کر رہے ہوتے ہیں وہ ان کے چہروں اور پیٹھ پر ضربیں لگائے جاتے ہیں لو اب جلنے کی سزا بھگتو۔''

اگر ملائکہ سے مراد کائناتی قوتیں لی جائیں تو اس مقام پر ان کا کافروں کی پیٹھ اور چہروں کو مارنے کا کیا مطلب ہوگا۔ اس معاملہ سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ روح قبض کرنے والی ایسی ہستیاں ہیں جو ان مرنے والے کافروں کی پیٹھ اور (چہروں پر ضربیں لگاتے ہیں اور ان کو دوزخ کی آگ کی خبر دیتے ہیں نہ کہ ایسی مادی قوتیں جن میں نہ شعور ہو اور نہ سمجھ اور نہ ہی کسی قسم کا اختیار ہو۔

⑥ ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الشوریٰ : ۵]

''قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔''

کائناتی اشیاء کے متعلق اگرچہ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اپنی زبان حال سے حمد اور تسبیح

کرتے ہیں مگر ان کا زمین والوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگنا یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، یہ کام وہی کر سکتا ہے جو جاندار اور عقل مند اور با اختیار ہستی ہو۔

سورۂ مومن میں ہے کہ ملائکہ حملۃ العرش وغیرہم کی باقاعدہ دعا مذکور ہے جس میں انسان کے لیے مغفرت کی طلب اور جو صراط مستقیم پر چلتے ہیں ان کے لیے جنت کی دعا اور جہنم کی آگ سے پناہ دینے کی عرض کی گئی ہے، اتنی بڑی دعا کے لیے یہ کہنا کہ یہ دعا کائناتی اشیاء کی قوتیں عرض کرتی ہیں۔ محض جہالت اور ہٹ دھرمی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

⑦﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا۟ يَعْبُدُونَ ﴾

[ سبا : ٤٠ ]

اور اس دن (قیامت) وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ (یعنی کفار) تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کفار بے جان اشیاء بھی پوجتے تھے۔ مثلاً بت، سورج وغیرہما۔ مگر قرآن کریم میں ان بے جان چیزوں کے لیے کہیں بھی وارد نہیں کہ ان سے یہ سوال کیا جائے گا کہ کیا کفار تمہاری عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ بے جان چیزیں تو اس شعور اور احساس سے بھی محروم ہیں اور یہ سوال (عبادت کرنے کا) تو اس سے کیا جا سکتا ہے جو صاحب عقل وفہم اور شعور ہو اور کفار کی اس حرکت کا مشاہدہ کر سکے۔ ان بے چاری بے جان چیزوں کو تو کچھ خبر نہیں اس لیے ان سے سوال کرنا بالکل مہمل بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام اور دوسرے صلحاء کے بارے میں آتا ہے کہ اس روز ان سے اس کے متعلق (یعنی عبادت کے) سوال کیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں بیان فرمایا گیا ہے اور اس طرح سورۂ فرقان میں عام صلحاء لوگوں، جس میں انبیاء وغیرہم سب آ جاتے ہیں، سے اس سوال کا بیان ہے۔ یعنی ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان میرے بندوں (یعنی کافروں) کو گمراہ کیا یا یہ خود ہی سیدھے راستے سے ہٹ گئے تھے؟ وہ عرض کریں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہماری تو یہ مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں مگر آپ نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا، حتیٰ کہ اس نصیحت کو بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔

ہر صاحب عقل آدمی آسانی سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ سوال اور اس کا یہ جواب ان ہستیوں سے تعلق رکھ سکتا ہے جو صاحب شعور اور چلنے پھرنے والی با اختیار مخلوق ہو نہ کہ وہ مخلوق جو بے جان اور جمادات کی لسٹ میں شامل ہوں۔ بعینہ اس طرح ملائکہ سے جو سوال کیا جائے گا اس کو سمجھنا چاہیے۔

⑧﴿ إِذْ يُوحِى رَبُّكَ إِلَى ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّى مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا۟ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ﴾ [الانفال : ١٢]

’’(یعنی وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ بے شک میں تمہارے

ساتھ ہوں پس تم اہل ایمان کے دلوں کو ثابت رکھو۔"

یہ بدر کی لڑائی کے موقع کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں یعنی ملائکہ کو مومنین کی طرف اس لیے بھیجا کہ وہ جا کر ان کے دلوں میں روح پھونکیں تا کہ وہ کفار کی زیادتی اور ان کے اسلحہ وغیرہ دیکھ کر ہراساں یا خوف زدہ نہ ہوں بلکہ اپنے قدم مضبوطی سے جما کر مقابلہ کریں۔ اس بارے میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے سورج اور جبل پہاڑ وغیرہ کو حکم دیا کہ ہمت افزائی اور اس کو دلاسا دینے یا اس کے مضطرب دل کو سکون دینے کا کام یا تو اس جیسا کوئی انسان کرسکتا ہے یا کوئی ایسی ہستی جو اگرچہ نظروں سے غائب ہو مگر وہاں موجود ہو جو اس کے دل میں اس قسم کا القا کر سکے۔ باقی بے شعور چیزیں تو ان کا نہ یہ کام ہے اور نہ ان میں اس قسم کی کوئی صلاحیت ہے۔

⑨ ﴿ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾

[ تحریم : ٦ ]

"یعنی اس جہنم کی آگ پر ایسے ملائکہ مقرر کیے گئے ہیں جو مزاج اور جسم کے اعتبار سے سخت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حکم ہوتا ہے۔"

اگر ملائکہ سے مراد آگ کی قوتیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ اس طرح "علیھا" نہ فرماتا بلکہ "فیھا ملائکۃ" فرماتا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ﴾ [المدثر : ٣٠، ٣١]

"یعنی اس پر (جہنم پر) انیس مقرر ہیں اور ہم نے جہنم پر صرف ملائکہ مقرر کیے ہیں۔"

اگر ملائکہ سے قوتیں مراد لی جائیں تو ان کی تعداد انیس بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ دوزخ کی آگ کے بارے میں ان کے اصحاب کا ذکر تب صحیح ہوسکتا ہے جب اس سے بااختیار ہستیاں مراد ہوں۔ محض قوتوں کو اصحاب النار کہنا بالکل غلط ہے۔

⑩ ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ﴾

[ الرعد: ٢٤، ٢٥ ]

"یعنی ان جنت والوں ہر دروازہ سے ملائکہ داخل ہوں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام ہو تمھارے صبر کی وجہ سے۔"

اس قسم کا سلام اور دعا وغیرہ کوئی باشعور ہستی ہی کرسکتی ہے۔

⑪ ﴿ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾

[ الزخرف : ۸۰ ]

”کیا انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں ہی نہیں سنتے؟ ہاں (ہم سب کچھ سن رہے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔“

اوپر سورۃ الحج کی آیت مبارکہ ذکر کر آئے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ سے اور انسانوں سے رسولوں کا چناؤ کرتا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کے کچھ رسول ان کے اعمال لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رسول انسانوں میں سے تو ہیں نہیں اگر انسان ہوتے تو ہم ضرور ان کا مشاہدہ کرتے۔ معلوم ہوا کہ یہ رسول ملائکہ میں سے ہیں جو انسانوں کے اعمال لکھ رہے ہیں اور انسانوں کے وہ اعمال لکھنے والے انسان ہی کی طرح متحرک بالارادہ بااختیار ہستیاں ہونی چاہییں نہ کہ صرف بے شعور اور بے جان قوتیں کیونکہ ان کی طرف انسان کے اعمال کو لکھنے پڑھنے کی نسبت قطعاً صحیح نہیں ہوسکتی۔

⑫ کفار کا یہ اعتراض تھا کہ ہماری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان رسول بن کر کیوں آیا ہے۔ اگر کوئی رسول بھیجنا تھا تو کسی فرشتہ کو بھیجتے یا کم از کم تمھارے ساتھ کوئی فرشتہ آتا جو دوسرے انسانوں کو ڈراتا اور کہتا کہ اگر اس رسول کا کہنا نہیں مانو گے تو تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

ان کا اس طرح کا بے تکا سوال قرآن کریم کے مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ [ بنی اسرائیل : ۹۵ ]

”ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے (یعنی انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے) تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو ان کے لیے آسمان سے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔“

یعنی جب کہ زمین میں تم انسان ہی آباد ہو تو حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کے پاس رسول بھی انسانوں میں سے بھیجے جائیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کفار بھی ملائکہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ کوئی مقدس اور اللہ تعالیٰ کی مقرب ہستیاں ہیں۔ اگرچہ اپنی گمراہی کی وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات پر تنبیہ ضرور فرمائی، لیکن ان کے اس عقیدہ کو کہ وہ ایک مقدس اور بااختیار ہستیاں ہیں، غلط قرار نہیں دیا۔

قرآن کریم کے مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ملائکہ کے وجود کا عقیدہ پوری انسانیت میں متفق علیہ عقیدہ رہا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

﴿ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ

عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ﴾

[المومنون: ٢٤]

''حضرت نوح علیہ السلام کو توحید کی تبلیغ پر اس کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے، اللہ کو اگر بھیجنا ہوتا تو فرشتے بھیجتا یہ بات تو ہم نے کبھی باپ دادا کے وقتوں میں سنی ہی نہیں (کہ بشر رسول بن کر آئے)۔''

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ○ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ [حٰمٓ السجدة: ١٣، ١٤]

''اے نبی! اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اس طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انھیں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انھوں نے کہا ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا۔ لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود کی قوم یہ ساری قوموں سے پہلے آئی ہیں اور شرک تو شروع ہی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے ہوا تھا۔ بہر حال ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ ان سے پہلی (اوائل) قوموں میں بھی ملائکہ کے وجود کا تصور موجود تھا اور ان کے انبیاء نوح، ہود اور صالح علیہم السلام نے بھی ان کی اس بات کو بحال رکھا۔ مگر معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ آج کل کے حضرات وجود کا کس بنیاد پر انکار کر رہے ہیں؟

⑬ زیر تفسیر آیہ میں بیان ہوا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی طرف جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے۔ اس پیغام لے کر آنے والے فرشتے کے بارے میں (کہ وہ جبریل تھا) شروع میں کافی بحث کر آئے ہیں۔ اس طرح حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے بیان میں یہ واضح کر آئے ہیں کہ آپ کی دعا کی مقبولیت کی خوش خبری ملائکہ نے ہی آپ کو نماز کی حالت میں دی تھی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی صورت میں حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کے فرشتے انسانی صورت میں آیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے دستور (یعنی مہمان نوازی) کے مطابق ایک بچھڑا بھون کر لے آئے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے بندے انسان نہ تھے اس لیے انھوں نے طعام کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوف لاحق ہوا اور جب فرشتوں کو یہ بات محسوس ہوئی تو انھوں نے

آپ سے فرمایا کہ آپ خوف زدہ نہ ہوں ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور آپ کو اس کی طرف سے ایک صاحب علم فرزند یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام کے تولد کی خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ اس کے بعد ان سے گفتگو کی اور انھوں نے بتایا کہ ہم حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو برباد کرنے آئے ہیں۔ اس کے بعد وہی فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل اختیار کر کے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے جن کو دیکھ کر حضرت لوط علیہ السلام بے حد پریشان ہوئے کہ میرے ان خوبصورت مہمانوں کی آمد کی میری نالائق قوم کو خبر ہو گی تو وہ ضرور میرے مہمانوں کی بے حرمتی کے لیے آئیں گے اور آپ کی قوم کو بھی ان خوبرو مہمانوں کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ اپنی بے حیائی اور اپنی رواجی بے انتہا بد خصلتی کے نشے میں دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو بہت ہی سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ اس پر آپ بہت پریشان ہوئے تب ان کو فرشتوں نے بتایا کہ آپ کچھ خیال نہ کریں یہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور ان کو صبح کے وقت نیست و نابود کر دیں گے۔ [سورۂ ہود: ع ۷]

اس قصہ سے معلوم ہوا کہ کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو انسانی صورت اختیار کر کے آتی رہی ہیں۔ کسی کے پاس وہ خوش خبری لے کر آتے تھے تو کسی پر عذاب۔ اور انھی ہستیوں کو قرآن مجید نے ملائکہ کے نام سے پکارا ہے۔ قرآن مجید میں اور بھی ایسی آیات ہیں جن میں سے اہل حق کے عقیدہ کے موجب ملائکہ کے وجود پر دلیل لی جا سکتی ہے لیکن ان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

﴿ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا﴾ [مریم: ۱۸]

"(اجنبی آدمی کو دیکھنے کے بعد) بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمن (اللہ) کی پناہ مانگتی ہوں۔" یعنی مجھ سے کسی قسم کا تعرض نہ کر۔ آیت کریمہ کے ابتدائی الفاظ سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ بی بی صاحبہ اجنبی مرد کی طرف ذرہ بھر بھی مائل نہ ہوئی بلکہ خود کو کمزور اور مدافعت میں عاجز اور بے بس تصور کر کے فوراً اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دیا۔

یہاں بی بی صاحبہ کی مثال بعینہ حضرت یوسف علیہ السلام والی ہے لیکن وہاں گناہ کی دعوت دینے والی عورت تھی اور مرد فطرتاً عورت سے قوی ہوتا ہے لہٰذا اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کی عورت سے کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ اسے کوئی جسمانی نقصان پہنچا سکے گی مگر وہاں اندیشہ اس بات کا تھا کہ وہ شہوت نفسانی سے مغلوب ہو کر کہیں کوئی ناشائستہ حرکت نہ کر بیٹھیں۔ اس لیے اس حالت میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی اور فوراً معاذ اللہ کے الفاظ کہے، لیکن اس مقام پر بی بی صاحبہ علیہا السلام کے تخلیہ میں حارج ہونے والا ایک نووارد مرد تھا اور اس کو ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک فرشتہ ہے۔ اس لیے فطرتاً اس کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اس تنہائی کی حالت میں جو اندر داخل ہوا ہے شاید اس کا کوئی غلط

ارادہ ہو اور اس کو یہ خیال بھی دامن گیر ہوا کہ میں ایک کمزور عورت اس قوی مرد کی مدافعت کرنے سے بالکل عاجز ہوں۔ اس لیے اس نے فوراً اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اس لیے پناہ طلب کی کہ کہیں نفسانی شہوت کی وجہ سے اس پر شیطان کا غلبہ نہ ہو جائے اور یہاں بی بی صاحبہ کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں یہ آنے والا میری کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر میری بے حرمتی نہ کرے اس لیے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی۔ حضرت مریم نے نو وارد کو اللہ تعالیٰ کا خیال دلانے کے لیے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مدنظر رکھ کر میرے ضعف اور کمزوری پر رحم کرے اور میری عزت پامال نہ کرے۔ یا اللہ تعالیٰ سے پناہ لینے میں مبالغہ پیدا کرنا اور اس کی بارگاہ میں رحمٰن والی صفت پیش کر کے اپنے لیے اس کی خاص رحمت حاصل کرنے کی دعا کی۔ یعنی اے اللہ رحمٰن تو میرے ضعیف حال پر رحم فرما میں تجھ سے پناہ کی طالب ہوں تو میرے لیے اس سے کافی ہو جا اور میری عصمت و عزت کو محفوظ رکھ۔

یہ تو ابتدائی الفاظ تھے جو ایک پاکدامن عورت کی زبان پر ایسے نازک موقع پر فوراً آجاتے ہیں۔ یعنی ایسی صورت حال جس کا گمان بھی نہ ہو اچانک سامنے آجائے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت نہیں تو وہ سب سے اعلیٰ قاہرہ طاقت یعنی اللہ تعالیٰ سے ہی پناہ طلب کرتا ہے کیونکہ وہ بہرحال ہر چیز پر قادر ہے اور ہر مصیبت سے نجات بھی دلا سکتا ہے۔

"ان کنت تقیا" کے بارے میں اکثر مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ یہاں اس شخص کا جواب محذوف ہے، جس پر کلام کا سیاق دلالت کر رہا ہے۔ یعنی تقدیر اس طرح ہوگی کہ "ان کنت تقیا فانی عائذة به منك" یعنی اگر تو پرہیز ہے، تیرے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور تجھ میں کوئی تقویٰ کی بات ہے تو میں اللہ تعالیٰ کے واسطے سے جس سے تو ڈرتا ہے تجھ سے اس کی پناہ میں آجاتی ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان پناہ اگرچہ متقی اور غیر متقی دونوں سے طلب کر سکتا ہے مگر اس کا اثر اس پر ظاہر ہوتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اور تقویٰ ہوتا ہے۔ کیونکہ جس آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا اور تقویٰ اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوگا تو اس کا دل خوف خدا سے بھر جائے گا اور وہ ایسے اقدام سے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرے اس سے باز رہتا ہے۔ سورۂ انفال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ ﴾ [الانفال : ۲]

"یعنی درحقیقت مومن کامل وہی جن کے سامنے جب بھی اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہوتا ہے تو ان کے دل خوف الٰہی سے بھر جاتے ہیں۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ﴾ [الطلاق : ۲]

''جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کے لیے ہر مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کرتا ہے۔''

اس لیے اگر کسی بھی شخص پر کسی بھی وقت بتقاضا بشریہ شیطانی وسوسوں کا کچھ غلبہ ہو جائے اور اس کو بھٹکنے کا کچھ اندیشہ ہو تو اسے فوراً اللہ تعالیٰ کی یاد آجاتی ہے اور اس کی یاد آنے سے اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جاتا ہے اور وہ ایک دم شیطان رجیم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے۔ اور اس طرح شیطان کا وہ گمراہ کن وسوسہ دفع ہو جاتا ہے۔ اور وہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بچ جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام نے نووارد کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلا کر خود سے دور رہنے اور کسی قسم کا تعرض نہ کرنے کی استدعا کی اور اسے سمجھایا کہ اگر تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور دل میں اس کا خوف رکھتا ہے تو اس کے نام کا ذکر تجھے مجھ سے دور رکھنے کے لیے کافی ہے۔

﴿قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا﴾ [مریم: ۱۹]

روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: (یعنی اس کے جواب میں) کہ میں تمھارے رب کی طرف سے ہی قاصد بن کے آیا ہوں تا کہ تجھے (اس کے حکم سے) ایک فرزند جو برائیوں اور گندی ذہنیت سے پاک ہو عطا کروں۔

یعنی حضرت جبریل علیہ السلام نے بی بی صاحبہ کو جواب دیا کہ میں انسان نہیں ہوں جیسا کہ تو سمجھ رہی ہے۔ بلکہ تمھارے رب کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہوں، اس پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کو ایک پاکیزہ خصلت فرزند پیدا ہوگا۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس جگہ پر اولاد بخشنے کی نسبت حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی طرف کیوں کی؟ وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہی اس کا سبب بنایا یعنی اس کے ہی حکم سے اس نے بی بی صاحبہ کے گریبان میں پھونک ماری جس سے اس کے بطن مبارک میں حمل نے قرار پکڑا۔ جیسا کہ اس طرح کا بیان قرآن کریم میں دو مقام پر مذکور ہے۔

① ﴿وَالَّتِيٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا﴾ [الانبیاء: ۹۱]

''اس عورت کا ذکر کیا جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

جیسا کہ روح کو پھونکنے والا فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آیا تھا اس لیے اس آیت کریمہ میں روح پھونکنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے۔ اس آیت مبارکہ میں "فیھا" کی جو ضمیر ہے وہ بی بی صاحبہ کی طرف لوٹتی ہے۔ مگر اس آیت مبارکہ میں یہ بیان نہیں ہے کہ یہ پھونک بی بی صاحبہ میں کس جگہ ماری گئی۔

دوسری آیت کریمہ میں اس طرح مذکور ہے:

② ﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَٰنَ الَّتِيٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا﴾

[تحریم: ۱۲]

اس آیت کریمہ میں لفظ فرج میں علم البلاغہ کے تیسرے فن یعنی علم البدیع کی ایک اصطلاح یعنی صنعت استخدام کو عمل میں لایا گیا ہے۔

صنعت استخدام کا مطلب یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معانی ہوں یا پھر اس لفظ میں سے ایک مقام پر ایک معنیٰ مراد لیا جائے اور آگے چل کر اس لفظ کی ضمیر لوٹائی جائے تو دوسرے معنی کی طرف راجع ہو یا اس ضمیر کی طرف دو ضمیریں لوٹائی جائیں۔ ایک ضمیر سے مراد ایک معنی کیا جائے اور دوسری ضمیر سے دوسرا معنی۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے: ؎

اذ انزل السماء بارض قوم عيناه وان كانوا غضباناً

اس شعر سے شاعر نے السماء سے بارش مراد لی ہے۔ یعنی جب کسی قوم کی زمین میں بارش اتری۔ اس سے گھاس اگتا ہے تو پھر ہم اس گھاس کو چرتے ہیں۔ اگرچہ جن کی زمین ہے وہ اس پر ناراض ہوں۔ مطلب کہ شاعر اپنے شعر کے پہلے مصرع میں السماء سے مراد بارش لی ہے اور عیناہ میں جو ''ہ'' ضمیر ہے اس سے مراد گھاس لی ہے۔ اس طرح اس آیت کریمہ میں فرج سے پہلے شرمگاہ مراد لی گئی ہے، بعد میں فیہ کی ضمیر فرج کے دوسرے معنی گریبان کی طرف راجع ہے۔ یعنی عمران کی بیٹی مریم نے جب اپنی عصمت کو محفوظ رکھا اور ہم نے اس کی گریبان میں روح پھونکی۔ بہرحال جب جبریل علیہ السلام کے حکم سے بی بی صاحبہ کے اندر روح پھونکنے کا سبب بنا تب انھوں نے اس فرزند کے عطا ہونے کی نسبت اپنی طرف کر دی، کیونکہ جبریل علیہ السلام اس طرح کرنے پر مامور تھے۔ جس طرح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی سے پرندے بنا کر ان کو زندہ پرندے بنانے کے لیے ان میں پھونک مارنے کا اظہار فرمایا۔ کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اذن ہی سے ہوا تھا جس طرح سورۂ آل عمران میں فرماتے ہیں کہ:

﴿ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

[آل عمران: ٤٩]

''یعنی میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں۔ اس کے بعد اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ زندہ پرندہ بن جاتا ہے، اللہ کے حکم سے اور مادر زاد نابینے اور کوڑھ کی مرض میں مبتلا کو تندرست اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔ یعنی مٹی کے پتلے میں پھونکنے کا سبب میں ہوں اور ان بیماریوں میں مبتلا لوگوں پر ہاتھ بھی میں پھیرتا ہوں اور مردوں کو بھی میں ہی بلاتا ہوں لیکن مٹی کے پتلے کا میری پھونک سے زندہ پرندہ بن جانا اور بیماروں کا صحت یاب ہو جانا اور مردوں کا میرے بلاوے پر اٹھ کھڑا ہونا یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہے۔ میں صرف ایک ظاہری سبب ہوں اور اس لیے کہ تمھارے اوپر میرے رسول ہونے کی حجت قائم ہو۔ بعینہ اسی طرح جبریل علیہ السلام بھی اللہ کے اذن سے آئے اس لیے اس فرزند کی ہبہ بطور انفاخ کے اپنی

طرف نسبت کر دی۔

اس آیت میں "غلاماً زکیاً" کا لفظ ہے۔ یعنی ایسا فرزند جو ہر طرح کی گندگیوں اور برائیوں سے پاک ہو۔ سورۂ آلِ عمران میں فرشتوں کی بزبانی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چند مزید اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [آل عمران : ٤٦-٤٥]

یہاں اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کو اپنی طرف سے ایک مبارک فرزند کی خوش خبری دیتا ہے۔ جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ دنیا و آخرت میں باوجاہت یعنی اعلیٰ مرتبہ و مقام پر فائز ہوگا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا اور لوگوں سے اس حالت میں بھی کہ ابھی ماں کی گود میں چھوٹے سے بچے ہوں گے، باتیں کریں گے اور اللہ کے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔ اتنی تفصیلی گفتگو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتے جبریل نے پہنچائی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریم علیہا السلام کی اور اللہ تعالیٰ کا پیغام جو ایک بابرکت فرزند کی ولادت کی صورت میں تھا اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آئے۔ جبریل روح الامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لے کر آئے جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر آتے، اس طرح بی بی صاحبہ کے پاس بھی راہ براست اللہ تعالیٰ کی وحی لاتے تھے۔ اسی طرح بی بی صاحبہ کے پاس بھی اللہ کے حکم سے وحی لے کر اسے پیغام پہنچا دیا۔ یعنی یہ پیغام بطور الہام نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ وحی کے حامل مقرب فرشتہ کی وساطت سے ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح مردوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا جبریل وحی لے کر آئے اُسی طرح عورتوں میں سیدہ مریم علیہا السلام کے پاس وہی فرشتہ اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر آیا اور یہ شرف دوسری کسی عورت کو حاصل نہیں ہوا۔ یہاں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ سیدہ مریم علیہا السلام نبیہ ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ آگے ہم اس بارے میں اپنی گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

## اثبات النبوت سیدہ مریم علیہا السلام:

اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے لفظ "نبوت" کی تحقیق ضروری ہے۔ لفظ نبوت اسی لغت میں ہے جس سے اللہ عزوجل نے ہمیں خطاب کیا ہے۔ انباء سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب ہے اعلام یعنی اطلاع دینا اور باخبر کرنا، پھر جس شخص کو اللہ عزوجل جو بات مستقبل میں ہونے والی ہے اس کے وقوع سے قبل اطلاع دے دی اس کی طرف کسی بات کی وحی بھیجے اور اسے کسی امر کی خبر دے تو وہ بلاشبہ نبی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان یا اطلاع اس الہام کے باب سے بھی نہیں جسے فطری الہام کہا جاتا ہے، یعنی جو فطری ہے۔ جس طرح

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ [النحل: ]

یعنی شہد کی مکھی کی طرف تمھارے رب نے الہام کیا، یعنی اس کی فطرت میں یہ بات رکھ دی اور نہ ہی یہ الہام ظن اور وہم کے باب سے ہے۔ جس طرح پاگل و مجنون آدمی کر سکتا ہے۔ نہ اس الہام کو کہانت کہا جا سکتا ہے جو شیاطین کی چوری چھپی آسمان کی طرف کان لگا کر وہاں سے فرشتوں کی گفتگو سن کر اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا لیے۔ پھر آکر اپنے انسانی دوستوں کو بتائے، کو کہا جاتا ہے اور یہ کہانت نبی ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد ختم ہوگئی اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع نجوم کے باب سے بھی نہیں کیونکہ علم نجوم انسانی تجربات اور پڑھنے اور سیکھنے کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح اس اطلاع کو خواب بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے متعلق سچ اور جھوٹ ہونے کا یقین نہیں ہوتا بلکہ یہ وحی کا خاصہ ہے۔ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قصداً اس شخص کی طرف اطلاع ہوتی ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی کی جاتی ہے اور اس وحی کے وقت وہ ان تمام وجوہ مذکورہ سے اوپر ہوتا ہے کیونکہ وہ وحی ایسی حقیقت ہوتی ہے جو ان تمام مذکورہ وجوہات فطری الہام وغیرہ سے خارج ہوتی ہے۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ کو وحی کرنا ہوتی ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ ایسا ضروری علم پیدا کرتا ہے، جس سے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ اور اس کا وہ یقین بعینہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کسی چیز کو اپنے حواس سے ادراک کرنے یا عقل کی بداہت سے سمجھ جائے اور اس کے متعلق اس کے نزدیک شک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، پھر وہ یا تو فرشتے کے آنے سے پہلے اس کی طرف ہوتا ہے یا اس خطاب سے جو اس کے نفس میں اللہ تعالیٰ خطاب کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم ہوتی ہے اس شخص کے لیے جسے کسی معلم کے واسطہ کے بغیر تعلیم دینا چاہتا ہے۔ اس سے قارئین کو نبوت کی حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی۔ اگر کسی کو نبوت کی اس معنی سے انکار ہے تو پھر وہ ثابت کرے کہ نبوت کا یہ معنی نہیں بلکہ یہ ہے، مگر کوئی شخص بھی نبوت کی دوسری معنی اصلاً پیش نہیں کر سکتا۔ جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو پھر جاننا چاہیے کہ قرآن کریم میں بیان ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے فرشتوں کو کچھ عورتوں کی طرف بھیجا جن کو انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی حق کی خبر دی۔ جس طرح اسحق علیہ السلام کی والدہ کو اسحق علیہ السلام کے تولد کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی:

﴿وَ امْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ﴾ [هود: ۷۱-۷۳]

”اور اس کی بیوی جو کھڑی تھی وہ ہنس پڑی۔ ہم نے اسے اسحق کی خوش خبری سنائی۔ اسحق کے علاوہ اس کے پوتے یعقوب کی خوش خبری بھی دی۔ تب بی بی صاحبہ نے کہا افسوس کیا میں جنوں گی۔ حالانکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے۔ بے شک یہ بات تو عجیب ہے! تو فرشتوں نے کہا کیا تو اللہ کے امر سے تعجب کرتی ہے۔ اللہ کی رحمتوں اور اس کی برکات تم اہل البیت پر ہوں بے شک وہ تعریف کیا ہوا اور بزرگی والا ہے، پھر جب یہ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارہ علیہا السلام کو اسحق علیہ السلام کے تولد کی بشارت کا خطاب ہے۔ اس کے بعد بی بی صاحبہ کو جواب میں فرشتوں نے یہ کہا تھا کہ تو اللہ کے امر میں تعجب کرتی ہے اور کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ خطاب فرشتے کی طرف سے کسی غیر نبی کی طرف ہو۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کی طرف جبریل کو بھیجا۔ جس نے آکر انھیں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کی خوش خبری دی اور ان سے مولود مبارک کی صفات حمیدہ کا ذکر کیا۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے، پھر یہ نبوت صحیح ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی صحیح کی صورت میں انھیں ملی۔ اس طرح سورۃ القصص میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ تو خوف کی حالت میں اپنے نومولود فرزند سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالہ کر دے اور اسے یہ اطلاع بھی فرمائی کہ عنقریب یہ آپ کا فرزند آپ کی طرف لوٹایا جائے گا اور اسے نبی مرسل بنایا جائے گا۔ لہٰذا یہ نبوت ہی ہے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر کوئی سمجھ دار انسان اپنے عقل و شعور سے سمجھ سکتا ہے کہ اگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اللہ تعالیٰ کی اس خبر پر یقین رکھنے والی نہ ہوں تو پھر اپنے بچے کو دریا کے حوالہ کرنا کسی خواب یا اپنے کسی خیال کی بنا پر پرلے درجہ کی بے وقوفانہ حرکت یا پھر جنون کا کام ہوتا۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص اس طرح کا کام خواب یا نفس کے خیالات کی وجہ سے کر ڈالے تو بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نافرمانی ہو جائے گی یا ایسا کام کرنے والا پاگلوں کی اسپتال میں داخل ہونے کے لائق ہے، تاکہ اس کا علاج کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ بات یقینی طور پر درست ہے کہ وہ وحی جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف اس کے فرزند کے متعلق دریا کے سپرد کرنے کے متعلق آئی تھی وہ بعینہ اس وحی کی طرح ہے، جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف خواب کی صورت میں اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کے متعلق آئی۔ کیونکہ اگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور اپنی اس وحی کی صحت کا بھی انھیں یقین نہ ہوتا تو محض خواب کی بنیاد پر اپنے بیٹے کے ذبح کرنے کا اقدام نہ کرتے۔ اگر کوئی غیر نبی خواب کی بنیاد پر اپنے بیٹے کو ذبح کرے تو بہت بڑا فاسق کہلائے گا یا پھر مجنون جس کا جنون انتہا کو پہنچ چکا ہو۔ یہ وہ بات ہے جس میں کوئی بھی شک نہیں کیا جا سکتا تو پھر یہ بات درست ثابت ہوئی کہ مذکورہ عورتیں اللہ تعالیٰ کی نبیہ تھیں۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ سیدہ مریم علیہا السلام اور بعض انبیاء کا ذکر خیر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ ﴾ [مریم: ۵۸]

مذکورہ انبیاء کی شخصیات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ جس طرح سیدنا آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے۔ الی آخر۔ اس آیت میں مذکورہ تمام شخصیات کو جن میں سیدہ مریم علیہا السلام بھی ہیں کو انبیاء کہا گیا ہے اور ایسی کوئی معقول دلیل نہیں جس کی بنا پر نبیین کے لفظ سے بی بی مریم کو خارج کیا جائے۔ نبیین اگر جمع مذکر سالم ہے، لیکن تغلیباً اس میں عورت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح سورۂ تحریم آیت ۱۲ میں ﴿من القانتین﴾ یعنی بی بی صاحبہ کی عاجزی سے عبادت کرنے والوں میں سے تھیں۔ حالانکہ اس پر قانتین بھی جمع مذکر سالم ہے اور اللہ عزوجل کا فرمان سورۂ مائدہ میں ہے کہ:

﴿ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۚ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ﴾ [المائدہ: ۷۵]

یعنی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ صدیقہ تھی اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس آیت میں بی بی صاحبہ کو صدیقہ کہنا اس کے نبیہ ہونے کے خلاف نہیں۔ کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق سورۂ یوسف میں ہے:

﴿ يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ ﴾ [یوسف: ٤٦]

یعنی یوسف علیہ السلام کو بھی صدیق کہا گیا ہے۔ لہٰذا صدیق ہونا نبی ہونے کے خلاف نہیں، اس طرح سورۂ مریم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا ادریس علیہ السلام کو صدیق کہا گیا۔ معلوم ہوا کہ صدیق ہونا نبی ہونے کے خلاف نہیں۔ کچھ لوگوں نے سورۂ یوسف اور سورۂ نحل کی اس آیت کریمہ:

﴿ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِ ﴾

سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی تو صرف مرد ہی ہو سکتا ہے نہ کہ عورتیں۔ حالانکہ اس آیت میں صرف رسالت کو مرد حضرات سے خاص کیا گیا ہے اور اس میں تو کچھ بحث و تکرار ہی نہیں۔ یہ تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ رسول صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ عورتیں غیر محرم مردوں کے سامنے نہیں آسکتیں۔ لہٰذا انھیں مردوں میں تبلیغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ دراصل رسول نبی سے اخص ہے اور نبی اعم ہے، یعنی ہر رسول نبی ضرور ہوتا ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔ اسی لیے رسالت کو مردوں سے خصوصیت اس بات کو مستلزم نہیں کہ نبوت بھی ان کے ساتھ خاص ہو اور نبوت کا معنی پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ اس میں کسی شخص کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے کے واسطے سے یا براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں الہام کرنا اور جس کی طرف یہ وحی ہوئی ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا یقین پیدا کیا جاتا ہے جو اس کو اس وحی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا اتنا یقین ہو جاتا ہے گویا کہ وہ اپنے حواس سے ادراک کر رہا ہے یا عقل کی بداہت کے ساتھ اسے جان رہا ہے اور یہ نبوت کی تعریف سیدہ سارہ علیہا السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور سیدہ مریم علیہا السلام میں باتم وجوہ موجود ہے۔ لہٰذا محض مقابلہ کی بنیاد پر ان کی نبوت سے انکار کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن کی ج ۴ ص ۸۶ پر سیدہ

مریم علیہا السلام کے نبی یا غیر نبی ہونے کے متعلق مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں یعنی سیدہ مریم کا نبیہ ہونا زیادہ ظاہر ہے، اکثر علماء کا مسلک بھی یہی ہے۔ اب اس مضمون کے متعلق کچھ احادیث ملاحظہ کیجیے۔ امام قرطبی کی تفسیر میں ہے کہ امام مسلم سیدنا ابوموسیٰ الاشعری سے روایت ہے کہ مردوں میں سے تو بہت ہی کامل "ایمان وتقویٰ میں" ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں سے مریم بنت عمران اور آسیہ فرعون کی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت کامل نہیں۔ بے شک سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کی فضیلت دیگر کھانوں پر ہے۔ (ثرید ایک طعام ہے کہ روٹی اور گوشت وغیرہ کو ملا کر کھایا جاتا ہے) اور پھر امام موصوف فرماتے ہیں کہ کئی صحیح طرق سے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یعنی تمام جہانوں کی عورتوں میں سے چار عورتیں سب سے بہتر ہیں۔ ایک مریم بنت عمران اور دوسری آسیہ بن مزاحم جو فرعون کی بیوی ہے اور خدیجہ بنت خویلد (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آگے لکھتے ہیں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسرے طریق سے اس طرح مرفوعاً روایت ہے کہ:

(( سيدة النساء اهل الجنة بعد مريم فاطمة و خديجة ))

"یعنی جنتی عورتوں کی سردار سیدہ مریم علیہا السلام کے بعد سیدہ فاطمہ اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔"

پھر آگے لکھتے ہیں کہ پھر قرآن کریم کا ظاہر اور مذکورہ احادیث تقاضا کرتی ہیں کہ بے شک سیدہ مریم علیہا السلام تمام جہانوں کی عورتوں سیدہ حوا علیہا السلام سے لے کر دنیا کی آخری عورت (جس پر قیامت قائم ہوگی) تک سب سے افضل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جو وحی پہنچائی اس میں انھیں کچھ باتوں کا مکلف بنایا گیا تھا۔ اس میں کچھ اوامر تھے تو کچھ اختیار۔ بعینہ اسی طرح جس طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی بھیجی اسی طرح بی بی مریم علیہا السلام کی طرف بھی وحی بھیجی۔ پھر اس وقت بی بی صاحبہ نبیہ ہے اور نبی ولی سے افضل ہے، پھر بی بی صاحبہ اگلی پچھلی سب عورتوں سے مطلقاً افضل ہے اور اس کے بعد فضیلت میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے اور ان کے بعد سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں اور پھر آسیہ اور اسی طرح روایت کیا ہے اس روایت موسیٰ بن عقبہ اس نے کریب سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے وہ جلیل القدر صحابی فرماتے ہیں کہ تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار علی الاطلاق مریم علیہا السلام اور اس کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا اور پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا اور پھر آسیہ۔ علامہ قرطبی مزید فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث حسن ہے جو تمام اشکالات کو رفع کر دیتی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے سیدہ مریم علیہا السلام کو ان باتوں کے ساتھ خاص کیا جو دیگر عورتوں کے حصہ میں نہ آئیں وہ اس طرح کہ روح القدس جبریل نے ان کے ساتھ کلام کیا اور ان کے سامنے ظاہر ہوئے اور ان کی گریبان میں پھونک ماری اور پھونک مارنے کے وقت ان کے قریب ہوئے لہٰذا ان باتوں میں سے کوئی بھی بات دیگر عورتوں کو حاصل نہیں ہوسکیں اور بی بی صاحبہ نے اللہ تعالیٰ کے کلمات کی پوری طرح تصدیق کی اور جب انھیں فرزند کے تولد کی خوش خبری ملی تب اس کے متعلق

کسی علامت اور نشانی کی طلب نہیں فرمائی۔ جس طرح سیدنا زکریا علیہ السلام نے طلب فرمائی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے تنزیل میں اسے صدیقہ کہا جس طرح فرمایا: ﴿ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ﴾

اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ ﴾ [التحریم: ۱۲]

پھر بی بی صاحبہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے صدیقوں کی گواہی دی اور ان کے متعلق قنوت کی شاہدی بھی دی اور ساتھ ہی کلمات الٰہیہ کی تصدیق کی۔ شاہدی دی بہر حال ان تمام مناقب میں بی بی صاحبہ کے ساتھ کوئی اور عورت شامل نہیں۔ یہاں امام قرطبی رحمہ اللہ کا بیان تھوڑے تصرف کے ساتھ ختم ہوا۔

﴿ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴾ [مریم: ۲۰]

اس آیت کریمہ میں ایک لفظ بغی ہے جس کا معنی زانیہ یا بدکار ہے۔ اس لفظ کے متعلق عربی کے کچھ علماء کہا کہنا ہے کہ اس کی اصل بغوی بروزن فعول کے تھی، پھر واؤ اور یاء کے جمع ہونے اور واؤ کے ساکن ہونے کی وجہ سے علم صرف کے قانون کے مطابق واؤ کو یاء سے بدل کر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا تو بغیاً بنا، یا کا تقاضا ہے کہ اس کا ما قبل مکسور ہونا چاہیے، لہٰذا اسے بغیا پڑھنا واجب ہے اور ان علماء کا کہنا ہے کہ ہم نے بغیا کو فعول کے وزن پر قرار دیا ہے نہ کہ فعیل کے وزن پر کیونکہ فعیل کے وزن پر بمعنی فاعل میں مونث پر (ت) ضرور لاحق ہوتی ہے۔ اگر فعیل کے وزن پر ہوتا تو بغیہ ہوتا۔ جب ایسا نہیں ہے تو بغوی ہی تھا اور صرفی قانون کے مطابق بغیا پڑھا گیا۔ دیگر علماء کا کہنا ہے کہ بغی فعیل کے وزن پر ہے باقی اس کے ساتھ (ت) اس لیے لاحق نہیں کی گئی کہ یہ لفظ عورتوں کے لیے آتا ہے۔ مردوں کو بغی نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو باغ کہا جاتا ہے۔ جب کہ بغی ہے ہی عورتوں کے ساتھ مخصوص۔ اس لیے تاء تانیث کے الحاق کی ضرورت نہیں جس طرح حائض یا طالق۔

مریم علیہا السلام نے فرمایا کہ مجھے بچہ کس طرح ہوسکتا ہے حال یہ ہے کہ کسی مرد نے چھوا ہی نہیں اور نہ ہی میں کوئی بدکار عورت ہوں؟ سیدہ مریم علیہا السلام کا یہ سوال جبریل سے نہ تھا بلکہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے عرض تھا جیسا کہ سورۂ آل عمران ۴۸ میں بی بی صاحبہ کے یہ الفاظ ہیں:

﴿ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ﴾

اس سے معلوم ہوا کہ سیدہ مریم علیہا السلام نے جب جبریل کی طرف سے بیٹے کے تولد کی بشارت سنی تب بی بی صاحبہ کو جو پہلے خوف پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا، اور ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ وہ غیر محرم نو وارد اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ وہ جب بھی کسی کی طرف وحی بھیجتا تھا تب اس کے دل میں یہ یقین پیدا کرتا تھا کہ وہ نو وارد اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہے۔ اس میں شیطان کا تصرف یا

وہم وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بعینہٖ اس طرح جب جبریل کی طرف سے بشارت پہنچائی گئی اور ان کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ خوش خبری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے اس لیے جو پہلے ان کے دل میں خوف پیدا ہوا وہ زائل ہو گیا اور بی بی صاحبہ نے بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے اس فرزند کے تولد کے متعلق دوسرا سوال کیا۔ بی بی صاحبہ کے اس سوال کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں ان میں سے ہمیں زیادہ قرین قیاس یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ سوال یا استفہام کیفیت کے متعلق تھا۔ یعنی عام طور پر کسی کو اولاد تب ہوتی ہے جب اس کو نکاح کی جائز صورت میں چھوا جائے یا پھر وہ عورت بدکار ہو، ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت میں اسے حمل ٹھہر جائے یہ دونوں صورتیں جو عام طور پر اولاد کے پیدا ہونے کے لیے قدرتی سبب ہیں اور یہ دونوں صورتیں بی بی صاحبہ پر صادق نہیں آ رہی تھیں۔ بی بی صاحبہ معاذ اللہ بدکار نہ تھیں اور نہ ہی ان کا کسی آدمی سے نکاح ہوا تھا۔ اس لیے استعجاباً اور اولاد ہونے کی کیفیت کے استفسار کے لیے سوال کیا۔ یعنی اے میرے پروردگار اولاد کے پیدا ہونے کے لیے جو عام صورتیں ہیں ان میں سے کوئی بھی صورت مجھ پر منطبق نہیں ہوتی تو پھر اس فرزند کے تولد کی صورت کیا بنے گی اور میرے اندر اس حمل کے استقرار کی کیا کیفیت ہوگی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح سیدنا زکریا علیہ السلام کے احوال میں پہلے گزر چکا ہے کہ انھوں نے بھی وہی سوال کیفیت کے علم حاصل کرنے کے لیے کیا تھا کہ میں دوبارہ جوان بنوں گا یا کوئی اور صورت ہو گی؟ اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ سورۂ آل عمران میں صرف بشر کے نہ چھونے کا ذکر ہے مگر اس مقام پر:

﴿وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾

بھی ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت سورۂ آل عمران میں:

﴿وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾

کے جو الفاظ ہیں وہ جائز اور ناجائز مساس دونوں کو شامل ہیں۔ اس مقام پر:

﴿وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾

کے الفاظ تخصیص بعد تعمیم کے طور پر آئے ہیں، جس طرح:

﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ﴾

کے الفاظ تمام میواجات کو شامل ہیں مگر اس کے بعد نخل و رمان کا ذکر بطور تخصیص کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں فرمان الٰہی ہے:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ٩٨]

اس آیت میں پہلے ملائکہ کا تذکرہ کیا جن میں جبریل اور میکائیل داخل تھے لیکن ان کے مقام و مرتبہ کو

ذکر کرتے ہوئے تعمیم کے بعد تخصیص کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح اس مقام پر اگرچہ:

﴿ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ﴾

میں جائز اور ناجائز مساس کی نفی تھی۔ کیونکہ بشر نکرہ ہے اور تحت النفی میں آیا ہے، اس لیے علم بلاغہ کے قواعد کے مطابق اسی میں عموم پیدا ہو جاتا ہے جو جائز یا ناجائز حساس دونوں کو شامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اپنے بدکار نہ ہونے کی تصریح اس کی اہمیت کی وجہ سے کی گئی اور ایک پاکدامن عورت اگرچہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے امر کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے مگر اس کے دل میں فطری طور پر یہ سوالات بار بار اٹھتے ہیں کہ آخر اس کو اولاد ہونے کی کونسی صورت ہوگی۔ حالانکہ مروجہ صورتوں میں سے کوئی بھی اس پر صادق نہیں آتی اس لیے بی بی صاحبہ جیسی عفیفہ اور پاکدامن عورت کا یہ سوال انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کا جواب انھیں آئندہ آیت میں دیا گیا ہے۔

﴿ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴾ [مریم : ۲۱]

”جبریل نے جواب دیا کہ تیرے رب نے فرمایا: اسی طرح ہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا کہ یہ بات میرے لیے آسان ہے اور یہ کام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم اس نومولود کو لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنائیں اور ہماری طرف سے اپنے متبعین کے لیے رحمت بنے اور معاملہ طے شدہ ہے۔“

شرح: یعنی جبریل نے بی بی صاحبہ کو جواب دیا کہ تجھے اولاد اسی حالت میں ہوگی اگرچہ تجھے کسی مرد نے جائز طریقہ سے بھی نہیں چھوا اور یہ خبر میں تجھے اپنی طرف سے نہیں بتا رہا بلکہ یہ خبر تیرے رب کی طرف سے آئی ہے اور وہ فرماتا ہے کہ میرے لیے یہ بات مشکل نہیں بلکہ مجھے ہر چیز اور ہر بات کی قدرت ہے اس لیے یہ بات تجھے تعجب نہ ہو کہ تجھے کسی مرد نے چھوا ہی نہیں۔ سورۂ آل عمران میں اس واقعہ کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

﴿ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾

[آل عمران : ٤٧]

”جبریل علیہ السلام نے فرمایا: اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے جب بھی کسی بات کے متعلق فیصلہ کرتا ہے یا کسی امر کے متعلق حکم کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔“

مطلب کہ اس (اللہ) کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ بات کوئی مشکل نہیں یہاں صرف عورت کے ذریعہ سے تخلیق فرمائی مگر وہ تو مرد اور عورت دونوں کے بغیر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ انسانی پیدائش کی تمام صورتوں میں اللہ کی قدرت کی تمام امثلہ موجود ہیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنی قدرت سے مٹی سے پیدا

کیا اور سیدہ حوا کو مرد میں سے پیدا کیا، یعنی سیدنا آدم علیہ السلام سے۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی ابتدا میں فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾

[ النساء : ۱ ]

''اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو وہ رب جس نے تم سب کو ایک ہی نفس (جان) سے پیدا کیا اور اس کی گھر والی کو اس میں سے پیدا کیا۔''

تیسری مثال۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عورت میں سے پیدا کیا جو بغیر مرد کے تھی۔ باقی دوسری مخلوق کو مرد اور عورت کے ملنے سے پیدا کیا۔ یعنی انسان کی تخلیق کی تمام تر صورتیں اور ان کی امثلہ ہمارے سامنے پیش کر دی۔ بہرحال جو ذات ماں اور باپ کے بغیر ہی پیدا کر سکتی ہے وہ ماں باپ میں سے کسی ایک سے بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اس لیے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

﴿ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾

میں کچھ محذوف ہے جو کہ وہ خود اس مقام پر دلالت کرتا ہے۔ علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں کہ و لنجعلهٗ میں جو تعلیل ہے اس کا معلل محذوف ہے۔ یعنی عبارت اس طرح ہے :

" وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ فعلنا ذالك "

یعنی ہم یہ معاملہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس نومولود کو لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنائیں یا پھر اس طرح کہا جائے کہ:

" و لنجعلهٗ والی تعلیل "

ایک دوسری تعلیل پر محذوف ہے جو یہاں مضمر ہے۔ اس سورت میں عبارت اس طرح ہوگی کہ:

" لنبيين به قدرتنا و لنجعلهٗ "

یعنی یہ معاملہ ہمارے لیے آسان ہے اور یہ سب کچھ ہم اس لیے کر رہے ہیں تا کہ اس کے ذریعے ہم اپنی قدرت کو بیان کریں اور اس نومولود کو اپنی طرف سے لوگوں کے لیے نشانی بنایا۔ قرآن کریم میں ایک مضمر تعلیل پر دوسری تعلیل کے عطف دیگر امثلہ بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ جاثیہ آیت نمبر ۲۲ میں ہے:

﴿ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ ﴾

کا عطف ایک دوسری تعلیل پر ہے جو اس مقام پر مضمر ہے جس پر سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔ دوسری مثال سورۂ یوسف میں ہے :

﴿ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ﴾

اسی طرح ہم نے یوسف کو زمین میں متمکن بنایا۔ اس لیے کہ اسے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچائیں اور اس لیے کہ

اسے تمام معاملات و امور میں سے نتائج اخذ کرنے کا علم عطا فرمائیں۔ اس آیت کریمہ میں اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (و رحمة منا) یعنی اس بابرکت مولود کو ہم اپنی طرف سے ان لوگوں کے لیے رحمت بنائیں جنھوں نے ان پر ایمان لایا اور جنھوں نے کفر کیا اس نے گویا کہ اپنے لیے رحمت کی طلب ہی نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ مَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ [الانبياء : ١٠٧]

یعنی ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ مطلب کہ آپ ﷺ تمام جہان والوں کے لیے رحمت تھے مگر کوئی شخص اپنے سوا اختیار سے اس عام رحمت سے اپنے آپ کو سائیڈ میں رکھے تو اس میں اسی کا قصور ہے جس طرح آفتاب عالمتاب تمام جہاں والوں پر ایک جتنی کرنیں بکھیرتا ہے مگر اگر کوئی شخص خود ہی زمین کے کسی تہہ خانے میں اتر کر چھپ کر بیٹھ جائے تو اس لیے سورج کی روشنی سے محروم ہو جائے تو یہ اس کا قصور ہے۔ اس میں سورج کا کوئی قصور نہیں یا کوئی شخص اپنی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے سورج کی روشنی سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی روشنی اس کے لیے مضر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ معاملہ اس کی آنکھوں کے نقص کی وجہ سے ہے سورج کی روشنی میں اس کا کوئی گناہ نہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ اپنی کتاب گلستان میں کتنا ہی پیارا شعر کہا ہے:

گر نہ بیند بروز شپر چشم — چشم آفتاب راچہ گناہ

"یعنی چمگادڑ اگر دن میں نہیں دیکھ سکتا تو اس اس میں سورج کا کیا گناہ ہے۔"

بہرحال سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے وقت میں اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لیے رحمت تھے لیکن اگر کوئی بدبخت و بدنصیب جان بوجھ کر اسی بابرکت ذات سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہا اور اس کی فیوضات اور ہدایت وارشاد سے مستفیض ہونے کو ناپسند کیا۔ اس لیے وہ اس رحمت کو حاصل کرنے سے محروم رہا تو اس میں اسی کا قصور ہے۔ آگے اس آیت کریمہ کے آخر میں ہے: ﴿ وَ كَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِيًّا ﴾ یعنی اس بابرکت مولود کا وجود ایک ایسا امر ہے جو طے شدہ یعنی ازل ہی سے ان کی پیدائش مقدر ہو چکی ہے اور ان کی پیدائش لوح محفوظ میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کی پیدائش کا وقوع لازمی امر ہے اور وہ ضرور واقع ہونے والا ہے کیونکہ جو بات اللہ کے علم میں مقدر ہے اس کا ٹلنا ناممکن ہے وہ ضرور اسی طرح ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ازلی علم میں ہے۔

بعض حضرات جو معجزات کے منکر ہیں یا اللہ کی قدرت پر انھیں پورا یقین نہیں ان کا کہنا ہے کہ جبریل کا بی بی صاحبہ کو جواب میں كذالك کہنے سے مراد ہے کہ اگرچہ فی الحال آپ شوہر والی نہیں لیکن ایسا ہی ہوگا کہ آپ شوہر والی بنیں گی اور اولاد بھی ہوگی لیکن ان حضرات نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہ دی اور نہ ہی توجہ کی زحمت گوارا کی جو آئندہ فقرہ:

﴿ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾

میں واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ اگر معاذ اللہ جبریل علیہ السلام کے ارشاد کا یہی مطلب تھا تو آپ عام دستور کے مطابق شادی کی قدرت کی کونسی اولاد بھی ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کونسی خاص نشانی ہے جس کی طرف:

﴿ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾

میں اشارہ کیا گیا ہے اور میاں بیوی کے اختلاط سے تو اولاد کا پیدا ہونا، یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کونسی نشانی ہے؟ بہرحال ان حضرات کی اس تحریف معنوی کو تسلیم کرنے سے:

﴿ وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾

والا فقرہ معاذ اللہ بالکل فضول بن جاتا ہے جس کا کوئی بھی مطلب نہیں نکلتا۔ اس کے علاوہ اگر بی بی صاحبہ نے شادی کی تھی اور اس سے انھیں اولاد تولد ہوئی تو پھر آگے چل کر جوان کی قوم کے متعلق جو بیان آتا ہے کہ انھوں نے بی بی صاحبہ پر ملامت اور طعن و تشنیع شروع کی کہ تو کنواری ہو کر بیٹا کہاں سے لائی۔ شادی شدہ عورت کو اولاد ہونا کیا طعن و تشنیع کا سبب بن سکتا ہے اور اس صورت میں تو بی بی صاحبہ اپنی قوم کے اتنے طوفان کے جواب میں نومولود کی طرف اشارہ نہ کرتی بلکہ زبان کے ساتھ کہہ دیتی کہ میں شادی شدہ ہوں تمھارا بہتان فضول ہے اور مجھے اولاد اپنے شوہر میں سے ہوئی ہے۔ بہرحال ان حضرات کی یہ جدت طرازی، فضول ہذیان اور مجنونیت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

﴿ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴾ [مریم: ۲۲]

انتبذت کا معنی ہے دور ہونا، الگ ہونا اور جدا ہونا۔ قصی کا معنی ہے دور۔ آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ سیدہ مریم علیہا السلام نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بطن میں اٹھایا، پھر اپنے حمل کے ساتھ کسی دور مقام پر اپنی قوم سے الگ ہو کر چل دی۔ بی بی صاحبہ کے اس حمل کے استقرار پکڑنے کے متعلق سورۂ انبیاء اور تحریم میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ جبریل علیہ السلام کا بی بی صاحبہ کی قمیص کے دامن میں پھونک مارنے سے حمل ٹھہرا اور یہ بات سورۂ تحریم کی آیت کریمہ: ﴿ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا ﴾ [الانبیاء: ۹۱] کی تشریح میں عرض کر آئے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کی پھونک گریبان میں تھی اور اس پھونک کے ذریعے سے اللہ کے حکم سے بی بی صاحبہ میں حمل ٹھہرا۔ باقی یہ سوال کہ پھونک جبریل علیہ السلام نے دی مگر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فنفخنا کی اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ ہی نے وہ حمل ٹھہرایا، باقی جبریل علیہ السلام پھونک دینے کا سبب بنے۔ یعنی اس کی پھونک اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی مشیت ہی سے تھی اور جبریل علیہ السلام میں کوئی بھی قدرت نہیں کہ پھونک سے حمل کی تخلیق کر سکے۔ ہاں اس میں اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور مشیت سے صرف پھونک ماری۔

اس حمل کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی اور چونکہ وہ پھونک اللہ کے حکم سے تھی۔ اس لیے اس کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی۔ جس طرح کوئی بادشاہ یا حاکم اپنے ملازمین یا کسی سے کسی شہر کے تعمیر کرنے کا امر کرتا ہے اور وہ اسے بنا کر تیار کریں تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

"بنیٰ هذا البلد الملك الفلانی" یعنی یہ شہر فلاں بادشاہ نے بنایا ہے، حالانکہ بنانے والے اور ہیں لیکن چونکہ ان کی یہ نسبت تعمیر بادشاہ کے حکم سے ہوئی، اس لیے ان کے بنانے کی نسبت بھی براہ راست اس کی طرف کی گئی ہے۔ اس طرح اس مقام پر پھونک مارنے والے جبریل علیہ السلام ہیں مگر چونکہ وہ اللہ کے حکم سے آئے اور اللہ کے حکم سے پھونک ماری، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ بی بی صاحبہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور یہ ازل ہی سے طے شدہ ہے، اس لیے اللہ کی قضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا لیکن جب محسوس ہوا کہ وہ حاملہ ہوگئی ہے تو پریشان ہوگئی کہ ایک ایسی عورت جو ایک بنی اسرائیل کے بنو ہارون کے مقدس خاندان کی چشم و چراغ ہو اور دوسری طرف وہ بیت المقدس میں عبادت کے لیے وقف ہو چکی ہو اور وہ کنواری بھی ہو، وہ بچے کو جنم دے تو اس کی اپنی قوم کے لوگ بھی اس کا جینا جنجال کر دیتے کیونکہ حاملہ عورت کی ظاہر ہیئت کو تغیر و تبدل حادث ہوتا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہ رہتا پھر جب قوم کے لوگ اس کی اس حالت کو دیکھتے تو وہ اس وقت بی بی صاحبہ کے لیے بڑا طوفان برپا کر دیتے کہ تو نے بیت المقدس کے لیے وقف ہونے اور غیر شادی شدہ ہونے کے یہ حمل کہاں سے لایا اور یہ کسی بھی صحیح روایت میں مروی نہیں کہ اس حمل نے کتنا وقت لیا۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ بی بی صاحبہ کے لیے بھی اتنا وقت ہی انتظار کرنا پڑا جتنا وقت عام حاملہ عورتیں انتظار کرتی ہیں۔ یعنی ۹، ۱۰ ماہ۔ اس لیے جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری ہو اور وضع حمل ہو تب تک اس ذہنی کوفت اور سخت ناگوار پریشانی سے بچنے کے لیے کسی دور کے مقام پر منتقل ہوگئیں۔ اس مقام کے نام کی تعیین قرآن کریم میں موجود نہیں، البتہ اس مقام کی وصف کا تذکرہ آتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مومنون آیت نمبر: ۵۰ میں فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾

"ہم نے مریم اور ان کے بیٹے کو نشانی بنایا اور انھیں ایسی جگہ دی جو اونچے مقام پر تھی اور آرام دہ اور چشموں والی تھی۔"

یعنی وہ جگہ زمین کی سطح سے کچھ اوپر تھی اور وہاں پانی وغیرہ کے چشمے بھی تھے اور رہنے سہنے کی سہولتیں بھی تھیں اور معلوم ہوا کہ اس اونچے مقام پر بی بی صاحبہ کا ایک جانا پہچانا کھجور کا تنا بھی تھا جس کی طرف وضع حمل کے وقت ٹیک لگا کر بیٹھیں تھیں۔ جس کا نام اگلی آیت کریمہ میں آئے گا۔ ہاں اناجیل میں اس کا نام بیت اللحم ہے اور مسیحی دنیا میں یہ بات مسلم ہے کہ اس مقام پر عیسیٰ علیہ السلام کا تولد ہوا تھا اور جمہور مفسرین نے بھی اس

جگہ کی تعیین بیت اللحم سے کی ہے۔ بیت اللحم یہ فلسطین کا ایک قدیمی شہر ہے جو بیت المقدس سے جنوب کی طرف آٹھ کلومیٹر یا چھ میل کی مسافت پر ہے۔

﴿ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ [مریم: ۲۳]

اجاء۔ اجاء یجئی سے باب افعال ہے، یعنی لانا۔ مخاض کا معنی ہے درد زہ یا جنم کے وقت کا درد۔ جذع کا معنی ہے تنا۔ مت لفظ کا معنی ظاہر ہے جس کا مادہ موت ہے اور یہ دو ابواب سے آتا ہے۔ نصر ینصر جیسے قال یقول اس صورت میں متکلم یا مخاطب کے صیغوں کے میم پر ضمہ آتا ہے۔ جیسے مُتُّ، مُتم اس صورت میں قال یقول کے وزن پر ہے جس طرح کہا جائے مات یموت۔ دوسرا باب علم یعلم سے آتا ہے۔ جیسے خاف یخاف جو اصل میں خَوِفَ یَخُوَفُ تھا جو صرفی تعلیل سے خاف یخاف بنا۔ یہ باب بھی اس صورت میں مات یمات ہوتا ہے جو اصل میں موت یموت اس صورت میں مخاطب اور متکلم کے صیغوں پر کسرہ آئی گی۔ جیسے مِتُّ اور یہ دونوں لغات فصیح ہیں۔ کلام عرب میں دونوں مستعمل اور مروج ہیں۔ قرآن کریم میں بھی یہ مَوْتُ دونوں ابواب سے وارد ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۵۷ میں اس طرح ہے۔ ﴿لَئِنْ مُّتُّمْ﴾ اس جگہ مات یموت کے باب سے مستعمل ہے۔ اس مقام پر جس کی تفسیر کر رہے ہیں میں مات یمات کے باب سے ہے، اس لیے میم پر زیر آئی ہے۔ نسیٌ ایسی حقیر اور بے وقت چیز جسے پھینک دیا جائے۔ اگر چلی جائے تو اسے بھلا دیا جائے منسیاً یہ اسم مفعول نَسِیَ یَنسیٰ سے ہے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہوگا:

> ”پھر آیا بی بی صاحبہ کو جنم کا درد اس معہود کھجور کے تنے کے پاس تو کہا کہ اے کاش! میں اس حالت سے قبل مر جاتی اور ہوتی ایسی حقیر اور بے وقعت چیز جس کے جانے کے بعد لوگوں نے اسے بھلا بھی دیا ہو۔“

کھجور کے تنے کے نزدیک بی بی صاحبہ اس لیے آئیں تاکہ وضع حمل کے وقت اس تنے کے ساتھ ٹیک لگائیں تاکہ وضع حمل میں نسبتاً آسانی ہو۔ باقی بی بی صاحبہ کے ان دکھ بھرے الفاظ کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ جبریل علیہ السلام نے اسے بابرکت تولد کی بشارت دی تھی اور بتایا تھا کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے متبعین کے لیے رحمت بنے گا لیکن ایک غیر شادی شدہ عورت کو فرزند تولد ہو اس پر اس کی قوم کے لوگ اور عوام و خواص جھگڑیں گے اور بی بی صاحبہ کے اوپر ان کی طرف سے جو ملامت اور طعن و تشنیع ہونے والی تھی، اس کے متعلق پہلے کچھ بھی مذکور نہ تھا کہ اس کے لیے بی بی صاحبہ کیا کریں۔ گو بشارت کے وقت بی بی صاحبہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا لیکن اب جب اس بابرکت مولود کی ولادت

اس کے سامنے یہ سب باتیں نہایت ہولناک منظر پیش کر رہی ہیں۔ اس لیے اسے انتہائی سخت پریشانی لاحق ہوئی اور سوچنے لگی کہ آنے والے طوفان کو کس طرح ٹالا جائے۔ ایک پاکدامن عفیفہ و صالحہ کے لیے اس سے بڑھ کر دوسری کوئی مصیبت تصور میں نہیں آسکتی کہ اس پر فحاشی کے ارتکاب کا بے بنیاد الزام لگایا جائے تو پھر ایسے عالم میں سیدہ مریم علیہا السلام جیسی مقدسہ اور باعصمت عورت کو ایسے بے بنیاد اور غلیظ بہتان سے اپنی موت ہزار بار بہتر نظر آتی ہے۔ یعنی نہ میں ہوتی اور نہ ایسے الزام سے دوچار ہوتی اور آپ کے اس جذبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف تسلی دی گئی جس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آیت میں آرہا ہے۔

﴿ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾ [مریم: ٢٤]

الا اصل میں اَنْ لَا تھا اور اس میں اَنْ تفسیریہ ہے کیونکہ نادیٰ میں قول کا معنیٰ ہے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ:

''پھر پکارا بی بی صاحبہ کو (اس پکار میں یہ تھا کہ) تو غم نہ کر بے شک بنایا ہے تیرے رب نے تیرے نیچے چھوٹی سی نہر یا چشمہ جاری کر دیا ہے۔''

اس آیت کریمہ سے پہلے والی آیت میں بیان ہے کہ وضع حمل کے وقت بی بی صاحبہ کو پریشانی اور غم لاحق ہوا اور آنے والے طوفان کے اندیشہ سے گھبرانے لگی اور اسی پریشانی کے عالم میں موت کی تمنا بھی کی۔ یہ مناسب موقع تھا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی ملے کہ آنے والے اندیشہ اور متوقع طوفان سے بچانے کا اللہ تعالیٰ خود ہی انتظام کرے گا۔ اس غم اور فکر کی کوئی بھی ضرورت نہیں۔ کھانے، پینے اور دیگر اشیاء ضرورت کی اطلاع بھی دی گئی اور یہ بتلایا گیا اگر کوئی شخص آپ کو دیکھے اور اعتراض اور ملامت کی زبان کھولے تو آپ کو کیا کرنا ہے۔ اس کا بیان آئندہ آیت میں آئے گا اس جگہ پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں لفظ نادیٰ کا فاعل یعنی پکارنے والا کون تھا؟ یعنی بی بی صاحبہ کو یہ تسلی دینے والا کون تھا؟ اس میں علماء اور مفسرین رحمہم اللہ کے دو اقوال ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ وہ پکارنے والا جبریل علیہ السلام تھا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ پکارا بی بی صاحبہ کو جبریل علیہ السلام جو ان سے نیچے کی سطح پر تھے یعنی بی بی صاحبہ کو جبریل علیہ السلام اوپر کی سطح پر یعنی ربوہ پر تھی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس سیاق میں جبریل کا ذکر ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کا۔ ان کا کہنا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس وقت بات کی تھی جب بی بی صاحبہ پر قوم نے طعن و تشنیع کیا اور زبان کھولی۔ اس سے پہلے انھوں نے بات نہیں کی۔ لہٰذا یہ پکارنے والا صرف جبریل علیہ السلام ہی ہوسکتا ہے مگر ان حضرات کی دلیل میں تامل ہے کیونکہ اس پورے قصہ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اس وقت (قوم کی طعن و تشنیع کے وقت) سے پہلے بات نہیں کی۔ یہ محض تخمین ہے کہ چونکہ ان کے بات کرنے کا ذکر صرف ایک ایسی جگہ پر ہے۔ مگر یہ کوئی اس سے پہلے بات نہ کرنے پر دلیل قاطع نہیں کیونکہ عدم ذکر عدم وجود پر مستلزم نہیں ہوتا۔ دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ پکارنے والا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ اس صورت میں یہ ترجمہ یہ ہوگا کہ:

''پکارا بی بی صاحبہ کو عیسیٰ علیہ السلام نے جو وضع حمل کے وقت ان کے نیچے تھا۔''

انھوں نے اس معنی پر دو دلیلیں دی ہیں۔

**دلیل نمبر ۱:**

ضمیر کے بارے میں اصولی قاعدہ یہ ہے کہ اگر اس مقام پر دلیل صارف موجود نہیں تو وہ ضمیر اپنے اقرب مرجع کی طرف لوٹتی ہے۔ اس جگہ اس نادیٰ میں جو ضمیر ہے اس کا قریب مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جس کا ذکر:

﴿ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴾ [مریم : ۲۲]

میں ہے۔ اس کے برعکس جبریل علیہ السلام کا ذکر کچھ دور ہے۔ اس لیے اس اصولی قاعدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ انسب نظر آتا ہے کہ نادیٰ کی ضمیر کا مرجع اسے بنایا جائے جو فحملة الخ میں ہے۔

**دلیل نمبر ۲:**

جب بی بی صاحبہ کے اوپر قوم والوں نے الزام لگایا تب بی بی صاحبہ اپنے اس نومولود عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔ لہٰذا جب یہ پکارنے والے عیسیٰ علیہ السلام نہ ہوتے تو اسے یہ خیال کیسے آتا کہ یہ بچہ اس الزام کی مجھ سے تردید کرے گا۔ حالانکہ پکارنے والے نے اس طرح نہیں کہا تھا کہ اگر آپ کوئی آدمی دیکھیں تو اس بچے کی طرف اشارہ کرنا بلکہ صرف یہ کہا گیا کہ اگر کوئی شخص دیکھے تو کہنا کہ مجھے روزہ ہے۔ اس لیے آج کے دن میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ یعنی اگر پکارنے والا جبریل علیہ السلام تھا تو اس نے تو خاموش رہنے کی رہنمائی کی تھی اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس بچہ کی طرف اشارہ کرنا۔ وہ خود ہی جواب دے گا۔ اس صورت میں بی بی صاحبہ کو قوم کے الزام پر صرف خاموش رہنا تھا نہ کہ اس کے ساتھ بچے کی طرف اشارہ کرنا۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوئی کہ پکارنے والا عیسیٰ علیہ السلام تھا۔ اس لیے بی بی صاحبہ ان کے بتائی ہوئی رہنمائی کے مطابق قوم کے دریافت کرنے پر خاموش بھی رہی اور ان کے جواب میں بچے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ بچہ اللہ کے حکم سے پہلے بھی بات کر چکا ہے اب بھی وہ ان کو اپنی زبان سے جواب دے گا۔ ان وجوہات کی بنا پر ہمیں زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ نادیٰ کا فاعل عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ یہ ہمیں راجح نظر آتا ہے اگرچہ دونوں صورتوں یعنی پکارنے والے کا جبریل علیہ السلام ہونے یا عیسیٰ علیہ السلام ہونے میں معنی و مطلب میں یا سیاق قصہ میں کوئی بھی تغیر و تبدیل پیدا نہیں ہوتا مگر کلام کے سیاق اور مذکورہ بالا قرائن کے مطابق ہم ترجیح ان مفسرین رحمہ اللہ کے قول کو دیتے جو نادیٰ کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں دوسرا لفظ سری ہے جس کا معنی ہے چھوٹی سی نہر اور اکثر مفسرین صحابہ کرام اور تابعین وغیرہم نے بھی اس کا ترجمہ یہی کیا ہے۔ ایک مرفوع حدیث جو کہ سنداً اگرچہ ضعیف ہے تاہم اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی نہر صغیر ہے۔ کچھ حضرات سری کا معنی سردار یا شریف یا بڑے رتبہ و مقام والا شخص لکھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا غالباً اس لیے ہے کہ

اس پکارنے والے نے آگے چل کر کہا کہ:

﴿فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا﴾ [مریم: ٢٦]

یعنی کھائیں اور پییں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کریں اور آنکھوں کی ٹھنڈک نو مولود بچہ ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی تجھے ایسا عظیم المرتبت اور مقام والا بچہ تولد ہوا ہے۔ جسے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر نہ کہ تجھے غم کرنا چاہیے۔ مگر ہمیں جمہور مفسرین و علماء کرام کی رائے زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ جو سری کا ترجمہ چھوٹی نہر کرتے ہیں:

اولاً: اس لیے کہ اس پکارنے والے نے بی بی صاحبہ کو کہا کہ آپ کھائیں اور پییں:

﴿فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ﴾ [مریم: ٢٦]

اور کھانے کے لیے تو تازہ کھجور کا تذکرہ ہے لیکن پینے کے لیے کسی چیز کی فراہمی کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر سری کا معنی شریف المرتبہ آدمی کیا جائے حالانکہ کلام کا سیاق اس بات کا متقاضی ہے کہ جس طرح کھانے کے لیے تازہ کھجوروں کا تذکرہ ہوا تو پینے کے لیے پانی کے لیے بھی کسی ذریعے کا ذکر ہونا چاہیے اور ثانیاً: یہ کہ اس سے پہلے ہم سورۂ مومنون کی آیت:

﴿وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ﴾

ذکر کر آئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے سیدہ مریم علیہا السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی جگہ ٹھہرایا جو پانی کے چشموں والی تھی۔ معین کا معنی چشمہ یا بہنے والا پانی ہے۔ یہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ اس جگہ پر سری کا معنی بھی نہر صغیر ہے۔ باقی آنکھوں کی ٹھنڈک کے متعلق جو نقطہ پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کی بابرکت چیز کے عطا سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ کھانے پینے کی چیزوں میں۔ ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس بابرکت مولود کے متعلق تو پہلے جبریل علیہ السلام کی بشارت میں:

﴿وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا﴾

میں ذکر ہو چکا ہے۔ مگر وہاں وضع حمل کی وجہ سے عورت کو جو کمزوری لاحق ہوتی ہے اس کے لیے کھانے پینے کا کوئی بھی ذکر نہیں۔ اس لیے اس جگہ پر کھانے پینے کی اشیاء کے ذکر کے ساتھ اس مولود مبارک جس کی بشارت پہلے ہی مل چکی تھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آپ اپنے طعام اور شراب کے ساتھ اپنے اس نو مولود کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے۔ اسی طرح اس میں کوئی بھی محظور لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب

﴿وَ هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾ [مریم: ٢٥]

هز یهز هزا جھنجوڑنا۔ جزع کا معنی تنا ہے۔ اس پر (ب) حرف جار داخل ہوا ہے جو تاکید ہے کیونکہ هز یهز باب متعدی ہے۔ وہ حرف جارہ کے واسطہ کے بغیر ہی عمل کرتا ہے مگر معنی میں تاکید پیدا کرنے کے

لیے اس متعدی فعل پر (ب) حرف جار لایا گیا۔ قرآن میں دوسری بھی کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں فعل لازم کو حرف جار کے واسطے کے ساتھ لایا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرہ: ۱۹۵]

قرآن کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر:

" ولاتلقوا بایدلکم الی التهلكة " بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ:

" تلقوا متعدی بنفسه "

اسی طرح سورۂ حج آیت ۲۵ میں ہے:

﴿ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ ﴾ [الحج: ۲۵]

اس میں یرد متعدی بنفسہ ہے مگر الحاد پر (ب) داخل کر کے معنی میں تاکید پیدا کی گئی ہے۔ تساقط۔ یہ واحد مونث غائب کا صیغہ مفاعلہ کے باب ساقط یساقط مساقطة سے ماخوذ ہے۔ رطب کا معنی کھجور ہے۔ جنیا۔ تروتازہ پکے ہوئے۔ آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''ہلائیں آپ اچھے طریقے سے اپنی طرف کھجور کے تنے کو تو گرائے گا آپ کے اوپر تازہ اور پکی ہوئی کھجوریں۔''

چونکہ بی بی صاحبہ علیہا السلام گرم ملک میں تھیں موسم بھی گرم تھا اور موسم گرما میں بھوک سے زیادہ پیاس لگتی ہے۔ اس لیے ترتیب ذکری میں پہلے پانی کے حصول کا ذریعہ جو چشمہ کی صورت میں بی بی صاحبہ کے لیے قدرت کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد میں کھانے کے لیے اس کھجور کے درخت میں تازہ کھجوریں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئیں اور کھانے کے لیے کھجور کا انتخاب میں ایک اور حکمت معلوم ہوئی جیسا کہ اہل طب حضرات لکھتے ہیں کہ نفاس والی عورت کے لیے تازہ کھجوریں نہایت مفید ہیں۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے روزگار کے لیے اسباب کو استعمال میں لانا توکل کے خلاف نہیں یہ دنیا کا چونکہ عالم اسباب ہے اس میں ہر رینگنے والی چیز کا رزق اگرچہ اللہ کے ذمہ ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [ھود: ٦]

اس کے باوجود اللہ ہی کا کام ہے کہ انسان اپنی طلب کے لیے اپنی طاقت کے مطابق ہر طرح کی کوشش کرتا رہے یعنی رزق کے حصول یا کسی بھی کام میں کوشش کرنے کے لیے جن اسباب و ذرائع اور وسائل کی ضرورت ہو ان کے وصول کے لیے جدوجہد کرتے معنی کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق ان کے کرنے میں سستی نہ کرے اس کے بعد اس کا نتیجہ اللہ کے سپرد کر دے جس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں سے فرمایا:

﴿ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ﴾ [يوسف : ٦٧]

آخر میں فرمایا:

﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ [يوسف : ٦٧]

یعنی اصل میرا توکل میرے رب پر ہے۔ باقی جو تمھیں کہا ہے کہ تم سب اکٹھے ایک دروازے سے داخل نہ ہو وہ صرف تحصیل اسباب کے باب سے ہے۔ وہ میں نے کیا ہے اور میرے اوپر یہی ضروری تھا کہ جو احتیاطی تدبیریں اس سلسلہ میں مجھے کرنی چاہییں تھیں وہ میں نے کی ہیں۔ باقی وہ تدبیریں آگے چل کر کارگر ثابت ہوں گی یا نہیں یہ میرے بس سے باہر ہے۔ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے وہی ان تدبیروں کو فائدہ مند بھی بنا سکتا ہے اور ان کو کسی حکمت بالغہ کی وجہ سے بے سود بھی کر سکتا ہے۔ انسان کا فرض صرف یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اپنی قدرت کے مطابق جدوجہد کرنے میں سستی نہ کرے۔ بی بی صاحبہ کو جو امر ہوا کہ آپ کھجور کے تنے کو ہلائیں اس میں ہی یہی حکمت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ علماء کرام لکھتے ہیں کہ وہ کھجور کا تنا بالکل سوکھا ہوا تھا اس میں کھجور وغیرہ نہ تھے۔ اس میں تازہ اور پکی ہوئی کھجوریں محض اللہ کی قدرت کا نتیجہ تھا اور بی بی صاحبہ علیہا السلام چونکہ اس سلسلہ میں اس کھجور کے تنے کو ہلا ہی سکتی ہیں اس لیے انھیں ارشاد ہوا کہ آپ جو آپ کے بس ہے وہ کریں یعنی اس تنے کو اپنی طرف ہلائیں۔ اس سے تازہ اور پکی ہیں کھجوریں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے گرائے گا۔ اللہ تعالیٰ تو اس بات پر قادر تھا کہ اس تنے کو ہلانے کے بغیر بی بی صاحبہ کے لیے کھجوریں مہیا کر دیتا۔ مگر اس صورت میں بی بی صاحبہ کو اپنے رزق کے حصول میں جو کوشش کرنی تھی وہ بالکل نہ رہتی، مطلب کہ انسان یہ سب کچھ بہرحال کرنا ہے جس کی قدرت اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے۔ اس لیے جب کہ بی بی صاحبہ کو قدرت صرف تنے کو ہلانے کی ہی تھی اس لیے اس کا صرف امر ہوا۔

﴿ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴾ [مريم : ٢٦]

قری کا معنی ہے ٹھنڈا کرنا۔ اما اصل میں اِن ما تھا۔ ان شرطیہ کے ساتھ ما مل گئی۔ شرط کے معنی میں تاکید پیدا کرنے کے طور پر۔ "تَرَيِنَّ" اصل میں "ترئیین" تھا تفعلین کے وزن پر پھر نون تاکید کے ملنے کے بعد صرفی اعلال کے بعد ترین ہو گیا۔ انسیا اُنس سے مأخوذ ہے معنی انسان ذات ہے۔

پھر کھائیں اور پییں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے جب انسانوں میں سے کسی کو دیکھیں۔ پھر کہیے میں نے اللہ الرحمٰن کے لیے روزہ مانا ہے۔ پھر میں آج کے دن کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ یہ کلام بھی اسی کا ہے جس نے پہلے حمل کے وقت پکارا تھا اور تسلی دی تھی گزشتہ صفحات میں اس پکارنے والے کے متعلق علماء کا اختلاف نقل کر چکے ہیں کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے یا عیسیٰ علیہ السلام اس سلسلے میں ہمارے نزدیک راجح تھا وہ عرض کر چکے

ہیں۔ ابتدا میں پہلے پانی کی فراہمی کا تذکرہ ہے۔ بعد میں کھانے کے لیے کھجوروں کا تذکرہ اس لیے کہ گرمی کے موسم میں کھانے سے زیادہ پانی کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ البتہ اس آیت کریمہ میں پہلے کھانے کا تذکرہ ہے، یعنی کھائیں اور پییں وہ اس لیے کہ عام طرح انسانوں کا معمول یہی ہے کہ لوگ پہلے کھاتے ہیں اور پھر پیتے ہیں۔ یعنی یہاں جس کی اہمیت زیادہ تھی اسے مقدم کیا گیا اور جیسا کہ انسانوں کے کھانے پینے کا دستور ہوتا ہے کہ پہلے طعام کھاتے ہیں بعد میں پانی پیتے ہیں۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں بی بی صاحبہ کو اس دستور کے مطابق فرمایا گیا کہ آپ اس کھجور سے کھائیں اور چشمہ کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے اور خوش ہوں اور غم نہ کریں۔ اس کے بعد سمجھایا گیا کہ اگر کوئی آدمی سامنے آجائے اور اس بچے کے بارے میں طعن و تشنیع کرنا چاہے تو اسے یہ بتلائیں کہ چونکہ میں نے آج اللہ کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے اس لیے آج مجھے کسی انسان سے بات نہیں کرنی۔ یعنی باقی معاملہ کو اللہ کے سپرد کریں وہ خود ہی اس کا انتظام کرے گا۔ صوم کی لغوی مطلق امساک ہے یعنی رک جانا یا روکنا اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ سیدنا انس بن مالک وغیرہ رضی اللہ عنہ سے طبرانی وغیرہ میں روایت منقول ہے۔

(( انی نذرت للرحمن صوماً ای صمتا ))

یعنی میں نذر مانی ہے اللہ تعالیٰ کے لیے خاموش رہنے کی، یعنی اس جگہ صوم سے مراد بات کرنے سے رک جانا ہے اور یہ لغوی معنی کے موافق ہے۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ صوم سے مراد وہ مشروع روزہ ہی ہے مگر اگلی امتوں میں کھانے پینے سے رک جانے کے ساتھ ساتھ بات کرنے سے بھی رکنا ہوتا تھا مگر ہمیں مذکورہ بالا صحابہ نے جو معنی یعنی خاموش رہنا سے کی ہے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ کی ابتدا میں کھانے پینے کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس سے مشروع روزہ مراد لینا کافی دور کی تاویل کے بغیر نہیں ہوسکتا مگر خاموشی والا روزہ دین اسلام میں مشروع نہیں۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت ذکر فرمائی ہے:

(( بینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب اذا ھو برجل قائم فسئل عنه فقالوا ابو اسرائیل نذر ان یقوم ولا یقعد ولا یستظل ولا یتکلم ویصوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرہ فلیتکلم ولیتسظل ولیقعد ویتم صوم ))

''ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ کو ایک شخص کھڑا نظر آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق دریافت فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ یہ ابواسرائیل ہے اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا اور بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ حاصل کرے گا اور بات بھی نہیں کرے گا اور روزہ بھی رکھے گا۔ (یہ سن کر) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسے کہو کہ بات کرے، یہ بھی حاصل کرلے اور

بیٹھ جائے باقی اپنا روزہ پورا کرے۔''

اس حدیث پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک مباح کلام سے خاموش رہنا اللہ کی اطاعت نہیں اور امام ابوداود رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے:

(( لا صمات یوم الی اللیل)) [رقم الحدیث : ۲۸۷۳]

''سارا دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں۔''

اور مزید فرماتے ہیں کہ وہ چیز جس سے انسان کو تکلیف اور ایذا پہنچے اگرچہ نتیجہ کے طور پر اس کے شر کے متعلق کتاب وسنت میں کچھ بھی نہیں۔ جس طرح پاؤں ننگے کر کے چلنا اور دھوپ میں بیٹھنا یہ سب کچھ اللہ کی اطاعت نہیں اس لیے اس طرح کی نذر قائم ہی نہیں ہوگی کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اسرائیل کو روزہ پورا کرنے کا امر فرمایا۔ باقی سب باتوں کو ترک کرنے کا امر فرمایا۔ یعنی اسے امر ہوا کہ بیٹھے بھی، سایہ بھی حاصل کرے اور بات بھی کرے۔ اور امام قرطبی رحمہ اللہ مذکورہ ابو اسرائیل والے قصے کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث واضح دلائل میں سے ہے کہ ایسی نذر جو معصیت ہو یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مشتمل ہو یا ایسی ہو کہ اس کی طاقت ہی نہ ہو تو ایسی نذر پوری نہ کرنے پر کفارہ واجب نہیں۔ یعنی اس لیے کہ کفارہ کا وجوب فرع ہے۔ نذر کے انعقاد کا، جب نذر ہی منعقد نہیں ہوئی تو کفارہ کیسے واجب ہوگا۔ انتھیٰ کلام الحافظ

بہر حال خاموشی روزے کے طور پر اگلی امتوں میں مشروع تھی مگر دین اسلام میں مشروع نہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ امر ہے کہ:

﴿ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا ﴾ [مریم: ۲۶]

اس کے متعلق کچھ علماء کہتے ہیں کہ بی بی صاحبہ کو امر ہوا کہ وہ یہی الفاظ یعنی:

(( فقولی انی نذرت للرحمن صوما ))

زبان سے کہہ کر سنائے اور بعض کا کہنا ہے کہ اسے حکم ہوا کہ مریم علیہا السلام نے یہ الفاظ:

(( فقولی انی نذرت للرحمن صوما ))

اشارہ سے کہے، زبان سے نہیں۔ زبان سے کہنے کا موقف جمہور کا ہے جب کہ آیت کریمہ سے بظاہر ایسے ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ قول کی ظاہری معنی یہی ہے کہ زبان سے کہا جائے اور جن کا کہنا ہے کہ اگر بی بی صاحبہ زبان سے کہتی تو نذر فاسد ہو جاتی۔ یعنی بی بی صاحبہ نے یہ سنا کہ وہ آج کے دن کسی سے بات نہ کریں۔ پھر جب کسی انسان کو اپنی زبان سے یہ کہے کہ آج میں نے اللہ رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے تو بلاشبہ وہ بات کر چکی۔ لہٰذا نذر فاسد ہوگئی اس کے قول کو یعنی بی بی صاحبہ کو بتایا گیا کہ اشارہ کے ساتھ بتلائے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں کہ اس قول

سے اشارہ مراد ہے نہ کہ لفظی قول تاکہ یہ (( فلن اکلم الیوم انسیا )) کے منافی نہ ہو۔ مخالفین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ "فلن اکلم الیوم انسیا" کا مطلب ہے کہ:

﴿ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا ﴾ [مریم: ٢٦]

کے علاوہ۔ لیکن یہ جواب کافی تکلیف کا متحمل ہے۔ اصل بات یہی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس قول کے مطابق قول سے اشارہ کرنا مراد ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اشارہ بمنزل کلام کے ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اشارہ پر قول کا اطلاق کیا گیا ہے اور کلام عرب میں کلام کا اطلاق اشارہ بھی بہت معروف ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

اذا کلمتنی بالعیون الفواطر ردت علیھا بدموع البوادر

جب وہ مجھ سے نیچے نظروں سے بات کرتی ہے تو میں اسے جلد آنسو کے ساتھ جواب دیتا ہوں۔

اس شعر میں آنکھوں کے اشاروں اور آنکھوں کے آنسوؤں کے بہنے کو کلام سے تعبیر کیا گیا ہے اور اشارہ ہاتھوں سے خواہ آنکھوں وغیرہ سے ہوتا ہے اس جگہ ہم چند نصوص پیش کرتے ہیں جن سے بخوبی معلوم ہوگا کہ ایسا اشارہ جس کا مطلب واضح ہو اور مخاطب با آسانی سمجھ جائے تو وہ اشارہ بمنزل کلام ہے۔ اسی بنا پر کتنے ہی مسائل مستنبط ہو سکتے ہے۔

سنن ابی داؤد وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( ان رجلاً اتی النبی صلی الله علیه وسلم بجاریة سوداء فقال یا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان عَلَیَّ رقبةً مؤمنةً فقال لها این الله فاشارت الی السماء بِأُصْبَعِهَا فقال لَهَا فمن انا فاشارت الی النبی صلی الله علیه وسلم والی السماء یعنی انت رسول الله فقال اعتقها فانها مؤمنة ))

"بے شک ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سیاہ فام لونڈی لے کر آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے اوپر ایک غلام آزاد کرنا لازم ہے۔ یعنی یہ لونڈی رقبہ مؤمنہ سے کافی ہو سکتی ہے؟ تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی سے پوچھا کہ اللہ کہاں ہے؟ تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ میں کون ہوں تو اس نے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کیا اور پھر آسمان کی طرف یعنی آپ اللہ کے رسول ہیں تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی سے فرمایا کہ آپ اسے آزاد کر دیں یہ مومنہ ہے۔"

امام قرطبی اپنی تفسیر میں یہ حدیث ذکر فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سیاہ فام لونڈی سے فرمایا:

((این اللہ)) اللہ کہاں ہے۔ اس نے اشارہ کیا آسمان کی طرف، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، اسے آزاد کر دو یہ مومنہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی اطاعت اور ایمان باللہ اسلام میں دیانت کی اصل ہے اور جس کے ذریعے انسان کا خون مال محفوظ رہتا ہے اور اس کے ذریعے جنت کا حق دار بنتا ہے اور اس کے ذریعے جہنم کی آگ سے نجات پاتا ہے۔ اس کو صرف اشارہ سے بحال کیا اور اس سے اس کے مومنہ ہونے کا حکم فرمایا۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح کوئی شخص زبان سے یہ الفاظ کہے تو اس پر مومن ہونے کا حکم لگایا گیا تو جب وہ امر جو دیانت کی اصل ہے اس کے متعلق اس کو کافی سمجھا گیا تو دین کے دیگر معاملات میں بھی ایسے اشارے کو کافی سمجھنا ضروری ہے اور یہی عام فقہاء کا قول ہے۔ انتہیٰ کلام القرطبی رحمہ اللہ۔

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر رمضان فضرب بیدیہ فقال الشھر ھکذا ھکذا ثم عقد ابھامہٗ فی الثالثۃ ))

''بے شک نبی ﷺ نے رمضان المبارک کا ذکر فرمایا اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور فرمایا مہینہ اس طرح ہوتا ہے اور مہینہ اس طرح ہوتا ہے، تیسری مرتبہ انگوٹھے پر ہاتھ رکھا مطلب کہ چاند انتیسواں بھی ہوتا ہے۔''

اس حدیث میں یہ صراحت ہے کہ نبی ﷺ اپنی انگلیوں کے اشارے سے یہ سمجھایا کہ بے شک مہینہ کبھی انتیسواں بھی ہوتا ہے، یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب اللعان میں بھی درج فرمائی ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ اشارہ بھی لفظ کی طرح ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لایعذب بدموع العین ولکن یعذب بھذا فاشار الی لسانہ))

''اللہ تعالیٰ غم اور تکلیف کے وقت آنسوؤں کے گرنے کی وجہ سے عذاب نہیں کرے گا مگر عذاب کرے گا اس کی وجہ سے آپ نے اشارہ فرمایا اپنی زبان کی طرف۔''

یعنی اشارہ اس لیے کیا کہ اگر غم اور دکھ کے وقت زبان سے آواز سے روئے اور چلائے گا تو یہ باعث عذاب ہے۔

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ذکر فرمائی ہے کہ ان کا ابن ابی حدرہ سے اختلاف ہوا...... تو آپ ﷺ نے انگلی کے نصف کی طرف اشارہ کیا، یعنی آدھا لے لیں۔ ایک دوسری حدیث وہ بھی صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

(( ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل فی حجتہٖ فقال ذبحت قبل ان ارمی

فاوما بیدہٖ فقال لاحرج۔ وقال الآخر حلقت قبل ان اذبح فاوْمابیدہٖ قال لاحرج ))

''نبی ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ دوران حج میں نے قربانی سے پہلے رمی کر دی ہے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا یعنی کوئی حرج نہیں اور دوسرا شخص آیا اس نے عرض کیا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈھا دیا ہے تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کوئی حرج نہیں۔''

ایک اور حدیث صحیح بخاری میں بواسطہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ:

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یقبض العلم ویظھر الجھل والفتن ویکثر الھَرجُ قیل یا رسول اللہ وما الھرج فقال ھٰکذا بیدہٖ فحرفھا کانہٗ یرید القتل))

''نبی ﷺ نے فرمایا کہ علم قبض کیا جائے گا اور جہالت اور فتنے ظاہر ہو گے اور حرج زیادہ ہو جائے گا کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول حرج کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو گھمایا گویا کہ قتل کے متعلق بتا رہے ہیں۔''

صحیح بخاری میں سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الصید للمحرم أمِنکُم اَحَدٌ امرہٗ ان یحمل علیھا اواشارہ الیھا قالوا لا قال فکلوا )) [1]

''محرم کے لیے نبی ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی نے شکار پر حملہ کرنے کا حکم کیا تھا یا تم میں سے کسی نے اشارہ کیا تھا تو انھوں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر آپ وہ شکار کھا سکتے ہیں۔''

اس حدیث میں تو صراحت ہے کہ اشارہ کرنا بھی بمنزلہ کلام ہے۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں:

((عدَا یھودیٌ فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ جاریۃ فَأَخَذَ اَوضَاحًا کَانَتْ عَلَیھَا وَرَضَخَ رَأْسَھَا فاتی بہٖ أھلھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھی فی آخر رمق وقد اصمتت فقال لھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قتلك فلان لغیر الذی قتلھا فاشارت برأسھا ان لا فقال لرجل آخر غیر الذی قتلھا فاشارت أن لا فقال فلان لقاتلھا فاشارت ان نعم فامر بِہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرضخ رأسہٗ بین حجرین ))

[ بخاری، کتاب الطلاق باب الاستارۃ فی الطلاق والامور رقم الحدیث : ۵۲۹۵]

---

[1] بخاری کتاب جزاء الصید۔ رقم الحدیث : ۱۸۲٤.

”نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک یہودی نے ایک بچی پر ظلم کیا اس بچی کے کنگن چاندی کے تھے اس نے وہ بھی لوٹے اور اس کے سر کو پتھر سے کچل دیا۔ پھر اس کو اس کے اہل خانہ نبی ﷺ کے پاس لے کر آئے اس حال میں کہ وہ آخری سانس لے رہی تھی اور بے شک وہ خاموش بن چکی تھی تو اس کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے فلاں نے قتل کیا ہے یعنی آپ نے اس شخص کا نام لیا جس نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے سر سے اشارہ کیا کہ نہیں پھر آپ ﷺ نے ایک دوسرے شخص کا نام لیا جس نے اسے قتل نہیں کیا تھا تو اس نے اشارہ کیا کہ نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ فلاں نے جو اصل اس کا قاتل تھا تو اس نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے متعلق حکم فرمایا۔ اس یہودی کے سر کو دو پتھروں سے کچل دیا گیا۔“

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقتول بچی سے جب پوچھا گیا کہ تجھے فلاں نے قتل کیا ہے اور وہ اس کا قاتل نہ تھا تو اس نے اپنے سر سے انکار کیا، جب اس شخص کا نام لیا گیا جس نے اسے قتل کیا تھا، تب بھی اس نے سر کے ساتھ اشارہ کیا اور نبی ﷺ نے اس کے اشارہ کو کلام کی جگہ پر رکھ کر اس یہودی کو گھر سے طلب کر لیا، پھر اس نے اپنے جرم کو تسلیم کیا اور قصاص کو طور پر اس کے سر کو بھی پتھروں سے کچلا گیا۔

ان سب احادیث سے معلوم ہوا کہ اگر اشارہ ایسا واضح ہے کہ آسانی سے اس کا مطب سمجھا جا سکتا ہے تو ایسا اشارہ کلام کے قائم مقام ہے۔ اس سے چند مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ شیخ ابن القاسم نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اگر گونگا شخص اشارہ سے طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جس کی زبان میں بیماری کی وجہ سے خلل پیدا ہو گیا ہے اور وہ بات نہیں کر سکتا وہ بھی اشارہ سے طلاق دے سکتا ہے اور اشارہ سے رجوع بھی کر سکتا ہے اور امام ابو حنیفہ بھی فرماتے ہیں یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ اشارہ ایسا ہو جس کو سمجھا جا سکتا ہو اس کے مطلب میں شک پیدا نہ ہو اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کے مذاہب ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ بعض فروع میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسا اشارہ جو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے وہ کلام کے قائم مقام ہے۔ المواق رحمہ اللہ مذکورہ مسئلہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بات گونگے سے معلوم ہوتی ہے پھر چاہے اشارہ سے ہو یا لکھنے سے، بات طلاق کے متعلق ہو یا خلع کے متعلق یا آزاد کرنے کے متعلق یا نکاح کرنے یا خرید و فروخت کرنے یا کسی کے اوپر قذف لگانے سے متعلق ہو ان تمام معاملات میں مشیر (اشارہ کرنے والا) متکلم کے حکم میں ہے۔ اور علامہ باجی مالکی روایت کرتے ہیں کہ تندرست آدمی کا اپنے سر یا ہاتھ کے اشارہ سے طلاق اسی طرح ہے جس طرح زبان سے طلاق دینا اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ گونگے کا اشارہ تو متکلم کے قائم مقام ہو سکتا ہے مگر اپنے ذاتی تصرفات میں جس طرح غلام آزاد کرنا اور طلاق دینا اور خرید و فروخت کرنا اور اس قسم کی دیگر باتوں میں۔

مگر وہ شخص جو تندرست ہے یعنی بات کر سکتا ہے اس کا اشارہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اسی طرح گونگے اپنی بیوی پر تہمت کے متعلق اس میں بھی امام صاحب کے نزدیک حد نہیں اور نہ ہی لعان۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی ایک گونگا ہو تو اس صورت میں لعان نہیں ہوسکتا ہے باقی گونگے کی طلاق، نکاح اور اس مشابہ دیگر معاملات میں امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک بھی اشارہ کلام کے قائم مقام ہے باقی تندرست آدمی کا طلاق وغیرہ کا اشارہ کرنا امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کچھ باتوں میں اشارہ ائمہ اربعہ کے نزدیک تو تمام باتوں میں اشارہ کے قائم مقام ہے۔ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی مسلک معلوم ہوتا ہے کہ اشارہ ہر معاملہ میں حتیٰ کہ قذف اور لعان میں بھی مقبول ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر وہ اشارہ جو آسانی سے سمجھا جائے اور اس کے مطلب میں کچھ خفا نہ ہو اور وہ اپنے مطلب پر واضح دلالت کرتا ہو تو اس کے مقصود میں شک و شبہ پیدا نہ ہوتا ہو تو ایسا اشارہ مطلقاً کلام کے حکم میں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص جو تندرست یا گونگا کسی آدمی پر زنا کی تہمت لگائے تو شواہد پیش نہ کرنے کی صورت میں بھی اس پر حد نہیں لگے گی کیونکہ کسی پر تہمت زنا اشارے سے واضح طور پر لگائی جا سکتی ہے۔ یعنی ہاتھوں سے ایسا اشارہ کیا جا سکتا ہے جس سے ہر شخص با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ شخص فلاں پر تہمت زنا لگا رہا ہے۔ البتہ لعان والے مسئلہ میں ہمیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی بات میں وزن نظر آتا ہے کیونکہ مسئلہ لعان اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں اس طرح بیان کیا ہے جس میں اشارہ اس کے قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ یعنی لعان میں پہلے مرد کو چار مرتبہ اللہ کو شاہد بنا کر یہ اظہار کرنا ہے کہ وہ اپنے الزام میں سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ اس الزام میں جھوٹا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ اس قسم کا طریقہ اور لعان کا کورس زبان کے علاوہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں اشارہ ہرگز کافی نہیں۔ لہٰذا لعان کے مسئلہ کو چھوڑ کر دیگر مسائل میں ہم ان ائمہ و محدثین کرام کے ہمنوا ہیں جو مفہوم اشارہ کو نطق اور کلام پر محمول کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

﴿ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ○ يٰٓأُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴾ [مریم: ۲۷، ۲۸]

"پھر وہ آئی (مریم علیہا السلام) اپنی قوم کے پاس اس حال میں کہ اپنے نومولود بچے (عیسیٰ علیہ السلام) کو اٹھائے ہوئی تھی۔ تب اپنی قوم والوں نے کہا کہ اے مریم علیہا السلام تو نے تو بہت خراب اور بڑی بات کا ارتکاب کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا والد برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری والدہ کوئی بدکار تھی۔" سیدہ مریم علیہا السلام کی قوم والوں نے اس بات سے زنا ہی مراد لیا تھا، جیسا کہ آنے والی آیت کی تعریض اس پر دلالت کر رہی ہے:

﴿ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۵۶]

یعنی ان یہودیوں کا مریم علیہا السلام کے اوپر بہت بڑا بہتان تھا۔ ان کی قوم کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اے مریم تیرا خاندان جس مذہبی تقدس پر فائز ہے اور تیرے والدین بھی نیکوکار ہیں ان میں تو بدکاری والی بات کبھی بھی دیکھنے میں نہیں آئی، پھر تو نے یہ کیا کیا ہے کہ کنواری اور غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود یہ بچہ کہاں سے لے کر آ گئی۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ تو نے بدکاری کی ہے۔ اخت ھارون۔ ہارون کی بہن۔ اس سے مراد سیدنا ہارون علیہ السلام جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے وہ مراد نہیں کچھ لوگ اس آیت سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام والا بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام سمجھ بیٹھے ہیں اور پھر قرآن کریم پر اعتراض کر دیا ہے کہ مریم اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کتنے ہی سو سال ہیں پھر سیدہ مریم کو کس طرح سیدنا ہارون علیہ السلام کی بہن کہا گیا ہے۔ لیکن اصل حقیقت ان لوگوں سے اوجھل ہے اس لیے اپنی جہالت کی وجہ سے اس پر اعتراض کر دیا ہے اصل حقیقت کیا ہے اس کا بیان صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں ہے۔ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے صحیح مسلم کے الفاظ ہیں کہ:

(( ان المغيرة بن شعبة قال لما قدمت النجران سلوني فقالو انكم تقرؤن (( يا اخت هارون )) و موسىٰ قبل عيسىٰ كذاو كذا و لما قدمت على رسول الله صلى الله عليه وسلم سئلته عن ذالك فقال انهم كانوا يسمون انبيائهم و صالحين قبلهم))

یعنی جب میں نجران آیا تو وہاں کے عیسائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم یا اخت ہارون پڑھتے ہو۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے اتنا اتنا عرصہ پہلے گزر چکے ہیں (یعنی مریم علیہا السلام ہارون علیہ السلام کی بہن کس طرح ہو سکتی ہے) پھر جب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے یہی سوال آپ سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہ لوگ اپنی اولاد پر جو انبیاء اور صلحاء گزر جاتے ان کے نام رکھا کرتے تھے۔ اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ میں جو ہارون مذکور ہے وہ موسیٰ علیہ السلام کا بھائی نہ تھا بلکہ یہ دوسرا شخص مریم کے وقت میں تھا۔ جس پر اس کے رشتہ داروں نے سیدنا ہارون علیہ السلام والا نام رکھا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ یہ واضح ہو چکا کہ یہ دوسرا شخص تھا جو مریم کے وقت میں تھا تو پھر جاننا چاہے کہ اس کے متعلق علماء کے دو اقوال ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ ہارون علیہ السلام سیدہ مریم کا بھائی تھا۔ دیگر کہتے ہیں کہ وہ اس کا بھائی نہ تھا لیکن انھی کی قوم کا ایک صالح اور نیک آدمی اس ہی نام کا تھا۔ پھر جس طرح عام محاورات میں دور کے رشتہ داروں کو بھی بھائی کہا جاتا ہے اسی طرح سیدہ مریم کو بھی اس ہارون کی بہن کہا گیا۔ کیونکہ وہ بھی انھی کی قوم کا ایک فرد تھا۔ ہمیں یہ بات زیادہ انسب نظر آتی ہے کہ یہ ہارون سیدہ مریم کا بھائی ہی تھا جو نیک اور صالح تھا۔ چونکہ سیدہ مریم سیدنا ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے اس لیے سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا دوسرا

بھائی بھی تھا۔ جس پر اس کے والدین نے اپنے دستور کے مطابق کہ وہ اپنی اولاد پر گزشتہ انبیاء وصلحاء کے اسماء رکھا کرتے تھے اس لیے اس نے فرزند پر ہارون نام رکھا ہوگا۔ کیونکہ لفظ اخت کا حقیقی معنی بہن ہے اور یہاں پر کوئی ایسا قرینہ نہیں جس کی وجہ سے ہم اخت کے حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجاز یعنی ہارون کی عزیزہ (رشتہ دار) کریں۔ اس لیے ہمیں یہی بات صحیح نظر آتی ہے کہ اس آیت میں مذکورہ ہارون علیہ السلام سیدہ مریم علیہا السلام کا بھائی ہی تھا نہ کہ محض ان کی قوم کا فرد۔

﴿ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴾ [مریم: ۲۹]

''پھر اشارہ کیا سیدہ مریم نے اپنے بیٹے کی طرف تو انھوں نے کہا ہم کیسے بات کریں اسے جو گہوارہ میں بچہ ہے۔''

اس جگہ پر کان بمعنی مضارع کے ہے جو حال سے مقترن ہے۔ یعنی جو بالفعل ابھی گہوارہ میں جھولنے والا بچہ ہے۔ اس کے ساتھ ہم کس طرح بات کریں۔ ان کے اس کہنے سے معلوم ہوا کہ بی بی صاحبہ نے جو بچے کی طرف اشارہ کیا اس اشارہ کا مطلب بھی یہی تھا کہ تم اس بچے سے بات کرو تو یہ تمھیں اس امر کی حقیقت کی خبر دے گا اور بی بی صاحبہ کا اپنے بچے کی طرف اشارہ کرنے سے معلوم ہوا (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس کے متعلق عرض کی ہیں) کہ پہلی بار بی بی صاحبہ کو تسلی دینے والا وہ بچہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ہی تھا کیونکہ اگر وہ بات کرنے والا جبریل ہوتا تو بی بی صاحبہ اپنی قوم کے لوگوں کے پوچھنے پر اپنے بچے کی طرف اشارہ نہ کرتی۔ اس لیے کہ جبریل علیہ السلام نے تو صرف یہ سمجھایا تھا کہ آپ جب آدمی دیکھیں تو اسے کہنا کہ میں روزے سے ہوں۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گی اور اس میں یہ نہیں تھا کہ آپ اپنے بچے کی طرف اشارہ کرنا لیکن اگر وہ بات کرنے والا نومولود بچہ ہی تھا اس سے بی بی صاحبہ کو یہ رہنمائی مل سکتی ہے کہ میری قوم کے پوچھنے پر میں اس کی طرف اشارہ کروں گی تو یہ بات کرے گا۔ کیونکہ معجزانہ طور پر ان کی بات کرنا پہلے سن چکی تھی، اس لیے فوراً اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

کچھ لوگ جو معجزات کا انکار کرتے ہیں وہ اس آیت کے متعلق بھی تحریف اور تبدیلی سے کام لینے میں کمی نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ بی بی صاحبہ کے قوم کے لوگوں کا کہنا کہ ہم اس بچے سے کس طرح بات کریں یہ عیسیٰ علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد کا واقعہ ہے جو کچھ وقت پہلے جھولے میں جھول رہا ہے، اس سے ہم کیسے بات کریں۔ حالانکہ ان حضرات کو یہ بات سمجھ نہ آسکی کہ اس آیت کا سیاق وسباق اس پر واضح دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑی دیر بعد کا ہے۔ علاوہ ازیں آیت سے پہلے والی آیت (۲۷) آیت میں یہ الفاظ ہیں: ﴿فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ﴾ ''بی بی صاحبہ اپنے بچہ کو اٹھا لائی کیا ایک نوجوان بندے کو ماں کا اٹھا لانا کسی زمانے میں معہود ہے؟ ماں تو اس بچے کو اٹھا لاتی ہے جو چلنے پھرنے جیسا نہ ہو اور کافی چھوٹا ہو

مگر جوان ہونے کے بعد ماں کا بچے کو اٹھا لانا ایسا واقعہ کبھی بھی سننے میں نہیں آیا اور نہ یہ عادۃً ہوسکتا ہے۔ بہر حال ان حضرات کو اس قسم کی کارستانی محض قرآن کریم کی واضح آیات کو اپنی آرا فاسدہ کے پیچھے لگانے کی ناپاک کوشش ہے اور بس۔

﴿ قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾ [مریم: ۳۰]

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں جس نے مجھے کتاب دی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔''

سیدہ مریم علیہا السلام کے اپنے نومولود کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جب قوم والوں نے اعتراض کیا تب اس بچے نے بات کرنا شروع کی۔ (دوسری مرتبہ) اس کلام سے معلوم ہوا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے کلام میں سب سے پہلے اپنے متعلق اللہ کے بندہ ہونے کا اظہار کیا اور اس میں عیسائیوں پر رد ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خود اللہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں۔ اس طرح دیگر آیات بھی قرآن کریم میں موجود ہیں۔ مثلاً:

﴿ وَ قَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ﴾ [مائدہ: ۷۲]

اور آل عمران میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴾

اسی طرح سورۂ زخرف میں ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴾

[الزخرف: ٦٣، ٦٤]

ان تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے بچپنے سے بڑی عمر تک واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا اور جب یہ زمین پر تھے، کہتے رہے کہ وہ ایک اللہ کا بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کے بندوں کی ہدایت کے لیے رسول بن کر آیا ہے اور اللہ ہی اس کا اور ان سب کا رب ہے۔ اس لیے عبادت اسی کی کی جائے، یہی سیدھا راستہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی الوہیت کا دعویٰ تو دور مگر اپنی ما فوق الفطرۃ شخصیت ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اس طرح سورۂ مائدہ میں ہے کہ قیامت والے دن عیسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ میرے اور میری والدہ کی عبادت کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے اے اللہ تو پاک ہے مجھے یہ لائق نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ کچھ آگے فرماتے ہیں:

﴿ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ﴾ [المائدہ: ۱۱۷]

''اے اللہ میں نے وہی کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ یعنی اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا

رب ہے۔ جب تک میں ان کے ہاں موجود تھا ان پر گواہ رہا۔"

اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾

[النساء : ۱۷۲]

یعنی مسیح علیہ السلام خواہ اللہ کے مقرب فرشتے اس بات سے ہرگز انکار نہیں کرتے کہ اللہ کے بندے ہو کر گزاریں۔ مقصد کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ خالص توحید کی تبلیغ تھی اس میں الوہیت کے دعویٰ کا کچھ بھی شائبہ نہ تھا مگر بعد میں ان کے گمراہ پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کو بگاڑ کر رکھ دیا اور انھیں معبود بنا ڈالا۔ جب کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی زمینی زندگی والے دور میں ہمیشہ واشگاف الفاظ میں اپنے بندہ ہونے کا اور اللہ کے معبود ہونے کا اقرار کرتے رہے اور دوسروں کا اسی کی تبلیغ کرتے رہے یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جو شخص اپنی پوری زندگی اپنے بندے ہونے کا اقرار کرتا رہے اس کے جانے کے بعد خود اسے ہی معبود بنا لیا جائے۔ بہر حال عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ابتدائی کلام میں ہی اپنے متعلق بندہ ہونے کا اقرار کیا پھر فرمایا کہ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو وہ نبی ہو یا فرشتہ اس کی رسالت پر ایمان رکھنے سے پہلے اس کے بندے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے نبی ہونے کے بعد میں ذکر ہے پہلے اپنے بندے ہونے کا اقرار کرتا ہے اسی طرح ہمیں حکم دیا کہ التحیات میں اس طرح کہا کریں۔

(( وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ))

یعنی ہمیں پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کا ذکر کرنا ہے بعد میں آپ کی رسالت کا۔ درحقیقت جو شخص جتنا عبدیت، بندگی میں زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انسان کے کمال کا یہ آخری درجہ ہے اس کی پوری زندگی اللہ کی بندگی کی مظہر بن جاتی ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، بول چال، کھانا پینا مطلب کہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں عبدیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ پھر جس قدر بندگی میں زیادہ کمال حاصل کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر انعامات اور نوازشات کی بارش ہوتی ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر جس مقام پر کسی بڑی نعمت کا ذکر ہے وہاں آپ کو عبد کے لقب سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کی بحث ہم ابتدا میں عرض کر آئے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں تقریباً تمام انبیاء کو عبد کے لقب سے پکارا گیا ہے یہ سب بابرکت شخصیات عبدیت کے کمال کی ہی تھیں۔ مثلاً سورۂ صٓ میں سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان، سیدنا ایوب، سیدنا ابراہیم، سیدنا یعقوب علیہم السلام کو عبد کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لیے جاننا چاہیے کہ اس آیت کریمہ میں کتاب کے ملنے اور نبوت سے مشرف ہونے کے

متعلق جو کہ مستقبل میں ہونا تھا۔ ماضی کے صیغے لائے گئے ہیں۔

﴿ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴾ [مریم : ۳۰]

وہ اس لیے کہ علم البلاغۃ کا قاعدہ ہے اگر کوئی بات کوئی امر کوئی فیصلہ کوئی فضا اتنا ہی حتمی اور محقق الوقوع ہو کہ اس کے ٹلنے کا کوئی امکان نہ ہو وہ ضرور بالضرور وقوع میں آنے والی ہو تو اس کا ماضی کے صیغے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی گویا کہ وہ بات ہوگی نہیں بلکہ ہو چکی ہم اپنی مادری زبان میں بھی حتمی اور لازمی بات کے متعلق ماضی کے صیغے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے متعلق سولی پر چڑھے جانے کا فیصلہ پکا ہو چکا ہو اور اس کے لیے عدالت عالیہ میں اپیل وغیرہ کی کوئی گنجائش بھی نہ ہو تو ایسے فیصلہ کے متعلق اگرچہ وہ بالفعل وقوع پذیر نہ ہوا ہو تب بھی اس کے حتمی ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں تو سولی پر چڑھ گیا ہے یعنی سولی کا فیصلہ اتنا تو یقینی اور اٹل ہے اس لیے گویا کہ وہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ یہ تعبیر اس لیے استعمال ہوتی ہے کہ مستقبل والا کام جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا اس کے وقوع میں تردد ہو سکتا ہے لیکن ماضی والی بات جو ہو چکی ہے اس کے متعلق تو تردد کی کوئی گنجائش نہیں، یعنی ماضی کا صیغہ اس بات کے یقیناً وقوع میں آنے کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کی امثلہ بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً سورۂ نحل کی ابتدا میں ہے:

﴿ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ﴾ [النحل : ۱]

''اے کافرو اللہ کا امر آچکا ہے۔'' اس کے لیے جلد بازی مت کرو۔'' اس کی جگہ آئندہ امر کی جگہ پر اتیٰ ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اسی طرح سورۂ اعراف میں ہے:

﴿ وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ ﴾ [الاعراف : ٤٤]

یعنی جنتی لوگ جہنمیوں کو پکاریں گے، یعنی یہ گفتگو جنتیوں کی جنت میں جانے کے بعد ہوگی جو کہ ظاہر ہے کہ آنے والے وقت کی بات ہے لیکن اس کے لیے نادیٰ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس لیے کہ یہ خبر اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہے:

﴿ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴾ [النساء : ۸۷]

''اور اللہ سے بڑھ کر دوسرا کوئی سچا ہو ہی نہیں سکتا۔'' مطلب کہ یہ گفتگو جب ضروری اور یقینی ہونی ہے اس لیے اس مستقبل کے صیغے کی بجائے ماضی کے صیغے سے تعبیر کیا گیا۔ اس طرح کی دیگر کئی امثلہ موجود ہیں اس طرح اس آیت کریمہ میں بھی جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نبوت سے مشرف ہونے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ملنے کا ذکر ہے جو کہ دونوں یقینی امر ہیں اس لیے ان کو ماضی کے صیغے سے بیان کیا گیا۔

﴿ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴾

[مریم : ۳۱]

"مبارک کا" برکت والا، برکت میں رفعت عظمت، اضافہ۔ دوام اور ثبوت خیرات اور حسنات کی زیادتی یہ سب مفہوم اس میں شامل ہیں۔ یعنی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جہاں بھی ہوں برکت والا بنایا ہے، جب تک زندہ رہوں تب تک نماز اور زکوۃ کے حکم کا فہم عطا فرمایا ہے کہ نماز اور زکوۃ کو قائم کرتا رہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایسی شخصیت تھے جو بلند شان اور اپنی بزرگی کے باوجود دیگر انسانوں کے لیے باعث خیر اور بابرکت تھے، چنانچہ ان کی تعلیمات کے متعلق یہ بیان موجود ہے کہ وہ بابرکت شخصیت جب تک اس زمین پر رہی تب تک انھیں ایک اللہ کی عبادت اور نیک اعمال اور اخوت کی تعلیم اور سیدھے راستے کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں یہ بیان ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد نابینا اور کوڑی کے مریض کو اللہ کے حکم سے صحت یاب کرتے تھے اور مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتے تھے مطلب کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام روحانی خواہ جسمانی طرح اپنی قوم کے لیے بڑی خیر و بھلائی کا موجب تھے، جس طرح ان کی قوم نے ان کی والدہ پر الزام لگایا تھا تو انھوں نے اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور یہود کے نظریہ کے مطابق ناجائز مولود نبی نہیں ہوسکتا اور یہ بھی بتلایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی قوم کے لیے نفع بخش اور فائدہ مند بنایا ہے اور ان کے لیے خیر اور برکت کا باعث بنایا ہے، اس طرح ان کے چند الزامات کو پوری طرح ختم کر دیا۔ کیونکہ معاذ اللہ اگر وہ ناجائز مولود ہوتا تو بچپن کی حالت میں کلام نہ کرتا اور نہ اپنے لیے نبوت اور بابرکت شخصیت ہونے کا اثبات کرتا اور آگے وہ بات جو عام طور پر تمام انبیاء میں مشترک تھی یعنی نماز اور زکوۃ ان کا تذکرہ فرمایا یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے جسمانی اور مالی عبادت کا امر فرمایا قرآن کے تتبع کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے دین میں نماز کا حکم تھا۔ اگرچہ زکوۃ بھی تمام انبیاء کے دین میں موجود تھی مگر نماز ان سب سے اعلیٰ مرتبے پر تھی، اس سورہ میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے کہ:

﴿ وَ كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ ﴾ [مریم: ۵۵]

نماز کا حکم فرماتے تھے اور تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا کہ:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ [مریم: ۵۹]

یعنی ان انبیاء کرام علیہم السلام بندوں کے بعد کچھ ایسے نااہل اخلاف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ مطلب کہ تمام نیک اعمال میں سے نماز کے ضائع ہونے کا ذکر فرمایا گیا اسی طرح سورۂ ابراہیم میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا مذکورہ ہے۔

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴾ [ابراھیم: ۴۰]

"اے میرے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میرے اللہ میری دعا قبول فرما۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾

میرے یاد کے لیے نماز قائم کر۔ اور سورۂ انبیاء میں فرمایا:

﴿ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ [الانبیاء: ۷۳]

''یعنی سیدنا ابراہیم، سیدنا لوط، سیدنا اسحاق، سیدنا یعقوب علیہم السلام کی طرف ہم نے نیک کام کرنے کی وحی کی اور ان کاموں میں سے خاص طرح نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور یہ سب ہمارے عبادت گزار تھے۔''

اور فرمایا:

﴿ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ﴾ [آل عمران: ٤٠]

یعنی پھر پکارا اسے (زکریا علیہ السلام کو) فرشتوں نے اس حالت میں کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کے متعلق سورۂ ہود میں فرمایا:

﴿ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ ﴾ [هود: ۸۷]

یعنی انھیں ان کی قوم نے کہا کہ اے شعیب کیا تجھے تیری نماز حکم کرتی ہے کہ ہم وہ سب معبود ترک کر دیں جن کی پرستش ہمارے آباء واجداد کرتے رہے۔ یعنی شعیب علیہ السلام بھی نماز پڑھتے تھے۔

مطلب کہ نماز ایک اہم چیز ہے دین میں اس کا مقام ومرتبہ اتنا بلند ہے کہ نیک اعمال میں سے دوسرا کوئی بھی اس کے مرتبہ ومقام کو نہیں پہنچ سکتا، اسی لیے تمام انبیاء اور امتوں میں نماز کا امر تھا اور اس نماز کے متعلق کسی بھی شخص کے لیے مثلاً امیر یا غریب، بادشاہ یا رعایا حاکم یا محکوم میاں، بیوی، سفر یا حضر میں صحت خواہ بیماری کی حالت میں کوئی بھی فرق نہیں، البتہ اتنی آسانی کی گئی ہے کہ اگر بیمار کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، اگر بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں تو لیٹ کر اشاروں سے پڑھے۔

سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿ یا مریم اقنتی لربك واسجدی وار كعی مع الر كعين ﴾ اے مریم اپنے رب کی خشوع اور خضوع سے عبادت کرتی رہ سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جب تک ہوش ہے تجھے نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں، اس امت مرحومہ کی تو قیامت کے دن یہی نشانی ہوگی یعنی وضو اور سجدہ (نماز) کی وجہ سے اس کا منہ دونوں بازو دونوں پاؤں یہ پانچوں اعضاء چمکتے ہوں گے اور اس علامت سے وہ پہچانے جائیں گے کہ وہ سیدنا وامامنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔ دیگر امتوں میں یہ علامت نہیں ہوگی مطلب یہ ہوا کہ جو تارک نماز ہے اس میں یہ علامت ہی نہیں ہوگی اس لیے آپ کی ام...

سے خارج ہو جائے گا۔ نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترک نماز سے جس طرح ستون کے گرنے سے عمارت گر جاتی ہے، اس طرح اس کے دین کی عمارت بھی گر جاتی ہے۔ اس دنیا میں بھی کسی شخص کے اسلامی برادری میں شامل ہونے کے لیے بھی نماز اور زکوۃ ضروری ہیں۔ یعنی اگر یہ فریضہ بجا نہیں لائے جائیں تو وہ اسلامی برادری سے خارج ہیں۔ جس طرح سورۂ توبہ میں فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوۃَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ [التوبہ : ۱۱]

”پھر جب وہ مشرکین شرک سے توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو پھر وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔“

افسوس آج دیگر تو دور مگر تعلیم یافتہ حضرات کے نزدیک بھی نماز کی وہ اہمیت اور اعلیٰ مقام باقی نہیں رہا، اس لیے جو شخص پوری عمر بالکل نماز کے قریب ہی نہیں جاتے ان کے ساتھ بھی زندگی میں اسلامی برادرانہ سلوک اور مرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ بغیر پس و پیش اسی طرح پڑھتے ہیں گویا کہ ترک نماز کوئی بات ہی نہیں، حالانکہ نبی ﷺ نے کچھ بڑے گناہوں کی وجہ سے بھی ان پر نماز جنازہ ادا نہیں فرمائی۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے پڑھے لکھے بے نمازی پر نماز جنازہ اس لیے ترک کریں کہ ترک نماز تمام بڑے گناہوں میں بڑا گناہ ہے تاکہ کافی لوگ اپنی اس غلط روش سے باز آجائیں اور ان میں کافی نمازی بن جائیں۔ نماز کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ اس جگہ نماز کا صحیح طریقہ جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں سکھلایا ہے اس کا یہاں بیان کریں۔ اس مقام پر ہم پہلے پانچ وقتی نماز کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور پھر بعد میں اس کا صحیح طریقہ عرض کیا جائے گا۔

”وماتو فیقی الا باللہ ھو حسبی ونعم الوکیل“

## پانچوں نمازوں کا ثبوت قرآن کریم سے :

سورۂ ہود میں ہے :

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [ھود : ۱۱۴]

”نماز کو قائم کریں دن کے دو اطراف میں اور رات کے کچھ وقت میں۔“

دن کے دو اطراف سے مراد صبح اور شام ہے، یہ دن کے دو اطراف ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے :

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾ [الاسراء : ۷۸]

”نماز قائم کریں سورج کے ڈھلنے کے وقت رات کے اندھیرے تک۔“ اور صبح کی نماز اس آیت میں ظہر نماز اور رات کے اندھیرے والی نماز مذکور ہے جس سے عشاء نماز مراد ہے، اسی طرح نماز عشاء اور فجر کی صراحت ہے سورۂ نور میں تصریح ہے :

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْکُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِّنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ ﴾ [النور: ۵۸]

''اے ایمان والو تمھارے غلاموں اور نابالغ بچوں کو بھی تمھارے پاس آنے کے لے تین اوقات میں اجازت لے کر پھر آنا چاہیے ① فجر کے نماز سے پہلے ② دوپہر کی گرمی کے وقت جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو ③ عشاء کے بعد۔''

اس آیت کریمہ میں تین نمازوں کی صراحت ہے: ① فجر ② ظہر ③ عشاء۔ سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ﴾ [البقرہ: ۲۳۸]

''نمازوں کی حفاظت کرو خاص طور پر عصر نماز کی۔''

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ نماز کے اوقات ثابت ہوئے اور یہ آیت بتلاتی ہے کہ ان نمازوں میں ایک نماز درمیانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ چار کا وسط نہیں ہوتا، اس لیے ضرور ماننا پڑے گا کہ ان چار کے علاوہ ایک دوسری نماز بھی ہے جس سے مل کر پانچ ہوگئیں، پھر ان پانچ نمازوں میں سے کسی کو بھی درمیانی نماز بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن صحیحین، مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابوداود وغیرہ میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ صلاۃ الوسطیٰ یعنی درمیانی نماز عصر کی نماز ہے، اسی طرح مسند احمد اور ترمذی میں سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتلایا کہ صلاۃ الوسطیٰ صلاۃ العصر ہے، اسی طرح ابن جریر رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت لائی ہے کہ صلاۃ الوسطیٰ صلاۃ العصر ہے، بہرحال اس مضمون کے متعلق دیگر کئی روایات مروی ہیں ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صلاۃ الوسطیٰ، یعنی درمیانی نماز عصر نماز ہے۔ نماز کے طریقہ کو شروع کرنے سے پہلے نماز کے لیے وضو کا طریقہ بیان کرنا ضروری ہے۔

### وضو کا بیان:

وضو کے لیے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ دل میں ارادہ کرے۔ جیسا کہ صحیحین میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ )) [متفق علیه]

''تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے۔'' یعنی تمام اعمال نیت سے درست ہوتے ہے۔

وضو بھی ایک عمل ہے اس لیے اس کے لیے بھی نیت ضروری ہے، دوسری بات یہ کہ وضو کی ابتدا میں بسم اللہ کہنا بھی ضروری ہے، جیسا کہ ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

(( لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه ))

''اس شخص کا وضو نہیں ہوا جس نے وضو پر اللہ کا نام نہیں لیا۔''

یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے محققین کے نزدیک حسن درجہ کی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی علل میں امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اس باب میں سیدنا سعید بن زید والی حدیث سے زیادہ کوئی بھی حدیث حسن نہیں ہے۔ وضو سے پہلے بسم اللہ کا امر دیگر کئی روایات صحیحہ میں موجود ہے جس طرح طبرانی صغیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( قال رسول الله يا ابا هريرة اذا توضأت فقل بسم الله والحمدلله فان حفظتك لاتبرح تكتب لك الحسنات حتى تحدث من ذالك الوضوء ))

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! جب آپ وضو کریں تو بسم اللہ والحمد للہ پڑھ لیا کرو، پھر آپ کے اوپر اللہ تعالیٰ کے محافظ فرشتے مقرر کر دیے جائیں گے وہ آپ کے لیے نیکیاں لکھتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بے وضو ہو جائیں۔''

علامہ ھیثمی نے اپنی کتاب مجمع الزوائد جلد ۱ میں اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ اسنادہ حسن، یعنی اس کی سند حسن ہے۔ اس حدیث میں صراحتاً وضو سے پہلے بسم اللہ کہنے کا امر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ کے ساتھ والحمد للہ کے الفاظ ملانا زیادہ مناسب ہیں۔ دوسری حدیث امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سنن الکبریٰ جلد اول میں بسم اللہ کہنے کے متعلق سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر پر تھے پھر وضو کے لیے پانی کی کمی ہو گئی، پھر صحابہ پانی کی طلب میں نکلے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کسی کے پاس کچھ پانی ہے یہاں تک کہ پانی لایا گیا۔ ((فوضع يدهٗ في الماء ويقول توضوأ بسم الله ورأيت الماء يخرج من بين اصابعه)) [الحديث]

پھر آپ نے اپنا ہاتھ مبارک پانی میں رکھا اور فرمایا کہ بسم اللہ کہہ کر وضو کرو۔ راوی کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ پانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پھوٹ رہا تھا اور اسی حدیث کی سند بھی صحیح ہے بہر حال صحیح بات یہی ہے کہ وضو سے پہلے بسم اللہ کہنا ضروری ہے، اگر بسم اللہ نہ کہی تو وضو نہیں ہو گا۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ وضو میں سر کے علاوہ دیگر تمام اعضاء کو تین تین مرتبہ دھونا بھی مروی ہے، اور یہی کامل وضو ہے جیسا کہ صحیحین میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زید سے اور ابوداؤد وغیرہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مسند احمد اور نسائی میں بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آخری الفاظ اضافی ہیں۔

(( فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا فَقَدْ اَسَاءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ ))

”جس نے تین مرتبہ سے زیادہ وضو میں پانی استعمال کیا تو بے شک اس نے برا کام کیا اور حد سے تجاوز کر گیا اور ظلم کیا۔“

اس حدیث کی امام ابن خزیمہ نے تصحیح کی ہے اور مذکور حدیث کی سند بھی صحیح ہے۔ مطلب کہ اسباغ الوضو تین مرتبہ دھونے میں ہے، مگر اس سے کم مرتبہ دھونا بھی جائز ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری اور سنن کبریٰ نسائی میں نبی ﷺ سے اعضا وضو ایک مرتبہ دھونا بھی ثابت ہے اور اسی طرح نبی ﷺ سے دو دو مرتبہ اعضاء وضو دھونا بھی ثابت ہے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت مروی ہے جو صحیح بخاری میں ہے اسی طرح نبی ﷺ سے کچھ اعضاء کا تین مرتبہ اور کچھ کا دو مرتبہ بھی ثابت ہے جس طرح اسی صحابی عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے صحیحین اور السنن الکبری للنسائی میں موجود ہے۔

**وضو کا طریقہ:**

اس کے بعد وضو کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ہاتھوں کو تین مرتبہ دھو کر انگلیوں میں خلال کرے، پھر ایک چلو سے کلی اور ناک میں پانی چڑھائے پھر تین مرتبہ ناک جھاڑے پھر تین مرتبہ چہرہ دھوئے پھر دونوں ہاتھ ملا کر پانی داڑھی کے نیچے تک پہنچائے، پھر تین مرتبہ خلال کرے، جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد اور مسند ابی یعلیٰ میں حسن سند کے ساتھ مروی ہے، اس کے بعد پہلے تین تین مرتبہ سیدھا بازو پھر الٹا بازو دھوئے پھر تھوڑا سا پانی لے کر سر کا مسح ایک مرتبہ کرے جیسا کہ ابو داؤد میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں۔

((وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً ثُمَّ قَالَ هٰذَا وُضُوْءُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ))

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سر کا مسح کیا ایک مرتبہ پھر فرمایا کہ اسی طرح نبی ﷺ کا وضو ہوا کرتا تھا۔“

اور سر کے مسح کی کیفیت جو سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوئی ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔ اس میں اس طرح ہے کہ آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی ابتدا سے لے گئے گدی تک اور پھر وہاں سے لوٹائے سر کی ابتدا تک اور صحیح طور پر کانوں کا مسح بھی سر کے مسح کے لیے، لیے گئے پانی سے ثابت ہے، جس طرح تمام صحیح احادیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے باقی جس حدیث میں ہے کہ آپ نے کانوں کے مسح کے لیے الگ سے پانی لیا اس حدیث کو محدثین نے شاذ قرار دیا ہے اور شاذ بھی ضعیف حدیث کی ایک قسم ہے۔ کانوں کے مسح کی کیفیت یہ ہے کہ شہادت کی انگلی سے کانوں کا اندرونی حصہ اور انگوٹھے سے باہر والے حصے کا مسح کیا جائے، اس کے بعد پہلے دایاں پاؤں، پھر بایاں پاؤں تین تین مرتبہ دھوئے اور انگلیوں کے درمیان خلال کرے جس طرح سیدنا لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے اسے وضو کے متعلق سمجھایا جس میں یہ الفاظ ہیں۔

(( وَخَلِّلْ بَيْنَ الْاَصَابِعِ وَبَالِغْ فِي الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ صَائِمًا ))

''اپنی انگلیوں کے درمیان خلال کریں اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کریں مگر آپ روزے سے ہوں۔''

یہ روایت ترمذی، ابوداؤد، احمد، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے اور ترمذی حاکم اور ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔

**فائدہ نمبر ۱:**

اوپر ہم کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کے متعلق لکھ آئے ہیں کہ دونوں ایک ہی چلو سے کیے جائیں۔ حدیث کی تمام کتب میں صحیح سند کے ساتھ جو احادیث مروی ہیں ان سب میں یہی مروی ہے راقم الحروف کہتا ہے کہ آج تک مجھے کوئی بھی ایسی حدیث نظر نہیں آئی جس کی سند بھی صحیح ہو اور اس میں کلی اور ناک کو الگ الگ پانی دینے کا بیان ہو سنن ابی داؤد میں ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کلی اور ناک کے لیے الگ الگ پانی لیا لیکن اس کی سند بالکل ضعیف اور نا قابل استدلال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

**فائدہ نمبر ۲:**

اوپر چہرہ دھونے کا ذکر ہے۔ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو ابن ماجہ ابوداؤد وغیرہ میں ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ آنکھوں کے کناروں کو اچھی طرح صاف کرتے تھے۔

**فائدہ نمبر ۳:**

اوپر بازو دھونے کا ذکر گزر چکا، بازو دھونے کی حد کہنی ہے یعنی کہنیاں بھی دھونی چاہییں۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو صحیح مسلم میں ہے اس میں ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور جب بازو دھوئے تو کہنیوں سے اوپر دھوتے چلے گئے، اسی طرح پاؤں دھونے میں ٹخنے دھوئے جائیں گے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ جب آپ نے پاؤں چھوئے تب ٹخنوں سے اوپر تک دھو دیے آخر میں فرمایا کہ:

(( هكذا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ))

صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( رأيت النبي صلى الله عليه وسلم يتوضا فجعل يدلك ذراعيه ))

''عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ وضو کرتے ہوئے اپنے بازوؤں کو رگڑ رہے تھے۔''

اس سے معلوم ہوتا کہ وضو میں پانی کے ساتھ بازوؤں کو رگڑنا سنت ہے۔

**فائدہ نمبر ۴:**

اوپر سیدنا لقیط بن سبرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر آئے ہیں جو ابوداؤد میں ہے اور اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( اذا توضأت فمضمض ))

''جب وضو کریں تو کلی کریں۔'' مطلب یہ ہوا کہ وضو میں کلی کرنا ضروری ہے۔

**فائدہ نمبر ۵:**

داڑھی کا خلال کرنے کے متعلق نبی کریم ﷺ سے عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ:

(( اِنَّہٗ کَانَ یُخَلِّلُ لِحیَتَہٗ ))

''آپ ﷺ وضو میں داڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔''

یہ روایت ابن ماجہ، ترمذی اور ابن خزیمہ میں ہے اور امام ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں سب سے زیادہ صحیح یہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ کلام امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور اوپر ابوداؤد اور مسند ابی یعلیٰ کے حوالہ سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت گزر چکی ہے جس میں ہے کہ پانی کا چلو لے کر داڑھی کے نیچے لگاتے تھے اور بعد میں خلال کرتے تھے اس حدیث کے آخر میں ہے۔ '' اَمَرَنِی رَبِّی ''یعنی میرے رب نے مجھے داڑھی کا خلال کرنے کا اس طرح حکم فرمایا ہے اس حدیث کی کتنے ہی محدثین نے تحسین کی ہے۔ مثلاً حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب النکت میں اور مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے اپنی کتاب غایۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور عصر حاضر کے محقق علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے طرق اور شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مشکوٰۃ المصابیح بتحقیق الألبانی ص ۱۲۹ ج ۱۔

**فائدہ نمبر ۶:**

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی نہیں لیا جائے گا بلکہ وہی پانی جس سے سر کا مسح کیا ہے اسی سے کانوں کا مسح کیا جائے گا، اس کے لیے درج ذیل حدیث بھی دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( الاذنان من الرأس ))

''کان سر ہی میں سے ہیں۔''

اس سے دو مطلب واضح ہوئے ① یہ کہ جب کان سر کا حصہ ہیں تو جب سر کا مسح فرض ہے تو کانوں کا مسح بھی ضروری ہوا۔ ② جب کان سر کا حصہ ہیں تو سر کے مسح کے لیے لیا ہوا پانی کانوں کے لیے بھی کافی ہوگا۔ یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے ان سب میں سے دو تین صحیح ہیں۔ ① ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد، طحاوی میں ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(( اَلْاُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ ))

اور یہ حدیث اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے۔ کچھ محدثین نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے لیکن علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کو موقوف بیان کرنے میں سلیمان بن حرب منفرد ہے۔ ادھر راویوں کی ایک جماعت اس کو مرفوع کہتی ہے اور جماعت کی روایت ایک کی روایت سے اولیٰ ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ ترمذی شریف کے بعض نسخوں میں امام ترمذی کی تحسین مذکور ہے۔ اسی طرح علامہ منذری، ابن دقیق العید، ابن ترکمانی، زیلعی نے بھی اس حدیث کو قوی قرار دیا ہے اور امام احمد نے بھی اس کی تقویت کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ شیخ اثرم نے اپنی سنن میں اس حدیث کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

" سَمِعْتُ ابا عبدالله يسئل الاذنان من الرأس؟ قال نعم "

''میں نے ابوعبداللہ یعنی امام احمد سے سنا آپ سے پوچھا کہ کیا کان سر کا حصہ ہیں؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا جی ہاں۔''

ملاحظہ ہو علامہ البانی رحمہ اللہ کی کتاب الاحادیث الصحیحہ ج ۱ ص ۴۷۔

**نمبر۲:**

دوسرا طرق سنن دارقطنی میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے درج بالا متن کے ساتھ مرفوعاً روایت مروی ہے، محققین کی تحقیق کے مطابق اس حدیث کی سند بھی صحیح ہے اگرچہ اس سند کے متعلق امام دارقطنی نے کلام کیا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے لیکن اس پر امام ابن الجوزی نے اپنی کتاب التحقیق میں اور علامہ البانی نے اپنی کتاب الاحادیث الصحیحہ میں تعاقب کیا ہے اور اس کا کافی وشافی جواب دیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے علاوہ ایک اور طرق بھی مروی ہے جو امام طبرانی نے اپنی کتاب المعجم الکبیر میں ذکر کیا ہے جس کی سند صحیح اور سند کے رجال سب کے سب ثقہ ہیں۔ علامہ البانی کے بقول اس حدیث میں کوئی بھی ایسی علت نہیں جو موجبِ ضعف ہو بہر حال یہ حدیث اپنے ان دو تین طرق سے صحت کے درجہ کو پہنچتی ہے اور قابل حجت ہے اس حدیث کے متعلق پوری طرح شرح صدر کے لیے علامہ البانی کی کتاب الاحادیث الصحیحہ کا صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۵۷ تک مطالعہ کرنا نہایت مفید ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

**فائدہ نمبر۷:**

کانوں کے مسح کی کیفیت جو اوپر ذکر کی گئی وہ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے اور ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور مسند احمد وغیرہم میں موجود ہے۔

**فائدہ نمبر۸:**

اوپر ہم نے پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا ذکر کیا ہے یہ روایت سیدنا مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بیان کرتے ہیں کہ:

(( رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا توضأ یدلك اصابع رجلیہ بخنصرہ ))

''میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ نے وضو کیا تو پاؤں کی انگلیوں کا ہاتھوں کی چھوٹی انگلی سے خلال کیا۔''

یہ روایت ابوداؤد اور ابن ماجہ میں مروی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔

### فائدہ نمبر ۹:

وضو کے ان تمام اعضاء کو دھونے میں ابتدا دائیں طرف والے عضو سے کی جائے گی۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

((کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یُعجِبُ التیمن فی تنعلہٖ و ترجلہٖ و طھورہٖ وفی شائنہٖ کلہٖ )) [رواہ البخاری ومسلم]

''نبی کریم ﷺ ہر معاملے میں دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے، یعنی چپل پہننے میں کنگھی کرنے میں اور پاکیزگی حاصل کرنے اور تمام معاملات میں سیدھی طرف سے شروع کرتے تھے۔''

### فائدہ نمبر ۱۰:

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے حالانکہ پاؤں پر درہم کے بقدر ایسی جگہ ہے جہاں پانی نہیں پہنچا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے وضو اور نماز لوٹانے کا حکم فرمایا یہ روایت امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ لائے ہیں مگر امام احمد کی روایت میں نماز کا ذکر نہیں صرف وضو کا ذکر ہے المرّی میں شیخ اثرم سے نقل کرتے ہیں کہ:

'' قُلتُ لِاحمَدَ أَھٰذا اِسناد جَیّد قال نَعَم ''

میں نے امام احمد سے گزارش کی کہ کیا یہ اسناد عمدہ ہے؟ امام صاحب نے فرمایا، ہاں۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عضو کو مکمل دھویا نہیں گیا اور کچھ حصہ بغیر دھونے کے رہ گیا ہے تو اسے وضو اور نماز دوبارہ پڑھنی چاہیے۔

### فائدہ نمبر ۱۱:

مستدرک حاکم، ابن السنی اور نسائی میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے حسن درجہ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ وضو فرماتے تھے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ اس وقت یعنی وضو کے دوران یہ دعا پڑھ رہے تھے:

(( اللھم اغفرلی ذنبی ووسع لی فی داری وبارك لی فی رزقی ))

''اے میرے رب میرے گناہ معاف فرما اور میرے لیے میرا گھر وسیع کر اور میرے رزق میں برکت عطا فرما۔''

## فائدہ نمبر۱۲:

وضو کے بعد صحیح مسلم میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کے بعد یہ دعا پڑھی:

(( اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك لهٗ واشهد ان محمداً عبدهٗ ورسولهٗ ))

تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔

وضو کے بعد ایک اور دعا بھی ثابت ہے۔ سنن نسائی، طبرانی اوسط میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے وضو کے بعد یہ دعا پڑھی:

(( سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك ))

تو یہ دعا اوپر لکھ دی جاتی ہے اور سیل مہر لگتی ہے اور عرش کے نیچے رکھ دی جاتی ہے اور پھر قیامت کے دن وہ سیل توڑی نہیں جائے گی۔

## فائدہ نمبر۱۳:

وضو کے متعلق ایک اہم روایت السنن الکبریٰ للبیہقی وغیرہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

(( انه اتى بوضو اواتى باناء فيه ماء فافرغ على يديه من الاناء فغسلهما ثلاثا قبل ان يدخل يده فى الاناء فادخل يدهٗ اليمنىٰ فى الاناء فَمَلَأَ فَمَهٗ فَتَمَضْمَضَ واستنشق واسْتَنْشَرَ بيدهٖ اليسرىٰ ففعلهٗ ذالك ثلاثا ثم ادخل يدهٗ فى الاناء فغسل وجههٗ ثلاثا ثم غسل يدهٗ اليمنىٰ ثلاث مرات الى المرفق ثم غسل يدهٗ اليسرىٰ ثلاث مرات الى المرفق ثم ادخل يدهٗ اليمنىٰ فى الاناء حتى غمرها الماء فدفعها بما خملت من الماء ثم مسحها بيدهٖ اليسرىٰ ثم مسح رأسهٗ بيديه كلتيهما مرةً ثُمَّ صَبَّ بِيَدِهٖ اليمنىٰ علىٰ قدمهٖ اليسرىٰ ثلاث مرات ثم غسلها بيده اليسرى ثم قال هذا طهور رسول الله صلى الله عليه وسلم )) [1]

”علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس وضو کا پانی لایا گیا یا برتن لایا گیا جس میں پانی تھا پھر آپ رضی اللہ عنہ نے برتن سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالا اور ان کو تین مرتبہ دھویا۔ انھیں برتن میں داخل کرنے سے پہلے پھر دائیں ہاتھ کو برتن میں داخل کیا اور پانی لے کر کلی کی اور ناک کو جھاڑا اور صاف کیا بائیں ہاتھ سے تین مرتبہ پھر تین مرتبہ چہرے کو دھویا پھر دائیں ہاتھ کو کہنی تک تین مرتبہ دھویا پھر بائیں کو اسی طرح تین مرتبہ پھر دائیں ہاتھ کو پانی میں داخل کیا پھر اسے اٹھایا اور بائیں پر مل کر سر کا مسح کیا،

---

[1] بيهقى۔ كتاب الطهارة باب كيفية المفهة والاستنشاق .

دونوں ہاتھوں سے ایک مرتبہ پھر دائیں ہاتھ سے دائیں پاؤں پر پانی بہا کر اسے بائیں ہاتھ سے دھویا پھر اسی طرح بائیں پاؤں کو دھویا پھر فرمایا یہی رسول اللہ ﷺ کے وضو کا طریقہ ہے۔"

اس حدیث سے چند فوائد معلوم ہوئے:

① تمام اعضاء میں دھونے میں سیدھے ہاتھ کو استعمال کیا جائے گا۔

② کلی اور ناک کو پانی بھی سیدھے ہاتھ سے لگایا جائے گا۔

③ ناک کو الٹے ہاتھ سے جھاڑنا ہو گا اور وہ بھی تین مرتبہ۔

④ سیدھے اور الٹے پاؤں پر پانی سیدھے ہاتھ سے ڈالا جائے اور الٹے ہاتھ سے دھویا جائے۔

❀❀❀❀

# نواقض الوضو کا بیان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لَا تُقبلُ صَلوٰۃ مَن اَحدَث حَتیٰ یَتوضأَ ))

''بے وضو آدمی کی نماز اس وقت قبول نہیں ہوتی جب تک وہ وضو نہ کرے۔''

اب دیکھنا یہ ہے کہ کونسی باتوں سے انسان بے وضو ہوتا ہے۔ ① انسان کے مقعد سے خارج ہونے والی ریح خواہ وہ آواز کے ساتھ ہو یا بے آواز۔ صحیح ابن خزیمہ وغیرہ میں حسن سند کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لا یزال العبد فی الصَّلوٰۃِ ما کانت تَحبِسُہُ مالم یحدث والاحداث ان یغسوا اویضرط انی لا استحی من مالم یستحی منہ رسول اللہ ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو مسجد میں نماز کا انتظار روکا ہوا ہے تو وہ نماز ہی میں ہے جب تک بے وضو نہیں ہوتا اور بے وضو ہونا یہ ہے کہ اس کے مقعد سے ہوا خارج ہو خواہ وہ بے آواز ہو یا آواز کے ساتھ بے شک میں ایسی بات بیان کرنے سے حیا نہیں کرتا جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا نہیں کیا۔''

ان پچھلے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے وضو ہونے کی تفسیر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے اسی طرح صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لَا وُضوءَ اِلَّامِن صَوتٍ اَو رِیحٍ ))

''وضو نہیں مگر آواز سے یا بد بو سے۔''

لیکن یہ حدیث مختصر ہے اس کا تعلق مسجد میں موجود شخص سے یا نماز میں مشغول ہونے والے سے ہے۔ ریح کے متعلق ایک دوسری حدیث سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اِذَا فَسَاأَحَدُکُم فلیتوضأ وَلَا تاتُوا النِّسآءِ فِی اِعجازِ ھِنَّ ))

''جب تم میں سے کوئی شخص (ہوا خارج ہونے کی وجہ) سے بے وضو ہو جائے تو اسے چاہیے وضو کرے اور عورتوں کے پیچھے سے نہ آؤ۔''

یہ روایت ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کی ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ اسی

طرح صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن زید بن مازن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(( لا ینصرف حتی یسمع صوتا اویجد ریحا ))

مسجد میں یا نماز میں کوئی شخص ہو اور اسے شک ہو جائے کہ اس کی وضو (ریح کے خروج کی وجہ سے) ٹوٹ چکا ہے۔ تو اسے چاہیے کہ نماز کو جاری رکھے یہاں تک کہ آواز سنے یا بدبو محسوس کرے۔ اسی طرح صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( إِذَا وَجَدَ احدکم فی بطنہٖ شیاً فاشکل عَلَیۡہِ أخرج منہ شیءٌ اولم یخرج فلایخرجن حتی یسمع صوتا اویجد ریحا ))

''تم میں سے کسی کو پیٹ میں کوئی گڑبڑ محسوس ہو پھر اسے اشکال پیدا ہو جائے کہ اس سے ہوا خارج ہوئی ہے یا نہیں تو اسے چاہیے کہ مت نکلے یہاں تک کہ آواز سنے یا بدبو محسوس کرے۔''

② بے وضو ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کی وجہ سے بھی انسان بے وضو ہو جاتا ہے۔ اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ ﴾ [ النساء : ٤٣ ]

یعنی اللہ تعالیٰ وضو کے وجوب یا پانی کی عدم موجودگی کے باوجود اور تیمم کے وجوب کو دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ قضائے حاجت کے ساتھ بھی معلق کیا ہے، یعنی جو شخص قضائے حاجت سے فارغ ہو تو اس پر پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم واجب ہے۔ اسی طرح امام شافعی، امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی اور بیہقی نے مشہور تابعی ذر بن حبیش سے ایسی سند سے جس کی بقول امام ترمذی امام بخاری رحمہ اللہ نے تحسین کی ہے اور خود امام ترمذی نے بھی اسے صحیح کہا ہے اور تابعی سیدنا صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں صفوان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا کہ ان سے موزوں پر مسح کے متعلق پوچھوں پھر مجھ سے انھوں نے پوچھا کہ آپ کونسی چیز لے کر آئی ہے، میں نے کہا علم کی طلب پھر فرمایا، اے ذر بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے طالب علم سے طلب علم کی وجہ سے راضی ہو کر اپنے پروں کو ان کی عزت افزائی کے لیے بچھاتے ہیں۔ ذر نے کہا مجھے قضا حاجت کے بعد موزوں کے مسح کے متعلق دریافت کرنا ہے۔ آپ نبی ﷺ کے صحابہ میں سے ہیں کیا آپ نے رسول اکرم ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سنا ہے؟ صفوان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں۔ آپ ﷺ ہمیں حکم فرماتے کہ جب ہم سفر پر ہوں یا اس طرح کہا کہ جب ہم مسافر ہوں تو اپنے موزے نہ اتاریں تین دن اور تین راتیں مگر غسل جنابت کی وجہ سے مگر قضاء حاجت یا پیشاب یا نیند کے وقت موزوں کو اتارنے کی ضرورت نہیں ان پر صرف مسح کرتے رہیں۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ قضا حاجت یا پیشاب اور نیند کے وقت وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نیند کے

متعلق تفصیل ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

③ مذی نکلنے کی وجہ سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے۔ مذی وہ پانی ہے جو جماع کے ارادہ کے وقت خارج ہوتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے:

(( كُنت رَجُلا مَذّاءً فكنت أستحي ان اسألَ النبي صلى الله عليه وسلم لمكان ابنتهٖ مني فامرت المقداد فسألهٗ فقال يغسل ذكرهٗ ويتوضأ ))

''میں بہت زیادہ مذی والا شخص تھا اور نبی ﷺ سے پوچھنے میں حیا محسوس کرتا تھا کیونکہ آپ ﷺ کی بیٹی میرے گھر میں تھی۔ پھر میں نے مقداد رضی اللہ عنہ کو کہا کہ آپ پوچھ کر آئیں، پھر اس نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا شرمگاہ کو دھوئے اور وضو کرے۔''

اسی طرح صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں بہت زیادہ مذی والا آدمی تھا۔ پھر اس وجہ سے میں موسم سرما میں بھی غسل کرتا تھا اور اس وجہ سے میرے جسم پر سردی کی وجہ سے نشان وغیرہ رہ جاتے، پھر میں نے یہ بات نبی ﷺ کو بتائی تو آپ نے فرمایا:

(( فَاغسِل ذَكَرك وَتوضأ وضوئك للصلاة فاذا انبَحَستِ الماء فاغتسل ))

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ ایسا نہ کریں جب مذی دیکھیں تو اپنے ذکر کو دھوئیں اور وضو کریں۔ پھر جب پانی نکلے یعنی منی تو پھر غسل کریں۔''

حافظ ابن حجر تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ امام ابوعوانہ اپنی صحیح میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اسی سند کے ساتھ جس میں کوئی عیب نہیں یہ زیادتی نقل کی ہے کہ:

(( يغسل انثييه و ذكرهٗ ))

''مذی کی حالت میں شرم گاہ اور خصیتین کو دھوئے۔''

مطلب کہ مذی نکلنے کی صورت میں ایک تو اپنے ذکر اور خصیتین کو دھوئے اور وضو کرے جب مذی کپڑے پر لگ جائے تو اسے دھویا جائے۔ جس طرح صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں حسن سند کے ساتھ سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے مذی کی وجہ سے بہت شدت اور تکلیف پہنچتی تھی اور میں زیادہ تر اس سے غسل کرتا تھا، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ آپ کو صرف وضو کافی ہے، غسل کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے کہا اگر مذی کپڑے کو لگ جائے تو پھر کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( يكفيك اَنْ تأخذ كفا من ماء فتنضح به من ثوبك حيث ترىٰ انهٗ اصاب ))

''یعنی تجھے یہ بات کافی ہے کہ کپڑے پر جس جگہ پر مذی لگی ہوئی ہو تو اس پر پانی چھڑک دے۔''

④ مرد یا عورت حائل یا پردے کے بغیر اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگائے تو اس کا وضوٹوٹ جائے گا۔

سیدہ سبرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا مس احدکم ذکرہٗ فلیتوضأ ))

''تم میں سے جو کوئی اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو اسے چاہیے کہ وضو کرے۔''

یہ روایت امام مالک، امام احمد، ابوداوٗد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کی ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ روایت حسن صحیح ہے اور علامہ البانی فرماتے ہیں اسی طرح ہی ہے جس طرح امام ترمذی نے فرمایا ہے اور دیگر کئی حضرات نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ سیدہ سبرہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں روایت مروی ہے:

(( قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا مس احدکم فرجہٗ فلیتوضأ والمرأۃ مثل ذالك ))

''جب تم میں سے کوئی اپنے شرمگاہ کو چھوئے پس چاہیے کہ وہ وضو کرے اور اسی طرح عورت بھی اس حکم میں شامل ہے۔''

ایک اور حدیث صحیح ابن حبان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حسن سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا افضیٰ احدکم بیدہ الی فرجہٖ لیس بینھما ستر ولا حجاب فلیتوضأ ))

''تم میں سے کوئی شخص اپنے ہاتھ کو شرمگاہ تک پہنچائے اس حالت میں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حائل یا پردہ نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وضو کرے۔''

معلوم ہونا چاہیے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سن سات ہجری کو مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اس لیے یہ حکم آخری قرار دیا جائے گا، لیکن کچھ محدثین اور علماء احناف کا یہ مسلک ہے کہ شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ضروری نہیں، ان کی دلیل سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ :

(( سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن مس رجل ذکرہٗ بعد مایتوضأ قال وھل ھو بضعۃ منك ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بھی تو اسی کے جسم کا ٹکڑا ہے یعنی جس طرح جس کے دوسرے کسی حصے کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو اسی طرح ذکر کو چھونے سے بھی نہیں ٹوٹتا۔''

لیکن بڑے بڑے حدیث کے محققین کی یہ تحقیق ہے کہ یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے لیکن منسوخ ہے اس لیے کہ یہ اوائلی زمانہ کا حکم ہے اور ہاتھ لگانے سے وضو کرنے کا حکم بہت بعد کا ہے، جیسا کہ امام ابن حبان اپنی صحیح میں سیدنا طلق بن علی سے صحیح سند سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ آیا ہجرت

کے پہلے سال میں تھا جب مسلمان مدینے میں مسجد بنا رہے تھے اور ادھر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر کو چھونے سے وضو کے وجوب کا حکم بیان کرتے ہیں اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث طلق رضی اللہ عنہ کی حدیث سے سات سال بعد کی ہے لہٰذا طلق رضی اللہ عنہ والی روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منسوخ ہوگئی اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ناسخ۔ امام ابن حبان اپنے موقف کی تائید میں سیدنا طلق رضی اللہ عنہ کی یہ روایت جو صحیح سند سے مروی ہے پیش کرتے ہیں کہ ہم چھ افراد وفد کی صورت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضور کے لیے نکلے پانچ بنو حنیفہ سے اور ایک بنو خبیعہ بن ربیعہ سے پھر جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ کو اطلاع دی کہ ہماری زمین ایک ......... ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے مستعمل پانی کی طلب کی پھر آپ نے پانی منگوایا پھر آپ نے وضو کیا اور کلی کی پھر اسے دوبارہ برتن میں انڈیل دیا پھر فرمایا کہ اس جگہ پر اسی پانی میں سے کچھ چھینٹے مارنا اور اس جگہ پر مسجد بنانا ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! شہر بہت دور ہے وہاں پہنچنے تک پانی خشک ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا: اس میں کچھ اور پانی شامل کر لینا وہ اسے بہتری ہی میں بڑھائے گا پھر ہم نکلے اور ہمارے درمیان اختلاف ہوگیا کہ وہ برتن کون اٹھائے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان باری مقرر کر دی کہ ایک رات اور ایک دن ایک شخص اٹھائے (پھر دوسرا) پھر ہم وہ پانی اٹھا کر نکلے پھر وہی کچھ کیا جو ہمیں حکم دیا گیا تھا اور اس قوم میں بنو طے قبیلے کا ایک شخص راہب تھا، پھر جب ہم نے اذان دی تو اس راہب نے کہا کہ یہ حق کی دعوت ہے پھر وہاں سے بھاگ گیا اور اس کے بعد وہاں نہیں دیکھا گیا۔ اس حدیث کو پورا کرنے کے بعد امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں واضح بیان ہے کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ پہلی مرتبہ وفد کے ساتھ آنے کے بعد دوبارہ اپنے شہر کی طرف لوٹ گیا اور ان کی پہلی مرتبہ آنا بھی ہم ذکر کر آئے ہیں اس کے بعد ان کا مدینہ لوٹنے کا کچھ علم نہیں اب جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ اس کے بعد دوسری مرتبہ بھی مدینہ آئے تھے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کے لیے کوئی صریح سنت یا حدیث پیش کرے، حالانکہ اس کے لیے ایسی سنت صریحہ لانے کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سیدنا طلق رضی اللہ عنہ دوسری مرتبہ مدینہ منورہ کی طرف آئے ہی نہیں تو لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ اس صحابی نے ذکر کو چھونے سے وضو کے نہ ٹوٹنے کی حدیث جو پیش کی وہ پہلی مرتبہ کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے، اس کے بعد وہ آئے ہی نہیں لہٰذا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث جو کہ صریحاً کافی بعد کی حدیث ہے وہ اس کی ناسخ ہے یہی بات بالکل واضح ہے۔ اس میں کچھ خفا نہیں۔ حدیث نمبر۳: امام احمد کی مسند میں جید سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ:

"ایما رَجُلٍ مَس فَرجهٗ فَلیتوضأ وَایما اِمرأۃ مَسَّتْ فَرجَهَا فلتتوضأ"

"جو مرد یا عورت اپنی شرمگاہ کو چھوئے پس چاہیے کہ وہ وضو کرے۔"

امام ترمذی، امام بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

(( وحدیث عبداللہ بن عمرو فی مس ذکر ھو عندی صحیح ))

''یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث شرمگاہ کو چھونے کے متعلق میرے نزدیک صحیح ہے۔''

[ علل کبیر ص ۱۶۱ ج۱ ]

## ⑤ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کا ٹوٹنا:

صحیح مسلم، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( ان رجلاً سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتوضأ من لحوم الغنم قال ان شئت فتوضأ و ان شئت فلا تتوضأ قال انتوضأ من لحوم الابل قال نعم فتوضأ من لحوم الابل قال اصلی فی مرابض الغنم قال نعم قال اصلی فی مبارك الابل قال لا ))

''ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کیا ہم بکریوں کے گوشت کھانے سے وضو کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو کرلو اگر چاہو تو نہ کرو پھر اس نے پوچھا کیا ہم اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کریں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اونٹ کے گوشت کھانے کے بعد وضو کریں، پھر کہنے لگا کیا ہم بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پھر اس نے دریافت کیا کہ کیا ہم اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔''

اسی طرح سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بھی اسی مضمون کے متعلق روایت مروی ہے۔ جس کی تصیح امام احمد اور ابن راہویہ اور ابن خزیمہ نے کی ہے۔ صحیح ابن خزیمۃ کے الفاظ اس طرح ہیں کہ:

(( جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اصلی فی مبارك الابل قال لا قال انَتوضأ من لحومها قال نعم قال اصلی فی مرابض الغنم قال نعم قال اتوضأ من لحومها؟ قال لا ))

''ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کیا میں اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، پھر اس نے کہا کیا ان کے گوشت کے کھانے کے بعد وضو کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پھر اس نے کہا کیا میں بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔''

امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اہل حدیث علماء کے درمیان ہمیں اس مسئلہ کے متعلق کوئی بھی اختلاف نظر نہیں آتا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ نقل کی حیثیت اور ناقلین کی عدالت کی وجہ سے بھی علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں

اس بارے میں (یعنی اونٹ کے گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کے متعلق) امر ثابت اور محکم ہے، اس کا کوئی بھی ناسخ وارد نہیں ہوا اس لیے اس پر عمل کرنا واجب ہے اور امام احمد اسی کے قائل ہیں، اگرچہ پہلے ہر آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنے کا حکم تھا لیکن بعد میں وہ حکم منسوخ ہو گیا، علاوہ اونٹ کا گوشت کھانے کے جیسا کہ پہلے سیدنا جابر بن سمرہ اور سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہم کی روایات میں تصریح موجود ہے کہ بکری کا گوشت کھانے سے وضو کرنا ضروری نہیں، اسی طرح صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے احادیث مروی ہیں جن میں یہ وضاحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کا گوشت کھایا لیکن وضو نہیں کیا اور نماز پڑھی اس سے بھی زیادہ اصرح روایت صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

(( كان آخر الامرين من رسول الله صلى الله عليه وسلم ترك الوضو ممامست النار ))

''صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آخری امر یہ وارد ہوا ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ضروری نہیں ہے۔''

یہ حدیث اس بات پر واضح دلیل ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنے کا حکم پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

⑥ نواقض الوضو میں سے نیند بھی ہے اسی مضمون کی ایک حدیث صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی پہلے گزر چکی ہے اس حدیث کے متعلق امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں تصحیح بھی فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا صفوان والی حدیث میں وضو کے ایجاب کے لیے قضائے حاجت اور پیشاب اور نیند کو اکھٹے لایا گیا ہے تو پھر پیشاب اور پاخانہ کے حکم کی طرح نیند کے لیے حکم بھی وہی ہے جو پاخانہ اور پیشاب کے لیے ہے۔ یعنی جس طرح پاخانہ اور پیشاب میں کم یا زیادہ کی تفریق نہیں ہے بلکہ جتنا بھی خارج ہو تو وضو لازم ہے اس طرح نیند کم ہو یا زیادہ ہر حالت میں ناقض الوضو ہو گی۔ البتہ اتنی بات ہے کہ نوم (نیند) اور نعاس (اونگھ) میں فرق کرنا لازمی ہے۔ امام خطابی اپنی کتاب غریب الحدیث میں لکھتے ہیں:

" حقيقة النوم هو غشية الثقيلة اتى تهجم على القلب فتغطيه عن معرفة الأمور الظاهرة "

''نیند ایسی ثقیل بے ہوشی ہے جو دل کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے ظاہری باتوں کی معلومات سے پردہ میں رکھتی ہے۔''

مزید فرماتے ہیں کہ مفضل نے فرمایا:

" السنة فى الرأس والنوم فى القلب "

''اونگھ کا اثر سر پر ہوتا ہے جب کہ نیند کا دل پر۔''

علامہ خطابی کی یہ عبارت علامہ البانی نے مشکوٰۃ کے حاشیہ میں نقل کی ہے اور اس بات کے موافق ابن حبان نے بھی کہا ہے جیسا کہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو ایسی نیند سو جائے جس سے اس کی عقل زائل ہو جائے تو اس پر وضو کرنا واجب ہے یعنی نیند میں وضو کے وجوب کی علت عقل کا زوال ہے۔ اس لیے صرف اونگھ کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس لیے کہ نیند نے دل کو نہیں ڈھانپا جس کی وجہ سے اس کی عقل زائل نہیں ہوئی اگر ہوا وغیرہ خارج ہوئی تو وہ معلوم کر لے گا۔ بخلاف نیند کے کہ اس میں انسان کو ریح وغیرہ کے خروج کا کچھ پتا نہیں ہوتا اس لیے دونوں میں فرق کو سمجھنے کے بعد اب اس مضمون کے متعلق چند احادیث نقل کی جاتی ہیں:

علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( وکاء السَّهِ العينان فمن نام فليتوضأ ))

اس حدیث کو امام ابوداوٗد اور امام احمد نے اپنی کتب میں نقل فرمایا ہے اور علامہ البانی فرماتے ہیں: ”هو عندی صحيح“ یعنی یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے۔ ترجمہ: آنکھیں مقعد کا بندھن ہیں پھر جو شخص بھی سو جائے اسے چاہیے کہ سو جائے یعنی نیند میں جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو مقعد کھل جاتا ہے اس لیے با آسانی ریح جاری رہتی ہے اور نیند کی وجہ سے اسے کچھ علم بھی نہیں ہو سکتا کہ کب میرے ریح خارج ہوئی ہے لہٰذا شریعت مطہرہ نے نیند سو جانے والے پر وضو کو لازم قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ناعس یعنی اونگ کا شکار کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

” ان من قويت حواسهٗ بحيث يسمع كلام جليسهٗ ولا يفهم معناه فهو ناعس وان زاد علىٰ ذالك فهو نائم ومن علامات النوم الرؤيا طالت او قصرت “

”جس شخص کے حواس قوی ہوں کہ اپنی مجلس کے کلام کو سن رہا ہو لیکن سمجھ نہ پائے وہ ناعس یعنی اونگھ والا ہے اور اگر اس سے زیادہ ہے یعنی مجلسی کلام سن بھی نہ پائے تو وہ نائم ہے، یعنی نیند سونے والا اور نیند کی علامات میں ایک علامت خواب بھی ہے۔ اگر چہ وہ کم ہو یا زیادہ۔“

مطلب یہ ہوا کہ ناعس پر وضو نہیں اور نائم پر ہے۔ حافظ صاحب فتح الباری میں اس کے متعلق صحیح مسلم کی وہ حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات کو نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

(( فجعلت اذا اغفيت اخذ بشحمة اذنى ))

”پھر مجھے اونگھ آنے لگ گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خبردار کرنے کے لیے کان کی لو سے پکڑ رہے تھے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ نیند کی ابتدائی حالت جیسے نعاس کہا جاتا ہے ناقض وضو نہیں، وضو صرف اس پر لازم

ہے جو نیند میں مستغرق ہو جائے اور حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن المنذ رسیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس نے فرمایا:

(( وجب الوضوء علی کل نائم الامن خفق خفقةً ))

''ہر نیند کرنے والے پر وضو لازم ہے مگر اونگھ والے پر نہیں۔''

مزید حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ امام محمد بن نصر مروزی اپنی کتاب قیام اللیل میں صحیح اسناد سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ:

(( کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینتظرون الصلاۃ فینعسون حتیٰ تخفق رؤسھم ثم یقومون الی الصلاۃ ))

''اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا انتظار کرتے پھر انہیں اونگھ آجاتی یہاں تک ان کے سر اوپر نیچے ہوتے رہتے لیکن پھر بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔''

## مختلف فیہ مسائل:

اب یہاں سے وہ مسائل لکھے جاتے ہیں جو علماء کے مابین مختلف فیہ ہیں کہ وہ ناقض الوضو ہیں یا نہیں، ہر ایک مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد ہم ایک طرف کو دلائل کی بنا پر ترجیح دیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

## المسئلۃ الاولیٰ:

بیوی کو ہاتھ یا پاؤں یا ہونٹوں سے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ کچھ علماء کرام مثلاً ابن حزم وغیرہ کا کہنا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، دوسری طرف کئی علمائے محدث و محقق کہتے ہیں کہ اس طرح عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس ختلاف کی بنیاد قرآن کریم کے الفاظ :

﴿ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ﴾ [النساء : ۴۳]

پر ہے جو کہتے ہیں کہ وضو ٹوٹ جائے گا تو ان کہنا ہے کہ '' لامستم'' کا لفظ عام ہے، لہٰذا عورت کو ہاتھ سے چھوئے یا ہاتھوں سے یا پھر ہونٹوں سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ اس مقام پر ''ملامست'' سے مراد جماع ہے نہ کہ ہاتھ وغیرہ سے چھونا۔ اس اختلاف کو معلوم کرنے کے بعد ہماری گزارش یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حق بات فریق ثانی کی ہے، یعنی ہاتھ وغیرہ کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ قرآن کریم کی تشریح...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے لگائی گئی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

﴿ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ [النحل : ۴۴]

''یہ ذکر یا یہ دین ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کو اس کی تبیین وتوضیح بتائیں۔''

اس بنیاد پر جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث کو دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے درج ذیل احادیث آتی ہیں۔

**الحدیث الاول:**

صحیح بخاری و مسلم میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( کنت انام بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رِجلَایَ فی قِبلَتہٖ فاذا سجد غمزنِیُ فقبضت رجلی واذا قام بسطتھا قالت وَالبُیُوتُ یومئذ لیس فیھا مصابیح ))

''میں آپ ﷺ کے سامنے لیٹی رہتی تھی میرے پاؤں قبلہ یعنی سجدہ کی جگہ پر ہوتے تھے پھر جب آپ ﷺ سجدہ کرتے ہاتھ سے مجھے چوکا اور میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی اور جب اٹھتے تو پھر بچھا لیتی فرماتی ہیں کہ ان دنوں گھروں میں بتیاں نہیں ہوتیں تھیں۔''

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت کو ہاتھ سے چھونا ناقض وضو نہیں کچھ حضرات نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ بی بی صاحبہ کے پاؤں وغیرہ پر کوئی حائل کپڑا وغیرہ ہو یا یہ آپ ﷺ کی ہی خصوصیت ہو لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس میں احتمال کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ خصوصیت صریح دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوتی۔ پھر بھی جس کو خصوصیت پر اصرار ہے تو اسے چاہیے کہ ایسی حدیث پیش کرے جس میں یہ وضاحت ہو کہ مذکورہ بات آپ ﷺ ہی کی خصوصیت تھی ورنہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [احزاب: ۲۱]

''تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''

مطلب کہ ہمیں اپنے ہر عمل میں آپ ﷺ ہی کی پیروی کرنی چاہیے الا یہ کہ آپ ﷺ وضاحت سے بیان کریں کہ یہ عمل مجھ سے خاص ہے۔ باقی رہی کپڑے وغیرہ کے حائل کی بات تو متعصب ہی سوچ سکتا ہے، حدیث کے الفاظ تو اس پر کلی طور پر دلالت کرتے ہیں۔

**الحدیث الثانی:**

نسائی میں صحیح سند سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں:

(( انہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصلی وانی معترضۃ بین یدیہ اعتراض الجنازۃ حتی اذا اراد ان یوتر مسنی برجلہٖ ))

حافظ ابن حجر تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ "اسنادہٗ صحیح" کہ اس کی سند صحیح ہے یعنی بے شک نبی ﷺ رات کی نماز پڑھتے اور میں آپ ﷺ کے سامنے جنازہ کی طرح لیٹی رہتی تھی۔ جب آپ وتر پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو پاؤں مبارک سے مجھے چھوتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت لمس سے مراد جماع ہے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی ہے کہ بی بی صاحبہ فرماتی ہیں:

(( فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الفراش فالتمستهٗ فوقعت يدى علىٰ بطن قدميه وهو فى المسجد وهما منصوبتان يقول اللهم انى اعوذ برضاك من سخطك...... الى آخره ))

''میں نے ایک رات آپ ﷺ کو بستر سے غائب پایا، پھر میں نے آپ کو تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ کے پاؤں کے پیٹھ پر جا لگا اور آپ مسجد میں تھے اور آپ کے پاؤں اور ہتھیلی کھڑے تھے۔ روایت میں ہے:'' وهو ساجد '' یعنی آپ حالت سجدہ میں تھے اور یہ دعا فرمار ہے تھے: '' أللهم اعوذ برضاك۔ الى آخره''

اس حدیث صحیح سے معلوم ہوا کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ بی بی صاحبہ کا ہاتھ آپ کے پاؤں مبارک پر لگا تو آپ کے پاؤں بھی بی بی صاحبہ کے ہاتھ کو لگے، پھر جب عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا تو آپ اپنی نماز کو قطع فرماتے اور بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میرا ہاتھ آپ کے پاؤں کی پیٹھ پر لگا، یہ بھی اس بات پر واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے پاؤں پر کوئی حائل کپڑا وغیرہ نہیں تھا۔ اس لیے جو حائل وغیرہ کا احتمال ظاہر کیا گیا وہ باطل ہو گیا، والحمد للہ رب العالمین۔ امام دارقطنی اپنی سنن میں علامہ احمد محمد شاکر کی تحقیق کے مطابق صحیح سند کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ بی بی صاحبہ فرماتی ہیں:

(( قَبل النبى صلى الله عليه وسلم بَعض نسائه ثم صلى ولم يتوضأ ثم ضحكت ))

''نبی ﷺ نے اپنی بیویوں میں سے کسی سے بوسہ لیا، پھر پڑھی اور وضو نہیں کیا اور بی بی صاحبہ ہنس پڑیں۔''

سنن دارقطنی میں صحیح سند سے بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ :

(( انها بلغها قول ابن عمر فى القبلة الوضوء فقالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل وهو صَائِمٌ ثُمَّ لَا يَتوضأ ))

''بی بی صاحبہ کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات کا علم ہوا کہ وہ کہتے ہیں کہ بوسہ لینے سے وضو ہے تو بی بی صاحبہ نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ حالت روزہ میں بوسہ لیتے پھر وضو نہیں کرتے تھے۔''

ابوبکر بزار نے اپنی مسند میں صحیح سند سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ:

(( انهٗ صلى الله عليه وسلم كان يقبل بعض نسائه ولا يتوضأ ))

''نبی ﷺ کی ان صحیح احادیث سے ثابت ہوا کہ عورت کو ہاتھ وغیرہ سے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔''

لہٰذا آیت کریمہ میں لامستم لفظ سے مراد جماع ہے نہ کہ مطلق لمس یا چھونا۔

اور سید امام محمد بن اسماعیل الصنعانی المعروف بالامیر اپنی بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں لکھتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی ''ملامست'' کی تفسیر جماع سے کی ہے، اسی طرح حبر الامۃ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

جس کے لیے نبی ﷺ نے قرآن مجید کی تفسیر سیکھنے کی دعا فرمائی تھی، انھوں نے بھی اس لفظ کی تفسیر جماع سے کی ہے جیسا کہ ان سے عبد بن حمید نے روایت کی ہے کہ اس صحابی رضی اللہ عنہ نے ملامست کی تفسیر کانوں میں انگلیاں داخل کرتے ہوئے یہ کی ہے کہ یعنی خبر دار ملامست سے مراد جماع ہے اس طرح الطستی نے اس سے روایت کیا ہے تو انھوں نے اس کی تفسیر جماع سے کی۔ مزید علامہ الصنعانی لکھتے ہیں کہ ان باتوں کے ساتھ آیت شریف کی ترکیب اور اسلوب و انداز بھی ہیں تقاضا کرتا ہے کہ ملامسة سے مراد جماع ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تیمّم کی مقتضیات میں سے قضاء حاجت کو بھی شمار کیا جس سے چھوٹے بے وضو ہونے پر تنبیہ ہے اور ملامست کو بھی شمار کی ہے اس سے بڑے بے وضو ہونے پر تنبیہ کرنا تھی اور یہ مقابل ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے جو پانی سے غسل کرنے کے متعلق وارد ہے یعنی:

﴿ وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ﴾ [ مائدة : ٦]

اگر ملامست کو صرف ہاتھ کے چھونے پر محمول کیا جائے تو اس کے متعلق تنبیہ کرنا ختم ہو جائے گی کہ مٹی بڑے حدث کو رفع کرنے میں پانی کا قائم مقام ہو سکتی ہے اور یہ حصہ آیت کی ابتدا کے مخالف بن جائے گا۔ انتھی

## المسئلة الثاني:

خون کا بہنا، علماء احناف کے نزدیک یہ نواقض الوضو میں سے ہے لیکن اس مسئلے میں بھی حق یہ ہے کہ یہ نواقض الوضو میں سے نہیں۔ پہلے ہم علماء احناف کے دلائل کو ذکر کر کے ان کے متعلق کلام کر کے بعد میں اپنے دلائل پیش کریں گے۔

## دلیل نمبر1:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تمیم بن اوس راوی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( ألوضوء من كل دم سائل )) [رواه الدارقطني في سننه]

”ہر بہنے والے خون سے وضو ہے۔“

اب خود امام دارقطنی رحمہ اللہ اس حدیث کو لانے کے بعد فرماتے ہیں:

”عبدالعزيز لم يدرك من تميم الداري“

”عمر بن عبدالعزیز نے تمیم داری رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔“

اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی سند میں یزید بن خالد اور یزید بن محمد دونوں مجہول ہیں، جہالت شدید جرح میں سے ہے اور ہم یہ بات کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ یہ دونوں علتیں امام دارقطنی رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں۔ مذکورہ روایت میں ایک اور علت بھی ہے، اس کی سند میں بقیہ بن الولید ہے جو کہ چھوٹے طبقہ کا مدلس ہے، اس قسم کے راویوں کی روایت جب تک وہ سماع کی تصریح نہ کریں تب تک قبول نہیں کی جاتی، اس

جگہ پر سماع کی تصریح نہیں ہے بلکہ روایت عن سے ہے۔ لہٰذا یہ روایت قابل حجت نہیں۔

**دلیل نمبر۲:**

سنن ابن ماجہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اصابه قُئی اور رُعَاف اوقلس او مذی فلينصرف فليتوضأ ثم ليبن علىٰ صلوٰته وهو فی ذالك لايتكلم ))

''جسے نماز میں قے آئے یا نکسیر یا کچا کھانا باہر آئے یا مذی خارج ہو تو اسے چاہیے کہ وضو کرے اور اپنی نماز کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے بنا کر لے لیکن اس دوران کلام نہ کرے۔''

اس حدیث کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ہے جو کہ صدوق ہے مگر تمام محدثین کے بقول اس کی وہ روایت جو غیر شامیین سے مروی ہو وہ مقبول نہیں ہوتی، اس لیے کہ یہ اپنے ملک شام کے علاوہ دوسرے ممالک کے رواۃ سے جو روایات لاتا تھا ان میں بہت غلطیوں کا مرتکب ہوتا تھا، کبھی موقوف کو مرفوع اور کبھی مرسل کو موصول وغیرہ کی اغلاط اس سے صادر ہوتی تھیں۔ اس جگہ یہ روایت عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج سے بیان کرتا ہے اور ابن جریج مکی حجازی ہے نہ کہ شامی اس لیے اس روایت میں غلطی بھی کی ہے کہ مرسل کو موصول بنا کر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ابن مریم کے حفاظ اصحاب نے یہ روایات اس طرح نقل کی ہیں کہ ابن جریج عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ابن جریج نے اپنے والد عبدالعزیز سے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً نقل کی ہے کیونکہ عبدالعزیز تابعی ہے نہ کہ صحابی۔ مطلب یہ ہوا کہ ابن جریج کے حافظ شاگردوں نے اس حدیث کو مرسلاً نقل کیا ہے مگر اسماعیل بن عیاش نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا واسطہ ذکر کیا ہے یعنی موصولاً ذکر کی ہے۔ یہ ہے ان کی غلطی کا ثبوت اور دوسری بات یہ ہے کہ اسماعیل بن عیاش تیسرے طبقہ کے مدلس ہیں اور تیسرے طبقہ کے مدلسین کی روایت بھی تصریح سماع کے بغیر مقبول نہیں۔ یہاں پر ابن جریج سے عن سے روایت کر رہا ہے اس وجہ سے بھی یہ روایت ضعیف ٹھہری اور تیسری وجہ اس روایت کے ضعف کی یہ ہے کہ اسماعیل بن عیاش کا استاد ابن جریج جو تیسرے طبقہ کا مدلس ہے۔ امام دارقطنی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ ابن جریج کی تدلیس بہت بری تدلیس ہے۔ ملاحظہ ہو طبقات المدلسین لابن حجر عسقلانی اور ابن ماجہ والی روایت میں ابن جریج نے سماع کی تصریح نہیں کہ بلکہ ابن ابی ملیکہ سے عَنْ سے روایت کی ہے۔ اس روایت میں اتنی ساری وجوہات ضعف کے باوجود اسے صحیح کہنا علم حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے یا پھر تجاہل عارفانہ اسی طرح اس حدیث کے متن میں ایک ایسی بات ہے جس نے اُس کو مزید کمزور کر دیا ہے، یعنی اس حدیث میں قے، نکسیر وغیرہ کے ساتھ مذی کا ذکر بھی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ مذی کے نکلنے کے باوجود یہ صرف وضو کر کے کلام نہ کرنے کی صورت میں آ کر جہاں نماز کو ترک کیا وہاں آ کر بنا کرے۔ حالانکہ

صحیح احادیث میں جو کہ پہلے ذکر ہو چکی ہیں، مذی شرمگاہ وغیرہ جہاں لگی ہوئی ہو دھو کر صاف کرنا ہے نہ کہ صرف وضو کر کے نماز شروع کر دی جائے جیسا کہ یہ روایت بتلاتی ہے کہ مذی کے خروج سے صرف وضو کرے اور وہاں ہی سے نماز کی بنا کرے۔ مطلب کہ مذی جہاں کہیں لگی ہو لگی رہے آ کر نماز میں شروع ہو جائے۔ باقی مرسل روایت کے بارے میں احناف حضرات کا جو یہ موقف ہے کہ مرسل ہمارے نزدیک مقبول ہے تو اولاً مرسل حدیث کے متعلق علی الاطلاق مقبول ہونے کا صحیح مسلک نہیں ہے اس کی تفصیل کتب مصطلح الحدیث میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اس جگہ پر صرف ارسال ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جس راوی نے یہ روایت مرسلاً بیان کی ہے یعنی عبدالعزیز بن جریج مکی، ان کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں "لیّن" یعنی کمزور ہے، یعنی یہ تابعی بھی ثقہ نہیں ہے، دوسرا ان سے روایت کرنے والا ابن جریج ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ تیسرے طبقہ کا ہے اور یہاں روایت بھی معنعن ہے اس لیے اگر ارسال کی وجہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے پھر بھی ایک راوی کا ضعف اور دوسرا تدلیس کے شبہ سے پیدا ہونے والا ضعف اس روایت کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ اسے معرض استدلال میں پیش کیا جائے اور اسی مضمون کی ایک روایت حافظ ابن عدی نے الکامل میں سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کی ہے، جس کے الفاظ بھی پہلی روایت کی طرح ہیں یعنی:

(( الوضوء من كل دم سائل ))

اس کے متعلق حافظ ابن عدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس روایت کی سند میں احمد بن الفرج راوی ہے:

" لا يحتج بحديثه " یعنی اس کی حدیث سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی اور اس کے ضعف کے باوجود محدثین اس کی روایت کو لیتے ہیں۔ اور علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن عدی رحمہ اللہ نے احمد بن الفرج کے متعلق تھوڑی سی جرح کا اظہار کیا ہے مگر محمد بن عوف جو احمد بن فرج کا ہم وطن تھا، اس نے اس پر سخت جرح کی ہے وہ فرماتے ہیں احمد کذاب ہے اور بقیہ بن ولید سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ اس حدیث کی اس کے پاس کچھ اصل نہیں اور اس کے بارے میں کہا کہ اللہ کی مخلوق میں سے سب سے بڑا جھوٹا ہے۔ علامہ البانی آگے رقم طراز ہیں کہ پھر میں نے ابن عدی کی الکامل کی مراجعت کی تو دیکھا کہ اس حدیث کو لا کر فرماتے ہیں:

" وَلِلْبَقِيَّةِ عن شعبة كتاب وفيه غرائب و تلك الغرائب ينفرد بها بقية عنه وهي محتملة وهذا عن شعبة باطل "

یعنی بقیہ بن ولید کے پاس امام شعبہ کی کتاب ہے جس میں کچھ غریب احادیث ہیں اور وہ غریب حدیثیں صرف بقیہ ہی نے امام شعبہ سے روایت کی ہیں اور وہ ایک حد تک قابل برداشت نہیں مگر یہ روایت

(یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث) جو بقیہ نے شعبہ سے روایت کی ہے باطل ہے یعنی یہ روایت قابل برداشت نہیں۔ آگے علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ خون نکلنے سے وضو کو واجب قرار دینے کے متعلق کوئی بھی صحیح روایت نہیں ہے۔

خون کے نکلنے سے وضو کے دلائل کی حقیقت معلوم کر لینے کے بعد اب ہم اپنے دلائل پیش کرتے ہیں:

**دلیل نمبر1:**

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مسند احمد، ابوداود، دارقطنی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور امام بخاری نے تعلیقاً روایت نقل کی ہے اور ابن خزیمہ، حاکم اور ابن حبان نے اس کی تصحیح کی ہے یہاں پر ابن حبان کے الفاظ درج کرتے ہیں، صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع سے نکلے، پھر مسلمانوں میں سے ایک شخص مشرکین کی عورتوں میں سے ایک عورت سے جا ملا اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو اس عورت کا شوہر آ گیا جو اس وقت نہیں تھا، اسے بتایا گیا کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص تیری بیوی سے مل گیا ہے تو اس نے قسم اٹھائی کہ وہ اس وقت تک سانس نہ لے گا جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں خون بہائے، پھر وہ نکلا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات پر چلتا رہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منزل پر پڑاؤ ڈالا اور فرمایا: آج رات ہماری کون حفاظت کرے گا، پھر مہاجرین اور انصار میں سے ایک ایک اٹھا دونوں نے کہا اے اللہ کے رسول! ہم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تم دونوں اس گھاٹی کے سر پر بیٹھ جاؤ۔ صحابی کہتا ہے کہ پھر جب وہ دونوں گھاٹی کے سر پر جا بیٹھ گئے تو انصاری صحابی نے مہاجر سے کہا کہ آپ کو رات کا کونسا حصہ بہتر لگتا ہے کہ میں اس سے آپ کی کفایت کروں تو مہاجر نے کہا پہلا۔ پھر مہاجر سو گیا اور انصاری نے اٹھ کر نماز پڑھنا شروع کر دی اور مشرکہ عورت کا شوہر آیا پھر جب اس نے دیکھا کہ انسانی جسم ہے اسے پہچان گیا کہ یہ قوم کا محافظ ہے، پھر اسے ایک تیر دے مارا اور وہ صحابی کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ انصاری نے وہ تیر نکال لیا اور نماز پڑھتا رہا، پھر دشمن نے دوبارہ تیر لگایا وہ بھی جسم میں پیوست ہو گیا۔ دشمن نے تیسرا تیر مارا وہ بھی جسم میں گھس گیا پھر صحابی نے وہ نکال کر رکوع کیا اور سجدہ کیا پھر مہاجر کو جگایا اور کہا کہ آپ اٹھ جائیں دشمن نے مجھے تیر مار دیے ہیں پھر مہاجر جاگ اٹھا پھر جب اس شخص نے دونوں کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ ان کو میرا علم ہو گیا ہے لہٰذا وہاں سے بھاگ نکلا پھر مہاجر نے انصاری سے کہا: (جب انصاری سے خون بہتا ہوا دیکھا) کہ سبحان اللہ پہلی مرتبہ جب تجھے اس نے تیر مارا تھا تو اس وقت تو نے مجھے کیوں نہ جگایا تو انصاری نے کہا میں ایک سورۂ پڑھ رہا تھا پھر مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ اسے ترک کر دوں یہاں تک کہ اسے مکمل کیا پھر مسلسل مجھے تیر لگتے رہے تو میں نے رکوع کیا اور تجھے اطلاع دی اور اللہ کی قسم! اگر اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ جس جگہ کی حفاظت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا اس کے ضایع ہو جانے کا مرتکب نہ ہو جاؤں تو میرا سانس نکل

جاتا اس سے پہلے کہ میں اس کو قطع کر دوں یا اسے مکمل کر لوں۔

**فائدہ:** حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ امام بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوت دوسرے طریقہ سے یہی روایت لائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکور انصاری کا نام عباد بن بشیر تھا اور مہاجرین کا نام عمار بن یاسر اور وہ سورۂ جو وہ پڑھ رہے تھے کہف تھی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابی رضی اللہ عنہ کو تیر لگ رہے تھے اور خون بھی جاری ہوا لیکن اس کی نماز نہیں ٹوٹی اگر دم سائل (بہنے والا خون) ناقض ہوتا تو پہلے تیر ہی سے جب خون جاری ہوا تب نماز ٹوٹ جاتی کچھ علماء نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ اس واقعے کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تھا اور پھر بھی آپ نے اسے برقرار رکھا، اس لیے یہ ہوسکتا ہے کہ یہ صحابی کا اپنا اجتہاد ہو لیکن ان حضرات کا یہ کہنا یا تو قلت تدبر پر مبنی ہے یا اس کا سبب عجلت یا جلد بازی ہے وہ دونوں صحابہ خود اپنی مرضی ومنشا سے گھاٹی کے سرہانے نہیں بیٹھے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں وہاں بیٹھنے کا حکم فرمایا تھا، لہٰذا یا تو صبح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا ہو گا یا پھر انھوں نے خود اس واقعہ کی اطلاع دی ہو گی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم نہ ہوا ہو۔ جب ہوا اور نماز کے لوٹانے کا امر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا اور نہ ہی یہ فرمایا کہ آپ کا وضو ٹوٹ گیا تھا تو معلوم ہوا کہ بہنے والے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ [1] علاوہ ازیں علامہ عینی نے ہدایہ کی شرح میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں سنن ابی داؤد اور صحیح ابن حبان اور دار قطنی وبیہقی سے یہ اضافہ نقل کیا ہے۔

(( فبلغ ذالك رسول الله صلى الله عليه وسلم فدعا لهما قال ولم يأمره بالوضوء ولا باعادة الصلوٰة ))

''پھر اس واقعہ کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے لیے دعائے خیر فرمائی اور راوی کہتا ہے کہ جسے تیر لگے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ تو وضو کا امر فرمایا اور نہ ہی نماز کے لوٹانے کا۔''

اور امام بخاری اپنی صحیح میں مشہور تابعی حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ اثر نقل فرمایا ہے کہ:

---

[1] کچھ حضرات نے جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث کو ان کا فرزند عقیل روایت کرتا ہے اور ان سے صرف صدقہ بن یسار۔ اس کی توثیق صرف ابن حبان نے کی ہے اور صرف ابن حبان کی توثیق مقبول نہیں ہوتی، لہٰذا مذکورہ صدقہ مجہول راوی ہے۔

جواب: تلخیص الحبیر کے محقق نے کہا ہے کہ صدقہ سے اس روایت کو عقیل کے ساتھ جابر البیاضی نے بھی روایت کی ہے لہٰذا جہالت العین ختم۔ باقی رہی جہالت حال تو ابن حبان رحمہ اللہ کے ساتھ ساتھ اس حدیث کی تصحیح ابن خزیمہ نے بھی کی ہے اور اس طرح حاکم رحمہ اللہ بھی اس حدیث کو صحیح کہتے ہیں اور کسی امام کی تصحیح حدیث اس کے رواۃ کی توثیق ہوتی ہے لہٰذا جہالت الحال بھی ختم ہو گئی اس لیے یہ روایت قابل استدلال بن گئی۔ از مصنف

"مازال المسلمون يصلون في جراحاتهم"

''مسلمان (صحابی) ہمیشہ اپنے زخموں میں ہر نماز پڑھتے رہتے تھے۔''

یعنی صحابہ کا یہ معمول تھا کہ وہ زخمی ہوتے تھے خون بہتا رہتا وہ نماز بھی پڑھتے رہتے تھے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مشہور تابعی طاؤس بن کیسان کا یہ اثر صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے کہ: " انهٗ كان لايرى في الدم وضوء يغسل عنه الدم ثم حسبه" یعنی امام طاؤس خون کے بہنے سے وضو کو لازم قرار نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ خون کو دھو لو یہی کافی ہے۔ اس طرح محمد بن علی بن الحسین بن علی ابو جعفر الباقر کا اثر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں۔ حافظ ابو مبشر عرف سمویہ کے فوائد سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ سلیمان بن مہران الاعمش کہتے ہیں:

"سألت ابا جعفر الباقر عن الرعاف فقال لوسال نهر من دم ما اعدت منه الوضوء"

''میں نے نکسیر کے متعلق ابو جعفر الباقر سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر خون کی نہر بھی بہہ پڑے پھر بھی میں نماز نہیں دہراؤں گا۔'' اس طرح خون سے وضو کے نہ ٹوٹنے کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد عطاء بن ابی الرباح سے مصنف عبدالرزاق میں صحیح اثر موجود ہے۔ اسی طرح مصنف عبدالرزاق ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر سے بھی آثار مروی ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اسماعیل بن اسحاق القاضی نے ابو الزناد کے طریق سے مدینہ کے ساتوں فقہاء سے بھی یہی موقف نقل کیا ہے اور یہی امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے تعلیقاً ایک اثر نقل کیا ہے، جیسے ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے موصولاً ذکر کی ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ:

"عصر ابن عمر بثرة فخرج منه الدم ثم صلى ولم يتوضأ"

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زخم کو دبایا پھر اس سے خون نکلا پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔''

اور اسی طرح صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کا اثر تعلیقاً ذکر کیا ہے اور امام سفیان ثوری نے اپنی جامع سفیان ثوری میں عطاء بن السائب سے موصولاً ذکر کی ہے کہ: "انهٗ رآه بزقِ دماً فمضى في صلوٰة" یعنی عطاء نے عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نماز میں تھوک میں خون آیا اور نماز جاری رکھی اور توڑی نہیں۔ اسی طرح امام بخاری نے سیدنا عبداللہ بن عمر کا یہ اثر نقل کیا ہے جو امام شافعی اور ابن ابی شیبہ نے موصولاً ذکر کیا ہے کہ:

((كان اذا احتجم غسل محاجمهٗ))

یعنی جب سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سنگی لگواتے تو صرف سنگی لگنے کی جگہ کو دھوتے تھے۔ اسی طرح حسن

بصری سے ابن ابی شیبہ نے ایک اثر نقل کیا ہے کہ:

" انهٔ سئل عن رجل یحتجم ماذا علیه قال یغسل اثر محاجمه "

یعنی حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص سنگی لگوائے تو اس پر کیا چیز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ سنگی لگنے والی جگہ کو دھو دے۔

مذکورہ بالا صحیح مرفوع روایات اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے صحیح آثار سے ثابت ہوا کہ بہنے والے خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ واللہ اعلم بالصواب

**المسئلة الثالثة:**

علماء احناف کے نزدیک قے جو منہ بھر آئے وہ ناقض الوضو ہے، ان کی ایک دلیل وہ ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور ابن ماجہ میں موجود ہے لیکن وہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ اوپر خون کی بحث میں ذکر کی جا چکی ہے۔

دوسری دلیل ترمذی شریف میں سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قاء فتوضأ )) [الحدیث]

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی اور وضو کیا۔

**الجواب:** مذکورہ حدیث ان الفاظ سے غیر محفوظ اور شاذ ہے جیسا کہ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ابکار المنن فی تنقید آثار السنن اور تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی میں وضاحت فرمائی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ سیدنا ابو درداء والی حدیث کو امام احمد اور اصحاب سنن ثالثہ اور ابی جارود، ابن حبان، دارقطنی، بیہقی، طبرانی، ابن مندہ اور حاکم نے روایت کی ہے اور خود امام ترمذی نے اپنی جامع کتاب الصیام میں فرماتے ہیں کہ ابو درداء، ثوبان اور فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم قاء فافطر ))

پھر امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے تھے پھر قے کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمزوری لاحق ہوگئی، لہٰذا اس وجہ سے روزہ افطار کر دیا۔ کچھ حدیثوں میں اسی طرح ہی اس کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابو درداء کے علاوہ دو اور صحابی یعنی ثوبان اور فضالہ بن عبید بھی "قاء فافطر" کے الفاظ راویت کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ حدیث محفوظ طریق سے "قاء فافطر" کے الفاظ سے ثابت ہے پھر جو شخص اس قے سے وضو کے نقض پر استدلال کرتا ہے اسے چاہیے کہ دلائل سے ثابت کرے کہ یہ حدیث "قاء فتوضأ" کے الفاظ سے دلیل لینا اصولاً صحیح نہیں ہے، ہم اوپر کئی کتب کے حوالہ سے ثابت کر آئے ہیں کہ اس حدیث میں محفوظ الفاظ قاء فافطر کے ہیں نہ کہ قاء فتوضأ کے اس لیے قاء فتوضأ

والی حدیث غیر محفوظ ٹھہری اور غیر محفوظ ضعیف ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں یہ وضاحت بھی نہیں کہ جو شخص قے کرے وہ وضو کرے اور نہ ہی یہ ہے کہ قے کرنا نقض وضو کا سبب ہے بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ پہلے ہی بے وضو ہوں، پھر قے آ گئی۔ اس کے بعد نماز کے لیے وضو کیا اور اس احتمال کو رد کرنے کے لیے مخالفین کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں۔ شیخ طحاوی شرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں احادیث میں یعنی ابودرداء اور ثوبان سے مروی شدہ میں جو یہ الفاظ ہیں کہ "قاء فافطر" میں کوئی دلالت اس بات پر نہیں کہ اس قے کی وجہ سے آپ ﷺ نے روزہ افطار کیا اس میں صرف یہ بات ہے کہ آپ ﷺ نے قے کی وجہ سے روزہ افطار کیا، اس میں صرف یہ بات ہے کہ آپ نے قے کی پھر اس کے بعد افطار کیا۔

اس طرح ہم کہتے ہیں کہ اگر "قاء فتوضأ" کے الفاظ محفوظ بھی ہوں تو بھی اس میں یہ دلیل نہیں کہ وہ وضو قے کی وجہ ہی سے آپ ﷺ نے کیا تھا۔ یا قے وضو کی ناقض تھی اس میں صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صرف قے کی اور اس کے بعد وضو کیا یہ بات بالکل واضح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جب قے وضو کی ناقض نہیں تو پھر وہ ناقض الوضوء کیسے بن گئی، لہٰذا قے کرنے والے کا وضو قائم ہے۔

**المسئلۃ الرابعۃ :**

نماز میں قہقہہ لگانا۔ علماء احناف کے نزدیک نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے۔ معجم الکبیر طبرانی میں ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( بَيْنَمَا رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي بالناس اِذْ دخل رجل فتردى في حضرة كانت في المسجد و كان في عَيْنَيْهِ ضرر فضحك كثير من القوم وهو في الصلوٰة فامر رسول الله صلى الله عليه وسلم من ضحك ان يعيد الوضوء و الصلوٰة ))

"یعنی ایک وقت نبی ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور مسجد میں ایک گڑھا تھا جس میں وہ جا گرا ان کی آنکھوں میں کچھ خلل تھا، اس کو دیکھ کر قوم میں سے بہت لوگ ہنس پڑے حالانکہ وہ نماز میں پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ وہ نماز اور وضو دہرائیں۔"

**الجواب :** اس کی سند میں ہشام ابن حسان ہے جو کہ چوتھے طبقے کا مدلس ہے اور وہ اس روایت میں حفصہ بنت سیرین سے عن سے روایت کر رہا ہے، لہٰذا یہ سند صحیح نہیں، دوسرے یہ کہ محدثین کا کہنا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے، اس میں ابوموسیٰ الاشعری کا واسطہ صحیح نہیں ہے اور اسے مرسل بیان کرنے والا ابو العالیہ ہے جس کا نام رفیع بن مہران ہے اور محدثین کے بقول ابو العالیہ ریاحی کی مراسیل روایات ہوا کی مانند ہیں، اس سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الدرایہ فی تخریج الھدایۃ"

میں لکھا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو العالیہ کی مرسل ہواؤں کی مانند ہیں اور امام حاکم رحمہ اللہ اپنی کتاب علوم الحدیث میں لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی مراد اس سے قہقہ والی حدیث ہے۔ فقط۔

اور امام بیہقی اپنی کتاب معرفہ میں فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی اس سے مراد وہ حدیثیں ہیں جو ابو العالیہ نے مرسل بیان کی ہیں نہ کہ وہ جو موصول بیان کرے۔ انتھیٰ کلام الحافظ۔

اور شیخ زیلعی اپنی کتاب ''نصب الرأیة'' میں فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی نے محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ آپ حسن بصری اور ابو العالیہ کی مراسیل نہ لیا کریں، اس لیے کہ وہ دونوں روایت بیان کرنے میں احتیاط نہیں برتتے تھے اور جس سے من میں آیا اس سے روایات لے لیتے تھے اور دار قطنی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عون سے روایت نقل کی ہے کہ محمد بن سیرین نے فرمایا کہ چار اشخاص ہیں جو ہر اس شخص کی تصدیق کرتے ہیں جو ان سے کوئی حدیث سنتا ہے پر وہ نہیں پرواہ کرتے کہ وہ حدیث اس نے بھی آگے کسی راوی (پختہ وثقہ) سے سنی ہے یا نہیں؟ ① حسن بصری ② ابو العالیہ ③ حمید بن ہلال ④ چوتھے کا ذکر (ابن عون نے) نہیں کیا، اس کا نام انس بن سیرین لیا گیا ہے۔

**دلیل نمبر ۲:**

مصنف عبدالرزاق سے نقل کیا جاتا ہے کہ ابو العالیہ کی مراسیل روایت میں سے ہے، اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

((ان اعمیٰ تردیٰ فی بِئرٍ والنبی صلی الله علیه وسلم یصلی باصحابه فضحك بعض من كان یصلی مع النبی صلی الله علیه وسلم فامر النبی صلی الله علیه وسلم مَن كانَ ضَحِكَ منهم ان یعید الوضوء و یعید الصلاة))

**الجواب:**

مذکورہ حدیث کی سند میں قتادہ مدلس ہے جو کہ تیسرے طبقہ سے ہے۔ اس روایت میں ابو العالیہ سے عن سے روایت کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ روایت ابو العالیہ کی مراسیل میں سے ہے جس کی تفصیل اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔ اس لیے یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ اس روایت کے ضعف کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اس مرسل روایت کے الفاظ پہلی مذکورہ موصول روایت کے الفاظ کے مخالف ہیں۔ یعنی پہلی روایت میں ہے کہ: نابینا شخص مسجد میں موجود گڑھے میں گر گیا اور اس مرسل روایت میں ہے کہ کنویں میں گر گیا۔ پہلی حدیث میں ہے کہ اس کو دیکھ کر قوم میں بہت لوگ ہنس پڑے اور اس مرسل روایت میں ہے کہ کچھ لوگ ہنسے، حالانکہ یہ حدیث ایک ہی ہے جو ابو العالیہ روایت کرتے ہیں اور ایک ہی حدیث میں متن اور الفاظ میں مخالفت۔ متن کے اضطراب کا باعث بنتا ہے اور حدیث کے متن یا سند میں اضطراب بھی حدیث کے ضعف کا موجب ہے

جیسا کہ اصول حدیث کی کتاب میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے، کیونکہ حدیث کے ایک ہی روایت میں کبھی کچھ الفاظ کہنا اور کبھی کچھ اور ظاہر کرتا ہے کہ راوی حدیث کو مکمل طور پر حفظ نہیں، اس لیے اس کی اس روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔

**خلاصہ کلام:** اس روایت کے ناقابل حجت ہونے کی تین وجوہات ہیں:

ایک راوی کی تدلیس، دوسری حدیث میں ارسال اور تیسری متن میں اضطراب۔ اس کے بعد قارئین کرام یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھیں کہ احناف حضرات کا دعویٰ تو خاص ہے یعنی مطلق ہنسنا نہیں بلکہ قہقہ لگا کر ہنسنا اور دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ دعویٰ کے مطابق بھی نہیں بلکہ دعویٰ سے عام ہے۔ یعنی روایت میں الفاظ ''ضحک'' کے ہیں جو معمولی ہنسنے اور قہقہ لگانے میں شامل ہے۔ حالانکہ یہ بزرگ کم ہنسنے سے وضو کے ناقض ہونے کے قائل نہیں، لہٰذا ان کے اس دعویٰ اور کمزور دلیل کی آپس میں مطابقت تامہ نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ ہنسنے سے نماز ٹوٹ جائے گی لیکن وضو کے ناقض ہونے پر کوئی بھی دلیل نہیں تب بھی نماز میں ہنسنے والے کا وضو بحال رہے گا، البتہ نماز اللہ تعالیٰ کے ارشاد مبارک:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ [البقرہ: ۲۳۸]

کی مخالفت کی وجہ سے ٹوٹ جائے گا جیسا کہ احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے (جو پہلے ذکر کر چکے ہیں) کہ اس آیات کریمہ کے نزول کے بعد نماز میں کلام وغیرہ سے روک دیا گیا اور اس لیے ہنسنا چونکہ اس حکم کے منافی ہے اس لیے اس سے نماز ٹوٹ جائے گی، باقی وضو کے ٹوٹنے کی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے ثابت نہیں ہوگا اور معمول یہ نہ رہے گا۔

## المسئلة الخامسة:

پانچواں مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ جنازے کو اٹھانے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق اکثر محدثین وغیرہم کا یہ مسلک ہے کہ جنازہ کو اٹھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہمیں بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کچھ محدثین جنازے کو اٹھانے سے وضو کے قائل ہیں ہم یہاں پر ان کے دلائل ذکر کر کے ان پر کلام کرتے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیے:

## دلیل نمبر ۱:

امام احمد اور بیہقی صالح مولیٰ التوأمہ کے طریق سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مرفوعاً روایت لاتے ہیں:

((من غسل ميتا فليغتسل ومن حمله فليتوضأ))

یعنی جو شخص میت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے اسے چاہیے کہ وضو کرے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ صالح ضعیف ہے۔

**دلیل نمبر۲:**

امام ابو داؤد سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ:

(( من غسل الميت فليغتسل و من حمله فليتوضأ ))

ترجمہ گزر چکا ہے۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عمرو بن عمیر ہے جس کے متعلق حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں کہ یہی مجہول ہے۔

**دلیل نمبر۳:**

ترمذی اور ابن حبان نے اس طریق سے روایت نقل کی ہے۔ سہیل بن ابی صالح اپنے والد ابو صالح سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت بیان کرتا ہے جس کے الفاظ ابو داؤد والی روایت کے الفاظ کی طرح ہیں۔ اس روایت کی اگرچہ ابن حبان اور ابن حزم نے تصحیح کی ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری اور تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث معلول ہے کیونکہ اس کی سند میں سہیل کا باپ جو ابو صالح ہے اس نے یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنی بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک غیر معروف راوی کا واسطہ ہے اس لیے یہ روایت متصل نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ٹھہری۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ ابو صالح اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان واسطہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے یہی روایت سہیل سے اس طرح نقل کی ہے کہ سہیل اپنے باپ ابو صالح سے اور اس نے اسحٰق مولیٰ زائدہ سے اور اس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ یعنی ابو صالح اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اسحاق کا واسطہ ہے وہ اسحاق اگرچہ ثقہ ہے مگر حافظ صاحب نے سفیان بن عیینہ تک کوئی سند ذکر نہیں کی، اس لیے جب تک سفیان بن عیینہ تک سند ذکر نہیں کی جاتی۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ سفیان تک سند کا یہ حصہ صحیح ہے یا نہیں۔ تب تک اس سے بحث شدہ مسئلہ پر دلیل نہیں لی جا سکتی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تغلیق التعلیق ج ۲ ص ۴۶۲ میں اسحاق مولیٰ زائدہ کی اس روایت کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ سے ذکر کیا ہے:

(( من غسله الغسل و من حمله الوضوء ))

یعنی میت کو غسل دینے سے غسل اور اٹھانے سے وضو ہے لیکن اس حدیث کی سند جو حافظ صاحب نے اپنی مذکور کتاب میں ذکر کی ہے۔ اس میں ایک راوی ابو واقد صالح بن محمد بن زائدہ اللیثی ہے۔ یعنی یہ راوی ضعیف ہے اور تہذیب التہذیب میں حافظ صاحب نے اس راوی کے متعلق جارحین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راوی سخت ضعیف ہے۔

نوٹ: بعد میں سنن الکبریٰ للبیہقی کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں یہ روایت سفیان بن عیینہ تک باسند مذکور ہے، اس لیے اوپر جو علت ہم نے پیش کی ہے وہ صحیح نہیں، للہذا اس روایت کے ضعف کی اصل علت

یہ ہے کہ اس روایت کے متعلق بڑے بڑے محدثین کی یہ تحقیق ہے کہ یہ روایت مرفوعاً ثابت نہیں، بلکہ ان کی تحقیق کے مطابق یہ روایت موقوف ہی صحیح ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب تلخیص الحبیر میں لکھتے ہیں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ اس حدیث کے چند طرق لا کر ان کی تضعیف کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

" والصحیح انهٗ موقوف "

صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

" الاشبهة موقوف "

حق بات کے زیادہ مشابہ یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استاذ علی بن المدینی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ:

" لا یصح فی الباب شیءٌ "

اس باب میں کوئی روایت بھی صحیح نہیں اور امام محمد بن یحییٰ ذہلی شیخ البخاری فرماتے ہیں کہ:

" لا اعلم فیه حدیثا ثابتا "

اس مسئلہ کے متعلق مجھے کوئی بھی صحیح و ثابت روایت کا علم نہیں ہوا اور اگر ثابت ہوتی تو ہمیں اس پر عمل کرنا لازم ہو جاتا اور امام ابن المنذر رفرماتے ہیں کہ:

" لیس فی الباب حدیثا یثبت "

اس باب میں کوئی روایت بھی ثابت نہیں اور امام ابن ابی حاتم کو اپنی کتاب کتاب العلل میں اپنے والد امام ابو حاتم سے نقل کرتے ہیں کہ:

" لا یرفعهٗ الثقات الثقات اِنّما هو موقوف "

اس حدیث کو ثقہ روایت مرفوعاً ذکر نہیں کرتے بلکہ یہ روایت موقوف ہی ہے اس طرح امام رافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

" لم یصح علماء الحدیث فی هذا الباب شیئاً مرفوعاً "

اس باب میں حدیث کے علماء نے کسی بھی مرفوع حدیث کی تصحیح نہیں کی ہے۔ ہمارے مذکورہ بالا کلام کی تائید امام ترمذی کے کتاب العلل میں مذکورہ اس کلام سے بھی ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے حدیث:

(( من غسل المیت الخ ))

کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: بعض رواۃ نے یہ روایت سہیل بن ابی صالح سے اور اس نے اسحاق مولیٰ زائدہ سے اور اس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کی ہے۔ یعنی امام بخاری رحمہ اللہ کا مطلب یہ

ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک موقوف ہے اور نبی اکرم ﷺ کی مرفوع حدیث نہیں، کیونکہ یہ روایت اسحاق مولیٰ زائدہ سے مروی ہے۔ امام ترمذی، امام بخاری رحمہ اللہ سے مزید نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"ان احمد بن حنبل وعلی بن عبداللہ قالا لا یصح من هذا الباب شيء"

یعنی امام احمد بن حنبل اور علی بن عبداللہ المدینی نے فرمایا کہ اس باب میں کوئی بھی مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

نوٹ: حدیث کے متعلق اس طرح کے احکام مثلاً فلاں روایت مرفوع ہے یا موقوف یا پھر موصول ہے یا مرسل وغیرھا علل کے متعلق ہمیں محدثین عظام رحمہم اللہ پر ہی اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ① حدیث کی خفیہ علل کا علم جو اللہ تعالیٰ نے ان بزرگان دین کو عطا فرمایا تھا وہ آج کل قریباً قریباً مفقود ہے۔ ② ان کے اذہان میں ایک ہی وقت میں ایک ہی حدیث کے کئی کئی طرق موجود ہوتے ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر روایت کے مراتب اور ان کے حفظ و اتقان کو درجات کو ملاحظہ کرتے ہوئے ان کا آپس میں موازنہ کر کے ان پر احکام لگاتے تھے کہ یہ روایت مرفوعاً صحیح ہے یا موقوف۔ اور چونکہ ہمیں اتنا علم نہیں ہے اور نہ ہی ان روایات کے متعدد طرف ذہن نشین ہیں کہ ان کی بنا پر کوئی فیصلہ کر سکیں اس لیے ہمیں حدیث کے اس اہم شعبہ کے متعلق اس فن کے ائمہ ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ ہم تو صرف کسی روایت کی سند کے راوی کے متعلق جرحاً وتعدیلاً کچھ نہ کچھ صحیح اندازہ لگا کر کچھ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ باقی حدیث کی خفیہ علل کا علم ہماری بساط سے بہت اوپر ہے۔ واللہ اعلم

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعلیق التعلیق میں سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( من غسل میتاً فلیغتسل )) "جو میت کو غسل دے وہ غسل کرے۔"

حافظ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کے رواۃ سب ثقہ ہیں لیکن امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ: "فیه نظر" "اس کی سند میں نظر ہے" یعنی اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ محدثین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حدیث کے متعلق علل کا ایسا علم عطا فرمایا ہے جس کی مثال ان سے پہلے کے زمانہ میں بالکل ہی نہ تھی۔ اپنے فہم ثاقب اور خداداد فراست سے کسی حدیث کی مخفی علل پر مطلع ہو جاتے تھے، اگرچہ بظاہر اس کی سند کے تمام راوی مضبوط ثقہ ہوتے ہیں۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس روایت کے متعلق کسی علت خفیہ کا علم امام دارقطنی کو ہوا تھا جس کی وجہ سے فرمایا: "فیه نظر" یعنی اس میں نظر ہے۔ اصول حدیث میں احادیث کی علل کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس کا علم کچھ اور چند بڑے بڑے محدثین کو ہی حاصل ہو سکتا ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا

سطر میں بیان کیا گیا۔ بہر حال عرض کر رہے تھے کہ سعید بن المسیب کی روایت بھی معلول ہے اور حافظ صاحب علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ کی کتاب الالمام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کے طریق سے مروی ہے ان سے محمد بن عمرو روایت کرتے ہیں اور یہ روایت مرفوع ہے۔ لیکن محمد بن عمرو سے روایت کرنے والے جو حفاظ ہیں وہ سب اس روایت کو موقوف ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت موقوف ہی صحیح ہے نہ کہ مرفوع۔ اس باب میں یعنی میت کو غسل دینے کے متعلق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے امام احمد اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے۔ اس کی سند میں مصعب بن شیبہ ہے جس کے متعلق حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ: "فيه مقال" یعنی اس میں کلام ہے اور تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں کہ:

" ضعفه ابوزرعه واحمد والبخارى و صححه ابن خزيمه "

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو ابو زرعہ احمد اور بخاری رحمہ اللہ نے تضعیف کی ہے، صرف ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔"

ہم کہتے ہیں تین بلند پایہ ائمہ کے مقابلے میں ابن خزیمہ رحمہ اللہ کی تصحیح اتنا وزن نہیں رکھتی۔ مزید فرماتے ہیں کہ میت کو غسل دینے والے پر غسل کے حکم کے متعلق امام ابن ابی حاتم اور دار قطنی نے اپنی علل میں سیدہ عائشہ سے انھوں نے سیدنا حذیفہ سے بھی روایت نقل کی ہے اور دونوں نے فرمایا کہ: " انهٗ لايثبت " یعنی یہ حدیث ثابت نہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ان محدثین کا اس حدیث سے انکار محدثین کے طریقہ کے مطابق ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ امام بیہقی نے مذکورہ روایت سیدنا حذیفہ سے اس سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ معمر عن ابی اسحٰق عن ابیہ عن حذیفہ امام بیہقی نے اس کے ضعف کی یہ علت بیان کی ہے کہ ابو بکر بن ابی اسحاق السبعی فرماتے ہیں کہ یہ روایت محض ہیچ ہے، کیونکہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو اسحاق السبعی ہے۔ وہ تیسرے طبقے کا مدلس ہے اور روایت عن سے کر رہا ہے اور مختلط بھی ہو گیا تھا، یہ علم نہیں کہ معمر سے اس کا سماع قدیم ہے یا پھر بعد الاختلاط ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے باپ کا علم نہیں کہ اس کا کیا حال ہے۔ یعنی مجہول الحال ہے اس کی توثیق و تعدیل ثابت نہیں، اس لیے یہ سند بے کار ہے۔ اس طرح اس مضمون کی ایک روایت سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے امام احمد نے مسند احمد میں نقل کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی مبہم ہے، لہٰذا اس راوی کی جہالت کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہوئی۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ مستدرک حاکم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت منقول ہے کہ:

(( ليس عليكم فى غسل ميتكم غسل اذا غسلتموه ان ميتكم يموت طاهر

و ليس بنجس فحسبكم ان تغسلوا بايديكم ))

''تمھارے اوپر میت کو غسل دینے کی وجہ سے غسل واجب نہیں کیونکہ تمھاری میت مرتی ہے پاک حالت میں اور نجس نہیں ہوتی، لہٰذا تمھارے لیے ہاتھوں کا دھونا ہی کافی ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خطیب بغدادی کی تاریخ سے امام احمد کے فرزند ارجمند عبداللہ کے طریق سے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ:

(( كنا نغسل الميت فمنا من يغتسل و منا من لايغتسل ))

''ہم میت کو غسل دیتے تھے پھر ہم میں سے کوئی تو غسل کر لیتا تو کوئی نہ کرتا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں غسل دینے والے پر غسل لازم نہیں۔ میت کو غسل دینے والے پر غسل نہ کرنے کی تائید میں سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کا یہ اثر بھی بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کو امام مالک نے مؤطا میں نقل کیا ہے۔ اس اثر کا مطلب یہ ہے کہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی میت کو غسل دیا، پھر وہاں جو مہاجرین موجود تھے ان سے پوچھا کہ آج کا دن بہت سردی کا ہے اور میں روزے سے ہوں، کیا مجھ پر شوہر کو غسل دینے کی وجہ سے غسل لازم ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، آپ پر غسل واجب نہیں۔ اور صحیح بخاری کتاب الجنائز باب غسل المیت کے تحت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر مطلقاً موجود ہے، جسے امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً ذکر کیا ہے کہ:

(( ان عبدالله بن عمر رضى الله عنه حظ ابنا لسعيد بن زيد و حملهٗ ثم دخل المسجد فصلّى و لم يتوضأ ))

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سعید بن زید کے ایک متوفی فرزند کو خوشبو لگائی اور اسے اٹھایا اور پھر مسجد میں داخل ہوئے اور نماز ادا کی اور وضو نہیں کیا۔''

اس اثر سے بھی معلوم ہوا کہ جنازہ کو اٹھانے والے پر وضو لازم نہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری میں سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا ایک اثر موجود ہے جسے امام ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ موصولاً نقل کیا ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی بیٹی عائشہ فرماتی ہیں کہ ان کے والد یعنی سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع پہنچی وہ مقام عقیق پر تھے، پھر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ آئے اور آکر سعید رضی اللہ عنہ کو غسل دیا اور کفن دیا اور خوشبو لگائی پھر گھر میں آئے غسل کیا پھر فرمایا میں نے سعید رضی اللہ عنہ کو غسل دینے کی وجہ سے غسل نہیں کیا بلکہ میں نے گرمی کی وجہ سے غسل کیا ہے، اگر وہ نجس ہوتے تو میں انھیں چھوتا ہی نہیں، اس اثر سے بخوبی معلوم ہوا کہ میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں۔ سعد رضی اللہ عنہ کے اس اثر کے فوائد میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ اس اثر کے فوائد میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر عالم کوئی ایسا کام

کرے جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو کوئی غلط فہمی یا اشتباہ کا اندیشہ ہو تو اسے چاہیے کہ ان کو اپنے اس کام کی حقیقت سے مطلع کرے تاکہ وہ اس کے اس عمل کو اس کے غیر محمل پر حمل نہ کریں یعنی سعد رضی اللہ عنہ نے جب سعید رضی اللہ عنہ کو غسل دیا تو گھر آ کر غسل کیا تو اسے دیکھنے والوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ سعد رضی اللہ عنہ نے شاید یہ غسل سعید رضی اللہ عنہ کو غسل دینے کی وجہ سے غسل کیا ہے، اس وجہ سے تھا نہ کہ میت کو غسل دینے کی وجہ سے۔

اسی باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا ایک ٹکڑا ذکر کیا جو صحیح بخاری باب ''الجنب یمشی فی السوق من کتاب الغسل'' میں موصولاً گزر چکی ہے۔ وہ ٹکڑا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المؤمن لا ینجس'' یعنی مومن نجس نہیں ہوتا۔ اس ٹکڑا کے لانے سے امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے جب معلوم ہوا کہ مومن پلید نہیں۔ تو اسی کا مطلب یہ ہوا کہ میت ہونے کی حالت میں بھی وہ طاہر ہے، باقی اسے غسل دینے والے پر غسل کرنا لازمی نہیں ہے، میت کو غسل دینے کا امر تعبدی ہونا اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وفات کے غسل دلایا گیا حالانکہ آپ سے بڑھ کر طاہر اور کوئی ہو سکتا ہے؟ واللہ اعلم بالصواب

❀❀❀❀

# غسل جنابت کا بیان

**موجوبات غسل:**

نمبرا: نیند میں خواہ جاگنے کی حالت میں منی کا انزال، چاہے دخول ہو یا نہ ہو۔

**دلیل نمبرا:**

صحیح ابن حبان وابن خزیمہ وغیرہما میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی عورت نیند میں دیکھے جس طرح مرد دیکھتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اذا انزلت المرأۃ فلتغتسل » یعنی ''جب اس کو اس حالت میں انزال ہو جائے تو وہ غسل کرے۔''

**دلیل نمبر۲:**

صحیح ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ سیدہ زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام سلیم، ابوطلحہ کی اہلیہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا، اے اللہ کے رسول:

(( ان اللہ لا یستحی من الحق ھل علی المرأۃ الغسل اذا ھی احتملت قال نعم اذا رأت الماء ))

''اللہ تعالیٰ حق کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا جب عورت کو احتلام ہو تو کیا عورت پر غسل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جب پانی دیکھے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جو پانی دیکھے اور اس احتلام یاد ہے یا نہیں تو اس پر غسل لازم ہے اور اگر احتلام یاد ہے لیکن پانی نہ دیکھا تو اس پر غسل لازم نہیں۔ اس میں مرد اور عورت کے لیے ایک ہی حکم ہے اور جاگتے ہوئے بھی بغیر دخول کے اگر کسی سبب سے منی کا خروج ہو جائے تو غسل واجب ہو جائے گا، جیسا کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث تمام کتب حدیث میں موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « الماء من الماء » یعنی اگر خروج منی ہوا تو غسل لازم ہوا یعنی کسی طرح بھی منی کا خروج ہوا تو غسل واجب ہو گیا۔ اس عام حدیث کی بنا پر ابتدائے اسلام میں دخول کے بعد اگر انزال نہ ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں ہوتا تھا لیکن یہ خاص جزء یعنی عورت کو فرج میں دخول کے بعد انزال کے نہ ہونے سے غسل کا واجب نہ ہونا بعد میں منسوخ

ہو گیا یعنی عورت کو فرج میں دخول کرنے سے خواہ انزال نہ بھی ہو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ مسئلہ ان شاء اللہ آگے احادیث کے دلائل سے پیش کیا جائے گا۔

## انزال نہ ہونے سے غسل واجب نہ ہونے کے نسخ کے دلائل:

### دلیل نمبر ۱:

صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حدیث سنائی کہ یہ فتویٰ جس کا مطلب یہ تھا کہ پانی سے پانی یعنی انزال ہو تو غسل واجب ہو گا ورنہ نہیں تو یہ :

(( کان رخصة رخصها رسول الله صلى الله عليه وسلم فى اول الزمان اوبدأ الاسلام ثم امر بالاغتسال بعد ))

''ایک رخصت تھی کہ نبی کریم ﷺ نے پہلے دی تھی یا ابتدائے اسلام میں دی تھی اور بعد میں ہر حالت میں غسل کا امر فرما دیا۔''

### دلیل نمبر ۲:

صحیح ابن حبان میں جید سند کے ساتھ امام زہری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے عروہ بن زبیر سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص جماع کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوتا تو اس کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا کہ لوگوں پر لازم ہے کہ اس حکم کو اختیار کریں جو بعد میں نبی کریم ﷺ سے موصول ہو، مجھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ بے شک نبی ﷺ فتح مکہ سے پہلے (عدم انزال کی صورت میں) غسل نہیں فرماتے تھے، (بعد میں) لوگوں کو غسل کا امر فرمایا۔

### دلیل نمبر ۳:

صحیح ابن حبان وغیرہ میں حسن سند کے ساتھ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( اذا جلس بين شعبها الاربع ثم جهدها فقد وجب الغسل وان لم ينزل ))

''اگر شوہر اپنی بیوی کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھا اور پھر کوشش کی تو (اس پر) غسل واجب ہو گیا، اگر چہ انزال نہ بھی ہوا۔''

### دلیل نمبر ۴:

صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک مقام پر بیٹھے تھے پھر آپس میں اس بات کا ذکر چھیڑ دیا کہ غسل کو واجب کرنے والی کونسی چیز ہے، اس پر مہاجر صحابہ جو وہاں موجود تھے، نے کہا کہ میاں بیوی کے ملنے سے غسل اس وقت واجب نہیں ہوتا جب تک انزال

نہ ہو۔ ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے ان سے کہا کہ میں تمھیں اس کے متعلق صحیح خبر لا کر بتلاتا ہوں، پھر ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف گئے اور سلام کہا اور عرض کی کہ میں آپ سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں جب کہ مجھے اس سے حیا بھی آ رہی ہے۔ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسی بات جو آپ اپنی ماں سے پوچھیں جس نے آپ کو جنا ہے، اس کے سوال کرنے میں حیا نہ کر، کیونکہ میں آپ کی ماں ہوں۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے کہا کہ کونسی چیز ہے جو غسل واجب کرتی ہے۔ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اس مسئلہ کے علم رکھنے والے کے پاس آئے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا جلس بین شعبها الأربع ومس الختان الختان وجب الغسل )) [1]

''جب شوہر بیوی کی چار شاخوں کے درمیان بیٹھے اور شرمگاہ شرمگاہ کو چھوئے تو غسل واجب ہو گیا۔''

## ترتیب وطریقہ غسل:

جنابت کے غسل کے لیے نیت ضروری ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( انّما الاعمال بالنیات وإنما لکل امرئ مانویٰ ))

''تمام اعمال نیت ہی سے درست ہوتے ہیں اور ہر شخص کو وہی کچھ ملے گا جو اس کی نیت ہو گی۔''

صحیح بخاری اور صحیح ابن خزیمہ میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میری خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا نے بتلایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غسل جنابت کے لیے پانی قریب کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین مرتبہ ہاتھوں کو دھویا، پھر سیدھا ہاتھ برتن میں داخل کیا، پھر سیدھے ہاتھ سے پانی بھر کر شرمگاہ پر بہایا اسے الٹے ہاتھ سے دھویا پھر اپنے الٹے ہاتھ کو زمین پر مارا اور سے اچھی طرح ملا پھر وضو کیا نماز کے وضو کی طرح (سر کے مسح اور پاؤں دھونے کے علاوہ) پھر اپنے سر مبارک پر تین چلو بہا دیے، پھر اپنے دوسرے جسم پر پانی بہایا، پھر اس جگہ سے تھوڑا سا ہٹ کر اپنے پاؤں مبارک دھوئے، پھر میں تولیہ لے کر آئی تو آپ نے نہ لیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ غسل کرنے میں وضو نصف بازوؤں تک کرنا ہے، سر کے مسح کی جگہ پر تین چلو بہائے جائیں، جس طرح اس حدیث میں اس کا واضح بیان موجود ہے۔ سنن نسائی میں صحیح سند کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے راویت مروی ہے جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا طریقہ بیان کیا ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ:

((حتی اذا بلغ رأسهٗ لم یمسحْ وافرغ علیه الماء))

''جب ہاتھ دھوئے اور منہ وغیرہ دھو کر سر تک پہنچے تب سر کا مسح نہیں۔''

بلکہ سر پر تین چلو بہائے جیسا کہ سابقہ حدیث میں بھی اس کا ذکر گزرا ہے۔ اس حدیث میں صراحت ہے

---

[1] صحیح ابن خزیمہ۔ کتاب الوضوء۔ جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۰۵۔

کہ سر کا مسح نہیں کیا بلکہ سر پر پانی بہایا۔ مطلب کہ جن احادیث میں یہ بیان ہے کہ آپ ﷺ نے نماز کا سا وضو کیا تو اس سے مراد باز ووں تک ہے سر پر مسح کے بجائے تین چلو پانی بہایا اور غسل مکمل کرنے کے بعد تھوڑا سا ہٹ کر پاؤں دھوئے جس کے سر کے بال بڑے ہوں اسے چاہیے کہ سر پر پانی کے چلو بہانے سے قبل انگلیاں تر کر کے بالوں کی جڑوں تک خلال کرے۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح ابن خزیمہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب غسل جنابت فرماتے تو پہلے برتن سے اپنے ہاتھ پر پانی ڈالتے تھے، پھر اسے دھوتے، پھر اپنے الٹے ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرمگاہ کو دھوتے اور نماز کے وضو کی طرح وضو کرتے، پھر اپنے ہاتھوں کو برتن میں ڈال کر ان تر شدہ ہاتھوں سے اپنے بالوں کا خلال کرتے تھے تاکہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے اور جب سمجھتے کہ اب سر کی کھال تک پانی پہنچ گیا ہے تو پھر اپنے سر پر تین چلو پانی بہا دیتے تھے اس کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی اپنے بقیہ جسم پر بہاتے تھے، تین چلوؤں کے بہانے کی کیفیت صحیح بخاری اور صحیح ابن خزیمہ کی روایت میں جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغتسل من حلاب فيأخذ بكفيه فيجعلهٗ على شقه الايمن و يأخذ بكفيه فيجعلهٗ على شِقِّهِ الايسر ثم يأخذ بكفيه فيجعلهٗ فى وسط رأسه ))

”رسول اکرم ﷺ حلاب میں سے غسل فرماتے تھے (حلاب ایک برتن ہے جس میں آٹھ رطل پانی ہوتا ہے) پھر آپ اس میں سے چلو بھر کر پہلے سیدھی طرف بہاتے، پھر الٹی طرف اور پھر چلو بھر کر سر کے بیچ میں بہا دیتے تھے۔“

اور وضو یا غسل میں اعضاء کا دھونا سیدھی طرف سے شروع کرتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح ابن خزیمہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت مروی ہے کہ بے شک نبی ﷺ:

(( يحب التيامن فى شأنه حتى فى ترجله ونعله وطهوره ))

”ہر بات میں سیدھی طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے یہاں تک کہ کنگھی کرنے، جوتی پہننے اور طہارت حاصل کرنے میں بھی۔“

عورتیں اپنے بالوں کی جو چوٹیاں بناتی ہیں۔ غسل جنابت میں ان کو کھولنا ضروری نہیں وہ صرف اپنے سر پر تین چلو پانی بہا دے۔ صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں نبی ﷺ کی اہلیہ ام المومنین سیدہ ام سلمہ سے روایت ہے کہ:

”قلت يا رسول الله( صلى الله عليه وسلم) انى امرأة اشد ضفر رأسى فانقضه لغسل الجنابة؟ فقال إنما يكفيك ان تحثين علىٰ رأسك ثلاث حثيات من ماء

ثم تفضين عليك الماء فتطهرين"

''میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں کہ اپنے سر کے بالوں کی چوٹیاں بنا دیتی ہوں تو کیا میں ان کو غسل جنابت کے وقت کھولوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرے لیے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر پانی کے تین چلو بہا دے پھر اپنے باقی جسم پر پانی بہا دے، پھر تو پاک ہو جائے گی۔''

صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان کو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی عورتوں کو حکم کرتے ہیں کہ وہ غسل جنابت کے وقت اپنے بالوں کو کھول دیں تو بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ عبداللہ بن عمرو پر تعجب ہے، انھوں نے عورتوں کو اتنی مشقت کی تکلیف دی ہے کیا پھر انھیں یہ حکم نہیں کرتا کہ وہ بال بھی منڈوا دیں البتہ میں اور رسول اکرم ﷺ غسل کرتے تھے اور ساتھ ہی طہارت حاصل کرنا شروع کرتے اور میں اپنے سر پر تین چلو بہانے کے علاوہ کچھ نہ کرتی تھی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میاں بیوی اکٹھے نہا سکتے ہیں اس میں کچھ بھی حرج وقباحت نہیں۔

## حالت جنابت میں قرآن مجید پڑھنے سے منع کا بیان:

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( لم يكن يحجب النبي صلى الله عليه وسلم عن القرآن شيءٌ سوى الجنابة))

''نبی کریم ﷺ کو جنابت کے علاوہ اور کوئی چیز تلاوت قرآن سے نہیں روکتی تھی۔''

اس روایت کو امام احمد، اصحاب السنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، بزار، دارقطنی، بیہقی نے روایت کیا ہے اور ترمذی ابن السکن۔ عبدالحق اور بغوی نے اس کی تصحیح کی ہے اور ابن خزیمہ اپنی اسناد سے امام شعبہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ یہ حدیث میرے اصل مال کا تیسرا حصہ ہے اور امام دارقطنی نے شعبہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "ماحدث بحديث احسن منه" ''اس حدیث سے بہتر حدیث میں بیان نہیں کرتا۔'' اور اس حدیث مرفوع کی تائید علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے بھی ہوتی ہے جو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ان سے موقوفاً ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ:

(( اقرؤ القرآن مالم تصب احدكم جنابة فان اصابة فلا ولاحرف ))

''تم قرآن مجید پڑھو جب تمھیں جنابت نہ پہنچے اگر تم جنبی ہو جاؤ تو پھر نہ پڑھو اور ایک حرف بھی نہیں۔''

اسی طرح مسند ابی یعلیٰ میں حسن سند کے ساتھ علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ:

(( رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم توضأ ثم قرأ شيئا من القرآن ثم قال

ھکذا لمن لیس بجنب فاما الجنب فلا و لا آیة ))

''میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا آپ نے وضو فرمایا اور قرآن مجید کی کچھ تلاوت فرمائی، پھر فرمایا یہ جائز ہے اس شخص کے لیے جو جنبی نہیں مگر اگر جنبی ہے تو پھر ایک آیت بھی نہ پڑھے۔''

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، باقی قرآن مجید کو آدمی بے وضو چھو سکتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ منع کے متعلق چند احادیث مروی ہیں:

**حدیث نمبر ۱:**

عمرو بن حزم کی طرف جو آپ ﷺ نے مراسلہ لکھا تھا اس میں دیگر احکامات کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ناپاک قرآن کو نہ چھوئے مگر اس کتاب کی اسناد میں کلام ہے۔

**حدیث نمبر ۲:**

طبرانی معجم الکبیر اور دار قطنی وغیرہ میں حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جب مجھے یمن بھیجا تو فرمایا:

((لا تمس القرآن الا وانت طاھر)) ''قرآن مجید کو صرف طہارت حالت میں چھویا کریں۔''

لیکن اس کی سند میں بھی ضعف ہے۔

**حدیث نمبر ۳:**

طبرانی کبیر وصغیر اور دار قطنی وبیہقی میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہے کہ:

(( لا یمس القرآن الا طاھر )) ''قرآن کو مت چھوئیں مگر طاہر حالت میں۔''

اس حدیث کے متعلق علامہ ہیثمی مجمع الزوائد ج ۱ ص ۲۷۶ میں فرماتے ہیں کہ: ''رجاله موثقون'' یعنی اس حدیث کے تمام راویوں کی توثیق کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص الحبیر ص ۱۳۱ ج ۱ میں فرماتے ہیں:

''وإسنادهٗ لا بأس به'' ''اس کی سند میں کوئی بھی حرج نہیں۔''

ہماری گزارش ہے کہ اس حدیث کی سند میں ابن جریج کی تدلیس کے شبہ کے علاوہ دوسری کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی مگر اس تدلیس کے شبہ کی وجہ سے سند میں کوئی شدید ضعف پیدا نہیں ہوتا ہے، اس لیے یہ حدیث مذکورہ بالا دو احادیث سے مل کر کم از کم حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ نجس آدمی بے وضو ہو یا جنابت والا قرآن کریم کو نہ چھوئے۔ واللہ اعلم بالصواب

**جنبی آدمی اگر غسل کرنے سے پہلے کھانا پینا چاہے یا سونا چاہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے:**

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( کان النبی صلی اللہ علیه وسلم إذا أراده ان یأکل أوینام وھو جنب وتوضأ

وضوءہٗ للصلاۃ ))

"جب آپ ﷺ حالت جنابت میں ہوتے اور آپ کا ارادہ غسل کرنے سے پہلے سونے کا ہوتا تو وضو فرماتے جس طرح نماز کے لیے وضو فرماتے تھے۔"

اور صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے:

(( اذا ارادہ ان ینام وھو جنب غسل فرجہٗ و توضأ للصلوٰۃ ))

"آپ ﷺ جب حالت جنابت میں ہوتے اور نیند کا ارادہ کرتے تو اپنے فرج کو دھوتے اور نماز والا وضو فرماتے تھے۔"

اور سنن نسائی میں صحیح سند کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں روایت ہے:

(( کان اذا اراد ان ینام وھو جنب توضأ وضوئه للصلاۃ و اذا اراد ان یأکل اویشرب غسل یدیه ثم یأکل او یشربُ ))

"جب آپ ﷺ حالت جنابت میں ہوتے اور سونے کا ارادہ فرماتے تو نماز والا وضو فرماتے اور جب کھانے پینے کا ارادہ فرماتے تو صرف ہاتھ دھوتے پھر کھا پی لیتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جنبی کے لیے سونے سے پہلے ہر صورت وضو کرنا ہے باقی کھانے پینے کے لیے اگر وضو کرے گا تو بہتر ہے اور اگر وضو نہیں کرتا تو پھر ہاتھ دھو کر کھا پی سکتا ہے۔ باقی وہ روایت جو اصحاب السنن سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ سوتے تھے حالت جنب میں اور پانی نہیں چھوتے تھے۔ اس کے متعلق امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں اور امام مسلم اس حدیث کو لا... ہیں مگر " لم یمس ماءً " (پانی نہ چھونے والی زیادتی کو حذف کر دیا) کیونکہ اس زیادتی کو اپنی کتاب التمیز میں معلول قرار دیا ہے۔ مشہور محدث احمد بن صالح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

(( لا یحل ان یروی ھذا الحدیث )) "اس حدیث کو روایت کرنا حلال نہیں۔"

ان محدثین کا کہنا ہے کہ اس زیادتی کو ذکر کرنے میں اس حدیث کی سند کے راوی ابو اسحاق السبعی سے خطا ہوئی ہے۔ حافظ صاحب تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا۔ آپ نے غسل کے لیے پانی کو نہیں چھوا اور اس میں وضو کی نفی نہیں ہے اور اس محمول کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جو امام احمد کی سند میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

(( کان یجنب من اللیل ثم یتوضأ وضوئہٗ للصلوٰۃ حتٰی یصبح ولا یمس ماءً ))

"آپ ﷺ رات کو جنبی ہوتے اور نماز کی طرح وضو فرماتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی اور آپ پانی کو چھوتے ہی نہیں تھے۔"

اس حدیث کو وضو کی تصریح ہے اور پانی کے نہ چھونے کا بھی ذکر ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپ غسل کے لیے پانی نہیں چھوتے تھے باقی وضو کی نفی اس میں نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس مضمون کی ایک دوسری حدیث صحیحین میں عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! اگر ہم میں سے کوئی جنبی ہو جائے تو وہ سو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو پھر وہ سو سکتا ہے۔ اس روایت کے دوسرے طریق میں یہ الفاظ ہیں کہ:

(( اغسل فرجك و توضأ )) ''شرمگاہ کو دھوئیں اور وضو کریں۔''

اور امام مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

(( نعم ليتوضأ ثم لينم حتى يغتسل اذا شاءَ ))

''ہاں وضو کر کے سو جائے یہاں تک کہ جب چاہے غسل کر لے۔''

صحیح میں ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ انھیں رات کو جنابت ہو گئی اس کا کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( توضأ واغسل ذكرك ثم نم )) ''اپنے شرمگاہ کو دھولے پھر وضو کر کے سو جاؤ۔''

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ جنبی شخص کے لیے بہر حال نیند سے پہلے شرمگاہ دھونا اور پھر سونا ہے۔

## اذان اور اقامت کا بیان:

نماز کے لیے وضو کے بعد خواہ جماعت کے لیے خواہ منفرد کے لیے اذان اور اقامت بھی ضروری ہے، یعنی جس جگہ پر اکیلا رہتا ہے تو اسے بھی اذان اور اقامت کہنی ہے مگر جب گاؤں اور شہر میں ہے وہاں نماز کے لیے اذان آچکی ہو اور اس سے جماعت فوت ہو چکی ہو اس صورت میں اگرچہ اذان ضروری نہیں ہے لیکن اقامت اسے ضروری طور پر کہنی ہے۔ اس حکم میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ شخص جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے قریب کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا تھا اور نماز میں رکوع اور سجدے نامکمل طور پر ادا کر رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین بار نماز لوٹانے کا حکم فرمایا اور یہ حدیث مسیئ الصلاۃ کے نام سے مشہور ہے ان کی روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں اور سیدنا خلاد بن رافع رضی اللہ عنہما سے ابو داود، نسائی، ترمذی، مسند احمد، صحیح ابن حبان میں مروی ہے۔ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے المصنف میں اس کے نام کی وضاحت کی ہے کہ کا نام خلاد بن رافع تھا۔ ان کتب احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے دو رکعتیں ادا کی تھیں جس سے معلوم ہوا کہ وہ نماز تحیۃ المسجد تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب نفلی نماز بھی درستگی سے نہ پڑھی جائے تو نہیں ہوتی، کیونکہ وہ تحیۃ المسجد تھی اور تحیۃ المسجد نفلی نماز ہے تو پھر فرض نماز بالاولی نہیں ہو گی۔ اس حدیث میں یہ بیان بھی ہے کہ تین بار نماز پڑھنے کے بعد اس صحابی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے

رسول! مجھے اس سے زیادہ بہتر طریقہ سے نماز پڑھنا نہیں آتی، مجھے سکھلایئے۔ تب آپ ﷺ نے اسے جو پہلا حکم فرمایا تو ترمذی اور نسائی کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ:

《 فتوضأ كما امرك الله ثم تشهد فاقم 》

''جب آپ نماز پڑھنے لگے تو پہلے اس طرح وضو کر جس طرح اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے پھر اذان کہہ اور بعد میں اقامت کہہ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اذان اور اقامت کہنا بھی ضروری ہے۔

## فائدہ:

اس حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے حسن امور کا تذکرہ فرمایا ہے، وہ سب نماز کے ارکان اور فرائض ہیں جن کے بغیر کوئی نماز خواہ فرض یا نفل ہرگز نہیں ہوتی۔ باقی وہ امور جو اس حدیث میں مذکور نہیں مندوبات اور مستحبات کے باب سے ہیں، لہٰذا جو امور اس حدیث میں مذکورہ ہیں وہ سب ضروری ہیں، ان کے بغیر کوئی بھی نماز نہیں ہوگی اس لیے کہ اس حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ان بتائی ہوئی باتوں میں سے کوئی بات مکمل نماز میں ترک کر دی یا کمی کر دی تو اس کی نماز میں نقص واقع ہو گیا اس لیے اکثر محققین نے نماز کے فرائض اور ارکان کے لیے اس حدیث کو اصل قرار دیا ہے یعنی جو باتیں اس حدیث میں مذکورہ ہیں وہ سب نماز کے ارکان اور فرائض ہیں ان میں سے کسی کو چھوڑنے سے نماز نہیں ہوگی۔

## سترہ کا بیان:

اسی طرح نماز کے لیے سترہ بھی ضروری ہے۔ جس طرح صحیح ابن خزیمہ میں عمدہ سند کے ساتھ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( لاتصل الا الى سترة ولا تدع احداً يَمُرُّ بين يديك فان ابىٰ فلتقاتلهُ فان معهُ القرين ))

''سترہ کے بغیر نماز مت پڑھیں اور کسی کو بھی اپنے سامنے سے گزرنے نہ دیں پھر اگر وہ انکار کرے اور گزرنے کی کوشش کرے تو اس سے لڑیں کیونکہ اس کے ساتھ شیطان ہے۔''

ابوداؤد اور مسند بزار اور حاکم (حاکم رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح بھی ہے کہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے برقرار رکھا ہے) میں سہل بن ابی حثمۃ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

(( اذا صلى احدكم الى سترة فليدن منها لايقطع الشيطان عليه صلوٰته ))

''جب تم سے کوئی شخص سترہ کی طرف نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ اس کے قریب ہو کر کھڑا ہو کیونکہ ایسا نہ ہو کہ شیطان اس کی نماز قطع کر دے۔''

کیونکہ شیطان وسوسے ڈالتا ہے، اس لیے سترہ کے قریب کھڑے ہونے کا حکم فرمایا اور خود نبی کریم ﷺ بھی سترہ کے قریب کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور آپ ﷺ کے درمیان صرف ہاتھ کا مفاصلہ ہوتا تھا یہ حدیث صحیح بخاری اور مسند احمد میں مروی ہے۔ اس مضمون کی ایک اور روایت صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن خزیمہ میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں یہ بیان ہے کہ آپ ﷺ اور قبلہ کے درمیان بکری کے گزرنے کا جتنی جگہ تھی ان دونوں حدیثوں کے درمیان محقق علماء نے اس طرح تطبیق پیش کی ہے جس وقت آپ ﷺ کھڑے ہوتے اور بیٹھتے تو کعبہ اور آپ ﷺ کے مابین تین ہاتھ کا مفاصلہ ہوتا تھا اور رکوع سجدہ کی حالت میں آپ ﷺ کے اور کعبہ کے درمیان بکری کے گزرنے جتنا مفاصلہ ہوتا تھا۔ اور یہی تطبیق صحیح و درست ہے جب نبی ﷺ کھلے میدان میں نماز پڑھتے تھے تو اپنے سامنے نیزہ وغیرہ جیسی کوئی چیز گاڑ دیتے تھے اور آپ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔ یہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابن ماجہ میں مروی ہے اور صحیح بخاری میں اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

(( وكان يفعل ذالك في السفر )) ''آپ ﷺ اس طرح سفر میں کرتے تھے۔''

یعنی سفر میں بھی نماز کے موقع پر نیزہ وغیرہ گاڑ کر اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد میں سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( اذا وضع احدكم بين يديه مثل مؤخرة الرحل فليصل ولا يبالي من مر وراء ذالك ))

''جب تم میں سے کوئی شخص اونٹ کے پلان کی پچھلی لکڑی کے بقدر سترہ رکھے تو وہ نماز پڑھ سکتا ہے اور جو اس کے باہر سے گزرے تو اس کی کوئی پرواہ نہ کرے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ کی لمبائی ایک یا دو ہاتھ کے دو تہائی کے برابر ہونی چاہیے۔

## صف بندی و مسنون طریقہ نماز:

اس کے بعد جماعت میں صف بندی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ صحیح بخاری میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

(( سووا صفوفكم فان تسوية الصفوف من اقامة الصلوٰة ))

''اپنی صفیں درست کریں کیونکہ صفوں کی درستگی نماز کی درستگی میں سے ہے۔''

یعنی جس شخص نے صف کو سیدھا نہ کیا اس نے نماز کو قائم نہ کیا۔ ایک دوسری روایت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو کہ صحیح بخاری میں ان الفاظ سے ہے:

(( قال اقيمت الصلوٰة فاقبل علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بوجهه

فقال اقیموا صفوفکم و تراصوا فانی اراکم من وراء ظھری ))

''نماز کی اقامت کہی گئی پھر رسول اللہ ﷺ ہم کو متوجہ ہوئے، پھر فرمایا اپنی صفیں درست کریں اور مل کر کھڑے ہو بے شک میں تمھیں نماز کی حالت میں اپنے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔''

صحیح بخاری میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

(( و کان احدنا یلزق منکبہٗ بمنکب صاحبہ و قدمہٗ بقدمہ ))

''آپ ﷺ نے ہمیں مل کر کھڑے ہونے کا حکم فرمایا تم ہی ہم میں سے ہر کوئی اپنے برابر میں کھڑے آدمی سے کندھے سے کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملا کر کھڑے ہوتے تھے۔''

صحیح بخاری میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(( لتسون صفوفکم او لیخالفن اللہ بین وجوھکم ))

''اپنی صفوں کو ضرور درست کریں ورنہ اللہ تعالیٰ تمھارے مابین مخالفت پیدا کرے گا۔''

ابوداود کی ایک روایت میں ہے اور '' لیخالفن اللہ بین قلوبکم ''یعنی صفوں کی عدم درستگی تمھارے دلوں میں اختلاف کا موجب ہے اور صفوں کی درستگی کا مطلب یہ ہے کہ صفوں میں کھڑے ہونے والے برابر ہو کر ایک ہی سمت کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے درمیان خلا نہ چھوڑیں، اگر خلا ہو بھی تو اسے بند کر دیں جیسا کہ خلا کو بند کرنے کا امر احادیث میں مروی ہے۔ اس کے بعد نماز کی نیت بھی ضروری ہے جیسا کہ صحیحین میں عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

(( إنما الاعمال بالنیات )) ''اعمال نیت ہی کی وجہ سے درست ہو سکتے ہیں۔''

مگر نیت کا مطلب ہے کہ دل ہی دل میں یہ اراد کر لے کہ فلاں نماز اللہ کے حکم کی تعمیل میں پڑھتا ہوں زبانً سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ نیت زبان سے ادا کرنا بدعت ہے۔ اس کے بعد کعبۃ اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ مسیٔ الصلوٰۃ کو آپ ﷺ نے امر فرمایا کہ:

(( اذا کنت الی الصلوٰۃ فاسبغ الوضوءَ ثم استقبل القبلۃ ))

''جب آپ نماز کی طرف کھڑے ہوں تو کامل وضو کریں پھر قبلہ سے متوجہ ہو کر کھڑے ہوں پھر تکبیر کہیں۔''

یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب بھی نماز کے لیے کھڑے ہوتے خواہ وہ فرض ہو یا نفل تو آپ ﷺ کعبہ کو سامنے کھڑے ہوتے البتہ سفر میں نفلی نماز اور وتر اپنی سواری پر پڑھتے تھے۔ جس طرف بھی سواری کا منہ ہوتا اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے، البتہ فرضی نماز سواری پر نہیں پڑھتے تھے بلکہ سواری سے اتر کر قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔

اس کے بعد نماز میں کھڑا ہونا ضروری ہے یعنی فرضی نماز میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کہ مجھے بواسیر کی بیماری لاحق تھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بیٹھ کر نماز پڑھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( صل قائماً فان لم تستطع فصل قاعداً فان لم تستطع فعلی جنب ))

''نماز کھڑے ہو کر پڑھیں اگر طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اگر بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت بھی نہ ہو تو پہلو پر۔''

[ صحیح بخاری، ابو داوٗد، مسند احمد]

اس کے بعد اللہ اکبر کہنا بھی ضروری ہے۔ جس طرح پہلے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں نماز درست نہ پڑھنے والے اور نماز کی ابتدا کرنے والے کو ابتدا میں اللہ اکبر کا امر فرمایا، اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ابو داوٗد، ترمذی اور حاکم میں روایت مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( مفتاح الصلوٰۃ الطھور وتحریمھا التکبیر و تحلیلھا التسلیم ))

یعنی طہارت نماز کی چابی ہے اور جو امور نماز میں حرام ہیں مثلا باتیں کرنا وغیرہ وہ سب تکبیر کہنے سے حرام ہو جاتے ہیں اور حلال اور جائز تب ہوں گے جب سلام کہہ کر نماز سے فارغ ہوگا۔ اس حدیث کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کے ساتھ موافقت کی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں دخول صرف اللہ اکبر کے کہنے سے ہی ہو سکتا ہے اس کی جگہ اور کوئی لفظ مثلا اللہ اجل وغیرہ کہہ کر ہرگز نماز میں داخل ہونا جائز نہیں ہو سکتا، پھر اسی طرح نماز سے نکلنا بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ سے درست ہوگا کسی دوسرے عمل سے نماز سے خارج ہونا ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔ جماعت کی صورت میں امام کے تکبیر کہنے کے بعد مقتدیوں کو بھی تکبیر کہنی ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( إنما جعل الامام لیؤتم بہ فاذ اکبر فکبروا و اذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہٗ فقولوا ربنا ولك الحمد واذا سجد فاسجدوا واذا صلی جالسا فصلوا جلوساً اجمعون ))

''امام اس لیے مقرر کیا گیا تا کہ اس کی اقتدا کی جائے، پھر جب تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب سمع اللہ لمن حمدہٗ کہے تو تم ربنا ولک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور جب بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

اسی طرح صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( إنما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا صلی قائماً فصلوا قیاما و اذا رکع فارکعوا و اذا رفع فارفعوا و اذا سجد فاسجدوا و اذا قال سمع اللہ لمن حمدہٗ و قولوا ربنا ولك الحمد ))

اس حدیث میں دو باتیں اضافی ہیں یعنی جب امام کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر پڑھو اور جب رکوع سے سر اوپر اٹھائے تو پھر تم اپنا سر اٹھاؤ، امام سے جلد بازی نہ کرنا بلکہ نماز کے ہر رکن کو امام کے بعد ادا کرنے کے متعلق صحیح بخاری میں اسے بھی واضح حدیث ہے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قال سمع الله لمن حمدهٗ لم یحن منا ظهرهٗ حتی یقع النبی صلی الله علیه وسلم ساجداً ثم نقع سجودا بعدهٗ ))

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے اوپر اٹھ کر "سمع الله لمن حمدهٗ" کہتے تھے تو ہم تب تک کھڑے رہتے تھے اور ہم میں سے کوئی بھی اپنی پیٹھ کو نہیں جھکاتا تھا یہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرہ مبارک سجدہ میں رکھ دیتے اس کے بعد ہم سجدہ میں جاتے تھے۔ جو شخص اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے اس کے متعلق صحیح بخاری وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( اما یخشی احدکم او لا یخشی احدکم اذا رفع رأسهٗ قبل الامام ان یجعل الله رأسهٗ رأس حمار او یجعل الله صورتهٗ صورة حمار ))

"تم میں جو شخص امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے اسے یہ خوف لاحق نہیں ہوتا کہ اس کے سر کو اللہ تعالیٰ گدھے کے سر جیسا نہ کر دے یا اس کی صورت گدھے کی صورت کی طرح نہ بنا دے۔"

اس کے بعد رفع الیدین بھی نماز میں ثابت ہے اس کے مختلف طریقے احادیث میں ملتے ہیں۔ ① تکبیر کے کہنے کے بعد ہاتھوں کو اٹھائے جیسا کہ مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں وارد ہے۔ ② پہلے رفع الیدین کرے بعد میں تکبیر کہے یہ طریقہ صحیحین میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ③ تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کرے یہ طریقہ سنن الکبریٰ للبیہقی میں وائل بن حجر رحمہ اللہ سے پختہ و مضبوط سند کے ساتھ مروی ہے اور یہ کبھی ہاتھوں کو اتنا اوپر اٹھاتے جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں مروی ہے اور کبھی ہاتھوں کو اتنا اوپر اٹھاتے کہ کانوں کے لو برابر کر دیتے۔ جس طرح صحیح مسلم میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ احادیث میں ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر کانوں کے برابر مذکور ہے، باقی آج کل عام طور پر نمازی انگوٹھے کانوں کی لو سے جا ملاتے ہیں اس کا ذکر کسی بھی حدیث میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ واللہ اعلم بالصواب

نماز میں ہاتھوں کا اٹھانا تکبیر تحریمہ کے علاوہ تین اور مقامات پر بھی ثابت ہے، یعنی رکوع میں جاتے وقت رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت۔ ان تینوں مقامات پر رفع الیدین کرنا بھی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور محققین کے نزدیک سنت مؤکدہ مستمرہ ہے۔ رفع الیدین کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایات: ① عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صحیح بخاوری و مسلم وغیرہ۔ ② علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان سے مروی راویت ابوداؤد اور سنن الکبریٰ للبیہقی رحمہ اللہ میں ہے اور امام ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کی تصحیح فرمائی

ہے۔ ③ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے ان صحابہ کرام کی موجودگی میں کھڑے ہوکر کہا کہ میں تم سے سب سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو جانتا ہوں، پھر انھوں نے مکمل نماز کی ترتیب پیش کی جس میں تین مقامات پر رفع الیدین کا تذکرہ فرمایا، آخر میں ان سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تصدیق کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح نماز پڑھتے تھے۔ یہ روایت ابو داؤد، دارمی، ترمذی، ابن ماجہ اور بیہقی میں مروی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حسن صحیح ہے، علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ ④ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کا چوتھا راوی مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ اس کی روایت صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن الکبریٰ، بیہقی وغیرہ میں ہے۔ ⑤۔⑥ عبداللہ بن زبیر اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سنن الکبریٰ، بیہقی میں اس طرح وارد ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ محدث ابواسماعیل محمد بن اسماعیل سلمی سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

(( صليت خلف ابى النعمان محمد بن الفضل فرفع يديه حين افتتح الصلوة و حين ركع وحين رفع رأسهٗ من الركوع فسألته عن ذالك فقال صليت خلف حماد بن زيد فرفع يديه حين افتتح الصلوٰة وحين ركع و حين رفع رأسهٗ من الركوع فسألته عن ذالك فقال صليت خلف ايوب السختيانى فكان يرفع يديه اذا افتتح الصلوٰة و إذا ركع و إذا رفع رأسهٗ من الركوع فسألته فقال رأيت عطاء بن ابى رباح يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة و إذا ركع و إذا رأسهٗ من الركوع فسألته فقال صليت خلف عبدالله بن الزبير فكان يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة وإذا ركع و إذا رفع رأسهٗ من الركوع فسألته فقال عبدالله بن الزبير صليت خلف أبى بكر صديق رضى الله عنه فكان يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة وإذا ركع وإذا رفع رأسهٗ من الركوع وقال ابوبكر صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم فكان يرفع يديه إذا افتتح الصلوٰة وإذا ركع و إذا رفع رأسهٗ من الركوع ))

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "رواته ثقات" یعنی اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ ترجمہ: محمد بن اسماعیل سلمی کہتے ہیں کہ میں نے ابوالنعمان محمد بن الفضل کے پیچھے نماز پڑھی تو اس نے نماز کی ابتدا میں رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کی تو میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اس نے کہا میں نے ایک مرتبہ حماد بن زید کے پیچھے نماز پڑھی تھی تو اس نے بھی اس تینوں مقامات پر رفع الیدین کی تھی تو میں نے اس سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے ایوب سختیانی کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ بھی اسی طرح کر

رہے تھے تو میں نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا کہ میں نے عطاء بن ابی رباح کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ نماز میں اسی طرح کر رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا میں نے عبداللہ بن زبیر کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ بھی ان تینوں مقامات پر ہاتھ اٹھا رہے تھے تو میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو وہ بھی اسی طرح رفع الیدین کر رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان تینوں مقامات پر رفع الیدین فرماتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب جزء رفع الیدین میں اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سنن الکبریٰ میں مشہور تابعی حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ:

(( كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفعون أيديهم إذا ركعوا وإذا رفعوا رؤسهم من الركوع كأنهم أيديهم مرواح ))

''یعنی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے گویا کہ ان کے ہاتھ پنکھے ہوں۔'' امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن الکبریٰ میں مشہور تابعی سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ:

(( أنهٗ سئل عن رفع اليدين في الصلوٰة فقال هو شيءٌ يزين به الرجل صلوٰة كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفعون أيديهم في الإفتتاح وعند الركوع وإذا رفعوا رؤسهم ))

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نماز میں ہاتھوں کے اٹھانے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے آدمی اپنی نماز کو مزین کرتا ہے اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ابتدا میں اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین فرماتے تھے۔ ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی جماعت نماز میں رفع الیدین پر عامل تھی اور یہی مسلک جمہور محدثین وفقہاء کا ہے اور یہی مذہب ائمہ ثلاثہ مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا ہے اور رفع الیدین کی احادیث کے تواتر کو دیکھ کر بعض علمائے احناف نے بھی اسے اختیار کیا ہے جن میں سے عصام بن یوسف البلخی بھی ہے جو امام ابو یوسف کا شاگرد ہے، جیسا کہ علامہ البانی نے یہ بات اپنی کتاب صفۃ صلوٰۃ النبی میں بیان فرمائی ہے۔ مگر اکثر علماء احناف نے عدم رفع الیدین کو اپنا مسلک بنایا ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب تھا ورنہ اس کے لیے ان کے پاس کوئی بھی مضبوط دلیل موجود نہیں ہے۔ اس طرح کی ایک روایت (نماز میں عدم رفع کے متعلق) براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کی جاتی ہے، لیکن اس کی سند میں یزید بن ابی زیاد ازدہی ہے جو کہ سخت ضعیف ہے۔ اس لیے یہ روایت دلیل بننے کے قابل نہیں۔ دوسری

روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ صرف نماز کی ابتدا میں اٹھانے چاہییں لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نہایت قدیم مسلمانوں میں سے ہے۔ مکہ مکرمہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں رفع الیدین صرف ابتدا ہی میں ہو اور بعد میں دوسرے مقامات پر بھی رفع الیدین کا فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہو اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ ہو سکا ہو یا انھیں بھول ہوئی ہو اور نماز میں دیگر چند باتوں میں تبدیلی ہوئی ہے۔ مثلاً پہلے نماز میں باتیں کرنے کی اجازت تھی لیکن بعد میں آیت

﴿قُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِينَ﴾ [البقرہ: ۲۳۸]

کے نازل ہونے سے یہ اجازت ختم ہوگئی جس طرح یہ بیان صحیح احادیث میں مروی ہے جب کہ صحابہ کرام کی اتنی بڑی جماعت جن میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسی بزرگ ہستیاں اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو بارگاہ رسالت کے آخری دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ مثلاً وائل بن حجر رضی اللہ عنہ وغیرہ یہ سب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع الیدین کے ناقل ہیں تو یہ بات انصاف سے بالکل بعید ہے کہ صرف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیکھ کر عدم رفع الیدین کو ترجیح دے دی جائے، خصوصاً جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دیگر کچھ باتیں بھی بھول گئی تھیں یا انھیں ان کے متعلق کسی سبب سے علم نہ ہو سکا حالانکہ اس کے متعلق پوری امت ان کے خلاف ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لیں تو پوری امت اس پر متفق ہے کہ رکوع کی حالت میں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جائیں لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اوائل حکم کے مطابق رکوع میں تطبیق پر عمل کرتے تھے یعنی گھٹنوں کے درمیان ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اس پر عامل رہے، انھیں دیکھ کر ان کے تلامذہ بھی اس پر عمل کرنے لگے حتی کہ ان کو دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً سعد بن ابی وقاص نے سمجھایا کہ یہ تطبیق کا عمل ابتدا میں تھا بعد میں منسوخ ہو گیا اور رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا امر ہوا یہ واقعہ ترمذی، سنن کبریٰ وغیرہ حدیث کی کئی کتب میں مروی ہے۔ علماء نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس طرح بھول کی اور بھی امثلہ ذکر کی ہیں مگر ہم طوالت کی وجہ سے ذکر نہیں کرتے، اگر کسی کو اس کے متعلق تحقیق کرنے کا ارادہ ہو تو وہ امام بیہقی رحمہ اللہ کی سنن الکبریٰ اور علامہ ابوالحسنات عبدالحئی لکھنوی کی کتاب تعلیق الممجد علی موطا امام محمد وغیرہ کا مطالعہ کر کے حقیقت حال تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری روایت آج کل کے حضرات پیش کرتے ہیں جو صحیح مسلم وغیرہ میں موجود ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نماز میں ہاتھ اٹھا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ:

(( مالی أراکم رافعی أیدیکم کأنها أذ ناب خیل شمس أسکنوا فی الصلوٰة ))

''یعنی کیا ہوا ہے کہ تم اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہو گویا کہ وہ شریر گھوڑوں کی دُمیں ہیں۔ نماز میں سکون سے رہا کریں۔'' لیکن یہ ان حضرات کی بڑی ناانصافی ہے بلکہ انصاف کا خون اور کتمان حق کی یہ نرالی مثال ہے کہ

اس حدیث کے متعلق خود صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ اور دیگر کتب میں یہ وضاحت موجود ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ ہاتھ سلام پھیرنے کے وقت اٹھاتے تھے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ مذکورہ کتب کی اس وضاحت کے بعد بھی اس حدیث سے رفع الیدین کی نفی پر استدلال کرنا علمی خیانت نہیں تو کیا ہے۔ رفع الیدین کے بعد ہاتھوں کو باندھنا ہے اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

**دلیل نمبر ۱:**

صحیح ابن حبان ج ۴ ص ۱۳۰ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت:

(( أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال أنا معاشر الأنبياء امرنا أن نؤخر سحورنا ونعجل فطرنا وان نمسك بايماننا على شمائلنا في صلاتنا ))

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم انبیاء کی جماعت کو حکم کیا گیا ہے کہ ہم سحری کھانے میں تاخیر کریں اور افطار میں جلدی کریں اور نماز میں اپنے سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ پر باندھیں۔"

**دلیل نمبر ۲:**

نسائی اور دارقطنی میں صحیح سند کے ساتھ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں الٹے ہاتھ کو سیدھے ہاتھ سے پکڑتے تھے۔

**دلیل نمبر ۳:**

مسلم، ابوداؤد اور مسند احمد میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يضع يدهٗ اليمنىٰ على اليسرىٰ ))

**دلیل نمبر ۴:**

صحیح بخاری میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( كان الناس يؤمرون أن يضع الرجل اليداليمنىٰ على ذراعيه اليُسرى في الصلوٰة ))

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں اپنے دائیں ہاتھ الٹے ہاتھوں پر رکھیں۔"

مسند احمد اور ابوداؤد میں صحیح سند کے ساتھ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک شخص سے ہوا کہ نماز پڑھ رہا تھا، اس حال میں کہ اس نے دائیں ہاتھ پر بایاں ہاتھ رکھا ہوا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچ کر دائیں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جو کچھ فتح الباری میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص عبداللہ بن مسعود نہ تھا۔ صحیح بخاری والی روایت سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو سیدھے ہاتھ کو بائیں بازو پر رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بازو کی کس جگہ پر رکھنا چاہیے۔ اس کی وضاحت ابوداؤد، نسائی اور صحیح

ابن خزیمہ میں صحیح سند کے ساتھ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( ثم وضع یدہٗ الیمنیٰ علیٰ ظھر کفه الیسریٰ وَالرسغ والصاعد ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ رکھا بائیں ہاتھ کی کلائی پر۔''

اس حدیث کو امام ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے اور جسم کی کونسی جگہ پر ہاتھ رکھے جائیں؟ تو اس کے متعلق صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر باندھے جائیں جیسا کہ امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح ج ۲ ص ۲۰۳ میں سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ:

(( صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم ووضع یدہٗ الیمنیٰ علیٰ یدہ الیسریٰ علی صدرہٖ ))

''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر سینے پر رکھا۔''

اس حدیث کی سند حسن ہے۔ اسی طرح مسند احمد میں سیدنا ہلب الطائی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھوں کو سینے پر باندھا۔ اس حدیث کی سند بھی عمدہ اور قوی ہے۔ لہٰذا ناف کے نیچے باندھنے کے لیے کوئی بھی دلیل ثبوت تک نہیں پہنچتی۔ کچھ روایات ہیں لیکن ان کی اسانید سخت ضعیف ہیں اور کچھ تو بالکل بے اصل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ:

(( نھیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم أن یصلی الرجل مختصراً ))

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کوئی شخص کوکھ پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھے۔''

صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''إن ذالك فعل الیهود'' یعنی اس طرح کا عمل کرنا یہودیوں کا کام ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں آدمی عجز و انکساری ظاہر کرے کوکھ پر ہاتھ رکھنا جو بظاہر متکبرانہ عمل ہے لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

اس طرح نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا بھی ممنوع ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لینتھین أقوام یرفعون أبصارھم إلی السماء فی الصلوٰة ولا ترجع الیھم وفی روایة او لَتُخطَفَنَّ ابصارھم ))

''لوگ نماز میں اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں وگرنہ ان کی واپس نہیں لوٹیں گی۔ ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی۔''

یہ حدیث بخاری و مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مطلب کہ نماز میں نظر سجدہ کی جگہ

پر ہونی چاہیے۔ صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الالتفات فى الصلوٰة فقال هو اختلاس يختلس الشيطان من صلوٰة العبد ))

میں نے نبی کریم ﷺ سے نماز میں ادھر اُدھر دیکھنے کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ شیطان کا جھپٹا مارنا ہے جس کے ذریعے سے شیطان بندے کی نماز سے جھپٹ لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس سے نماز کے خشوع میں نقصان کا پتہ چلتا ہے لیکن ضرورت کے مطابق دائیں بائیں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ اور ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يلتفت فى صلوٰته يمينا وشمالا ولا يلوى عنقهٗ خلف ظهره ))

''نبی کریم ﷺ نماز میں دائیں بائیں دیکھتے تھے لیکن اپنی گردن کو ادھر اُدھر موڑتے نہیں تھے۔''

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے ''يلتفت فى صلوٰته'' کا مطلب یہ لکھا ہے کہ: ''يلحظ بعينه يمينا و شمالا'' یعنی آپ ﷺ اپنی آنکھ مبارک سے دائیں بائیں دیکھتے تھے۔ یہ معنی بالکل درست ہے کیونکہ اس حدیث میں گردن کو موڑنے کی نفی کی گئی ہے۔ اسی طرح ترمذی والی رروایت میں بھی یلحظ کا لفظ ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ البتہ مقتدی امام کی طرف نماز کے انتقالات وغیرہ کے لیے دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں مشہور تابعی ابو معمر عبداللہ بن سخبرہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے خباب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:

(( أكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرءُ فى الظهر والعصر؟ قال نعم قلنا بم كنتم تعرفون ذاك قال باضطراب لحيته ))

''کیا نبی کریم ﷺ ظہر اور عصر میں قرأت کرتے تھے تو انھوں نے فرمایا جی ہاں کرتے تھے تو ہم نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوتا تھا تو انھوں نے کہا آپ ﷺ کی داڑھی مبارک حرکت کرنے کی وجہ سے۔''

اسی طرح ایک دوسری روایت صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( إنهم كانوا مع النبى صلى الله عليه وسلم فرفع رأسهٗ من الركوع قاموا قياما حتى يرونهٗ قد سجد ))

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کرتے تو جب آپ رکوع سر مبارک اوپر اٹھاتے تو صحابہ کھڑے رہتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو دیکھتے کہ آپ سجدہ میں جا چکے ہیں۔''

تکبیر تحریمہ کے بعد صحیح احادیث میں استفتاح یعنی ابتدا صلاۃ کی کئی ادعیہ وارد ہوئی ہیں جن میں سے کچھ لمبی تو کچھ مختصر ہیں۔ ہم ذیل میں آسانی کے لیے صرف تین دعائیں درج کرتے ہیں ان سے کوئی بھی قرأت

سے پہلے پڑھی جا سکتی ہے۔

نمبر ۱:

ابوداؤد اور ترمذی میں ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حسن لغیرہ سند کے ساتھ روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ابتدا میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے۔

(( سبحانك اللهم و بحمدك وتبارك اسمك وتعالىٰ جدك ولا اله غيرك ))

نمبر ۲:

صحیح بخاری و مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز میں تکبیر اور قرأت کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

(( اللهم باعدبيني و بين خطاياى كما باعدت بين المشرق والمغرب اللهم نقني من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس اللهم اغسل اخطايا بالماء والثلج والبرد ))

نمبر ۳:

صحیح مسلم اور نسائی میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص صف میں اس حال میں آ کر داخل ہوا کہ ہانپ رہا تھا، پھر ''الله اكبر کہہ کر الحمد لله حمداً كثيراً طيبا مباركاً فيه'' کہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے بارہ فرشتوں کو دیکھا جو ان الفاظ کو لینے میں جلدی کر رہے تھے کہ ان میں سے کون الفاظ کو اٹھاتا ہے اور صحیح مسلم میں اس دعا میں اس دعا کو استفتاح والی ادعیہ کے باب میں ذکر کیا گیا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو مقتدی بعد میں آ کر جماعت میں شامل ہوا اس کی وہ رکعت پہلی ہی ہوگی کیونکہ دعائے استفتاح پہلی رکعت میں ہوتی ہے نہ کہ دوسری یا تیسری رکعت میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے اس عمل کو بحال رکھنا بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقتدی جس رکعت میں ملے اس کی وہ پہلی رکعت ہے۔ اس پر یہ حدیث بھی واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ جو صحیح میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( إذا سَمِعْتُمُ الإقامة فامشوا إلى الصلوٰة و عليكم بالسكينة والوقار ولا تسرعوا فما أدركتم فصلوا وما فأتكم فأتموا ))

''جب تم اقامت سنو تو نماز کی کی طرف اس حال میں چلو کہ تمھارے اوپر سکینت اور وقار ہونا چاہیے اور جلد بازی مت کرو پس جو تم پالو وہ نماز پڑھ لو اور فوت ہو جائے اسے پورا کرلو۔''

ظاہر ہے کہ اتمام اور پورا کرنا اس کو کہا جاتا ہے جس کی ابتدا ہو اور جس کی ابتدا ہی نہ ہو تو اسے پورا کیسے کیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے

ہیں کہ اس حدیث کے طرق میں فاتموا کا لفظ وارد ہوا ہے اور بعض طرق میں "فاقضوا" کا لفظ بھی ہے لیکن جب ان تمام طرف کا مخرج ایک ہے۔ یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو اس صورت میں دونوں الفاظ کو آپس میں تطبیق دینی چاہیے۔ اب اگر ہم "فاقضوا" سے مراد یہ لیں جو بعض علماء کرام لیتے ہیں یعنی قضاء کرنا تو اس صورت میں "فاتموا" کا لفظ جو اکثر طرف میں وارد ہوا ہے۔ بالکل بے معنیٰ بن جاتا ہے کیونکہ "فاتموا"۔ (اتمام) اصطلاح میں قضاء کی معنی میں آتی ہی نہیں بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس چیز کی ابتدا ہوا سے پورا کیا جائے، لہٰذا "فاقضوا" کی اس معنیٰ سے ان دونوں الفاظ کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس قضاء کے معنیٰ کسی سے فارغ ہونا یا کسی کام کو ادا کرنا بھی آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ﴾ [القصص : ۳۰]

ظاہر ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا مقررہ وقت پورا کیا اس کی یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہو گی کہ موسیٰ علیہ السلام نے فوت ہو چکا وقت پورا کیا۔ اسی طرح سورۂ جمعہ میں ہے:

﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ ﴾ [الجمعة : ۱۰] یعنی جب پوری ہو جائے، اس پر بھی قضا کا اصطلاحی معنی صادق نہیں آتا۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ ﴾ [البقرہ : ۲۰۰] پھر جب تم نے حج کے احکام پورے کیے اس میں بھی قضاء کا اصطلاحی معنی کوئی بھی نہیں آتا۔ بہر حال قضیٰ کا معنی ادا کرنا اور اس سے فارغ ہونا آتا ہے تو پھر اس حدیث کے جن طرف میں "فاقضا" کا لفظ ہے اگر اس کا معنیٰ یہ کیا جائے کہ فوت ہو چکی ہوئی نماز ادا کریں یا پوری کر کے فارغ ہو جائیں تو یہ لفظ "فاتموا" سے متفق ہو جائے گا اس لیے اس مقام پر جب "فاقضوا" کا یہ معنیٰ کیا جائے جو بعض علماء کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کی "فاتموا" سے تطبیق نہیں ہو سکتی حالانکہ اس حدیث کے اکثر طرف میں لفظ "فاتموا" ہی وارد ہوا ہے۔

"فتد بروا" حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے شخص سے جو کچھ فوت ہو چکا ہے اسے ضرور پورا کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص رکوع میں آ کر ملا اس کی رکعت نہیں ہو گی اس لیے کہ اس سے قرأت اور قیام دونوں فوت ہو گئے تو ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان کو پورا کیا جائے اور مذکورہ حکم کی اتباع تب ہی ہو گی جب وہ رکعت دوبارہ پڑھی جائے۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ رکوع میں ملنے والے کی رکعت کا نہ ہونا یہ مذہب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک بڑی جماعت کا یہی نظریہ ہے، بلکہ امام بخاری نے اپنی کتاب جزء القرأۃ خلف الامام میں یہی قول ہر اس شخص سے نقل کیا ہے جو امام کے پیچھے قرأۃ کے وجوب کا قائل ہے اور اسی قول کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

# قائلین مدرک رکوع مدرک رکعت کے دلائل کے جواب

**دلیل نمبرا:**

صحیح بخاری میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس حال میں آیا کہ آپ رکوع میں تھے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کرتا ہوا چلا اور صف میں جاملا، پھر جب یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے حرص کو بڑھائے، آئندہ اس طرح نہ کریں۔ مستدلین کا کہنا ہے کہ صحابی نے صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع اس لیے کیا کہ ایسا نہ ہو کہ صف تک پہنچنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے کھڑے نہ ہو جائیں اور اس وجہ سے مجھ سے رکعت نکل نہ جائے۔ اس لیے وہ رکوع کرتے ہوئے آکر صف میں شامل ہوا یہاں تک کہ اس کی رکعت ہوگئی اور دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ صحابی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکعت لوٹانے کا حکم نہیں کیا، معلوم ہوا کہ مدرک رکوع کی رکعت ہوگئی۔ کچھ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس صحابی رضی اللہ عنہ کو یہ فرمایا کہ دوبارہ ایسا نہ کرنا اس سے مراد یہ ہے کہ آئندہ اس طرح جلد بازی اور دوڑ مت لگانا، اس معنی کی دلیل مسند احمد کی یہ روایت پیش کرتے ہیں۔ یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تب فرمایا:

(( من الساعی قال ابوبکرۃ انا ))

کہ دوڑ لگانے والا کون ہے؟ تو ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (( زادك الله حرصاً الخ )) اب ان حضرات کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دوڑنے پر اعتراض نہیں فرمایا گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کرنے کا علم ہی نہ تھا، اس لیے صرف یہ پوچھا کہ دوڑ کر آنے والا کون ہے؟ حالانکہ یہ ان حضرات کی انتہائی ناانصافی ہے جس حدیث میں " من الساعی " ہے، وہ سنداً بالکل ضعیف ہے۔ اس کے برعکس مسند احمد میں حسن سند کے ساتھ یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

(( فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ھذا الذی رکع ثم مساعد الصف فقال ابوبکرۃ انا ))

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کون ہے جو رکوع کرتے ہوئے صف میں شامل ہوا ہے اس لیے بعد میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں منع بھی اسی سے تھی، یعنی صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کرتے ہوئے چلنے والا عمل آئندہ اختیار نہ کرنا۔ اس وضاحت کے بعد ان حضرات کی تاویل بالکل باطل ہوگئی جو ایک ضعیف روایت کی بنیاد پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ممانعت کو صرف نماز کی طرف دوڑنے کے ساتھ محدود رکھا ہے۔ ان کی اس

بات کو یہ بات بھی رد کرتی ہے کہ طبرانی نے اس روایت کو ایک اور طریق سے روایت کیا۔ اس کے اختتام میں یہ الفاظ ہیں:

(( صل ما ادرکت واقض ما سبقك ))

یہ الفاظ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی جزء القراۃ میں نقل کیے ہیں جو آپ کو ملا وہ پڑھ لو اور جو رہ گیا اسے ادا کرو۔ اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ باہر سے آنے والے کو صف میں پہنچنے سے پہلے ہی اس رکعت کو جس میں امام ہے اسے صف سے پہلے ہی ادا کرتے ہوئے نہیں آنا چاہیے بلکہ صف میں پہنچنے کے بعد نماز کے جس حصہ کو ملا ہے اسے ادا کرے۔ اسی طرح ان حضرات کی اس رکعت کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ مرفوع روایت جو طحاوی نے روایت کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

(( اذا اتیٰ احدکم الصلوٰۃ فلا یرکع دون الصف حتی یأخذ مکانہٗ من الصف))

”جب تم میں سے کوئی شخص نماز کی طرف آئے تو وہ صف سے پہلے رکوع نہ کرے یہاں تک کہ صف میں اپنی جگہ پالے۔“

باقی ان حضرات کا یہ کہنا کہ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع اس لیے کیا کہ رکوع میں ملنے سے میری رکعت پوری ہو جائے گی لیکن یہ احتمال درست نہیں کیونکہ اس کے متعلق کوئی بھی دلیل نہیں بلکہ قرین عقل و قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ جس رکن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ مجھ سے فوت نہ ہو جائے خواہ اس کے ملنے سے رکعت ہوئی یا نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں یہی تھا کہ جس حالت بھی مجھے دیکھو اس حالت میں مل جاؤ یہ حدیث پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے یہاں دوبارہ دہراتے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح کے اختتام پر سعید بن منصور سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

((عن اناس من اهل المدينة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال من وجدنی قائماً أو راكعا او ساجدا فليقم معی علی حالتی أنا عليها ))

”جو شخص مجھے نماز میں قیام، رکوع یا سجدے کی حالت میں پائے اسے چاہیے کہ وہ اسی حالت میں مل جائے جس میں میں ہوں۔“

حافظ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ ترمذی میں اس کے موافق علی رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے اس کی سند میں کچھ ضعف ہے لیکن وہ سعید بن منصور کی مذکورہ روایت سے منجبر ہو جاتا ہے بہر حال صحابی رضی اللہ عنہ نے صف سے پہلے رکوع اس لیے کیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل کرے کہ جس حالت میں مجھ سے ملو اسی طرح کرو اور اس صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع کی حالت میں دیکھا اس لیے رکوع

کرتے ہوئے صف میں شامل ہو گیا یعنی اس خدشہ سے کہ کہیں اس سے رکوع فوت نہ ہو جائے اس لیے نہیں کہ اسے پوری رکعت مل جائے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں مگر نبی کریم ﷺ نے اس فعل سے منع فرما دیا یعنی صف میں پہنچنے سے پہلے نماز کے کسی بھی رکن میں داخل نہیں ہونا بلکہ صف میں پہنچنے کے بعد جو صورتحال ہو اس کے مطابق عمل کرے۔ اسی طرح ان بزرگوں کا یہ کہنا کہ جب رکوع کو پہنچنے والے کی رکعت نہ ہوئی ہوتی تو یہ صحابی رضی اللہ عنہ اس رکعت کو ضرور لوٹاتے یا آپ ﷺ اسے لوٹانے کا امر فرماتے لیکن یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ جس طرح حدیث میں رکعت کو لوٹانے کا ذکر نہیں اسی طرح یہ صراحت بھی تو نہیں کہ اس صحابی رضی اللہ عنہ نے وہ رکعت نہیں لوٹائی تھی بلکہ دونوں باتوں سے یہ حدیث ساقط ہے لیکن قوی احتمال یہی ہے کہ اس صحابی رضی اللہ عنہ نے اس رکعت کو لوٹایا ہوگا کیونکہ اس صحابی سے نماز کے دو رکن ایک مختلف فیہ یعنی فاتحہ اور دوسرا متفق علیہ یعنی قیام فوت ہو گئے تھے تو پھر ایک یا دو ارکان کے فوت ہونے کے باوجود اس صحابی رضی اللہ عنہ نے اس رکعت کو کیوں نہ لوٹایا ہوگا جب کہ قرآن اور حدیث سے نماز میں قیام کا رکن اور فرض ہونا واضح ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ [البقرہ : ۲۳۸]

ان الفاظ سے آگے نمازوں کا تذکرہ ہے مطلب کہ حکم ہے کہ نماز میں کھڑے ہو اسی طرح سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ ﴾ [المائدہ : ٦]

اسی طرح صحیح بخاری میں عمران رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حکم فرمایا کہ:

(( صل قائماً فان لم تستطع فقاعداً ))

''یعنی نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر طاقت نہ ہو تو پھر بیٹھ کر۔''

اور اسی طرح پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ فرضی نماز میں قیام بھی فرض اور رکن ہے اگر بغیر عذر کے قیام نہ کیا تو اس کی نماز نہیں ہوگی اسی طرح ہم سورۃ الفاتحہ کی فرضیت اور رکنیت کے متعلق پہلے بھی کچھ صحیح احادیث ذکر کر آئے ہیں جن سے امام و مقتدی اور منفرد کے لیے سورۃ الفاتحہ کے پڑھنے کا فرض ہونا ظاہر و باہر ہے لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ دو ارکان کے فوت ہو جانے کے باوجود یہ سمجھے کہ صرف رکوع میں ملنے سے رکعت ہو گئی۔ جن باتوں کے متعلق ہمیں یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ نماز میں فرض ہیں تو ان کی فرضیت کو صرف شک اور احتمال کس طرح ساقط کرے گا؟ آگے چل کر ذکر کریں گے کہ صحیح سند سے کسی بھی حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رکوع میں ملنے والے کی رکعت ہو گی۔ اب انصاف کیجیے کہ ایک طرف ان دونوں ارکان کی فرضیت کا ثبوت ہمارے سامنے ہے، اور ان دونوں ارکان میں سے فاتحہ کی فرضیت کے متعلق علماء احناف ہم سے متفق نہیں لیکن قیام کے متعلق تو وہ بھی متفق ہیں، قیام فرض ہونا قطعی ...

پر ان کے نزدیک بھی ثابت ہے پھر ان دونوں ارکان کو یا صرف ایک رکن کو قیام کی فرضیت کو جو قطعی طور پر ثابت ہے اسے ساقط کرنے کے لیے اسی طرح کی یقینی دلیل چاہیے جیسا اس کی فرضیت کے لیے موجود ہے صرف شک اور احتمال کی بنا پر اس حدیث میں نماز لوٹانے کا حکم ہی نہیں اس کی فرضیت کو کیسے ساقط کیا جا سکتا ہے؟

﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر : ٢]

باقی یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے اسے اعادہ کا امر نہیں فرمایا تو اس کے لیے گزارش ہے کہ جیسا کہ اوپر تحقیق گزر چکی ہے قرین عقل وقیاس یہی بات ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ نے اس رکعت کو لوٹایا ہوگا پھر جب اس نے خود اس رکعت کو لوٹایا تو پھر نبی ﷺ کا اسے رکعت لوٹانے کے امر کی کوئی بھی ضرورت نہ رہی۔ واللہ اعلم بالصواب

**دلیل نمبر ۲:**

مدرک رکوع کی رکعت ہو جانے کے قائلین کی طرف سے دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے جو ابوداؤد وغیرہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

(( اذا جئتم الى الصلوٰة ونحن سجود فاسجدوا وَلا تَعُدُّوْهَا شيئا ومن ادرك الركعة فقد ادرك الصلوٰة ))

''جب تم نماز کی طرف آؤ اور ہم سجدہ کی حالت میں ہوں تو پھر تم بھی سجدہ کرو اور اسے شمار نہ کرو یعنی وہ رکعت تمھاری نہیں ہوئی اور جو رکوع کو ملا وہ نماز کو پہنچ گیا اس کی رکعت ہوگئی۔''

ہماری گزارش ہے کہ اس روایت کی سند میں یحییٰ بن ابی سلیمان المدنی ہے جس کے متعلق امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

(( ويحيىٰ هذا منكرا لحديث۔ روى عنه ابو سعيد مولىٰ بنى هاشم و عبدالله بن رجاء البصرى مناكير ولم يتبين سماعهٗ من زيد ولا من ابن المقبرى ولا تقوم به الحُجّة ''انتهىٰ'' ))

''یحییٰ بن ابی سلیمان منکر الحدیث کا اطلاق کریں اس کی روایت لینا حلال بھی نہیں اور امام بخاری مزید فرماتے ہیں اس یحییٰ سے ابوسعید بنی ہاشم کے مولیٰ اور عبداللہ بن رجاء بصری منکر روایات لائے ہیں اور تیسری بات امام بخاری نے یہ فرمائی کہ اس روایت میں یہ یحییٰ جس نے زید بن ابی العتاب اور ابن المقبری سے روایت بیان کی ہے ان دونوں کی یحییٰ کے سماع کی واضح دلیل نہیں مل سکی ہے۔ آخر میں امام صاحب نے یہ نتیجہ بیان فرمایا کہ اس شخص سے کوئی بھی حجت نہیں پکڑی جا سکتی اور یحییٰ مذکور کے متعلق میزان الاعتدال اور تہذیب التہذیب میں ابوحاتم سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''يكتب حديثهٗ وليس بالقوى''

''یعنی اس کی حدیث لکھی جا سکتی ہے اور یہ حدیث میں قوی نہیں'' البتہ حاکم اور ابن حبان نے اسے ثقات میں درج کیا ہے لیکن جب یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ دونوں حضرات توثیق میں کافی حد تک متساھل تھے اس لیے اس مقام پر جرح و تعدیل کے ائمہ میں سے کسی بلند پایہ امام نے اس راوی کی تضعیف کی ہے تو اس جگہ ان کی تحقیق معتبر نہیں ہوگی۔ خصوصاً اس امام کی جرح جو تشدد اور تعنت سے بری اور معتدل ہے جس طرح اس روایت کے متعلق ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے راوی کے متعلق یحییٰ بن ابی سلیمان کے متعلق منکر الحدیث کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور منکر الحدیث کے الفاظ شدید جرح شمار ہوتے ہیں خصوصاً امام بخاری رحمہ اللہ متشددین میں سے نہیں تھے بلکہ معتدل تھے جیسا کہ '' الرفع والتکمیل للعلامہ لکھنوی اور میزان الاعتدال للذھبی رحمہ اللہ لسان المیزان للحافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور اصول حدیث کی کتب سے۔ جب یہ ثابت ہوا کہ اس روایت کی سند میں یحییٰ بن ابی سلیمان منکر الحدیث ہے تب یہ روایت سخت ضعیف ہوگی اور ایسی ضعیف روایت کی بنا پر دو ارکان یا دو فرائض کی فرضیت کو ساقط کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

**دلیل نمبر ۳:**

سنن دارقطنی وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( من ادرك ركعة من الصلوٰة فقد ادركها قبل ان يقيم الامام صلبه ))

''جو شخص نماز میں سے رکوع کو پہنچا اس سے پہلے کہ امام اپنی پیٹھ اوپر اٹھائے تو اس نے نماز کو پالیا۔''

لیکن یہ روایت بالکل بے کار ہے کیونکہ اس کی سند میں عبداللہ بن وہب کا استاد یحییٰ بن حمید ہے اس کے متعلق امام بخاری اپنی کتاب جزء القرأۃ میں فرماتے ہیں کہ :

(( امام يحيىٰ بن حميد مجهول لا يعتمد علىٰ حديثه غير معروف بصحته خبر معروف وليس هذا مما يحتج به اهل العلم ))

''یحییٰ بن حمید مجہول ہے اس کی حدیث پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور نہ ہی کسی صحیح مرفوع حدیث کو بیان کرنے میں معروف ہے۔''

اور ایسے شخص سے اہل علم حجت نہیں پکڑتے اور حافظ ابن حجر اپنی کتاب لسان المیز ان میں امام بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ یحییٰ بن حمید کے متعلق انھوں نے فرمایا: ''لا يتابع في حديثه '' یعنی اس کی احادیث کی کوئی بھی متابعت نہیں کرتا اور فرمایا کہ:

''وَضَعَّفَهُ الدار قطنی '' یعنی امام دارقطنی نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن عدی نے اپنی کتاب الکامل میں زیر بحث روایت کو لا کر فرمایا: '' تفرد بهذه الزيادة ولا اعرفه غيرهٗ '' یعنی یحییٰ بن حمید

ہی اس زیر بحث روایت میں یہ زیادتی یعنی: "قبل ان یقیم الامام صلبه" بیان کی ہے مجھے اس کی اور کوئی روایت معلوم نہیں تو پھر ایسے مجہول اور ضعیف راوی سے حجت پکڑنا اور وہ بھی نماز کے دو ارکان کو ساقط کرنے کے لیے اہل علم کی شان سے بہت بعید ہے جب کہ راوی کی جہالت بھی جروح شدیدہ میں شمار ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کی روایت میں یحییٰ بن حمید کا استاد قرہ بن عبدالرحمٰن ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر اپنی کتاب تقریب التہذیب میں فرماتے ہیں کہ: "صدوق وله مناكير" یعنی یہ راوی ہے تو صدوق مگر اس کے پاس بہت منکر احادیث ہیں۔ اور محدثین کی صداقت کے مطابق اس روایت میں قبل ان یقیم الامام صلبهٗ کی زیادتی منکر ہے لہٰذا یہ روایت قرہ بن عبدالرحمٰن کی مناکیر میں شمار ہوگی۔

خلاصہ کلام:

رکوع میں ملنے والے کی رکعت ہو جانے کے متعلق اب تک صحیح دلیل پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی اگر کوئی حدیث صحیح بھی ہے تو اس میں صراحت نہیں کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے اور اگر کسی روایت میں ایسی صراحت ملتی بھی ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں باقی امام ابوداؤد رحمہ اللہ کا اس روایت کو اپنی سنن میں لانا اس بات پر دلیل نہیں کہ وہ روایت صحیح ہے کیونکہ امام داؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں صرف صحیح احادیث درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ کئی روایات کے متعلق خود امام صاحب نے اپنی سنن میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس کی سند میں فلاں راوی سخت ضعیف یا متروک وغیرہ ہے لہٰذا کسی روایت کو صرف امام ابوداؤد کی سنن میں دیکھنے کے بعد اس کے متعلق یہ حکم لگا دینا کہ وہ روایت صحیح ہے قطعاً درست نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

گزشتہ صفحات میں مذکور حدیث: "فما ادركتم فصلوا" کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے نماز کے کسی بھی جز کے ملنے سے جماعت کی فرضیت کے حاصل ہونے پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( فما ادركتم فصلوا )) "یعنی نماز کے کسی بھی جز کو پہنچو تو ادا کرو۔"

آپ ﷺ نے کم اور زیادہ میں تفریق نہیں کی اور یہی جمہور کا قول ہے اس حدیث سے اس بات پر بھی دلیل لی گئی ہے کہ آنے والے مقتدی کو چاہیے کہ وہ امام کو جیسی بھی حالت میں پائے اس میں شامل ہو جائے کیونکہ: "فما ادركتم" کا یہی تقاضہ ہے۔ مزید حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے متعلق اس سے بھی زیادہ صریح حدیث وہ ہے جو ابن ابی شیبہ میں عبدالعزیز بن رفیع کی طرف سے انصار میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت بیان کی ہے کہ:

(( من وجدني راكعا او قائماً او ساجداً فليكن معي على حالتي التي انا عليها ))

"جو شخص مجھے رکوع یا قیام یا سجدہ کی حالت میں پائے تو چاہیے کہ مجھ سے اس حال میں ملے جس پر

میں ہوں۔“

**فائدہ:**

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مقتدی امام کو اس وقت پاتا ہے کہ وہ دو رکعات پڑھ چکا ہے اگر وہ آیا ہوا مقتدی مسافر ہے تو بھی وہ دو رکعات اٹھ کر پڑھ لے کیونکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جتنی بقدر جماعت کو ملو وہ پڑھو باقی جو رہ جائے اسے پورا کرلو اور ظاہر ہے کہ اس آئے ہوئے مقتدی کو دو رکعات ملیں جو اس نے پڑھ لیں اور جو اس سے رہ گئی ہیں وہ اُسے پڑھنی ہوں گی۔ نبی ﷺ نے مقیم اور مسافر مقتدی کے درمیان کوئی بھی فرق نہیں کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

دعائے استفتاح کے بعد قرأت سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَٰنِ الرَّجِيمِ ﴾ [النحل: ]

استعاذہ پڑھنا بھی ضروری ہے اور استعاذہ کے الفاظ صحیح احادیث میں اس طرح مروی ہوئے ہیں:

(( اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم من ھمزہ و نفخہ و نفثہ ))

اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والے سے پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے اس کے جنون اور اس کے تکبر اور اس کے شر سے۔“

یہ روایت ابوداؤد، ابن ماجہ، دار قطنی، حاکم، ابن حبان، ترمذی میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ اور ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر دوسری رکعت میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس میں استعاذہ نہیں کیا جائے گا جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم اور مستدرک حاکم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے۔

(( کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نھض فی الثانیۃ استفتح بالحمد للہ رب العالمین و لم یسکت ))

”جب آپ ﷺ دوسری کے لیے اٹھتے تو الحمد للہ رب العالمین سے نماز شروع کرتے اور خاموش نہیں ہوتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا استعاذہ کے الفاظ اگر دوسری رکعت میں بھی پڑھتے تو لامحالہ کچھ دیر کے لیے وقفہ کرتے جب خاموش ہونے کی نفی ہوگئی تو معلوم ہوا کہ دوسری رکعت میں استعاذہ نہیں تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

اس کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے مگر صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تسمیہ جہری نمازوں میں نبی کریم ﷺ اور ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم آہستہ پڑھا کرتے تھے، اسے جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس کے متعلق ہم ذیل میں چند احادیث ذکر کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ابابکر و عمر رضی اللہ عنھما کانوا

یستفتحون الصلوٰۃ بالحمدللہ رب العالمین ))

”نبی ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نماز الحمدللہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔“

اور یہی حدیث صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے۔

(( فلم اسمع احداً منھم یقرء بسم اللہ الرحمن الرحیم ))

”انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے نہیں سنا کہ وہ نماز میں جہراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوں۔“

**نمبر۲:**

امام احمد نے مسند میں انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت بیان کی ہے:

(( صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و خلف ابی بکر و عمر و عثمان و کانوا لایجھرون بسم اللہ الرحمن الرحیم ))

”میں نے رسول اکرم ﷺ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز ادا کی وہ سب نماز میں سورۂ الفاتحہ جہراً نہیں پڑھتے تھے۔“

**نمبر۳:**

انس رضی اللہ عنہ سے مسند ابی یعلیٰ میں الفاظ کے ساتھ روایت وارد ہوئی ہے۔

(( صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخلف ابی بکر وخلف عمرو عثمان لم یکونوا یستفتحون القرأۃ بسم اللہ الرحمن الرحیم قال شعبۃ قلت لقتادۃ اسمعتہٗ من انس قال نعم و نحن سألناہ عنہٗ ))

”انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے پیچھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان سے شروع نہیں کرتے۔ امام شعبہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے قتادہ سے کہا کہ پھر (جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے) کیا آپ نے یہ انس رضی اللہ عنہ سے سنا تھا تو قتادہ نے جواب دیا کہ ہاں اور ہم نے ہی تو ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔“

یعنی ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ نبی ﷺ بسم اللہ سے قرأۃ شروع کرتے تھے یا الحمدللہ سے یہ سب احادیث اعلیٰ درجہ کے ثقہ راویوں سے مروی ہیں اور ان کی اسانید صحیح بلکہ اصح ہیں۔ معجم الکبیر طبرانی جلد اول میں حسن سند کے ساتھ اسی طرح روایت مروی ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسر بسم اللہ الرحمن الرحیم و ابوبکر و عمر رضی اللہ عنھما ))

یعنی نبی کریم ﷺ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سری پڑھا کرتے تھے۔ اس مسئلہ کے متعلق دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے عمدہ اسانید سے روایات مروی ہیں جن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہری نہیں پڑھتے تھے اور اس باب میں کوئی بھی صحیح مرفوع حدیث وارد نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ ﷺ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہر سے پڑھتے ہوں جو روایات صریح اور مرفوع جہراً پڑھنے کے متعلق وارد ہوئی ہیں وہ سب سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہیں۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنے کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ مرفوع حدیث کوئی بھی صحیح سند سے وارد نہیں ہوئی۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کا یہ قول شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الدرایہ فی تخریج الاحادیث الہدایہ میں نقل فرمایا ہے اسی مسئلہ کے متعلق ہم نے عربی زبان میں ایک کتاب بنام ''تحصیل المعلات'' میں سیر حاصل بحث کی ہے اس میں انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ جن دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بالسر کی روایات ہیں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے اور جن روایات سے مخالفین یعنی جہر کے قائلین استدلال کرتے ہیں ان کے شائقین کو اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس کا غور و تدبر اور عدل و انصاف سے مطالعہ کریں۔ بسم اللہ کے بعد سورۃ الفاتحہ یعنی الحمد شریف پڑھنا بھی ضروری ہے اور فرض و نماز کا رکن ہے خواہ وہ نماز پڑھنے والا امام ہو یا مقتدی یا منفرد اسی طرح نماز خواہ فرض ہو یا نفل جہری ہو یا سری۔ مسافر ہو یا مقیم اور وہ نماز رکوع و سجدہ والی ہو یا بغیر رکوع و سجدہ والی یعنی جنازہ نماز اور نماز پڑھنے والا مرد ہو یا عورت ان تمام صورتوں میں نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھنا ضروری ہے اگر نہیں پڑھی تو نماز نہیں ہوگی۔ جس رکعت میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی گئی وہ رکعت نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ کے متعلق تحقیق کرنے کے لیے امام بخاری کی کتب جزء القرأۃ اور امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب القرأۃ اور متقدمین خواہ متاخرین محدثین کی وہ کتب جو خاص اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کا تدبر اور تفکر سے مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ان علماء کرام اور محدثین عظام نے اس مسئلہ کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ متلاشیان حق کے لیے ان میں یہ سب کچھ مل سکتا ہے اختصار کو مدنظر کرتے ہوئے اس جگہ پر چند صحیح احادیث لکھی جا رہی ہیں جنھیں ملاحظہ کرنے سے طالب حق کے لیے ان شاء اللہ تشفی اور تسلی ہو جائے گی۔

**حدیث نمبر ۱:**

صحیحین میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب ))

''بے شک رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی نماز نہیں جس میں سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی گئی۔''

یہ صحیح حدیث اپنے عموم سے ہر نماز (جس کی تفسیر اوپر ذکر ہو چکی ہے) کو شامل ہے اس عموم سے نماز کے یا نمازی کے کسی بھی فرد کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے مستقل اور کوئی صحیح دلیل چاہیے اور کوئی صحیح دلیل ایسی موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی فرد کو خارج قرار دیا جائے۔ یہ حدیث اپنے عموم پر قائم رہے گی۔

**حدیث نمبر۲:**

مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں رفاعہ بن رافع سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ: مسیئ الصلاۃ کو آپ ﷺ نے نماز کے وہ ضروری امور جن کو ترک کرنے کی وجہ سے نماز نہیں ہوتی بتلائے اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

(( اذا استقبلت الْقِبْلَةَ فكبر ثم اقرأ بام القرآن ثم اقرأ بماشئت ))

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ جب قبلہ رو ہوں تو پھر تکبیر کہیں پھر سورۂ الفاتحہ پڑھا کریں اس کے بعد جو چاہو پڑھو۔''

واضح ہو کہ آپ مسیئ الصلاۃ کو وہ امور سکھلا رہے ہیں جو ضروری ہیں جن کو ترک کرنے سے نماز صحیح نہیں ہوگی ان امور میں آپ ﷺ نے سورۂ الفاتحہ کا ذکر بھی کیا تو معلوم ہوا کہ الحمد شریف کا نماز میں پڑھنا لازمی و ضروری ہے اور اس حدیث کے آخر میں آپ ﷺ نے مسیئ الصلوٰۃ کو فرمایا:

(( ثم افعل ذالك في صلوٰتك كلها ))

''جو باتیں تجھے سکھلائی گئیں ان سب کو اپنی مکمل نماز میں اپنائے رکھیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ الفاتحہ بھی تمام رکعات میں پڑھنی ہے مطلب کہ نماز میں قرأت کی فرضیت صرف سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے ادا ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر مزید قرآن کریم پڑھے گا وہ بہتر ہے ورنہ فرضیت سورۂ الفاتحہ سے ادا ہوگئی۔

**حدیث نمبر۳:**

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور کتاب القرأۃ للبیہقی میں طویل حدیث مروی ہے اس میں یہ بھی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

(( صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بعض الصَّلَوَاتِ التي يجهر فيها بالقرأة فالتبست عليها القرأة فلما انصرف قال هل تقرؤن معي قالوا نعم قال فلا تفعلوا الا بأم القرآن فانه لا صلاة لمن لم يقرء بها ))

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ سند صحیح ہے اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں۔ ہمیں نبی کریم ﷺ نے ایک جہری نماز پڑھائی پس آپ پر قرأت ملتبس ہوگئی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا تم میرے ساتھ

پڑھتے ہو تو انھوں نے کہا ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: سورۂ الفاتحہ کے علاوہ مزید نہیں پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

امام دارقطنی وغیرہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

(( فلا تقرؤ بشیءٍ من القرآن اذا جهرت الّابأم القرآن ))

صحابہ رضی اللہ عنہم کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب میں جہری قرأت کروں تو تم سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھو۔ امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ صحیح حدیث صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ جس نماز میں امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو تو بھی سورۃ الفاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نماز میں امام جہراً قرأت کر رہا ہو اس میں مقتدیوں کو سورۃ الفاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھنا چاہیے اور اس کے مفہوم مخالف سے معلوم ہوا کہ جب امام سراً قرأت کر رہا ہو تو پھر مقتدی سورۃ الفاتحہ کے ساتھ اور کوئی سورت بھی پڑھ سکتے ہیں۔

**حدیث نمبر۴:**

کتاب القرأۃ للبیہقی اور مسند ابی یعلیٰ میں عمدہ سند کے ساتھ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول الله صلی الله علیه وسلم صَلّٰی باصحابهٖ فلما قضیٰ صلوٰتهٗ اقبل علیهم بوجههٖ فقال اتقرؤن فی صلوٰتکم خلف الامام والامام یقرء فسکتوا فقالها ثلاث مرات قال قائل اوقال قائلون۔ فقط۔ انا لنفعل قال فلا تفعلوا لیقرء احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسهٖ۔ واللفظ لابی یعلیٰ ))

''یعنی نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھائی، پھر جب آپ ﷺ نے اپنی نماز مکمل کی تو صحابہ سے متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیا تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ تو سب خاموش رہے، آپ ﷺ نے تین بار پوچھا جب کسی ایک نے کہا یا بعض افراد نے کہا کہ ہم ایسا کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تم ایسا نہ کیا کرو تم میں سے ہر کوئی اپنے دل میں سورۃ الفاتحہ پڑھ لیا کرے۔ اس حدیث میں بھی صریح حکم وارد ہے کہ جہری قرأت کی صورت میں بہرحال سورۃ الفاتحہ کو ضرور پڑھنا ہوگا۔

**حدیث نمبر۵:**

امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی کتاب القرأۃ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ:

(( قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا صلوٰة لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب خلف الامام ))

''یعنی رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ سند صحیح ہے کتاب القراۃ ص ۵۶ طبع ادارہ احیاء السنۃ گھر جاکھ گوجرانوالہ

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے بخوبی معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سری خواہ جہری نمازوں میں سورۂ الفاتحہ ضرور پڑھنا ہوگی۔ علماء احناف کی طرف اس کے مقابلے میں چند احادیث اور قرآن کریم کی آیت پیش کی جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ امام کے پیچھے خاص طور پر جہری نمازوں میں قراۃ بالکل نہ کی جائے۔ یعنی سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ ان روایات کے متعلق گزارش ہے کہ ان روایات میں سے کوئی بھی روایت محدثانہ تحقیق کے مطابق سنداً صحیح نہیں اس لیے کہ وہ روایات یا تو کسی راوی کے ضعف کی وجہ سے یا سند میں انقطاع اور ارسال وغیرہ کی وجہ سے پایہ ثبوت کو نہیں پہنچیں، اس لیے صحیح احادیث کے مقابلہ میں ان کو پیش کرنا اصولی غلطی ہے لیکن اگر وجہ التنزل ان روایات کو حسن درجہ کی تسلیم کیا جائے، تب بھی اصل مسئلہ پر کچھ اثر نہ پڑے گا اس لیے کہ جو روایات اس سلسلہ میں پیش کی جاتی ہیں ان سب میں امام کے پیچھے عام قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کا نام لے کر اس سے کسی بھی روایت میں منع نہیں کیا گیا اس کے برعکس ہم نے جو روایات پیش کی ہیں ان سب میں صراحتاً امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ کے پڑھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اصولاً خاص اور عام کے موقع پر خاص ہی مقدم کیا جاتا ہے، اگر ان روایات کو حسن بھی تسلیم کیا جائے تو پھر بھی ان میں اس تطبیق ممکن ہے کہ جب قرأت کر رہا ہو تو سورۃ الفاتحہ کے علاوہ دوسری قرأت ممنوع ہے اور اس طرح دونوں احادیث جمع ہو جائیں گی اور کسی کو بھی ترک نہیں کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر مخالفین کی احادیث کو بالکلیہ عموم پر رکھا جائے تو لامحالہ ان خاص روایات کو جو بہر حال ان روایات سے کئی درجے زیادہ صحیح ہیں اور انھیں ترک کرنا پڑے گا اور اصولی طور پر یہ بات درست نہیں۔ باقی رہی وہ آیت جو سورۂ اعراف سے پیش کی جاتی ہے، یعنی:

﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [الاعراف: ۲۰۴]

''اور جب قرآن مجید پڑھا جائے تو توجہ کے ساتھ خاموش ہو کر سنا کرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہ حکم تمام نمازوں کو شامل ہے لہٰذا جب امام قرأت کر رہا ہو تو مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔

## ہماری گزارش:

اولاً: اس آیت کریمہ میں نماز کا کوئی بھی ذکر نہیں تو پھر اس کو نماز میں امام کی قرأت کرنے کے وقت مقتدیوں کو خاموش رہنے کے حکم میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: اگر اس آیت کو بالکل عموم پر رکھا جائے گا تو پھر نماز میں اور نماز سے باہر کچھ ایسی صورتیں پیدا ہوں گی جن کو خارج کرنے کے لیے دلیل نہیں مل سکتی، پہلی صورت مثلاً ایک شخص مسجد میں جا کر قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے تو باہر سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا تو وہ تحیۃ المسجد پڑھے یا قرآن کی تلاوت سنے۔ اگر کہو

گے کہ تحیۃ المسجد پڑھے (لامحالہ یہی جواب تمھیں دینا پڑے گا) تو اس صورت میں تم اسے کس دلیل کی بنا پر مستثنیٰ کرو گے۔

دوسری صورت حنفی بزرگ کہتے ہیں کہ فجر نماز ہو رہی ہو تو باہر سے کوئی مقتدی آئے جس نے دو رکعت سنت نہیں پڑھی وہ ایک جانب میں کھڑا ہو کر دو رکعات سنت پڑھے تو پھر جماعت میں شامل ہو جائے حالانکہ ان کا یہ حکم صریحاً اس آیت کریمہ کے خلاف ہے، کیونکہ یہ آیت قرآن کے پڑھنے کے وقت خاموش رہنے کا حکم دے رہی ہے جب کہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ پہلے سنت پڑھے پھر جماعت میں شامل ہو جائے اسے خاموش رہنے کا حکم نہیں دیتے تو اس صورت کو کس صحیح دلیل کے مطابق خارج کیا گیا ہے۔

**صورت نمبر ۳:**

کسی جگہ پر طلباء قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہوں تو اس آیت کریمہ کی تقاضہ یہ ہے (یعنی اگر اس کو عموم وشمول پر رکھا جائے) کہ ایک طالب علم قرآن کی تلاوت کرے اور دوسرے سنیں اور جب وہ فارغ ہو تو کوئی اور پڑھے حالانکہ عملاً ایسے نہیں کیا جاتا اس طرح کی اور صورتیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن کو علماء کرام نے اس آیت کے عموم سے خارج کیا ہے لہٰذا یہ آیت عام مخصوص منہ البعض ہوئی اور حنفی اصول فقہ کے مطابق عام مخصوص منہ البعض کو کسی خبر واحد بلکہ ان کے بقول قیاس سے بھی تخصیص کی جاسکتی، لہٰذا آیت کریمہ سے ان تینوں صورتوں کے خارج کرنے کی وجہ سے یہ عام مخصوص منہ البعض ہوگئی۔ اس لیے اصول فقہ کے بالکل مطابق بھی صحیح احادیث کی وجہ سے ہم سورۃ فاتحہ کو بھی اس عموم سے خارج قرار دیں تو کوئی بھی خرابی لازم نہیں آئے گی۔

**ثالثاً:** اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی اس لیے آیات نازل فرمائیں تاکہ آپ ﷺ کی تبیین و تشریح کریں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾ [النحل : ٤٤]

”ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر اس لیے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کی طرف جو نازل کیا گیا بیان کریں۔“

اب ہم کہتے ہیں کہ آیت کریمہ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن نبی اکرم ﷺ ان کی وضاحت فرماتے ہوئے اس طرح فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ اس عموم سے سورۂ فاتحہ مخصوص ہے یہ اس طرح جس طرح سورۂ نور میں فرمایا کہ:

﴿ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [النور : ٢]

”زانیہ عورت اور ہر زانی مرد میں سے دونوں کو (۱۰۰) کوڑے مارو۔“

الفاظ کے اعتبار سے یہ حکم زانی اور زانیہ خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ سب کو شامل معلوم ہو رہا ہے لیکن تمام مکاتب فکر کے علماء نے اس حکم کو صرف غیر محصن یعنی (جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی) کے ساتھ ملحق سمجھا ہے۔ یہ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ہر قول و فعل مبارک سے اس حکم کو صرف غیر محصن سے ملحق قرار دیا ہے اسی طرح آیت کریمہ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے فرمان واجب الاذعان سے یہ واضح فرما دیا کہ یہ حکم یعنی قرآن کریم کی قرأت کے وقت خاموش رہنے والے سے سورۂ الفاتحہ مستثنیٰ ہے، یعنی جب نماز میں قرآن پڑھا جائے تو سورۂ فاتحہ بہر حال پڑھی جائے گی۔ باقی دوسری قرأت سے سکوت اختیار کیا جائے گا۔

رابعاً: سورۂ اعراف مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور نماز میں اس سورت کے ضروری پڑھنے والا حکم مدینہ منورہ میں دیا گیا ہے، یعنی اس حکم کے رواۃ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہم سب مدینہ منورہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی۔ لہٰذا یہ بات کس طرح عقل میں آسکتی ہے کہ جو حکم کافی عرصہ گزرنے کے بعد ملا اس کو اس سے کافی پہلے نازل ہو چکی ہوئی آیت کریمہ نے منسوخ کیا یا اس سے روکا۔ درحقیقت اگر تحقیق سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زیر بحث آیت کریمہ میں نماز کے متعلق کوئی بھی حکم نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے قرآن کریم پڑھا جائے تب خاموش توجہ سے سننے کا حکم ہوا اور یہ ارشاد مؤمنین کو کفار کے غلط طریقہ کار کے خلاف صحیح طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے فرمایا گیا جیسا کہ حٰم سجدہ میں ہے کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾

[المومن : ٢٦]

”کفار نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنیں اور اس کی تلاوت کے وقت شور شرابا برپا کرو تاکہ تم غالب آجاؤ۔“

نیز ان کے اس قول و مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کے ساتھ متوجہ ہو کر سننے کا حکم فرمایا۔ ہماری اس گزارش پر دلیل یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے پہلے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہیں:

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾

اس کے بعد ﴿واذا قرئ القرآن .....﴾ ہے۔ یعنی یہ کلام پاک عام لوگوں کے لیے بصیرت اور عبر کا باعث ہے اور مؤمنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ پھر اس کے متصل یہ سمجھایا گیا کہ مؤمنین کو یہ ہدایت تب حاصل ہوگی کہ جب قرآن کی تبلیغ کے لیے تلاوت کے وقت مکمل طور پر خاموش رہیں پوری توجہ سے کلام

پاک کو سنیں۔ واللہ اعلم بالصواب

علماء اہل حدیث نے اس حدیث اور آیت کریمہ کے کئی اور جوابات بھی دیے ہیں۔ اسی طرح تمام مخالف راویات کے بھی مدلل کافی و شافی جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ اس مقام پر اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اس لیے یہاں پر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تحقیق کے لیے اس مسئلہ کے متعلق تحریر کی ہوئی معلومات کی طرف مراجعت کرنا چاہیے۔ اللھم وفق لنا بِمَا تحب و ترضیٰ

اس کے بعد نماز میں قرأت کیسے کرنی چاہیے۔ اس کے لیے گزارش ہے کہ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک ایک آیت پر وقف کرتے تھے جیسا کہ مسند احمد ص ۲۸۸ ج ۶ پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

(( عن بعض ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوعامر قال نافع أُرَاهَاحفصة انها سئلت عن قرأة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالت انكم لاتستطیعونها قَالَتْ فقیل لها اَخْبِرِيْنَا بِهَا قال فقرأت قرأة ترسلت فیها قال ابوعامر قال نافع فحکیٰ لنا ابن ابی ملیکة الحمدللّٰہ رب العالمین ثم قطع الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ثُمَّ قَطَعَ مالك یوم الدین ))

"یعنی ابن ابی ملیکہ نے نبی ﷺ کی ازواج محترمہ میں کسی سے روایت بیان کی ابو عامر (سند کا راوی) کہتا ہے کہ نافع بن عمر (جس سے ابو عامر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے) نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ بے شک بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ بے شک تمھیں (آپ ﷺ کی قرأۃ) کی طاقت نہیں تو انھیں کہا گیا کہ آپ بتا دیں تو انھوں نے آہستہ آہستہ قرأت فرمائی۔ ابو عامر کہتے ہیں کہ نافع نے ہمیں بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کی قرأت اس طرح پڑھ کر سنائی یعنی الحمد اللہ رب العالمین کہہ کر قرأت ختم کر دی، پھر الرحمٰن الرحیم کہا اور قرأت موقوف کی، پھر مالک یوم الدین کہا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب النکت میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم ﷺ اپنی قرأۃ میں آیت آیت پر وقف کرتے تھے، اس لیے ایک متبع سنت کو اس معاملہ میں بھی آپ ﷺ کی اتباع کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [الاحزاب: ۲۱]

اور تمھارے لیے نبی ﷺ کی ذات مبارکہ میں بہترین نمونہ ہے، یعنی ہر بات میں آپ ﷺ کے نمونہ زندگی کی اتباع کرنا واجب ہے۔

## آمین بالجہر کا ثبوت:

سورۂ الفاتحہ سے فارغ ہو کر آمین کہنا چاہیے جیسا کہ صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا قال احدكم اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ: فى صلواته آمين وقالت الملائكة فى السماء آمين فوافقت احداهما الاخرى غفر لهٗ ماتقدم من ذنبه ))

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کہے اور فرشتے بھی آسمانوں میں آمین کہتے ہیں۔ پھر جب ان کی آپس میں آمین کی موافقت ہو گئی تو اس کے اگلے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

اس حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں آمین کہے، اس سے نماز سری اور جہری دونوں ہی مراد ہیں یعنی جب بھی کوئی نماز میں الحمد پڑھے خواہ سراً یا جہراً تو وہ آمین کہے۔ اس طرح دوسری حدیث میں جو صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( قال اذا امن الامام فامنوا فانهٗ من وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر لهٗ ماتقدم من ذنبه ))

''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو پھر جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق ہو گئی تو اس کے اگلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

اس حدیث میں حکم فرمایا گیا ہے کہ جب امام آمین کہے تو پھر تم بھی آمین کہو۔ اس سے صراحتاً معلوم ہوا کہ بلند آواز سے قرأت والی نماز میں بلند آواز سے آمین کہنا ہو گی تا کہ مقتدیوں کو علم ہو کہ وہ بھی اس کے ساتھ آمین کہیں۔ اس باب میں اس سے بھی اصرح حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مسند احمد، سنن کبریٰ للبیہقی وغیرہ میں ان الفاظ سے روایت مروی ہے کہ:

(( كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا قال آمين رفع بها صوتهٗ ))

[ رواه الترمذى و ابوداود و ابن ماجة]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (نماز میں جب) آمین کہتے تو اپنی آواز کو بلند فرماتے تھے۔''

(( ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين ))

''امام جب غير المغضوب عليهم ولا الضالين'' کہے تو تم آمین کہو اور گزشتہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ امام کو بھی آمین جہراً کہنی چاہیے۔

دونوں احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ جب امام غیر المغضوب علیھم و لا الضالین کہے تو پھر وہ آمین کہے اور اس کے ساتھ مقتدی بھی آمین کہیں۔ اسی طرح مقتدیوں کو بھی جہری نماز میں آمین جہری کہنی ہو گی۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ابن جریج سے روایت ہے کہ میں نے عطاء بن ابی رباح کو کہا کہ:

(( أكَانَ ابن الزبير يؤمن اثر ام القرآن قال نعم يؤمن من ورائهٖ حتی ان للمسجد للجة ثم قال إنما آمين دعاء ))

''میں نے عطاء بن ابی رباح سے پوچھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب فاتحہ کو ختم کرتے آمین کہتے تھے تو انھوں نے کہا ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آمین کہتے تھے اور اس کے پیچھے والے لوگ بھی آمین کہتے یہاں تک کہ مسجد میں شور ہو جاتا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً بالجزم ذکر کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے سنن الکبریٰ میں صحیح سند کے ساتھ ابورافع (اس کا نام نفیع الصائغ ہے) روایت کرتے ہیں کہ:

(( ان أباهريرة كان يؤذن لمروان بن الحكم فاشترطَ ان لا يَسْبِقَهٗ و لاالضالين حتى يعلم انهٗ دخل الصف فكان اِذَا قَالَ مروان و لاالضالين قال ابوهريرة آمين يمد بها صوتهٗ وقال اذا وافق تأمين أهل الارض تأمين أهل السماء غفرلهم ))

''بے شک ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروان کے لیے اذان دیتے تھے پھر اسے انھوں نے شرط مقرر کی کہ اگر مجھے نماز میں تصور نہ کریں تو جب تک یہ نہ جان لیں کہ میں صف میں شامل ہو چکا ہوں تو جلد بازی سے ولا الضالین نہ پڑھیں، پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بلند سے آمین کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب زمین والوں کی آمین آسمان والوں کی آمین سے موافقت ہوگئی تو انھیں معاف کیا جائے گا۔''

امام بیہقی اپنی کتاب سنن کبریٰ میں عطاء بن ابی رباح سے حسن لغیرہ سند سے روایت نقل کی ہے کہ:

(( قال ادركت مأتين من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فى هذه المسجد اذا قال الامام غيرالمغضوب عليهم ولاالضالين سمعت لهم رجة بآمين ))

''میں اس مسجد (مسجد حرام) میں دو سو صحابہ کو پایا ہے کہ جب امام غیر المغضوب علیھم و لا الضالین کہتا تو میں آمین کا شور سنتا تھا۔''

بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا یہ عمل کہ وہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بلند آواز سے آمین کہتے تھے اور ان صحابہ کے خلاف کسی دوسرے صحابی کا اثر اس وقت نہیں مل سکا جس میں اس عمل کے خلاف ثبوت ملتا ہو۔ ایک روایت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت بیان کی جاتی ہے اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین

آہستہ کہی لیکن اس روایت کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وائل بن حجر سے تو آمین بلند سے کہنا مروی ہے جو کہ اوپر گزر چکی ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ بلند آواز سے آمین کہتے تھے۔ ابوز ہیر نمیری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات ليلة فَاَتَيْنَا على رجل قَدْ أَلَحَّ فِيْ المسئلة فقال النبى صلى الله عليه وسلم اوجب ان ختم فقال رجل من القوم باى شىء يختم قال آمين )) [رواه ابوداؤد بسند حسن] [1]

یعنی وہ شخص آیا جو سوال کرنے میں زیادہ مبالغہ کر رہا تھا پھر نبی ﷺ نے فرمایا اگر اس نے اپنی دعا پر مہر لگائی تو پھر اس نے اپنے لیے جنت کو واجب کر دیا، پھر کسی شخص نے عرض کیا کہ کس چیز سے مہر لگائی تو آپ ﷺ نے فرمایا آمین کے ساتھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ آمین دعا کے لیے مہر کی طرح ہے جس سے معلوم ہوا کہ سورۂ الفاتحہ کے آخر میں آمین کہنا چاہیے کیونکہ سورۂ الفاتحہ کی آخری تین آیات اھدنا الصراط المستقیم سے لے کر ولا الضالین تک دعا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ادب المفرد میں اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اور امام احمد نے المسند میں صحیح سند سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کرتے تھے کہ:

(( ماحسدتكم اليهود على شىء ما حسدتكم على السلام والتأمين خلف الامام))

"یہودیوں کو کسی چیز پر بھی اتنا حسد نہیں ہوا کرتا جتنا حسد سلام اور آمین امام کے پیچھے کہنے پر ہوتا ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے آمین بلند آواز سے کہنا چاہیے کیونکہ جب تک کوئی شخص آمین کی آواز نہیں سنے گا تب تک اس پر حسد کیسے کریں گے۔ واللہ اعلم بالصواب

**فائدہ:**

خلف الامام کے الفاظ صرف مسند احمد میں ہیں۔ نماز میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنا بھی فرض ہے، اس سے مزید اگر کوئی دوسری سورت نہیں پڑھتا تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ جیسا کہ ابوداؤد کی حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کی سند صحیح ہے جس میں معاذ رضی اللہ عنہ کا عشاء نماز طویل پڑھنا مذکورہ ہے اور ایک صحابی کے نماز چھوڑ کر جانے کا ذکر ہے اور آپ ﷺ نے اس معاملہ پر ان کی سرزنش فرمائی اس میں مزید یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نے اس شخص سے فرمایا کہ:

(( كيف تصنع يا ابن اخى اذ اصليت ))

[1] كتاب الصلوٰة - رقم الحديث : ٩٣٨

''اے بھتیجے جب آپ نماز پڑھتے ہو تو کیا کرتے ہو؟''

اس نے کہا:

(( اقرا فاتحه الكتاب واسئل الله الجنة واعوذ به من النار ))

''میں نماز میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتا ہوں۔ اور اس اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ طلب کرتا ہوں۔''

اور اس بات کو نبی ﷺ نے بحال رکھا۔ معلوم ہوا کہ نماز میں صرف سورۂ الفاتحہ پر اکتفا کرنا بھی درست ہے۔ نبی ﷺ فجر کی دونوں رکعتوں میں اور مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں عشاء کی بھی پہلی دو رکعتوں میں قرأت جہری پڑھتے تھے مگر کبھی کبھی سری قرأت والی نماز میں بھی کوئی آیت جہراً پڑھ لیتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سن لیتے تھے جیسا کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مروی ہے کہ معلوم ہوا کہ سری نمازوں میں بھی جب کسی نے جہراً قرأت کر لی تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ چار رکعات والی یا تین رکعات والی نماز کی آخری رکعات میں کبھی صرف سورۂ الفاتحہ پر اکتفا کرتے تھے جیسا کہ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ والی صحیحین کی روایت میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کبھی پچھلی رکعات میں بھی فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۂ بھی ضم کرتے تھے۔ جیسا کہ ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہے جو صحیح مسلم ہے۔

**فائدہ نمبر ۱:**

اگر امام قرأت میں بھول جائے تو اسے لقمہ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ ابوداؤد اور ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( صلى صلوٰة فقرأ فيهما فلبس عليه فلما انصرف فقال لأبی اصليت معنا قال نعم قال فما منعك ))

ابوداؤد میں صرف یہی ہے ابن حبان وغیرہ میں مزید یہ بھی ہے کہ: "ان تفتح علی" یعنی نبی ﷺ نے نماز پڑھی، پھر اس میں آپ نے قرأت فرمائی اور آپ ﷺ پر کچھ قرأت ملتبس ہوگئی۔ پھر نماز سے فارغ ہوئے تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا، کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ تو انھوں نے کہا، جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر کس چیز نے آپ کو روکا کہ مجھے آپ بتلاتے۔

**فائدہ نمبر ۲:**

اگر نماز میں کوئی بات ہو جائے یا امام سے بھول ہو جائے تو مقتدیوں کو سبحان اللہ کہہ کر متنبہ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من نابه فی صلوٰته شیءٌ فليقل سبحان

الله ))

''جب کسی مسلمان کو نماز میں کوئی بات پیش آئے یا کوئی بھول ہو جائے تو سبحان اللہ کہے۔''

[ صحیح بخاری و صحیح ابن خزیمہ ]

**فائدہ نمبر۳:**

نماز میں کلام کرنا جائز نہیں مگر جب کوئی شخص بے خبری یا جہالت کی وجہ سے کلام کر بیٹھے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ جیسا کہ معاویہ بن الحکم سلمی کی حدیث جو صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں وارد ہے کہ انھوں نے نماز میں کلام کر لیا۔ نماز کے بعد وہ صحابی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

(( والله ماضر بنی ولا قهرنی ولا شتَمَنِیُ ولکن قال ان صلوٰتنا هذه لا يصلح فيها شيء من كلام الناس إنما هی التكبير والتسبيح و تلاوة القرآن ))

''اللہ کی قسم! نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مارا اور نہ ہی مجھے ڈانٹ ڈپٹ فرمائی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ہماری نمازیں ان میں باتیں کرنا درست نہیں بلکہ یہ تو تکبیر و تسبیح اور قرآن مجید کی تلاوت کا نام ہے۔''

ظاہر ہے کہ جب کسی بے خبر کے کلام کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم فرماتے۔ جیسا کہ مسیئ الصلوٰۃ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بھول میں یہ سمجھے کہ میں نماز مکمل کر چکا ہوں پھر کسی سے کلام کر بیٹھے اور اسے یاد آئے یا اسے یاد دلایا جائے تو وہ بقیہ نماز کو مکمل کرے اور سجدہ سہو بھی ادا کرے۔ اس کا بھول کی وجہ سے نماز میں بات کرنا مفسدۂ صلوٰۃ نہیں جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح بن خزیمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی نمازوں میں سے کسی نماز میں کچھ رکعتوں پر سلام پھیر دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذوالیدین نے یاد دلایا کہ اے اللہ کے رسول! کیا نماز اللہ کے حکم سے کم ہوئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں، پھر دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھ کر اور تحقیق کرنے کے بعد بقیہ دو رکعات ادا فرمائیں اور سہو کے سجدے ادا کیے اور مکمل نماز کا اعادہ نہیں فرمایا۔

**فائدہ نمبر۴:**

نماز میں سانپ اور بچھو وغیرہ کو مارا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ نسائی و ابن خزیمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول الله صلی الله عليه وسلم امر بقتل الاسودين فی الصلوٰة العقرب والحية ))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بھی سانپ اور بچھو کو مارنے کا حکم فرمایا۔''

## فائدہ نمبر ۵:

اگر دو بچے آپس میں لڑ پڑیں تو ایک دوسرے سے الگ کرنے سے نماز فاسد نہیں ہو گی۔ جیسا کہ ابن خزیمہ، نسائی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے تو بنو عبدالمطلب کی دو بچیاں آپس میں لڑ پڑیں۔ پھر آپ ﷺ نے دونوں کو ایک دوسری سے الگ کر دیا اور اسے کچھ شمار نہ کیا۔

## فائدہ نمبر ۶:

اگر نماز میں قاری ایسی آیت پڑھے جس میں سجدہ ہو تو وہ سجدہ تلاوت ادا کر سکتا ہے اور مقتدی بھی اس کے ساتھ سجدہ کریں گے۔ جیسا کہ صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں ابو رافع سے روایت ہے کہ:

(( صليت مع ابى هريرة العتمة قرأ اِذَا السماء انشقت فسجد فقلت لهٗ ما هذه السجدة قال سجدت بها خلف ابى القاسم صلى الله عليه وسلم ))

اس روایت کے دوسرے طریق میں اس طرح ہے کہ:

(( صليت خلف ابى القاسم فسجد بها فلا ازال اسجد بها حتّٰى القىٰ ابا القاسم صلى الله عليه وسلم ))

جب میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے سورۂ اذا السماء انشقت پڑھی، پھر سجدہ کیا پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ کونسا سجدہ ہے؟ تو صحابی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی پھر آپ ﷺ نے بھی اس سورت کے پڑھنے پر سجدہ فرمایا تھا، تو میں نے بھی سجدہ کیا۔ اب میں ہمیشہ اس سورت کے پڑھنے پر سجدہ کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ جا کر نبی ﷺ سے جا ملوں۔ اگر قاری ایسی سورت پڑھے جس کے آخر میں سجدہ ہو تو وہ سجدہ کرے پھر اٹھ کر کوئی دوسری سورت پڑھے اور رکوع کرے جیسا کہ یہ فعل عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے سنن الکبریٰ للبیہقی میں وارد ہوا ہے اور اس سجدہ تلاوت میں یہ دعا پڑھنی چاہیے:

(( اللهم اكتب لى بها عندك اجرا وحط عنى بها وزراً واجعلها لى عندك ذخراً و تقبلها منى كما تقبلتها من عبدك داوٗد ))

[ راوه الترمذى وابن خزيمه عن ابن عباس]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند سے ترمذی، نسائی، صحیح ابن سکن میں جنوں والی رات کو میں نے یہی سورت ان پر تلاوت کی، پھر انہوں نے تم سے زیادہ بہتر جواب دیا جب بھی میں نے ان پر آیت:

﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمن : ۱۳]

پڑھی تو انہوں نے کہا: "لا بشیء من نعمك ربنا نكذب فلك الحمد "یعنی اے ہمارے

رب! ہم تیری کسی نعمت کا انکار نہیں کرتے تیرے لیے حمد ہے۔ اس حدیث کی سند حسن لغیرہ ہے اور اس حدیث کا شاہد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ابن جریر طبری کی تفسیر میں اور خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ص۳۰۱ ج ۴ میں اور مسند بزاز وغیرہم میں مضبوط راویوں سے حسن سند سے مروی ہے۔ بہرحال سورۂ رحمٰن کی اس آیت کے پڑھنے کے وقت پڑھنے اور سننے والے دونوں کے لیے مستحب ہے کہ وہ مذکورہ بالا الفاظ کہے۔

**فائدہ نمبر ۹:**

نماز کی دونوں رکعات میں ایک ہی سورۂ پڑھنے کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ یہ بھی مشروع ہے جیسا کہ سنن ابی داؤد میں صحیح سند جہینہ قبیلے کے ایک شخص سے مروی ہے کہ:

(( کانه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم قرأ فی الصبح "اذا زلزلت" فی الرکعتین کلتیهما أَنَسِيَ ام قرأ ذالك عمداً ))

یعنی اس صحابی رضی اللہ عنہ نے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دونوں رکعتوں میں: " اذا زلزلت الارض " پڑھی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو بھول ہوگئی یا جان بوجھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ظاہر یہ بات ہے کہ یہ کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر کیا نہ کہ بھول سے بلکہ اس فعل کی مشروعیت اور تعلیم کے لیے ایسے کیا۔ ہمیں بھی علامہ موصوف کی یہ بات صحیح نظر آتی ہے اس لیے کہ کئی لوگ ایسے ہیں جنھیں قرآن کریم کی ایک دو سورتوں کے علاوہ مزید کچھ یاد ہی نہیں ہوتا تو پھر ایسے شخص کو یہ حکم کیا جائے کہ تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورۂ پڑھا کر تو یہ کام اس کے لیے بڑی تکلیف کا باعث بن جائے گا۔ مثلاً کسی شخص کو سورۂ فاتحہ اور قل هو الله احد یاد ہے تو اس کے لیے یہی مشروع ہے کہ وہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قل هو الله احد پڑھتا رہے کئی لوگ ایسے ہیں جنھیں زیادہ قرآن مجید یاد نہیں ہوسکتا انھیں صرف دو یا تین سورتیں یاد ہوئی ہیں جن کو وہ اپنی نماز میں دہرائے رہتے ہیں۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ان اشخاص کے لیے بڑی آسانی کا باعث ہے ورنہ بصورت دیگر ان کے لیے کافی مشقت پیدا ہوسکتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بھی فرماتا ہے:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة : ١٨٥]

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا۔ واللہ اعلم بالصواب

**فائدہ نمبر ۱۰:**

نماز میں اگر کسی شخص چھینک آجائے تو اس کے لیے یہ دعا پڑھنا مسنون ہے:

(( الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه مبارکاً علیه کما یحب ربنا و یرضیٰ ))

جیسا کہ رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے نسائی شریف میں ہے۔ مطلب کہ چھینک دینے والا خود ہی

یہ الفاظ کہہ سکتا ہے۔ باقی جو کوئی اور شخص نماز میں ہو تو اسے اس کی حمد کے الفاظ سن کر "یرحمك الله" کے الفاظ سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ناجائز ہے جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث اور معاویہ بن الحکم السلمی کی اوپر ذکر شدہ حدیث میں یہ بیان ہے کہ کسی شخص نے چھینک دی تو ایک آدمی نے کہا: "یرحمك الله" نبی ﷺ نے اسے سمجھایا کہ نماز میں کلام کرنا درست نہیں۔ کما مر

آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رکوع میں جانے سے پہلے قرأۃ سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے، جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس روایت کو امام حاکم نے صحیح اور حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے ائمہ کا یہ طریقہ جو آج کل مروج ہے کہ قرأۃ سے فارغ ہوتے ہی فوراً اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جاتے ہیں۔ صحیح نہیں بلکہ رکوع میں جانے سے پہلے کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے تاکہ قیام اور رکوع والے ارکان میں امتیاز ہو جائے یعنی معلوم ہو جائے کہ ایک رکن ختم ہو چکا اور دوسرا رکن شروع ہو گا۔

**فائدہ نمبر ۱۱:**

جب انسان نماز میں بے وضو ہو جائے تو وضو کر کے نماز دوبارہ شروع کرے اسی پر بنا نہ کرے جیسا کہ صحیح ابن حبان میں حسن سند سے علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ:

(( اذا فسا احدکم فی الصلوٰۃ فلینصرف ثم لیتوضا و لیعد صلوٰتہٗ ))

''تم میں سے کوئی نماز میں ہوا خارج کرے تو نماز کو دوبارہ لوٹائے۔''

صحیح ابن حبان ج ۵ ص ۴ میں ہے کہ یہ حکم امام اور مأموم دونوں کے لیے ہے جیسا مذکورہ کتاب میں ص ۵ ج ۴ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

(( اذا احدث احدکم فی الصلوٰۃ و لیاخذ علیٰ انفہ ثم لینصرف ))

''جب تم میں سے کوئی نماز کی حالت میں بے وضو ہو جائے اسے چاہیے کہ ناک پکڑ کے نکل جائے۔''

یہ حدیث اپنے عموم کے لحاظ سے امام اور منفرد کو شامل ہے۔

**فائدہ نمبر ۱۲:**

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ابو داؤد میں روایت مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کا کپڑا نصف پنڈلی پر ہونا چاہیے اور اس میں کوئی حرج اور گناہ نہیں یا اس سے کچھ نیچے ہو۔ باقی:

« ما اسفل من الکعبین فھو فی النار و من جرازارہ بطراً لم ینظر اللہ الیہ »

''باقی جو حصہ پنڈلیوں سے نیچے ہو وہ آگ میں جائے گا اور جو اپنے ازار کو تکبر سے لٹکائے گا اسے

اللہ تعالیٰ نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔‘‘

اسی سے معلوم ہوا کہ مرد کے لیے اپنی شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ناجائز ہے جب کہ یہ کام نماز سے باہر بھی ناجائز ہے۔ تو پھر نماز میں بالاولیٰ اس کا عدم جواز مؤکدہ بن جائے گا۔ اگر شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکا کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوگی۔ بہرحال قیام کو مکمل کرنے کے بعد تکبیر کہہ کر رفع الیدین کر کے رکوع میں جائے۔ رفع الیدین کا بیان پہلے ہم کر آئے ہیں۔ اور صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اکبر کہہ کر پھر رکوع میں جاتے تھے یہ حدیث زیادہ مفصل ہے ان شاء اللہ یہ حدیث سجدہ کی بحث میں مکمل ذکر کریں گے۔ اور تکبیر کہہ کر رکوع میں جانے کے متعلق مسیء الصلوٰۃ کی حدیث بھی حجت ہے، جس کا ذکر پہلے بھی ہم کر آئے ہیں وہ حدیث اس طرح شروع ہوتی ہے:

(( انها لاتتم صلاة احدكم حتىٰ يسبغ الوضوء ))

’’تم میں سے کسی کی نماز نہیں ہوگی یہاں تک کہ کامل وضو کر لے۔‘‘

دو تین باتوں کے بعد فرمایا:

(( ثم يكبر ويركع ويضع يديه علىٰ ركبتيه حتىٰ تطمئن مفاصله وتسترخى ))

’’پھر وہ تکبیر اور رکوع کرے اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تاکہ اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جائیں اور پرسکون ہو جائیں۔‘‘

یہ حدیث نسائی، ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں ہے امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی موافقت کی ہے، یہی روایت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مسند احمد میں اس طرح مروی ہے:

(( فاذا ركعت فاجعل راحتيك علىٰ ركبتيه وامدد ظهرك "الحديث" ))

’’پھر جب آپ رکوع کریں تو اپنی ہاتھوں کی ہتھیلی گھٹنوں پر رکھیں اور اپنی پیٹھ کو سیدھا کریں۔‘‘

اور صحیح ابن خزیمہ بخاری اور ابوداؤد میں ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس میں اس طرح ہے:

(( ثم ركع فوضع يديه علىٰ ركبتيه كالقابض عليها فلم يصب راسه ولم يقنعه ونحىٰ يديه علىٰ جنبيه ))

’’پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا تو اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور گھٹنوں کو ہاتھوں سے پکڑ رہے تھے پھر اپنے سر مبارک کو نہ جھکایا اور نہ اوپر اٹھایا اور اپنے ہاتھوں کو پہلوؤں سے دور رکھا۔‘‘

صحیح ابن خزیمہ اور ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند سے ابومسعود رضی اللہ عنہ اور عفیہ بن عامر بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لاتجزئ الصلوٰة من لايقيم صلبه من الركوع ))

''جو شخص رکوع اور سجدوں میں اپنی پیٹھ کو سیدھا نہیں کرتا اس کی نماز مکمل نہیں۔''

اور ابوداؤد میں ایک دوسری روایت ابوساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( و وتر یدیه فنحیٰ هما عن جنبیه ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بازوؤں کو سیدھا رکھا اور اپنے پہلوؤں سے ان کو دور رکھا۔''

اور رکوع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگلیوں کو کھول کر رکھتے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا رکع فرج بین اصابعه ))

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کرتے تو اپنی انگلیوں کو فراخ کر لیتے۔''

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت صحیح ابن حبان میں بھی ہے لیکن اس میں کچھ اضافہ ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا رکع فرج اصابعه واذا سجد ضم اصابعه ))

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع فرماتے تو اپنی انگلیوں کو کھول کر رکھتے اور جب سجدہ فرماتے تو ان کو ملا دیتے۔''

اسی طرح رکوع میں اطمینان وسکون لازمی امر ہے۔ جیسا کہ مسئ الصلوٰۃ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی امر فرمایا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے رکوع اور سجدہ میں اعتدال نہیں کر رہا تھا۔ تو جب اس نے نماز مکمل کی تو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا اور کہا کہ تو نے نماز مکمل نہیں کی اگر اسی حالت میں تجھے موت آ گئی تو جس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا ہے اس پر تیری موت نہیں آئے گی۔ مسند احمد میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اَسْوَأُ النَّاسِ سرقة الذی یسرق من صلوٰة قالوا یا رسول الله و کیف یسرق من صلوٰته قال لایتم رکوعها ولا سجودها ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوری کے لحاظ سے سب سے بڑا چور وہ شخص ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے چوری کس طرح کر سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کے سجدہ اور رکوع کو مکمل نہیں کرتا۔''

رکوع کے اذکار میں مختلف اذکار وارد ہوئے ہیں صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں یہ دعا پڑھ رہے تھے سبحان ربی العظیم اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ام المؤمنین بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجدہ میں یہ دعا اکثر طور پڑھا کرتے تھے: « سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلی » اور صحیح مسلم میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا

سے روایت ہے کہ نبی ﷺ رکوع اور سجدوں میں یہ تسبیح پڑھتے تھے۔ (( سبوح قدوس رب الملئکۃ والروح )) انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ رکوع میں یہ دعا پڑھ رہے تھے:

(( سبحان ذی الجبروت والکبریاء والعظمۃ )) [نسائی۔ ابوداؤد]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(( الا انی نھیت ان أقرا القرآن راکعاً اوساجداً فاما الرکوع فعظموا فیہ الرب واما السجود فاجتھدوا فی الدعاء فقمن ان یستجاب لکم ))

''مجھے رکوع میں قرآن کریم پڑھنے سے روکا گیا ہے مگر رکوع میں اپنے اللہ کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں دعا کی کوشش کرو کیونکہ لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کی جائے۔'' [صحیح مسلم]

رکوع اور سجدہ میں قرآن کریم کے منع نہ پڑھنے والی روایت علی رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح مسلم میں مروی ہے۔

**فائدہ:**

رکوع میں پیٹھ سیدھی کرنے کی روایت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے، اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رکوع میں پہنچ کر آپ '' فحصر ظھرہ'' آپ ﷺ اپنی پیٹھ مبارک کو کچھ نیچے کیا تا کہ سیدھی ہو جائے اس کے بعد آپ ﷺ پیٹھ مبارک رکوع سے اوپر اٹھتے ہوئے یہ کہتے تھے'' سمع اللہ لمن حمدہ'' صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے مسیٔ الصلوٰۃ کے متعلق اس کو آپ ﷺ نے یہ حکم بھی فرمایا تھا کہ: (( لاتتم الصلوٰۃ لاحد من الناس...... حتی...... )) پھر تکبیر وغیرہ کا امر فرمایا اور پھر فرمایا کہ:

(( ثم یرکع ثم یقول سمع اللہ لمن حمدہ حتی یستوی قائمًا ))

''پھر وہ رکوع کرے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو جائے۔''

اور انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ اس اعتدال میں کبھی کبھی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ: (( حتی یقول القائل قدنسی )) آپ ﷺ تو بھول گئے ہیں (یعنی سجدہ میں جانا)۔

رکوع سے اٹھنے کے بعد رفع الیدین کرتے تھے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی اپنے ہاتھ مبارک کندھوں کے برابر اٹھاتے تھے جیسا کہ اس بارے میں ابوحمید رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پہلے گزر چکی ہے اور کبھی کانوں کے برابر اٹھاتے تھے جیسا کہ مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کی روایت میں مروی ہے یہ بھی پہلے گزر چکی ہے۔

اس موقع پر ہاتھوں کو چھوڑ دینا ہے ہمارے نزدیک یہی بات درست ہے ذیل میں چند دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

## دلیل نمبر ۱:

مسند احمد میں صحیح سند سے رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مسیئ الصلوٰۃ والی روایت مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

(( فاذا رفعت رأسك فاقم صلبك حتى ترجع العظام الى مفاصلها ))

[مسند احمد ج٤ ص٣٤]

''پھر جب آپ رکوع سے سر اٹھائیں تو اپنی پیٹھ کو سیدھا رکھیں یہاں تک کہ جسم کے تمام اعضاء اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ آئیں۔''

حدیث کے اس ٹکڑے میں العظام جمع کثرت کا صیغہ ہے اور اس کے شروع میں الف لام استغراق کا داخل ہے اور اصول کے مطابق اگر ایسی جمع کے اوپر الف لام داخل ہو تو اس میں استغراق کی معنیٰ پیدا ہو جاتے ہیں یعنی وہ اپنے تمام افراد کو شامل ہوتا ہے یعنی کوئی فرد بھی دلیل کے بغیر اس سے خارج نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے جسم کے تمام اعضاء جوڑوں کی طرف لوٹ آئیں اور اس رکن میں رفع الیدین کی وجہ سے کہنیوں کی ہڈیاں بھی اپنے جوڑوں سے نکل گئی تھیں۔ پیٹھ کے سیدھے کرنے سے پیٹھ کی ہڈیاں اپنے جوڑوں کی طرف لوٹ آئیں لیکن کہنیوں کی ہڈیاں ابھی باقی ہیں وہ اپنے جوڑوں کی طرف تب لوٹیں گے جب ارسال کیا جائے، وضع کی صورت میں وہ یقیناً اپنے جوڑوں کی طرف نہیں لوٹ سکتیں اور ایسی کوئی بھی دلیل نہیں کہ کہنیوں کی ہڈیاں اس حکم سے خارج ہوں۔ یہی وجہ علامہ البانی نے اپنی کتاب صلوٰۃ النبی ﷺ میں اس حدیث کے اس ٹکڑے پر جو ہم نے نقل کیا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے اس قیام میں وضع ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ '' هي تدل دلالة ظاهرة علىٰ خلاف ذالك '' یعنی حدیث کا یہ ٹکڑا اس کے بالکل برعکس یعنی ارسال پر دلالت کرتا ہے، اس دلیل پر کچھ اعتراضات کے جوابات ہم نے اپنی کتاب ''تائید عالم الغیب والشہادۃ الکبیر المتعال'' میں دیے ہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

## دلیل نمبر ۲:

ابوحمید رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں اس رکن کے متعلق اس طرح روایت وارد ہے: ''فاستوىٰ حتى يعود كل فقار مكانه '' الحدیث یعنی پھر آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا اور سیدھے کھڑے ہوگئے۔ یہاں تک تمام ہڈیاں اپنی جگہ پر لوٹ آئیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام اسمعی سے فقار کے متعلق نقل کیا ہے کہ فقار پچیس ہڈیوں کو شامل ہے۔ جن میں سے سات گردن میں اور پانچ پیٹھ میں باقی پہلوؤں میں اور ان کے اطراف میں۔ یہ تمام اعضاء اپنی جسمانی جگہ پر لوٹیں گے تو لامحالہ ارسال لازم آئے گا۔ اگر بازوؤں اور کہنیوں کو ہڈیاں کو باہر نکالا جائے تو وہ لفظ ''کل'' کے بالکل خلاف جائے گا۔ باقی جن لوگوں نے فقار کو پیٹھ کی ہڈیوں تک محدود کھا ہے تو ہمارے اوپر لازم نہیں کہ ہم ان کی تقلید کریں جب کہ لغت کی کتب میں ایک امام

یعنی اصمعی جو لغت عربی کے نقل میں حجت ہے وہ لفظ فقار کو صرف پیٹھ تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اطراف وغیرہ کی ہڈیاں بھی اس میں شامل سمجھتا ہے۔ بہر حال اس فعلی حدیث کا حال یہی ہے جو پہلی قولی حدیث کا تھا۔

## دلیل نمبر ۳:

امام بخاری کی جزء القراءۃ اور سنن الکبریٰ بیہقی وغیرہ میں جلیل القدر تابعی حسن بصری رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ:

(( کان اصحاب النبي صلی الله علیه وسلم کإنما اَیَدِیُهُمُ المرواح یرفعونها اذا رکعوا واذا رفعوا رؤسهم ))

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت اپنے ہاتھ اٹھاتے تھے گویا کہ ان کے ہاتھ پنکھے ہوں۔''

ظاہر ہے کہ اس وقت کے پنکھے آج کل کے برق (الیکٹرانک) پنکھے نہیں تھے بلکہ وہ کھجی وغیرہ کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ جیسا کہ آج کل بھی ان مقامات پر جہاں (بجلی) لائٹ نہیں ہوتی وہاں یہ استعمال ہوتے ہیں ان کے ہوا کے لیے اوپر نیچے کیا جاتا ہے۔ اس جگہ پر امام حسن بصری رحمہ اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کو پنکھوں سے تشبیہ دی ہے یہ تشبیہ جس طرح رکوع میں جاتے وقت بالکل واضح ہے یعنی پہلے ہاتھ اوپر اٹھائے جاتے ہیں پھر نیچے کر کے گھٹنوں پر رکھے جاتے ہیں اس طرح رکوع سے اٹھتے وقت بھی پنکھوں والی تشبیہ تب ہی ثابت ہو گی جب ہاتھ اوپر اٹھا کر پھر چھوڑ دیے جائیں مگر جب وضع کیا جائے گا۔ تو یہ تشبیہ اس حالت میں غلط ہو گی، کیونکہ اس صورت میں ہاتھ اوپر اٹھ کر دائیں بائیں چلے جاتے ہیں اور نیچے نہیں جائے کہ پنکھوں سے ان کی مشابہت ہو۔

## دلیل نمبر ۴:

صحیح بخاری اور مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( کان اذا رفع رأسه من الرکوع انتصب قائما حتی یقول القائل قدنسی ))

[الحدیث]

''جب رکوع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک اوپر اٹھاتے تو اتنی دیر سیدھے کھڑے یہاں تک کہ کہنے والا کہتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ کرنا بھول گئے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ رکوع کے بعد اتنی دیر اس قیام میں لگ جائے اور اس قیام میں وضع کے قائلین کے بقول اگر اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ باندھے تو آج بھی ائمہ کے ہاتھ باندھنے چاہییں تو پھر بتایا جائے کہ جب باہر سے کوئی مسبوق آئے اور امام کو اس حالت میں دیکھے تو وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے تو آخر وہ مسبوق کس

طرح معلوم کرے کہ امام پہلے قیام میں ہے تاکہ سورۂ الفاتحہ وغیرہ پڑھ لے یا رکوع کے بعد والے قیام کے اذکار پڑھ کر دوسری رکعت کی طرف اٹھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے اور مسبوق یہ سمجھے کہ وہ رکوع کے بعد والے قیام میں کھڑا ہے اس لیے وہ سورۂ الفاتحہ نہیں پڑھتا تو لامحالہ مسبوق کی وہ رکعت نہیں ہوئی اور اگر امام رکوع کے بعد والے قیام میں کھڑا ہے مگر یہ سمجھے کہ ابھی پہلے قیام میں ہے اس لیے وہ سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کرتا ہے تو اس میں امام کی مخالفت لازم آئے گی کیونکہ ارشاد ہے کہ جب امام " سمع الله لمن حمده" کہے تو تم "ربنا و لك الحمد" کہو اور رکعت کا جانا اور امر کی مخالفت تب لازم آئی جب امام دونوں قیاموں میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگا۔ اگر دوسرے قیام میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوگا تو اس طرح کا اشتباہ اور التباس ہرگز لازم نہیں ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ نے دونوں قیاموں میں ہاتھ باندھے تھے تو اس طرح کا اشتباہ اور التباس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ضرور پیش آتا اور وہ اس مشکل کے حل کے لیے ضرور بارگاہ رسالت کی طرف رجوع کرتے اور آپ ﷺ کی طرف سے ان کے اس مسئلہ کا حل بھی ملتا لیکن جب اس دوسرے قیام کے اتنے طویل کرنے کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشتباہ پیش نہ آیا تو اس سے یقینی طور پر یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ دوسرے قیام میں ارسال ہی تھا۔ وضع کے لیے دوسری کوئی واضح دلیل نہیں۔ صرف یہ ایک دلیل پیش کی جاتی ہے جو نسائی شریف میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ:

(( رأیت رسول اللّٰهِ صلى الله علیه وسلم اِذَا کان قائماً فی الصلوٰة قبض بیمینه علیٰ شماله ))

"میں نے رسول اکرم ﷺ کو دیکھا کہ جب بھی نماز میں کھڑے ہوتے تو اپنے سیدھے ہاتھ بائیں سے پکڑتے تھے۔"

ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس روایت میں قائمًا کا لفظ دونوں قیاموں کو شامل ہے، یعنی جب بھی کھڑے ہو خواہ قبل الرکوع یا بعد الرکوع تو ہاتھ باندھے جائیں گے۔ یہ ہے ان کی دلیل کا خلاصہ ان کی اس دلیل کا جواب ہم نے تفصیل سے اپنی کتاب نیل الامانی میں عرض کیا ہے یہاں چند حروف عرض کیے جاتے ہیں۔ ایک تو وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث مجمل ہے مگر یہی وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث مسند احمد، صحیح مسلم اور طبرانی کی معجم کبیر اور دیگر کئی کتب حدیث میں مفصل مروی ہے۔ اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہاتھوں کا باندھنا پہلے قیام میں تھا یہاں راوی نے صرف اختصار سے کام لیتے ہوئے قائمًا کا لفظ کہا ہے۔ اس لیے متقدمین میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ وغیرہم کے نزدیک قیام کا لفظ اپنی اطلاقی صورتیں یعنی جس جگہ پر اس کے ساتھ کوئی قید نہیں آئی ہو پہلے قیام مشہور و معروف تھا، اس کے متعلق نیل الامانی میں چند دلائل پیش کیے ہیں دوسرے بھی چند قرائن پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس جگہ قائمًا سے مراد صرف پہلا قیام ہے نہ کہ مابعد

رکوع کا قیام اس مسئلہ کے متعلق تحقیق کے شائقین کو اپیل کی جاتی ہے، وہ ہماری کتاب ''نیل الامانی'' جو کہ مختصر ہے۔ اور ''تائید عالم الغیب'' جو کہ مفصل ہے کا مطالعہ کریں۔

جب '' سمع اللہ لمن حمدہ '' کہہ کر سیدھے ہوتے تب '' ربنا و لك الحمد'' کہتے جیسا کہ صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کبھی واو کے بغیر صرف '' ربنا لك الحمد'' کہتے۔ جیسا کہ ابوہریرہ سے صحیحین میں اس طرح روایت ہے کہ:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام الى الصلوٰة يكبر حين يقوم ثم يكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده حين يرفع صلبه من الركعة ثم يقول وهو قائم ربنا لك الحمد )) [الحديث]

مشکوۃ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے اور جب رکوع کرتے تو تکبیر کہتے اور پھر کہتے '' ربنا لك الحمد'' اور کبھی ''اللّٰهم ربنا لك الحمد'' کہتے تھے واؤ کے بغیر جیسا کہ صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے '' باب فضل اللهم ربنالك الحمد'' میں مروی ہے۔ اس طرح ابوداؤد میں ابوحمید والی حدیث میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں اور کبھی ''اللهم ربنا ولك الحمد'' بھی کہتے تھے۔ جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں '' باب مايقول الامام ومن خلفه اذا رفع رأسه من الركوع'' میں مروی ہے یہ روایت امام احمد کی مسند میں بھی ہے اور آپ نے صحابہ کو بھی امر فرمایا:

(( اذاقال الامام سمع الله لمن حمده فقولوا اللّٰهم ربنا ولك الحمد فانه من وافق قوله قول الملائكة غفرله ماتقدم من ذنبه ))

یعنی جب امام '' سمع اللہ لم حمدہ'' کہے تو تم ''اللهم ربنا ولك الحمد'' کہو پھر جس کا قول ملائکہ کے قول کے موافق ہو گیا تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کیے جائیں گے۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام ترمذی نے مسند احمد والی حدیث کو صحیح بھی کہا ہے اور کبھی ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہنے کے بعد :

(( اللهم ربنا لك الحمد مِلأ السمٰوٰت وملٔ الأرض ما شئت ومن شیء بعد ))

یہ روایت صحیح مسلم میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے یہی روایات صحیح بخاری میں رافع بن رفاعہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے، پھر جب اپنا سر مبارک رکوع سے اوپر اٹھایا اور '' سمع اللہ لمن حمدہ'' کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک صحابی نے کہا:

(( ربنا لك الحمد حمداً كثيراً طيباًمبار كاً فيه ))

اور جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تب فرمایا کہ یہ کلمات کہنے والا کون تھا پھر اس شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا وہ سب جلدی کررہے تھے کہ ان میں سے کون وہ کلمات پہلے لکھے۔ اس حدیث سے اعتدال میں ان کلمات کہنے کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ مقتدی بھی" سمع الله لمن حمده "اور "اللهم ربنا لك الحمد" دونوں کو جمع کرے۔ جیسا کہ امام کو بھی ان دونوں کے جمع کرنے کا حکم مسنون ہے لیکن ہماری تحقیق ہے یہ ہے کہ مقتدی کو صرف "اللهم ربنا لك الحمد يا ربنا ولك الحمد الخ" یعنی تحمید کے کلمات کہنے چاہییں کیونکہ اوپر حدیث ذکر کر آئے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب امام" سمع الله لمن حمده" کہے تو تم کہو " ربنا لك الحمد"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو صرف اس تحمید کے کلمات پر اکتفا کرنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

البتہ اگر کوئی منفرد ہے تو وہ دونوں کو اکٹھے پڑھ سکتا ہے ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے تو جب رکوع سے سر مبارک اوپر اٹھایا تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے "ربنا لك الحمد حمداً كثيراً طيباًمبار كاً فيه" پڑھا، نماز کے بعد آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ الفاظ کہنے والا کون ہے اس کہنے والے کے بتانے پر آپ ﷺ نے ان الفاظ کے کہنے کی فضیلت بیان فرمائی۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ رکوع سے اٹھنے کے بعد یہ الفاظ بلند آواز سے کہنے چاہییں نہ تو ان الفاظ کہنے کا صحابہ کا مستمر عمل تھا اگر صحابہ یہ الفاظ ہمیشہ بلند آواز سے کہتے رہتے تھے تو نبی اکرم ﷺ کو ان الفاظ کے پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اگر یہ عمل ہمیشہ سے چلتا آیا ہوتا تو ان کے متعلق پوچھنا کہ یہ الفاظ کس نے کہے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ہے اور نہ ہی اس واقعہ کے بعد آئندہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان الفاظ کو بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا تھا اگر ایسا ہوتا تو جس طرح آمین کے متعلق روایات میں آتا ہے (جس طرح اوپر گزر چکا) کہ لوگوں کے آمین کہنے کی وجہ سے مسجد میں شور برپا ہو جاتا تھا، اسی طرح اگر یہ الفاظ اس واقعہ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم بلند آواز سے کہنا شروع کر دیے تھے تو ضرور روایات میں اس طرح نقل کیا جاتا۔ لہٰذا آج کل کئی لوگوں کا یہ عمل ہے کہ وہ اکثر طور پر رکوع کے بعد والے قیام میں ہمیشہ بلند آواز سے کہتے رہتے ہیں۔ یہ درست طریقہ نہیں ہاں اگر کسی نے گاہے بگاہے یہ الفاظ زور سے کہہ دیے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ باقی یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ کے اجر وثواب کا ذکر فرمایا وہ ان کے بلند آواز سے کہنے کی وجہ سے یہ درست نہیں بلکہ یہ فضیلت ان کلمات ہی کی ہے نہ کہ ان الفاظ کے بلند آواز سے کہنے کی ورنہ یہ ثواب اور فضیلت اسی شخص کے متعلق بھی وارد ہے جس نے نماز میں چھینک ماری تھی اور پھر "الحمدللہ الخ" کہا۔ تو اس کے لیے بھی نبی کریم ﷺ نے فضیلت بیان فرمائی تھی (اور یہ حدیث اوپر ذکر ہو چکی ہے) پھر یا یہ حضرات فتویٰ صادر فرمائیں گے کہ جسے چھینک آئے تو وہ

زور شور سے یہ الفاظ کہے؟ علاوہ ازیں اوپر صحیح مسلم سے استفتاح یعنی نماز کی ابتدائی دعا بھی منقول ہوئی ہے کہ ایک شخص نے صف میں پہنچنے کے بعد "الحمد للہ الخ" کہا اس کے لیے بھی نماز کی فراغت کے بعد نبی ﷺ نے اس کے اجر وثواب کا ذکر فرمایا، پھر کیا اس سے بھی یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ اب جب بھی کوئی شخص باہر سے آئے تو استفتاح کے یہ الفاظ بلند آواز سے کہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ استفتاح کی دعا ہمیشہ بلند آواز سے کہنے کے قائل نہیں، حالانکہ ان دونوں صورتوں میں دو صحابہ کا فعل ان الفاظ کے جہراً پڑھنے والا ہے دونوں میں بھی یہ ثواب وفضیلت ان الفاظ کے جہراً سے وارد ہوئی ہے تو پھر جہراً پڑھنے والے اس دعا کو اور مذکورہ بالا دعا کو کیوں جہراً نہیں پڑھتے؟ اس طرح اوپر یہ حدیث گزر چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ سری نمازوں میں کبھی کبھی کوئی آیت جہراً پڑھتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنتے تھے کہ آپ ﷺ فلاں سورۂ پڑھ رہے ہیں اور اس سے کوئی بھی عقل مند شخص یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالے گا کہ ہمیں ہر سری نماز میں ہمیشہ ایک دو آیات جہراً پڑھنی چاہییں مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ گاہے بگاہے آپ ﷺ کا سری قراۃ والی نماز میں ایک دو آیات کا بلند آواز سے پڑھنا یہ صحابہ کرام کی تعلیم کے لیے تھا۔ تا کہ انہیں معلوم ہو کہ سری نمازوں میں بھی قراۃ ہے بہر حال ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ رکوع کے بعد رکن میں ان الفاظ کا کہنا ہی مسنون مستحب باعث اجر وثواب ضرور ہیں، لیکن یہ کلمات آہستہ کہنا مسنون ہیں۔ کبھی کسی نے اگر جہراً کہہ دیے تو اس کی نماز میں کوئی بھی حرج نہیں باقی اس عمل کو مستمر بنا دینا، اس کے لیے کوئی بھی مضبوط دلیل نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

**سجدہ:**

اس کے بعد نبی کریم ﷺ تکبیر کہہ کر سجدہ میں چلے جاتے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مفصل حدیث جو صحیحین میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے یہ روایت اس طرح مروی ہے:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام الىٰ الصلوٰة يكبر حين يقوم يكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده حين يرفع صلبه من الركعة ثم يقول حين يسجد وهو قائم ربنا لك الحمد ثم يكبر حين يهوى ثم يكبر حين يرفع راسه ثم يفصل ذالك فى الصلوٰة كلها حتىٰ يقضيها ويكبر حين يقوم من الاِثْنَتَيْنِ بعد الجلوس ))

"رسول اللہ ﷺ جب نماز کی طرف کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے، پھر جب رکوع کرتے تو تکبیر کہتے پھر "سمع اللہ لمن حمدہ" کہتے جب رکوع سے اپنا سر مبارک اوپر اٹھاتے اور کھڑے کھڑے "ربنا لک الحمد" پڑھتے ثم تکبیر کہتے جب سجدہ میں جاتے، پھر تکبیر کہتے اور جب سجدہ سے سر مبارک اوپر

اٹھاتے پھر نماز کے اختتام پر اسی طرح کرتے تھے۔"

اور جب دو رکعات کے بعد بیٹھ کر اٹھتے تو تکبیر کہتے۔ اور مسئی الصلوٰۃ کو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

(( لاتتم الصلوٰة لاحد من الناس حتىٰ يقول سمع الله لمن حمده حتىٰ يستوى قائماً ثم يقول الله اكبر ثم يسجد حتى تطمئن مفاصله ))

تم میں کسی شخص کی نماز اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ رکوع سے کھڑا ہو "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے اور سیدھا کھڑا ہو کر کہے اللہ اکبر پھر سجدہ کرے یہاں تک کہ اس کے جوڑ پر سکون ہو جائیں۔ یہ روایت ابوداود اور حاکم میں رفاعہ بن رافع سے مروی ہے حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔

## سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے جائیں:

نبی کریم ﷺ سجدے میں جاتے وقت پہلے اپنے ہاتھ مبارک زمین پر رکھتے اور پھر گھٹنے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ اور سنن کبریٰ بیہقی میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( انه كان يضع يديه قبل ركبتيه وقال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل كذالك ))

"ابن عمر رضی اللہ عنہ پہلے ہاتھ رکھتے تھے، پھر گھٹنے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔"

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح کہا ہے اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی موافقت کی ہے اور امام بخاری نے بھی اس کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔

مسند احمد، سنن ابی داود، ترمذی اور نسائی اور صحیح ابن خزیمہ اور دارمی میں صحیح سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ:

(( قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سجد احدكم فلا يبرك كما يبرك البعير ويضع يديه قبل ركبتيه ))

"آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے یعنی پہلے اونٹ اپنے گھٹنے رکھتا ہے جو کہ اس کے ہاتھوں یعنی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔"

یعنی اس طرح تم میں سے کوئی بھی گھٹنے مت رکھے اپنے ہاتھوں سے پہلے اس حدیث پر کچھ علماء نے اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث کی سند کے کسی راوی سے شاید غلطی ہوگئی ہے، اس لیے کہ اس حدیث کی ابتدا اس کے آخری الفاظ کے خلاف ہے کیونکہ اونٹ کی اگلی دونوں ٹانگیں اس کے ہاتھ ہیں اور معلوم ہے کہ اونٹ

بیٹھنے کے وقت پہلے ہاتھ یعنی پہلی ٹانگیں رکھتا ہے بعد میں پچھلی۔ پھر اگر پہلے ہاتھ رکھے پھر گھٹنے تو یہ بیٹھنا اونٹ کے بیٹھنے کی طرح ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ ان حضرات نے نہ تو لغت عرب کی کتب کا پوری طرح مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی اہل زبان کے محاورات پر غور کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانوں کے گھٹنے پاؤں میں ہوتے ہیں اور چوپائے جانوروں کے گھٹنے ان کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ یعنی ٹانگوں میں ہوتے ہیں ہماری اس بات پر لسان العرب وغیرہ لغت کی کتب شاہد ہیں کیونکہ ان میں یہ صراحت ہے کہ اونٹ کے گھٹنے ان کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب مشکل الآثار اور شرح معانی الآثار میں اس کے موافق لکھا ہے اس طرح صحیح بخاری کی ہجرت والی حدیث جس میں سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:

(( سَاخَتْ یدا فرسی فی الارض حتّٰی بلغتا الرکبتین ))

''میرے گھوڑے کے دونوں ہاتھ زمین میں گھس گئے یہاں تک کہ گھٹنوں تک جا پہنچے۔''

اس صحیح حدیث میں سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ جو کہ اہل زبان ہیں کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ چوپایہ جانوروں کے گھٹنے ہاتھوں میں ہوتے ہیں یعنی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح امام طحاوی اپنی شرح معانی الآثار جلد ا میں علقمہ اور اسود سے صحیح سند سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

(( حفظنا من عمر فی صلوٰته انه خر بعد رکوعه علی رکبتیه کما یخر البعیر وضع رکبتیه قبل یدیه ))

''ہم نے عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق یاد رکھا ہے کہ وہ رکوع کے بعد اپنے گھٹنوں پر اس طرح گرے جس طرح اونٹ گرتا ہے، یعنی اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے رکھے۔''

اس اثر میں عمر رضی اللہ عنہ کا جو فعل مذکور ہے وہ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل اور قول کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے معمول بہ نہیں لیکن اس پہ حقیقت معلوم ہوئی ہے کہ اونٹ کے گھٹنے ان کے ہاتھوں میں یعنی اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں اس لیے راوی نے نقل کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کی طرح سجدہ میں گرے یعنی اونٹ کی طرح مذکورہ آثار سے بخوبی معلوم ہو گیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی ابتدا حدیث کے آخری حصہ کے مخالف نہیں، یعنی جیسا کہ اونٹ اپنے گھٹنے یعنی ہاتھوں کی اگلی ٹانگوں میں ہیں بلکہ تم پہلے ہاتھ رکھا کریں بعد میں گھٹنے اب سوچا جائے کہ اس میں راوی کی کونسی غلطی ہے اور حدیث کی ابتدا اس کے آخری حصہ سے کونسی مخالفت ہے۔ دراصل ان حضرات نے اس سلسلے میں مکمل طور غور فکر سے کام نہیں لیا ورنہ حدیث کی ابتدا کی اس کی انتہا کی مخالفت والی بات نہ کرتے۔ واللہ اعلم بالصوب۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی اس سے موافق منقول ہے جیسا کہ امام ابن الجوزی کی کتاب التحقیق میں ہے کہ یہی اکثر اہل حدیث علماء کا مذہب ہے اور یہی

مسلک صحیح ہے کچھ علماء ابن ابی داؤد سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا سجد احد کم بر کبتیه و لا یبرك بروك الجمل ))

''جب تم سے کوئی سجدہ کرے تو اسے اپنے ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھنے چاہییں اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے۔''

لیکن یہ حدیث سخت ضعیف ہے اور اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن سعید بن ابی سعید المقبری ہے جو کہ سخت ضعیف اور متروک ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب تقریب التہذیب میں لکھا ہے، لہٰذا ضعیف روایت سے صحیح روایت کو ہرگز رد نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ایک روایت دار قطنی اور حاکم اور بیہقی وغیرہم نے انس رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کی ہے کہ:

(( رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم انحط بتکبیر فسبقت رکبتاه یدیه ))

''میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر لگے۔''

لیکن یہ روایت بھی سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں (علماء کا کہنا ہے کہ) علاء بن اسماعیل العطار مجہول ہے جیسا کہ امام بیہقی سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تلخیص الحبیر میں نقل کیا ہے، اسی طرح حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب زاد المعاد میں بھی اسے مجہول کہا ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب العلل میں اپنے والد ابو حاتم رازی سے نقل کیا ہے کہ ''هذا حدیث منکر'' یعنی یہ حدیث منکر ہے، لہٰذا یہ روایت بھی نا قابل حجت ہے ایک دوسری روایت بھی وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے ابو داود، نسائی، ترمذی، ابن حبان، دار قطنی، حاکم، بیہقی وغیرہم نے ان الفاظ سے نقل کی ہے:

(( رأیت النبی صلی الله علیه وسلم اذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه )) [الحدیث]

''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھے۔''

لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں شریک بن عبداللہ قاضی ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کتاب تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ: '' صدوق یخطئی کثیراً تغیر حفظه منذ ولی القضاء بالکوفه'' ''یہ صدوق ہے، لیکن بہت غلطیاں کرتا ہے جب اسے کوفہ کا قاضی مقرر کیا گیا تو اس کا حافظہ بگڑ گیا۔''

اصول حدیث کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ جو راوی غلطیاں اور خطائیں زیادہ کرتے ہیں اور ان کا حافظہ خراب ہو تو ان کا تفرد یعنی اس کا کسی روایت کو اکیلا بیان کرنا ہے، یعنی جس کا اور کوئی متابع نہ ہو اس کی

روایت ہرگز مقبول نہیں۔ چہ جائیکہ ایسی روایت جس میں وہ دیگر ثقہ راویوں کی مخالفت کرے اس صورت میں اس کی روایت ہرگز مقبول نہیں کی جائے گی۔ اس جگہ پر یہی معاملہ ہے ثقہ راویوں کی ایک جماعت جیسا کہ زائد اور سفیان عیینہ، شجاع بن ولید نے نقل کیا ہے ان کی روایات ابوداؤد، نسائی، احمد میں موجود ہیں مگر ان روایات میں سجدہ کی یہ کیفیت بالکل مذکور نہیں بلکہ اس کیفیت کے نقل کرنے میں عاصم بن کلیب سے شریک قاضی ہی منفرد ہے، لہٰذا جب شریک قاضی حافظہ کا کمزور اور بہت غلطیاں کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چند ثقہ راویوں کی مخالفت بھی کی ہے، لہٰذا اس کا تفرد منکرات میں شمار ہوگا، لہٰذا ایسی منکر روایت کو صحیح احادیث یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی فعلی اور قولی احادیث کے مقابلہ میں پیش کرنا قطعاً نامناسب اور ناجائز ہے۔

**خلاصہ کلام:**

کہ سجدہ میں جانے کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل اور قول میں سے صحیح طور پر معلوم ہوا کہ گھٹنوں سے پہلے ہاتھ رکھنے چاہییں۔ اس کے برخلاف جن روایت میں گھٹنے پہلے رکھنے کا ذکر ہے وہ سب روایات ضعیف اور منکر ہیں ایسی ضعیف روایات کو صحیح احادیث کے مقابلہ میں پیش کرنا نامناسب ہے۔

❀❀❀❀

# سجدہ کی کیفیت اور اس کے مسائل

سجدہ کی کیفیت صحیحین میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

(( امرت ان اسجد علی سبعة اعظم علی الجبهة والیدین و الرکبتین واطراف القدمین وَلَا نَکُفِتَ الثیاب والشعر ))

''مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں یعنی جن سات اعضاء کو زمین پر رکھنا وہ یہ ہیں پیشانی، دو ہاتھ اور دو گھٹنے اور دونوں پاؤں کے اطراف۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں کپڑوں اور بالوں کو باندھا نہیں۔''

اور صحیح بخاری کی اسی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:((امرت ان اسجد علی سبعة اعظم علی الجبهة واشاره بیده الی انفه)) ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں۔ پیشانی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناک کی طرف بھی اشارہ کیا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناک اور پیشانی ایک عضو شمار کیا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے پیشانی زمین پر رکھی لیکن ناک نہ رکھا تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ یہی روایت صحیح مسلم میں اس سے بھی زیادہ اصرح ہے فرماتے ہیں کہ:

(( امرت ان اسجد علی سبعة واکف الشعر ولاثیاب الجبهة والانف۔ والیدین والرکبتین والقدمین ))

''مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر پیشانی اور ناک دو ہاتھوں دو گھٹنے اور دو پاؤں پر۔''

دارقطنی طبرانی اور سنن کبریٰ بیہقی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے جب سجدہ کیا تو اس کی ناک زمین پر نہ لگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( لاصلوٰة لمن لایمس انفه الارض مایمس الجبین ))

''جس شخص کا ناک اس جگہ پر نہ لگا جس جگہ اس کی پیشانی لگی ہے تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔''

اس حدیث کے متعلق بعض محدثین کا کہنا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے لیکن اس کے موافق خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے، لہٰذا ان کا قول اور مذکورہ حدیث صحیحین میں مذکورہ بالا روایات سے مل کر تقویت حاصل کر جاتا ہے۔ صحیحین میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اعتدلوا فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیه انبساط الکلب ))

''سجدہ میں اعتدال اور اطمینان کریں اور اپنی بازوؤں کو کتے کی طرح مت بچھائیں۔''

صحیح مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذاسجدت فاضع کفیك و رافع مرفقیك ))

''جب سجدہ کرو تو اپنی ہتھیلیاں زمین پر بچھا دو اور کہنیوں کو اوپر رکھو۔''

اور ابوداؤد میں میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( کان النبی صلی اللہ علیه وسلم اذا سجد جافی بین یدیه حتی لو ان بهمة اَرَادَتْ ان تمر تحت یدیه مَرَّتْ ))

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ فرماتے تو ہاتھوں کے درمیان اتنا فاصلہ رکھتے کہ اگر بکری کا بچہ ہاتھوں کے نیچے سے گزرنا چاہتا تو گزر جاتا۔''

صحیح مسلم میں اس معنیٰ کے موافق روایت مروی ہے اور صحیحین میں عبداللہ بن مالک بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( کان النبی صلی اللہ علیه وسلم اذاسجد فرج یدیه حتی یبدو بیاض ابطیه ))

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ فرماتے تو ہاتھوں کو اتنا کشادہ رکھتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔''

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ملا کر رکھتے جیسا کہ یہ حدیث ابن حذیفہ، ابن حبان، بیہقی، حاکم میں وائل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور یہ حدیث رکوع کی بحث میں گزر چکا ہے اور اپنی انگلیوں کا رخ قبلہ کی جانب کر دیتے تھے۔ جیسا کہ بیہقی وغیرہ میں حسن سند سے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور شاہد سنن کبریٰ بیہقی میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا فعل مروی ہے اور اپنے ہاتھوں کو کبھی کندھوں کے برابر رکھتے تھے۔ جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی میں ابوحمید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی روایت کو صحیح فرمایا ہے اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کانوں کے برابر رکھتے تھے، یعنی اپنے منہ مبارک کے سامنے ہاتھوں کے درمیان میں رکھتے تھے جیسا کہ ابوداؤد، نسائی میں وائل رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے مروی ہے۔ ابوداؤد میں ابوحمید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اپنے پاؤں کی ایڑیوں کو ملا لیتے تھے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند سے مروی ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

(( فقدت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وکان معی علیٰ فراشی فوجدته ساجداً رصاً عقبیه مستقبلاً باطراف اصابعه القبلة )) [الحدیث]

''ایک دن میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گم پایا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھ بستر پر تھے، پھر جب میں نے ان کو پایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے اور آپ کی ایڑیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں کی انگلیوں کے اطراف کو قبلہ کی طرف متوجہ کیے ہوئے تھے۔''

# سجدہ میں ہاتھوں کو قبلہ کی طرف متوجہ کرنا

اس بارے میں ایک حدیث پہلے ذکر کر آئے ہیں مصنف ابن ابی شیبہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذاسجد وضع یدیہ وجاہ القبلۃ ))

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کا رخ قبلہ کی جانب کرتے تھے۔''

اس کی سند ضعیف ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک اثر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مذکور ہے، اس کی سند صحیح ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( انہ کان یقول اذا سجد احدکم فلیستقبل القبلۃ یدیہ فانھما یسجدان مع الوجہ))

''بے شک عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھوں کو قبلہ کی جانب کرے۔''

کیونکہ وہ دونوں ہاتھ چہرے کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔ یہ اثر بظاہر اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کو دخل نہیں ہوسکتا۔ امام ابن ابی شیبہ نے دیگر کئی آثار ذکر کیے ہیں بہرحال سجدہ میں ہاتھوں کی انگلیوں سمیت قبلہ کے سامنے رکھنا ہوگا۔ باقی کچھ لوگ سجدہ میں ہاتھوں کو موڑ کر جنوب وشمال کی طرف کردیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اس طرح سجدہ کامل نہیں ہوتا اور سجدے میں پاؤں کی انگلیوں کو کچھ موڑنا چاہیے جیسا کہ ابوحمید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو امام ترمذی اپنی جامع میں لائے ہیں جس کے متعلق امام موصوف فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( ثم ھویٰ الی الارض ساجداً ثم قال اللہ اکبر ثم جافیٰ عضدیہ عن ابطیہ وفتح اصابع رجلیہ )) [الحدیث]

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے سجدہ کی طرف گئے اور اللہ اکبر کہا اور اپنے بازوؤں کو بغلوں سے دور رکھا اور اپنے پاؤں کی انگلیوں کو موڑ دیا۔''

ابومسعود عقبہ بن عمر رضی اللہ عنہ الانصاری بدری نے اسے حسن صحیح کہا اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لاتجزی صلوٰۃ الرجل حتیٰ یقیم ظھرہ فی الرکوع والسجود ))

''اس شخص کی نماز کافی نہیں ہوتی جو اپنی پیٹھ کو رکوع اور سجدہ میں سیدھا نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے سیدھا کر لے۔''

یہ حدیث رکوع کے بیان میں گزر چکی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کی مسند میں صحیح سند سے سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لاینظر اللہ عزوجل الی صلوٰۃ عبد لایقیم فیھا صلبه بین رکوعھا وسجودھا ))

''اللہ عزوجل ایسے شخص کی نماز کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنی پیٹھ رکوع اور سجدہ میں سیدھی نہیں رکھتا۔''

اور سجدہ میں اطمینان واعتدال بھی ضروری ہے اگر سجدہ میں اطمینان واعتدال نہیں تو اس کی نماز نہیں ہو گی۔ مسئ الصلوٰۃ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں:

(( ثم اسجد حتٰی تطمئن ساجداً )) ''پھر آپ سجدہ کریں یہاں تک کہ اطمینان کر لیں۔''

اور یہی روایت جو نسائی اور ابوداؤد میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( ثم یکبر فیسجد حتٰی یمکن وجھه او جبھته حتٰی تطمئن مفاصله وتَسْتَرْخِیُ ))

''پھر تکبیر کہے اور پھر سجدہ کرے یہاں تک کہ اپنے چہرے یا پیشانی کو اچھے طریقہ سے زمین پر ٹکا لے یہاں تک کہ اعضاء وجوڑ اطمینان حاصل کر لیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سجدہ میں جانے کے لیے تکبیر کہنا اور اطمینان لینا بھی ضروری ہے۔

# سجدہ کی دعائیں

**نمبر۱:**

صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے:

(( اللهم اغفرلی ذنبی کله دقه وجله و اوله وآخره وعلانية وسرهٗ ))

''اے اللہ! میرے چھوٹے بڑے اگلے پچھلے ظاہری اور چھپے گناہ معاف فرما۔''

**نمبر۲:**

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ میں یہ الفاظ کہے:

(( اللهم انی اعوذ برضاك من سخطك وبمُعَافَاتِكَ من عقوبتك واعوذبك لا احصی ثناء علیك انت كما اثنيت علىٰ نفسك ))

''اے اللہ! میں تیری رضا مندی سے تیری ناراضگی کی پناہ طلب کرتا ہوں اور تیرے معافی سے تیری سزا سے پناہ طلب کرتا ہوں اور تیری ثنا میں پوری طرح نہیں کرسکتا تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی ثنا بیان کی ہے۔[ صحیح مسلم]

**نمبر۳:**

عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجدہ میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

(( سبحان ذی الجبروت والملكوت و الكبرياء والعظمة ))

''یعنی پاکائی تقدیس ہے زبردست جبر یا قہر اور بڑی بادشاہی اور ملکیت کے صاحب کسی بڑائی اور عظمت کی۔'' [نسائی]

**نمبر۴:**

ابوداؤد اور ترمذی میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' پڑھا کرتے تھے۔ اس کی کم از کم تعداد تین بار ہے جس طرح صحیح روایات میں مروی ہے۔

**نمبر۵:**

صحیح بخاری ومسلم میں ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع وسجدہ میں یہ تسبیح پڑھتے تھے:

(( سبحانك اللهم ربنا وبحمدك اللهم اغفرلی ))

"اے اللہ! میں تیری پاکائی بیان کرتا ہوں اے ہمارے رب! تیری ثناء کے ساتھ اے اللہ! مجھے معاف فرما۔"

**نمبر۶:**

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجدہ میں یہ تسبیح پڑھتے تھے:

(( سبوح قدوس رب الملائكة والروح ))

"(اے اللہ! تو ذات وصفات کے لحاظ سے) پاک ہے اور تو ہی تمام فرشتوں اور روح کا رب ہے۔"

❁❁❁❁

# سجدے سے اٹھنا

اس کے بعد آپ ﷺ رکوع سے سر مبارک اوپر اٹھاتے تو تکبیر کہتے یہ حدیث مبارکہ مکمل سجدہ کے بیان میں گذر چکی ہے۔اسی طرح ابو داؤد وغیرہ سیدنا ابوحمید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

(( ثم يقول الله اكبر ويرفع رأسه ويثنى رجله اليسرىٰ ويقعد عليها حتّٰى يرجع كل عظم الى موضعه ))

"پھر اللہ اکبر کہتے اور اپنا سر مبارک اوپر اٹھاتے تھے اور اپنے بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ پر آجاتی۔"

اور مسئی الصلوٰۃ کو آپ ﷺ نے تکبیر کا حکم فرمایا تھا جیسا کہ ابو داؤد اور حاکم میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے بھی روایت مروی ہے۔امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔اس کے الفاظ اس طرح ہیں" ثم يقول الله اكبر ويرفع رأسه حتّٰى يستوى قاعداً "یعنی پھر تکبیر کہہ کر سیدھا بیٹھ جاتے اور ان دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی ہیئت یہ ہے کہ بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جائے اور سیدھے پاؤں کو کھڑا رکھے جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث گزری جو کہ زیادہ اصرح ہے اور وہ ابن حبان میں ان الفاظ سے مروی ہے:

(( كان اذا جلس بين السجدتين افترش رجله اليسرىٰ واقبل بصدر اليمنىٰ على قبلته ))

"جب آپ ﷺ دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو الٹے پاؤں کو بچھا دیتے اور سیدھے پاؤں کے اوپر والے حصہ کو نصب کر کے قبلہ کے سامنے کرتے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ آخری تشہد میں بیٹھنے کے علاوہ دیگر تمام جلسات میں نماز کے بیٹھنے کی ہیئت یہی ہے جو ابھی بیان ہوئی اسی طرح صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( إنما سنة الصلوٰة ان تنصب رجلك اليمنىٰ وتثنى اليسرىٰ ))

"نماز میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا رکھے اور بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جائے۔"

مطلب کہ دیگر جلسات کی ہیئت آخری تشہد کے قعدہ کی ہیئت سے الگ ہے۔آخری قعدہ کی ہیئت آگے ذکر کی جائے گی۔ان شاء اللہ

اور نماز کے تمام جلسات میں دونوں ہاتھوں کی کیفیت اس طرح ہوگی۔اور صحیح مسلم اور ابن حبان میں

سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

(( كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قعد يدعوا وضع يده اليمنىٰ علىٰ فخذه اليمنىٰ ويده اليسرىٰ على فخذه اليسرىٰ واشاره باصبعه السبابة ووضع ابهامهٗ علىٰ اصبعه الوسطىٰ ويلقم كفه اليسرىٰ ركبته ))

"سیدنا رسول اکرم ﷺ جب بیٹھتے تو دعا کرتے تھے اور رکھتے تھے اپنا سیدھا ہاتھ اپنی دائیں ران پر اور اپنا بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اپنا انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھتے تھے اور اپنی بائیں ہتھیلی کو اپنے بائیں گھٹنے کا لقمہ دیتے تھے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے ہر اس جلسہ میں جس میں دعا پڑھی جاتی ہے، مثلاً دو سجدوں کے درمیان میں اور پچھلے اور پہلے تشہد کے بیٹھنے میں دعا نہیں ہے۔ جس طرح جلسہ استراحت تو اس میں انگلی کے اشارہ کی ضرورت نہیں دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی صریح حدیث حسن سند سے امام احمد رحمہ اللہ کی مسند میں موجود ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

(( ثم جلس فافترش رجلهٗ اليسرىٰ ثم وضع يدهٗ اليسرىٰ علىٰ ركبته اليسرىٰ ووضع ذراعيه اليمنىٰ علىٰ فخذه اليمنىٰ ثم اشار بسبابة ووضع الابهام على الوسطى وقبض سائر اصابعه ثم سجد )) [الحديث]

"پھر آپ ﷺ پہلے سجدے سے اٹھ کر بیٹھتے پھر اپنے بایاں پاؤں بچھایا، پھر بایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا اور دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھا، پھر شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا اور انگوٹھا درمیانی انگلی پر رکھا اور سب انگلیوں کو بند کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا سجدہ کیا اور دائیں بازو کی کہنی کا انتہائی حصہ دائیں ران پر رکھتے تھے جس طرح وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس طرح مروی ہے کہ: (( وضع حد مرفقه علىٰ فخذه اليمنىٰ وعقد ثلاثين وَحلق حَلْقَةً واشاره باصبعيه السبابة )) یعنی اپنے بیٹھنے کے وقت اپنی کہنی کے انتہائی حصہ کو اپنی سیدھی ران پر رکھا اور تیس کا عقد کیا اور ایک حلقہ باندھا اور اشارہ کیا شہادت کی انگلی سے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیٹھنے کی حالت میں دائیں ہاتھ کی کہنی سیدھی ران پر رکھنی چاہیے، مگر بعض علماء جو یہ لکھتے ہیں کہ بیٹھنے کی حالت میں دائیں کہنی کو دائیں ران سے اوپر روکنا چاہیے، اپنے اس موقف پر یہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جو ابو داؤد میں ان الفاظ سے مروی ہے:

(( ووضع يده اليسرىٰ علىٰ فخذه اليسرىٰ وحد مرفقيه الايمن علىٰ فخذه اليمنى))

"اپنی دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھا اور (حد) کو فعل ماضی بنا کر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی

سیدھی کہنی کو سیدھی ران سے روکا۔"

الجواب اولاً: یہ بات ہے کہ اس جگہ پر بلا وجہ "علی" کو بمعنیٰ "من" یا "عن" کے کرتے ہیں، اس کے علاوہ اس حدیث کے اسی طریقے کو اختیار کیا گیا ہے اور اس کے چند دیگر طرق کو نظر انداز کیا گیا ہے وائل رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کو ان سے کلیب بن شہاب روایت کرتا ہے اور کلیب سے اس کا لڑکا عاصم روایت بیان کرتا ہے اور عاصم سے روایت کرنے والے بہت ہیں اور داؤد کی اس حدیث میں عاصم بن کلیب سے بشر بن المفضل روایت کرتے ہیں اور دوسری طرف مسند احمد اور طبرانی کی معجم الکبیر میں پانچ یا چھ ثقہ راوی ہیں جو عاصم بن کلیب سے اس روایت کے خلاف نقل کرتے ہیں اس اعتبار سے ابو داؤد کی یہ روایت شاذ ہوئی۔ قارئین کرام اس کی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ اصول حدیث کے مطابق شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جو ایک راوی ضعیف نہ ہو بلکہ ثقہ ہو وہ کوئی ایسی روایت بیان کرے جو اس سے زیادہ ثقہ یا احفظ یا اکثر راویوں کی روایت کے خلاف ہو۔ تو اس ثقہ کی روایت جو اوثق یا احفظ یا زیادہ ثقہ راویوں کی روایت کو محدثین کی اصطلاح میں محفوظ کہتے ہیں۔ اور شاذ ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اس حقیقت کی روشنی میں آئے ہم اس حدیث کی متعدد طرق پر تحقیق کریں۔

معجم الکبیر طبرانی میں عاصم بن کلیب سے ایک راوی ابو الاحوص یعنی سلام بن سلیم الحنفی (جس کے متعلق تقریب التہذیب میں ہے ثقة متقن، صاحب حدیث یعنی ابو الاحوص ثقہ بھی ہے اور مضبوط حافظہ والا ہے) اس نے جو روایت بیان کی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( فوضع كفه اليسرى على فخذه اليسرىٰ ووضع مرفقه الايمن علىٰ فخذه اليمنىٰ)) [الحديث]

"پھر آپ ﷺ نے الٹی ہتھیلی کو ران پر اور دائیں کہنی کو اپنی دائیں ران پر رکھا۔"

طریق آخر:

معجم الکبیر طبرانی ہی میں عاصم بن کلیب سے مشہور حافظ حدیث امام فن سفیان بن سعید الثوری جس کے متعلق تقریب التہذیب میں ہے ثقه، حافظ، فقيه عابد، امام حجة۔ اس کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

(( وضع يده اليسرىٰ علىٰ رُكْبَتِهِ اليسرىٰ وضع ذراعه اليمنىٰ علىٰ فخذه اليمنىٰ ))

"پھر آپ ﷺ نے اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھا اور اپنا دائیاں بازو دائیں ران پر اور اہل علم جانتے ہیں کہ کہنی بازو میں شامل ہے۔"

طریق آخر:

طبرانی کبیر ہی میں عاصم بن کلیب سے ایک راوی زائدہ بن قدامہ" اس کے متعلق تقریب التہذیب میں

ہے کہ " ثقة ثبت، صاحب سنة" یعنی ثقہ اور حافظہ تھا مضبوط صاحب سنت ہے۔ روایت بیان کرتا ہے اور اس کو روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

(( و وضع كفه اليسرىٰ وجعل حد مرفقه الايمن علىٰ فخذه اليمنىٰ ))

" پھر آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ کی کہنی کو دائیں ران پر اور بائیں ہتھیلی بائیں ران پر رکھا۔ یہ حدیث بھی اپنے مطلب میں بالکل واضح ہے۔"

## طریق نمبر ۴:

عاصم بن کلیب سے یہی مروی ہے طبرانی کبیر میں زہیر بن معاویہ بیان کرتے ہیں (اور اس کے متعلق تقریب میں ہے کہ ثقة ثبت یعنی ثقہ اور پختہ راوی ہے) اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( و وضع كفه اليسرىٰ علىٰ ركبته اليسرىٰ ثم وضع حد مرفقه الايمن علىٰ فخذه اليمنىٰ)) [الحديث]

" پھر آپ ﷺ نے اپنے بائیں ہتھیلی بائیں ران پر اور دائیں کہنی اپنی دائیں ران پر رکھی۔"

## طریق نمبر ۵:

طبرانی کبیر میں عاصم بن کلیب سے روایت کو قیس بن الربیع بیان کرتا ہے۔ (جو اگرچہ حافظہ میں کمزور تھا لیکن پھر بھی صدوق تھا جیسا کہ تقریب میں ہے) شواہد اور متابعت میں اس کی روایت مقبول ہوسکتی ہے اوپر چار نہایت پختہ راویوں کی روایات مذکورہ ہیں ان کی تائید میں اس روایت کو پیش کیا جاسکتا ہے اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( و وضع مرفقه اليمنىٰ علىٰ فخذه اليمنىٰ ))

" آپ ﷺ نے اپنی دائیں کہنی کو دائیں ران پر رکھا۔"

## طریقہ نمبر ۶:

مسند احمد میں یہ روایت عاصم بن کلیب سے عبد الواحد بن زیادہ بیان کرتا ہے (جس کے متعلق تقریب میں ہے ثقة یعنی ثقہ ہے) اس کے الفاظ ہیں :

(( فلما قعد افترش رجله اليسرىٰ و وضع يده اليسرىٰ علىٰ ركبتيه اليسرىٰ و وضع حذ مرفقه علىٰ فخذه اليمنىٰ )) [الحديث]

" اور جب آپ ﷺ بیٹھے تو بائیں پاؤں کو بچھایا اور اپنا بایاں ہاتھ گھٹنے پر رکھا اور اپنی کہنی کا انتہائی حصہ سیدھی ران پر۔"

یہ روایت بھی مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس طرح امام احمد کی مسند میں عاصم بن کلیب سے سفیان ثوری

بھی راوی ہے اور اس کے الفاظ وہی ہیں جو طبرانی کبیر کے پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یعنی "ووضع ذراعه الیمنیٰ علیٰ فخذه الیمنیٰ" آپ ﷺ نے دایاں بازو دائیں ران پر رکھا۔ زہیر بن معاویہ کی عاصم بن کلیب سے روایت پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ مسند احمد میں بھی اس کے اسی طرح ہیں یعنی "ثم وضع حد مرفقه الایمن علیٰ فخذ الیمنیٰ" یعنی پھر آپ ﷺ نے دائیں کہنی کا انتہائی حصہ دائیں ران پر رکھا۔ زہیر بن معاویہ کی عاصم بن کلیب سے روایت پہلے ذکر کر آئے ہیں مسند احمد میں بھی اس کے اسی طرح ہیں:

(( ثم وضع حد مرفقه الایمن علیٰ فخذ الیمنیٰ ))

"پھر آپ ﷺ نے دائیں کہنی کا انتہائی حصہ دائیں ران پر رکھا۔"

ابتدا میں اصول حدیث کے ذکر شدہ قانون کے مطابق ابوداؤد کی روایت جو بشر بن مفضل کے طریق مروی ہے وہ شاذ معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بشر بن مفضل اگرچہ ثقہ ہے لیکن اس کی روایت پانچ ثقہ راویوں اور ایک صدوق سئی الحفظ کی روایت کے خلاف ہے اور ان کو آپس میں کسی طور پر بھی جمع نہیں کیا جاسکتا، اس لیے مسلمہ اصول کے مطابق ابوداؤد کی مذکورہ روایت شاذ ٹھہری اور یہ روایات محفوظ۔ بعض علماء نے ابوداؤد کی اس روایت کو ان احادیث کے موافق بنانے کے لیے اس طرح توجیہ پیش کی ہے کہ (حد) مضاف ہے مرفق کی طرف، پھر یہ مضاف مضاف الیہ مل کر مبتدا علیٰ فخذه الیمنیٰ یہ ہوئی اس کی خبر۔ اس اعتبار سے معنی اس طرح ہوگا کہ حال یہ ہے کہ آپ ﷺ کی دائیں کہنی دائیں ران پر مستقل رکھی تھی۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ حد پر مفعولیت کی بنا پر زبر ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف یده الیسریٰ پر ہے اور یہ مفعول ہے وضع کا جو کہ اس سے پہلے والے جملہ میں واقع ہے۔ معنی اس طرح ہوگا کہ آپ ﷺ نے اپنا بایاں ہاتھ رکھا بائیں ران پر اور اپنی دائیں کہنی کا انتہائی حصہ سیدھی ران پر۔ یہ توجیہ عون المعبود شرح ابی داؤد میں منقول ہے۔ اس توجیہ سے ان تمام روایات میں کوئی بھی تخالف باقی نہیں رہتا لیکن ہم نے ابتدا میں شاذ اور محفوظ کی بحث اس لیے چھیڑی ہے کہ بعض حضرات (حد) کو ماضی بنانے پر مصر ہیں، اس لحاظ سے لامحالہ اس روایت کا دوسری روایات سے مخالف لازم آئے گا، پھر اصول حدیث کے مطابق ابوداؤد والی روایت شاذ بن جائے گی اور دیگر روایات محفوظ و راجع ہوں گی۔ واللہ اعلم بالصواب [معجم الکبیر طبرانی ج ۲۲ ص ۳٤ ]

اور صحیح ابن حبان میں ہے سیدنا نمیر خزاعی رضی اللہ عنہ سے حسن سند سے روایت مروی ہے اور ابوداؤد میں بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز میں دیکھا کہ:

(( واضعاً الیمنیٰ علیٰ فخذه الیمنیٰ رافعا اصبعه السبابة قد حنکها شیئاً وهو یدعو )) "آپ ﷺ سیدھے ہاتھ کو سیدھی ران پر رکھ کر بیٹھے تھے اور انگشت شہادت کو اوپر کر کے کچھ نیچے جھکا دیا تھا اور آپ ﷺ یہ دعا پڑھ رہے تھے۔ اور اشارہ کے لیے ضروری ہے کہ آپ ﷺ کا انگشت شہادت

منہ قبلہ رو ہونا چاہیے جیسا کہ صحیح ابن حبان میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( انه رأى رجلاً يحرك الحصا بيده وهو فى الصلوٰة فلما انصرف قال له عبدالله لاتحرك الحصا وانت فى الصلوٰة فان ذالك من الشيطان ولكن اصنع كما كان رسول صلى الله عليه وسلم يصنع قال وضع يده اليمنىٰ علىٰ فخذه واشار باصبعه التى تَلِيهَا الابهام الى القبلة ورمى ببصره اليها أو نحوها ثم قال هكذا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصنع ))

''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں کنکریوں سے کھیل رہا تھا، پھر جب وہ فارغ ہوا تو اسے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب آپ نماز کی حالت میں ہوں تو کنکریوں کو نہ چھوا کر، کیونکہ یہ کام شیطان کا ہے۔ آپ اسی طرح کریں جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ راوی نے کہا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ ران پر رکھا اور اپنی اس انگلی سے جو انگوٹھے کے قریب ہے یعنی انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ کیا قبلہ کی طرف اور اپنی نظر اس کی طرف ٹکا کر رکھی، پھر کہا کہ میں نے اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

اس حدیث سے بھی زیادہ صریح حدیث سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرماتے ہیں کہ ''لايجاوز وصله اشارته'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس انگشت سے باہر نظر نہیں کرتے تھے بلکہ اشارہ سے ہی ملاتے تھے اور سنن ابی داؤد کی روایت بیان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جس شخص کو نماز میں کنکریوں کو حرکت دینے سے روکا وہ خود ہی وہ آدمی ہے جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کر رہا ہے، یعنی تابعین علی بن عبدالرحمٰن المعاوی۔ صحیح مسلم میں ایک راوی ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت بیان کرتا ہے:

(( اذا قعد فى التشهد وضع يده اليسرىٰ علىٰ ركبته اليسرىٰ ووضع يده اليمنىٰ علىٰ ركبته اليمنىٰ وعقد ثلاثة وخمسين واشار بسبابة ))

''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ گھٹنے پر اور سیدھا ہاتھ سیدھے گھٹنے پر رکھتے تھے اور اپنے دائیں ہاتھ کو ترپن (۵۳) کا عقد بناتے تھے۔''

اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔ ترپن کا عقد اس طرح ہے کہ انگشت شہادت کے قریب والی تینوں انگلیوں کو بند کر دیا جائے اور انگشت شہادت کو کھول کر رکھتے اور انگوٹھے کو انگشت شہادت کی جڑ سے ملا لیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے صحیح مسلم میں ایک دوسری روایت اس طرح مروی ہے کہ:

(( كان جلس فى الصلوٰة وضع يده علىٰ ركبته ورفع اصبعه اليمنىٰ التى تلى

الابهام يدعو بها ويده اليسرىٰ علىٰ ركبته باسطها عليها ))

"جب بھی آپ ﷺ نماز میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھتے تھے۔ اور دائیں ہاتھ کی انگلی جو انگوٹھے کے قریب ہے اسے اوپر کھڑا رکھتے اور اس سے اشارہ کرتے اور دعا پڑھتے رہتے اور آپ ﷺ کا دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر بچھا ہوا ہوتا تھا۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز کی ہر بیٹھنے کی حالت میں آپ ﷺ کے بیٹھنے کا طریقہ یہی ہوتا تھا، اس جلوس سے خارج صرف وہ بیٹھنا ہے جو آخری رکعت میں سلام کے لیے بیٹھنا ہے۔ جس کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص نماز بیٹھ کر پڑھے تو اس کے بیٹھنے کی ہیئت اور کیفیت ہاتھوں کے علاوہ اسی طرح ہونی چاہیے جو اس حدیث میں بیان ہوئی البتہ قرأت والے ارکان میں ہاتھوں کو باندھا جائے گا۔ اور رکوع سے اٹھنے کے بعد چھوڑا جائے گا ان تمام جلسات میں اشارہ کے متعلق مروی ہے۔ تمام احادیث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اشارہ بیٹھنے کی ابتدا سے لے کر آخر تک مستمر تھا۔ باقی جو علماء احناف کہتے ہیں کہ "اشهد ان لا اله" کے کہنے کے وقت انگلی کو اوپر اٹھاتے پھر "لا الله" کہنے پر نیچے کر دے اس کے لیے کوئی بھی دلیل نہیں۔ علامہ البانی مشکوٰۃ کی تعلیق میں ان احادیث کے ماتحت لکھتے ہیں اس نمونہ پر سنت کی کتب میں سے کوئی بھی دلیل نہیں ہے نہ کسی صحیح سند سے اور نہ ہی ضعیف سند سے بلکہ نہ ہی موضوع سند سے بلکہ ان تمام احادیث کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے بیٹھنے میں یہ اشارہ ابتدا سے لے کر آخر تک مستمر رہا۔ سنن ابی داؤد میں حسن مسند ہے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

"ان النبی صلى الله عليه وسلم كان يشير باصبعه اذا دعا ولا يحركها"

"نبی کریم ﷺ جب دعا پڑھتے تو اپنی انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے۔"

اس حدیث کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام بن حبان نے اپنی کتاب الثقات ج ۷ ص ۴۴۸ میں صحیح سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے نقل کی ہے:

(( انه كان يضع يده اليمنىٰ علىٰ ركبته اليمنىٰ ويده اليسرىٰ علىٰ ركبته اليسرىٰ و يشير باصبعه ولا يحركها ويقول كانها مذبة الشيطان ويقول كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعله ))

"سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (نماز میں بیٹھنے کی حالت) اپنا دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر اور بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور انگلی سے اشارہ کرتے تھے اور اسے حرکت نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ شیطان کو دفع کرنے والی ہے اور کہتے تھے کہ رسول اکرم ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔"

اس کے علاوہ اکثر روایات میں انگشت شہادت سے صرف اشارہ کرنے کا ذکر ہے، اسے حرکت دینے کا

ذکر نہیں کسی ایک روایت میں حرکت دینے کا ذکر آتا ہے لیکن وہ روایت شاذ ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ بیٹھنے کے وقت ابتدا سے لے کر آخر تک انگلی سے اشارہ کرتا رہے باقی نہ اسے حرکت دے اور نہ ہی اوپر نیچے کرے۔ واللہ اعلم۔

انگلی سے اشارہ کرنے کے احادیث میں کئی طریقے ہیں۔

① ابوداؤد وغیرہ میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( وقبض ثِنْتَيْنِ وحلق حلقة ورأيته يقول هكذا وحلق بِشْرُ الْإِبْهَامِ والوسطىٰ واشار بالسبابة ))

'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں (درمیانی انگلی کے برابر والی) بند کر دیں اور دو انگلیوں کا حلقہ بنایا اور اس حلقہ کی تفسیر راوی بشر بن مفضل نے اس طرح بیان کیا ہے کہ انگوٹھے اور درمیانی انگشت سے حلقہ بناتے تھے اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔''

اور اوپر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی روایت میں گزر چکا کہ انگوٹھا درمیانی انگلی کے اوپر ہوتا ہے۔

② دوسری ہیئت یہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی سے ترپین (۵۳) کا عقد بناتے تھے۔ یہ حدیث بھی گزر چکی ہے۔

③ تیسری ہیئت یہ ہے جو سنن ابی داؤد میں صحیح سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے علی بن عبدالرحمٰن المعاوی کو سمجھایا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تھے تو:

(( وضع كف اليمنىٰ علىٰ فخذه اليمنىٰ وقبض اصابعه كلها واشار باصبعها التى تلى الابهام ))

'' اپنی دائیں ران پر رکھتے اور اپنی تمام انگلیاں بند کر دیتے اور اپنی انگلی جو انگوٹھے سے متصل ہے اس سے اشارہ کرتے تھے۔''

❁❁❁❁

# دوسجدوں کے درمیان بیٹھنے میں اعتدال واطمینان

اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ دوسجدوں کے درمیان بیٹھنے کے وقت اعتدال واطمینان بھی ضروری ہے جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ والی روایت جو ابوداؤد، دارمی، ترمذی وغیرہ میں مروی ہے (جسے امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے) اس کے الفاظ اس طرح ہیں۔

(( ثم يرفع رأسه ويثنى رجله اليسرىٰ فيقعد عليها ثم يعتدل حَتّٰى يرجع كل عظم فى موضعه )) [الحديث]

''جب پہلے سجدہ سے سر مبارک اوپر اٹھاتے اور اپنے بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جاتے پھر برابر سیدھے ہو کر بیٹھ جاتے یہاں تک کے ہر ہڈی اپنی جگہ پر آ جاتی۔''

اور مسیء الصلوٰۃ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کا امر فرمایا کہ تم میں سے کسی کی نماز اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک سجدہ کے بعد تکبیر کہے اور سر اوپر اٹھائے یہاں تک کہ اعتدال واطمینان کے ساتھ سیدھا بیٹھ جائے اور اپنی پیٹھ کو سیدھا رکھے۔ یہ روایت ابوداؤد اور نسائی کی ہے اور اس روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( فاذارفعت رأسك فاجلس علىٰ فخذك اليسرىٰ ))

''پھر جب سجدہ سے سر اوپر اٹھائے تو اپنی بائیں ران پر بیٹھ جا۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص دوسجدوں کے درمیان پوری طرح سیدھا نہیں بیٹھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ دونوں دوسجدوں کے درمیان دو دعائیں مروی ہیں جو کہ نیچے درج کی جاتی ہیں۔

## نماز میں بیٹھنے کی حالت میں ہاتھوں سے ٹیک لگانے سے منع کا بیان:

بیٹھنے کی حالت میں اپنے ہاتھوں سے زمین پر ٹیک لگا کر نہ بیٹھے جس طرح ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجلس الرَّجُلُ فى الصلوٰة وهو معتمد علىٰ يده ))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں ہاتھوں سے ٹیک لگا کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔''

یہ مذکور روایت مصنف عبدالرزاق میں بھی ہے اس میں یدہ کی جگہ یدیہ کے الفاظ ہیں۔ مستدرک حاکم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے اس طرح روایت مروی ہے کہ:

(( ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی رجلاً وھو جالس معتمد علیٰ یدہ الیسریٰ فی الصلوٰۃ وقال انھا صلوٰۃ الیھود ))

”آپ ﷺ نے ایک شخص کو نماز میں اپنے ہاتھ کے ٹیک لگا کر بیٹھا دیکھا اور اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ یہ ہیئت یہودیوں کی نماز کی ہے۔“

امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم کے شروط پر صحیح ہے علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔ مسند احمد میں عمدہ سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے روایت مروی ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأی رجلا ساقطا یدہ فی الصلاۃ فقال لاتجلس ھکذا إنما ھذہ جلسۃ الذین یعذبون ))

”بے شک رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز میں اپنے ہاتھوں کو نیچے گرا کہ بیٹھا تھا، تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح نہ بیٹھیں کیونکہ اس طرح کا بیٹھنا ان لوگوں کے بیٹھنے کی طرح ہے جن کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔“ دو سجدوں کے درمیان کے جلسہ کے بعد تکبیر کہہ کر دوسرے سجدہ میں جائے جیسا کہ صحیحین کی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت میں اس طرح الفاظ ہیں کہ (( ثم یکبر حین یسجد )) یعنی پھر آپ ﷺ تکبیر کہتے تھے۔ پھر دوسرا سجدہ کرتے تھے اور نبی ﷺ نے مسئ الصلوٰۃ کو بھی دوسرے سجدہ کے متعلق تکبیر کہہ کر سجدے میں جانے کا امر فرمایا۔ دو سجدوں کے درمیان مکمل اعتدال واطمینان کے بعد (جیسا کہ پہلے گزر چکا) پھر فرمایا:

(( ثم تقول اللہ اکبر ثم تسجد حتیٰ تطمئن مفاصلك ثم افعل ذالك فی صلواتك کلھا ))

”پھر اللہ اکبر کہیں اور سجدہ کریں یہاں تک تمام اعضاء ومفاصل پرسکون ہو جائیں، پھر یہ سب باتیں جو بھی بتلائی گئیں اپنی پوری نماز میں کرتے رہیں۔“

یہ روایت آخری الفاظ کی زیادتی (( ثم افعل ذالك )) کے علاوہ ابو داؤد اور حاکم وغیرہما میں حسن سند سے رفاعہ بن رافع سے مروی ہے اور دوسرا سجدہ بھی اسی طرح کرنا ہے اور اس کی ہیئت بھی وہی ہے جو پہلے سجدے میں گزر چکی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پھر دوبارہ تکبیر کہہ کر اوپر دوسری رکعت کے لیے جائے جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ:

(( ثم یکبر حین یرفع رأسہ ثم یفعل ذالك فی صلاۃ کلھا حتیٰ یقضیھا ))

”اور پھر تکبیر کہتے جب سر مبارک دوسرے سجدے سے اٹھاتے، پھر اپنی مکمل نماز میں اسی طرح کرتے یہاں تک کہ نماز مکمل نہ کر لیں۔“

اور مسئ الصلوٰۃ کو بھی آپ ﷺ نے دوسرے سجدے کے بعد یہی امر فرمایا کہ ((ثم یرفع رأسه فیکبر)) یعنی پھر نمازی اپنا سر اوپر اٹھائے، پھر تکبیر کہے۔ یہ روایت ابو داؤد اور حاکم میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حاکم رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور رفاعہ رضی اللہ عنہ ہی سے مسند احمد، ترمذی میں ایک روایت ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اس میں یہ الفاظ یہ ہیں۔

(( ثم اصنع ذالك في كل ركعة وسجدة فاذافعلت ذالك فقد تمت صلوٰتك وان انكست منه شيئاً انكست من صلوٰتك ))

"یعنی پھر اس طرح ہر رکعت اور ہر سجدے میں پھر تو نے اسی طرح کیا تو تیری ی نماز مکمل ہوئی اور اگر اس میں سے کچھ کمی کی تو تیری نماز میں کمی ہوگی۔"

پھر بائیں پاؤں پر بیٹھ جائے اور اسے فقہاء نے جلسہ استراحت کہا ہے اور یہی قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے اور اسی کے موافق علامہ ابن الجوزی نے اپنی کتاب "تحقیق" میں یہ قول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا ہے۔

# جلسہ استراحت کے دلائل

## دلیل نمبرا:

سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جو ابوداؤد، دارمی، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں مروی ہے اس میں دوسرے سجدے کے بعد مروی ہے:

(( ثم یقول الله اکبر ویرفع ویثنی فی رجله الیسریٰ ویقعد علیها ثم یعتدل حتی یرجع کل عظم الیٰ موضعه ثم ینهض))

''دوسرے سجدے کے بعد اللہ اکبر کہتے اور سر مبارک اوپر اٹھاتے اور بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھ جاتے، پھر سیدھے بیٹھ جاتے یہاں تک ہر ہڈی اپنے مقام پر آجاتی، پھر دوسری رکعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔''

اس حدیث میں صاف طور پر جلسہ استراحت کا ذکر ہے۔

## دلیل نمبر۲:

صحیح بخاری میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ:

(( انه رأى النبی صلی الله علیه وسلم یصلی فاذا کان فی وتر من صلوٰته لم ینهض حتی یستوی قاعدا ))

''یعنی مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طاق رکعت میں ہوتے، یعنی پہلی اور تیسری میں تو دوسری اور چوتھی رکعت سے اٹھنے سے قبل سیدھے بیٹھ جاتے پھر اوپر اٹھ جاتے۔'' اس صحیح حدیث میں جلسہ استراحت کا واضح اور صحیح دلیل موجود نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بڑھاپے اور مرض کی وجہ سے تھا لیکن یہ محض بے ثبوت تخمینہ اور اٹکل بچو ہے اس طرح کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی بھی واضح دلیل موجود نہیں اوپر دلیل نمبرا میں سیدنا ابوحمید رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کر آئے ہیں۔ اس میں بھی اس طرح بیٹھنے کا ذکر موجود ہے حالانکہ نماز کا یہ طریقہ ابوحمید رضی اللہ عنہ نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بیٹھ کر بیان کیا تھا آخر میں تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے بیان کردہ طریقہ کی تصدیق کی کہ ہاں واقعاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے اتنے واضح ثبوت و دلیل کے باوجود بھی اگر کوئی مرغی کی ایک ٹانگ کہتا پھرے تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں کچھ علماء اپنے موقف پر ترمذی ابوداؤد اور نسائی کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں جو عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( كان النبی صلی الله علیه و سلم فی الر کعتین الا و لیین کانه علی الرضف حتی یقوم ))

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دو رکعتیں میں اس طرح ہوتے گویا کہ گرم پتھروں پر ہوں یہاں تک کے کھڑے ہو جاتے۔''

جواباً عرض ہے کہ اولاً عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس روایت میں راوی ان کا فرزند ابوعبیدہ ہے۔ اس کا اپنے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں، لہٰذا یہ روایت منقطع ہوئی اور منقطع ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے، اس لیے ایک ضعیف حدیث کو صحیح احادیث کے مقابلہ میں بطور معاوضہ پیش کرنا علمی شان کے منافی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس روایت میں یہ تو نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت پڑھتے ہی اٹھ جاتے یعنی بیٹھتے نہیں تھے بلکہ اس میں اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو رکعت نماز میں بیٹھتے تھے گویا کہ گرم پتھروں کے اوپر ہوں یعنی دو رکعتوں پر قعدہ کرنے کے وقت تھوڑی دیر بیٹھتے تھے۔ آخری رکعت کی طرح زیادہ دیر نہیں بیٹھتے تھے، یعنی چار رکعتوں والی نماز پڑھتے تھے تو رکعتوں پر اتنا نہیں بیٹھتے جتنی دیر چار رکعات پر بیٹھتے تھے اس میں جلسہ استراحت کی نفی کا کوئی نام نشان بھی نہیں۔ جو حضرات جلسۂ استراحت کے قائل نہیں ان کی طرف سے ایک اور حدیث جو سنن سعید بن منصور میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے:

(( انه صلی الله علیه و سلم کان ینهض علیٰ صدو ر قدمیه ))

''بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاؤں کے سینے کے بل ہی اٹھ جاتے تھے۔''

یعنی بیٹھتے نہیں تھے لیکن اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری ''باب کیف یعتمد علی الارض اذاقام من الر کعة'' کے تحت جو حدیث کے خلاف وارد ہے اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے بہر حال جلسہ استراحت کے خلاف کوئی بھی صحیح مرفوع حدیث وارد نہیں ہوئی۔

خلاصہ کلام:

کہ طاق رکعات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث میں کچھ دیر بیٹھنے کا ثبوت ملتا ہے اس لیے ایک متبع سنت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا زیادہ انسب اور اولیٰ ہے اور مستحب ومندوب اجروثواب کا باعث ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو بھی کسی حالت میں ترک نہیں کرنا چاہیے خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان: ''صلوا کما رأیتمونی أصلي'' ''جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھو۔'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس سنت کی اتباع بھی کریں اور اس جلسہ میں چونکہ کوئی بھی مسنون دعا نہیں ہے اس لیے اس میں انگلی سے اشارہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں جیسا کہ پہلے دو سجدوں کے درمیان

ہیں بیٹھنے کی ہیئت بیان کرنے کے وقت عرض کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

اس جلسے کے بعد زمین پر ہاتھوں سے ٹیک لگا کر اوپر اٹھ جائے۔ بیہقی، جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح ابن حبان میں مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ اس طرح مروی ہے (اس جگہ پر ہم صحیح ابن حبان کے الفاظ نقل کرتے ہیں) ابو قلابہ تابعی کہتے ہیں کہ مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ ہمارے اوپر ہماری مسجد میں داخل ہوئے اور فرمایا:

(( انی لأصلی وما أرید الصلوٰۃ ولکنی أرید أن أعلمکم کیف کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی قال فذکرانہ حیث رفعہ من السجود فی الرکعۃ الاولی استوی قاعدا ثم قام فاعتمد علی الارض))

''بے شک میں نماز پڑھتا ہوں اور میرا ارادہ نماز پڑھنے کا نہیں مگر میں ارادہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں نماز سکھلاؤں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ ابو قلابہ نے ذکر کیا کہ بے شک مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جب اپنا سر پہلی رکعت کے دوسرے سجدے سے اوپر اٹھایا۔ (معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح بخاری میں ''اذا رفع رأسہ عن السجدۃ الثانیۃ'' کے الفاظ ہیں، یعنی جب دوسرے سجدے سے سر اوپر اٹھایا) تو سیدھے بیٹھ جاتے پھر اٹھتے زمین پر ٹیک لگا کر۔ صحیح بخاری میں اس طرح مروی ہے کہ ''جلس واعتمد علی الارض ثم قام'' یعنی دوسرے سجدے سے سر اوپر اٹھا کر بیٹھتے تھے اور زمین پر ہاتھوں سے ٹیک لگا کر اٹھتے تھے۔ اسی طرح ابو اسحاق الہروی اپنی کتاب غریب الحدیث میں ازرق بن قیس سے روایت کرتا ہے کہ:

(( رایت ابن عمر یعجن فی الصلوٰۃ یعتمد علیٰ یدیہ اذا قام فقلت لہ فقال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفعل ))

''میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ نماز میں گوندتے تھے (یعنی گوندنے کی طرح اٹھتے تھے) ٹیک لگاتے تھے ہاتھوں پر جب اٹھتے تھے، پھر میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کرتے دیکھا ہے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے اور یعجن کی معنی لکھتے ہیں: ''ای یعتمد علی یدیہ اذا قام کما یفعل الذی یعجن العجین'' ''اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگاتے تھے جب اٹھتے تھے جس طرح آٹا گوندنے والا شخص کرتا ہے۔'' علامہ ابن الاثیر حدیث کی لغت کی کتاب النہایہ میں یہ حدیث لا کر ''یعجن'' کا مطلب بعینہ وہی رکھا ہے جو علامہ البانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، علامہ وحید الزمان لغات الحدیث میں ''یعجن فی الصلوٰۃ'' کا ٹکڑا لا کر مطلب بیان کرتا ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نماز میں کھڑے ہوتے وقت دونوں ہاتھوں کو اس طرح کرتے جیسے آٹا گوندتے ہیں زمین پر ٹیک لگا کر اٹھتے۔ مذکورہ عبارات

سے معلوم ہوا کہ یعجن کے معنی زمین پر ہاتھوں کو ٹیک لگانا، کسی نے بھی یہ معنیٰ نہیں بیان کیا کہ ہاتھوں کی انگلیاں جمع کر کے پھر ان سے زمین پر ٹیک کر اٹھا جائے اگر ان کا مقصد یہ ہوتا تو ان کی عبارت کچھ اس طرح ہوتی کہ: " كان يقبض اصابع يديها ثم يعتمدعليها و قام" "اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو بند کیا پھر ان پر ٹیک لگا کر اٹھتے۔" باقی رہی آٹے گوندنے والی تشبیہ تو آٹے کو ہتھیلیوں سے بھی گوندا جاسکتا ہے۔ راوی کا اصل مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر لگا کر ان پر ٹیک لگا اوپر اٹھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں جیسا کہ اوپر گزر چکا یہ الفاظ ہیں کہ: " جلس واعتمد على الارض ثم قام" "زمین پر بیٹھنے ٹیک لگائے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔" اور صحیح ابن حبان میں یہ الفاظ ہیں، "استوىٰ قاعداً فاعتمد على الارض" "سیدھے بیٹھ گئے، پھر اٹھے اور زمین پر ٹیک لگائی۔" ان سب روایات میں زمین پر ٹیک لگانے کا ذکر ہے ہاتھوں سے۔ کسی میں بھی انگلیوں سے ٹیک لگانے کا ذکر نہیں، پھر دوسری رکعت میں بھی اس طرح کرے جس طرح پہلی رکعت کیا تھا۔ جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ابوداؤد ترمذی وغیرہ میں ہے اس میں یہ الفاظ ہیں" ثم يصنع فى الركعة الثانية مثل ذالك" پھر دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح پہلی رکعت میں کیا تھا۔ اور طبرانی کی معجم الکبیر میں حسن سند سیدنا وائل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس حدیث میں صحابہ رضی اللہ عنہ پہلی رکعت کا بیان بتا کر پھر فرماتے ہیں کہ دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھی اور مسیئ الصلوٰۃ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت کا طریقہ سمجھا اور فرمایا کہ" ثم افعل ذالك فى صلوٰتك كلها " پھر تو اپنی پوری نماز میں اس طرح کر یہ حدیث صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حدیث رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں"ثم اصنع ذالك فى كل ركعة و سجدة "یعنی جب پھر اسی طرح کریں ہر رکعت اور ہر سجدہ میں اور دوسری رکعت میں خاموش نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ کھڑے ہوتے ہی سے الحمدللہ کی قرأۃ کی ابتدا کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے صحیح مسلم کے حوالہ سے گزر چکا۔ مذکورہ ترتیب کے مطابق دو رکعات کو مکمل کرنے کے بعد اگر نماز تین یا چار رکعتوں والی ہوتی تو دو رکعتوں کے بعد التحیات کے لیے بیٹھتے تھے۔ جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت میں جو صحیح بخاری وغیرہ میں ہے اور مسیئ الصلوٰۃ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امر فرمایا جیسا کہ ابو داوٗد اور بیہقی میں عمدہ سند سے رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے مروی ہے:

(( فاذا جلست فى وسط الصلوٰة فاطمئن جالساً ثم افترش فخذك اليسرىٰ ثم تشهد ))

"پھر جب آپ درمیان میں بیٹھیں تو اطمینان سے بیٹھ جائیں اور اپنی بائیں ران بچھا دے۔"

یعنی اس پر بیٹھ جایئے پھر التحیات پڑھیں، لیکن یہ بیٹھنا اگرچہ مشروع ہے لیکن جب کوئی بھول کر اٹھ گیا تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی اسے نماز ختم کرنے کے بعد سہو کے دو سجدے دینے پڑیں گے۔ اس کی تفصیل

بحث آئندہ آئے گی۔ ان شاء اللہ

دو رکعتوں پر بیٹھنے اور آخری رکعت کے بیٹھنے کے علاوہ نماز کے دیگر جلسات کی ہیئت اور کیفیت پہلے بیان کر چکے ہیں وہاں ملاحظہ کیجیے اور انگلی سے اشارہ بھی دونوں التحیات کے جلسات میں کرنا ہے اس کے بارے میں گذارش عرض کی جا چکی ہے۔ مزید یہ کہ بیہقی وغیرہ میں عمدہ سند سے سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( کان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جلس فی ثنتین اوفی اربع وضع یدیہ علیٰ رکبتیہ ثم اشار باصبعہ ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دو رکعتوں یا چار رکعتوں کے بعد بیٹھتے تو ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھتے اور انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ اور اشارہ صرف ایک انگلی سے کرنا ہے۔''

ترمذی، نسائی اور بیہقی نے اپنی کتاب الدعوات الکبیر میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت لائی ہے کہ:

(( ان رجلاً کان یدعوا باصبعیہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد احد ))

''بے شک ایک شخص نماز میں دو انگلیوں سے دعا پڑھ رہا تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک انگلی سے ایک انگلی (اشارہ کریں)۔''

امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے اور امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے اور نافع مولیٰ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( کان عبداللہ بن عمر اذا جلس فی الصلوٰۃ وضع یدیہ علیٰ رکبتیہ واشارباصبعہ واتبعھا و صلہ ثم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّھَا اشدعلی الشیطان من الحدید یعنی السبابۃ ))

''جب ابن عمر رضی اللہ عنہ نماز میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھتے اور اشارہ کرتے تھے اور اپنی نظر اس کی طرف کرتے تھے پھر کہتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ انگشت شہادت شیطان پر لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے (غالباً اس لیے کہ انگلی سے اشارہ کرنا توحید کی طرف اشارہ ہے)۔''

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے حسن سند سے بیان کیا ہے اور مسنون طریقہ یہی ہے کہ التحیات کو مخفی کیا جائے جیسا کہ ابو داود، ترمذی اور صحیح ابن خزیمہ میں حسن سند سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''من السنۃ اخفاء التشھد'' یعنی سنت یہ ہے کہ تشہد کو مخفی (آہستہ) پڑھا جائے التحیات والے جلسہ میں دوسرے ہر کلمہ سے پہلے التحیات پڑھنا ہے۔ جیسا کہ امام بیہقی اپنی کتاب سنن الکبریٰ میں حسن سند سے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ ''فاذا کان عندالقعود فیقل اول ما یتکلمہ بی التحیات الخ'' یہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔ پھر جس وقت بیٹھتے تو کہے التحیات الخ۔

# التحیات کے صیغے

التحیات کا سب سے مشہور زمانہ اور متداول وہ صیغہ ہے جو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں اس طرح مروی ہے:

(( التحيات لله والصلوٰت و الطيّبات السلام عليك ايها النبی ورحمة الله وبركاتهٗ السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين اشهد ان لا اِلٰهَ الا الله واشهد ان محمداً عبدهٗ ورسوله ))

یہ الفاظ صحیح بخاری کے کتاب الدعوات کے ہیں امام بخاری رحمہ اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کتاب الاستیذان میں بھی نقل کی ہے اس میں کچھ الفاظ زائد ہیں جو کہ درج ذیل "وهو بين ظَهرانِنَا فلما قبض قلنا السلام يعني على النبی" یعنی التحیات میں ہم "السلام عليك ايها النبی" تب کہتے تھے جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود ہوتے تھے علیہ السلام پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رحلت فرما گئے تو ہم نے "على النبی" غائب کے صیغے سے پڑھنا شروع کر دیا اس کا شاہد صحیح سند سے مصنف عبدالرزاق من عطاء بن رباح سے اس طرح مروی ہے:

(( اِن الصحابة كانوا يقولون والنبی صلى الله عليه وسلم حی السلام عليك اَيّها النبی فلما مات قالوا السلام على النبی ))

"بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوتے تو السلام عليك ايها النبی کہتے، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات فرما گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم السلام علی النبی یعنی کہتے تھے۔"

عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ جلیل القدر تابعین میں سے ہیں۔ اس صحیح اثر سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد السلام علی النبی کے کہنے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما منفرد نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ چند دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے جو السلام علی النبی کہتے تھے۔ راقم السطور کہتا ہے کہ مجھے بھی ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ بات انسب (الی الحق) نظر آتی ہے اس لیے میں اسی پر عمل پیرا ہوں لیکن دوسری صورت کو ناجائز نہیں سمجھتا اور جو اس پر عمل کرتے ہیں ان کی تغلیط کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد" السلام عليك ايها النبی" کے بدلے السلام علی النبی کے کہنے پر اجماع ہرگز نہ تھا جیسا کہ سنن الکبریٰ میں صحیح سند سے عبدالرحمٰن بن عبدالقاری عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

(( شھدت عمربن الخطاب علی المنبر یعلم الناس التشھد ))

''میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا وہ منبر پر لوگوں کو التحیات کو سکھلا رہے تھے۔''

پھر کہا راوی نے التحیات کے پہلے الفاظ ذکر کیے اس کے بعد کہا ''السلام علیك ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته الخ'' اس روایت سے معلوم ہوا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر جو التحیات سکھلایا، اس میں ''السلام علیك ایھاالنبی'' کے الفاظ سے اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کا ہے اس طرح صحیح مسلم اور سنن کبریٰ للبیھقی میں ابوموسیٰ الاشعریٰ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو وہ نماز کے متعلق سمجھاتے ہوئے جب التحیات پر پہنچے تو ابتدائی الفاظ کہے اور پھر ''السلام علیك ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته'' کہا۔ اس حدیث کے ابتدا میں ہم پہلے ایک عنوان کے تحت ذکر کر آئے ہیں کہ بیٹھنے کے وقت دیگر کلمات سے پہلے التحیات پڑھنا ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ''السلام علیك ایھا النبی'' کہنے والے متعدد تھے جس سے ثابت ہوا کہ: '' السلام علی النبی'' پر صحابہ کا اتفاق نہیں ہے، اس لیے السلام علی النبی کے کہنے کو ترجیح دینے کے باوجود یہ فقیہ یہ خیال رکھتا ہے کہ ''السلام علیك ایھا النبی'' کے قائلین کی تغلیط نہ کی جائے۔ واللہ اعلم وعلمه اتم واحکم

## التحیات کے ابتدائی الفاظ کے معانی:

**التحیات کے لفظ کا ترجمہ:**

اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں لیکن مجھے ان میں سے دو اقوال زیادہ انسب نظر آتے ہیں:

① ایک یہ کہ ''التحیات'' سے مراد انواع التنظیم کی جائیں یعنی تعظیم کی تمام اقسام یعنی ہر قسم کی تعظیم کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

② دوسرا قول یہ کہ ''التحیات'' سے مراد عبادات قولیہ ہیں یعنی جو بھی زبان سے حمد بیان کی جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کے لیے خاص ہے اسی طرح صلوٰت کی معنی بھی علماء کے الگ الگ اقوال ہیں ہم ان میں سے ایک لکھتے ہیں جو ہمیں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ''صلوات اور طیبات'' کا ترجمہ۔

صلوات کا ترجمہ ہے عبادات فعلیہ یا بدنیہ جس طرح نماز روزہ حج وغیرہ۔ اسی طرح طیبات کے متعلق بھی ہمیں زیادہ انسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ طیبات سے مراد عبادات مالیہ ہیں جس طرح زکوٰۃ، صدقات وغیرہ۔ باقی جو لوگ السلام علیک پڑھتے ہیں وہ اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ ہم اس خطاب میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں حاضر ہیں ہم تو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھتے ہیں بلکہ اس کی مثال اس طرح جس طرح کوئی شخص کسی دوست یا رفیق کی طرف خط یا مراسلہ ارسال کرتا ہے۔ تو خط میں وہ مخاطب ہو کر خطاب کے الفاظ استعمال کرتا ہے، حالانکہ لکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جس کی طرف خط ارسال کر رہا ہے وہ وہاں موجود

نہیں لیکن وہ خطاب کے الفاظ اس لیے استعمال کرتا ہے کہ یہ خط مکتوب الیہ کو مل جائے گا۔ اور وہ خط میرے طرف سے مخاطب ہو کر اسے سب کچھ بتلا دی گا جو میں کہتا ہوں۔ اسی طرح چونکہ صحیح احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارا صلاۃ وسلام نبی کریم ﷺ تک پہنچایا جاتا ہے اس لیے ہم ''السلام علیك ایھا النبی'' کہتے ہیں تاکہ فرشتے جا کر نبی ﷺ کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔ واللہ اعلم بالصواب

فرشتوں کے ذریعے نبی ﷺ کو ہمارے سلام پہنچانے کے متعلق کئی احادیث ثابت ہیں یہاں صرف دو احادیث کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔

① نسائی، دارمی، مستدرک حاکم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ کے فرشتے مقرر کیے ہوئے ہیں جو زمین میں سیر کرتے ہیں اور صحیح میری امت کے سلام پہنچاتے ہیں۔

② ابوداؤد، بیہقی فی شعب الایمان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان الفاظ سے روایت وارد ہے:
(( سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لاتجعلوا بيوتكم قبورا ولا تجعلوا قَبرِیُ عيداً وصلوه على فان صلوٰتكم تبلغنى حيث كنتم ))
''میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا اور مجھ پر صلوٰۃ پڑھتے رہو، پس بے شک تمہارا درود پڑھنا تم جہاں کہیں بھی ہو مجھے پہنچایا جاتا ہے۔''

التحیات کے الفاظ میں کچھ دیگر صحابہ سے ابتدائی الفاظ کچھ تبدیلی وارد ہوئی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہمیں التحیات سکھلاتے اور پھر فرماتے:
(( التحيات المباركات الصلوٰت الطيبات لله )) اور آخر میں (( واشهد ان محمداً )) کے بعد ایک روایت میں ''رسول اللہ ﷺ'' کے الفاظ ہیں اور ایک اور روایت میں الفاظ ''واشهد ان محمدعبده ورسوله'' وارد ہوئے ہے۔ یہ دونوں روایات صحیح مسلم، ابوعوانہ، مسند شافعی اور نسائی میں ہیں۔ مذکور الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ قولی عبادات جو برکات والی ہیں۔ اور ابتدائی الفاظ کے متعلق امام نووی فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کی تقریر اس طرح ہے ''والمباركات والصلوٰت والطيبات'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی جس روایت میں ہے یعنی ان سب کے درمیان واؤ ہے یہاں اختصار کے طور پر واؤ کو حذف کیا گیا ہے اور یہ جائز اور عربی زبان میں معروف ہے۔ اب حدیث کی معنی اس طرح ہوگا کہ تحیات کی مذکورہ اوصاف ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ان کا حق دار ہے اور ان کی حقیقت کسی دوسرے کے لیے صحیح نہیں ہو سکتی۔

**خلاصہ:**

التحیات کے جو صیغے مختلف وارد ہیں ان میں سے کسی بھی صیغہ کے پڑھنے کے جواز کے متعلق علماء کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ دوسرے صیغے بھی سند سے وارد ہیں مگر اختلاف صرف اولیت اور افضلیت میں ہے اکثر علماء جن میں فقہا محدثین بھی شامل ہیں وہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مروی الفاظ کو اولیت دینے کے قائل ہیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس التحیات کے متعلق مشہور محدث بزار سے نقل کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ التحیات کے متعلق کونسی روایت زیادہ صحیح ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک وہ حدیث جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے وہ (۲۰) سے زائد طرق سے مروی ہے اور مجھے التحیات کے متعلق اس سے زیادہ صحیح حدیث کا علم نہیں، جو اس سے زیادہ اثبت ہو اور اسانید کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہو اور رواۃ کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہو۔ آگے حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ واقعتاً اہل حدیث کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور یہی بات امام بغوی رحمہ اللہ نے یقین سے کہی۔ مزید حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو زیادہ ترجیح اس لیے ہے کہ یہ روایت متفق علیہ اس کے برعکس التحیات کے متعلق جو دوسرے صیغے وارد ہیں ان کی روایات متفق علیہ نہیں ہیں مثلاً ابن عباس رضی اللہ عنہ کی التحیات سے مروی روایت جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے وہ صحیح بخاری میں نہیں ہے باقی دیگر کتب میں ہے اور دوسری بات یہ کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو ثقہ روایت بیان کرتے ہیں ان کا التحیات کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اس کے برعکس دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم جن سے التحیات منقول ہے ان سے روایت کرنے والے راوی ہیں ان کی روایات میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے اور یہ بھی وجہ ترجیح ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تلقیناً التحیات حاصل کیا جیسا کہ طحاوی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

((أخذت التشهد من فی رسول الله صلى الله عليه وسلم ولقيته كلمة كلمة))

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک سے التحیات حاصل کیا اور مجھے آپ نے ایک ایک کر کے تلقین کروائی۔''

اسی طرح امام بخاری کتاب الاستیذان میں دوسرے طریق سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( علمنی رسول الله صلى الله عليه وسلم التشهد وكفى بين كفيه كما يعلمنى السورة من القرآن ))

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے التحیات اس حال میں سکھلایا کہ میری ہتھیلی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں تھی جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قرآن کی کوئی سورۂ سکھلاتے تھے۔'' انتہی کلام الحافظ اور نسائی میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

سے ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ ہر دو رکعات کے بعد التحیات پڑھا کرو، اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( اذاقعدتم فی کل رکعتین فقولوا ))

"جب تم ہر دو رکعت پر بیٹھو تو التحیات پڑھا کرو۔"

حافظ صاحب نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو مزید ترجیح اس طرح دی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں واؤ عطف ہے۔ التحیات، طیبات، الصلوٰت کے درمیان واؤ عاطفہ ہے جو کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت کی تقاضہ کرتا ہے اس لیے ہر ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی مستقل ثنا بنے گا۔

برخلاف اس کے کہ واؤ کو حذف کیا جائے تو یہ سب ماقبل کی اوصاف بنیں گی۔ یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ثناء کا تعدد ہے۔ اس کی ترجیح کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ التحیات کے متعلق امر کا صیغہ وارد ہے بخلاف غیر کے اس میں محض حکایت ہے امام احمد کی سند میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں:

(( ان رسول الله صلی الله علیه وسلم علمه التشهد وامره ان یعلمه الناس))

"آپ ﷺ نے انہیں التحیات سکھلایا اور حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کو سکھلائیں۔"

دوسرے کسی بھی صحابی کی روایت میں یہ بات منقول نہیں اس میں اس کی مزید برتری کی دلیل ہے۔ انتہی کلام الحافظ التحیات کے بعد درمیانے تشہد خواہ آخری تشہد میں نبی ﷺ پر درود پڑھیں درمیانے تشہد میں درود شریف پڑھنے کی دلیل یہ حدیث ہے۔ صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، بیہقی وغیرہ میں صحیح سند سے ان الفاظ سے حدیث وارد ہے:

(( عن ابی مسعود رضی اللّٰه عنه قال اقبل رجل حتیٰ جلس بین یدی رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن عنده فقال یا رسول الله صلی الله علیه وسلم اما السلام علیك فقد عرفناه فکیف نصلی علیك اذا نحن صلینا فِیْ صلواتنا صلی الله عَلَیْكَ؟ قال فَصَمَتَ حتی احببنا اَنَّ الرجل لم یسأله ثُمَّ قال اذا انتم صلیتم علی فقولوا ))

"ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ہم آپ بھی وہاں موجود تھے اس نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ پر سلام کے متعلق تو ہمیں معلومات حاصل ہو چکی ہے ہم آپ پر صلوٰۃ کیسے پڑھیں؟ آپ ﷺ خاموش ہو گئے یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ شخص سوال ہی نہ کرتا تو صحیح ہوتا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب نماز پڑھو تو میرے اوپر اس طرح صلوٰۃ پڑھو۔" الخ

اس حدیث پر امام ابن حبان رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا ہے:

(( ذکر البیان بان النبی صلی اللہ علیہ وسلم إنما سئل عن الصلوٰۃ علیہ فی الصلوٰۃ عند ذکر ھم ایاہ فی التشھد ))

''اس بات کا بیان کہ نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام نے یہ پوچھا کہ نماز میں التحیات میں آپ ﷺ کے نام کے ذکر ہونے پر صلوٰۃ کیسے پڑھیں؟''

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے اس طرح پوچھا سلام کے متعلق ہمیں معلومات ہے باقی صلوٰۃ کس طرح پڑھیں یہ سوال انہیں اس لیے پیش آیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم سورۂ احزاب میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [الاحزاب: ٥٦]

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں تو صلوٰۃ وسلام کا اکٹھے امر فرمایا ہے تو سلام تو ہم جانتے ہیں کہ ہم اس طرح کہیں السلام علیك ایھا النبی''

باقی ہمیں یہ معلومات نہیں کہ ہم صلوٰۃ کیسے پڑھیں پھر نبی ﷺ نے انہیں بتلایا کہ اس طرح پڑھیں، اور یہ سوال نماز کی حالت کے متعلق تھا جس طرح اس حدیث میں تصریح ہے۔ نماز میں سلام التحیات میں مذکور ہے جس سے ثابت ہوا کہ جس جلسہ میں بھی التحیات پڑھا جائے گا تو صلوٰۃ بھی پڑھنا ہوگی۔ اس طرح صحیح بخاری وغیرہ میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

(( قد علمنا کیف نسلم علیك فکیف نصلی علیك فقال قولوا اللھم صل علیٰ محمد ))

''ہمیں معلوم ہوا کہ آپ ﷺ پر سلام کیسے بھیجیں باقی صلوٰۃ آپ پر کس طرح پڑھیں، آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو'' اللھم صَلِّ علیٰ محمد الخ'' اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سلام کے متعلق اشارہ التحیات کے سلام کی طرف ہے تو صلوٰۃ بھی اس وقت یعنی نماز میں التحیات کے بعد پڑھنے کے متعلق دریافت کیا۔ ان احادیث سے بالکل ظاہر اور واضح معلوم ہوتا ہے کہ التحیات کے دونوں جلسات درمیان اور آخر میں جس طرح التحیات مشروع ہے اس طرح درود شریف بھی مشروع ہے، یہی امام شافعی کا مذہب ہے جیسا کہ امام موصوف نے اپنی کتاب (الأم) میں وضاحت فرمائی ہے۔ اور یہی مذہب ان کے اصحاب اور مقلدین کے نزدیک درست ہے جیسا کہ امام نووی نے اپنی کتاب ''المجموع'' میں تصریح کی ہے، حنابلہ میں سے وزیر بن ہبیرہ نے اپنی کتاب ''الفصاح'' میں اسے اختیار کیا ہے علامہ ناصر الدین البانی بھی اسی کے قائل ہیں۔ مرحوم مولانا عبدالقادر حصاری کی بھی یہی تحقیق ہے علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں جو

حضرات درمیانے تشہد میں التحیات کے ساتھ درود شریف سے منع کرتے ہیں ان کے پاس کوئی بھی واضح دلیل نہیں جس سے دلیل پکڑی جاسکتی ہو ہمارے والد محترم اور جدامجد محترم کا بھی یہی موقف تھا ہمیں بھی یہی بات درست نظر آتی ہے اور خود نبی ﷺ سے درود شریف پڑھنا ثابت ہے صحیح ابوعوانہ وغیرہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ سے رات کی عبادت اس طرح منقول ہے:

(( يتوضأ ثم يصلي تسع ركعات لايجلس فيهن الاعندالثامنة فيدعوا به يصلي علىٰ نبيه صلى الله عليه وسلم ويدعوا يسلم تسليمايسمعنا )) [الحديث]

''آپ ﷺ وضو کرتے پھر نو رکعات پڑھتے (اور ان نو رکعات میں سے) آٹھویں میں بیٹھتے، پھر اپنے رب سے دعا مانگتے نبی ﷺ پر دورد پڑھتے پھر اٹھ جاتے اور سلام نہ پھرتے۔''

اور پھر نویں رکعت پڑھتے، پھر بیٹھتے تھے اپنے رب کی حمد بیان کرتے اور نبی ﷺ پر مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ درمیانے تشہد کے بیٹھنے میں صلوٰۃ کے علاوہ اور کوئی دعا نہیں پڑھی جائے گی بلکہ اللہ اکبر کہہ کر تیسری رکعت میں داخل ہوجانا ہوگا۔

صلوٰۃ کے الفاظ بھی احادیث میں مختلف وارد ہوئے ہیں مگر اس جگہ ہم صلوٰۃ کے وہ الفاظ لکھتے ہیں جو زیادہ مشہور اور عام طور پر عوام وخواص کے پاس متداول ہیں اور وہ صحیح بخاری وغیرہ میں کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے ابتدائی الفاظ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ہم صلوٰۃ کیسے پڑھیں سلام تو ہمیں معلوم ہے تو نبی ﷺ سے فرمایا اس طرح کہو:

(( اللهم صَلِّ علىٰ محمد وَّعلىٰ آل محمد كما صليت علىٰ ابراهيم وعلىٰ آل ابراهيم انك حميد مجيد، اللهم بارك علىٰ محمد وعلىٰ آل محمد كما باركت علىٰ ابراهيم وعلىٰ آل ابراهيم انك حميد مجيد ))

التحیات کے بعد تیسری رکعت کی طرف تکبیر کہتے ہوئے اٹھتے تھے جس طرح بخاری اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے۔ ''ويكبر حين يقوم من اثنتين بعد الجلوس'' یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آپ ﷺ دو رکعات کے بیٹھنے کے بعد تکبیر کہتے تھے اور (تیسری رکعت کے لیے) اٹھ جاتے۔ یہ روایت مفصلاً پہلے گزر چکی اور مسیٔ الصلوٰۃ کو آپ ﷺ نے ان الفاظ میں امر فرمایا: ''ثم اصنع ذالك في كل ركعة وسجدة'' بتائے ہوئے طریقے کے بمطابق ہر رکعت اور ہر سجدہ میں کرتا جا۔ اور تیسری رکعت کی ابتدا میں رفع الیدین کرتے تھے جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

❁❁❁❁

# قنوت نازلہ اور قنوت وتر کے مسائل

اگر مسلمانوں کو کوئی مشکل پیش آجائے اور دعا مانگنے کی ضرورت ہو یا کفار پر بددعا کرنی ہو تو ہر فرض نماز کی آخری رکعت میں رکوع کے بعد سیدھے ہو کر سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کہہ کر قنوت نازلہ پڑھی جاسکتی ہے اس کی ترتیب کے متعلق عرض کیا جاتا ہے۔

**حدیث نمبرا:**

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور یہی روایت ابوداؤد میں ہے کہ انہوں نے فرمایا:

(( لاقربن بِكُمْ صَلَاةَ النبی صلی الله علیه وسلم قَالَ فكان ابو هريرة رضی الله عنه يقنت فی الرَّكَعَةِ الآخِرَةِ من صلوٰة الظهر وصلوٰة العشاء وصلوٰة الصبح بعد ما يقول سمع الله لمن حمده فيدعوا للمؤمنين وَيلعن الكفار ))

''میں ضرور تمہارے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کر دوں گا پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ قنوت پڑھتے۔ظہر،عشاء، فجر کے آخر میں سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد یہی وہ مومنین کے لیے دعا کرتے اور کفار کے لیے بدعا۔''

اس طرح صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مغرب اور فجر کے بعد قنوت ہوا کرتی تھی۔ابوداؤد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم كان يقنت فی صلوٰة الصبح وصلوٰة المغرب ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر اور مغرب میں قنوت پڑھتے تھے۔'' ابوداؤد ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( قنت رسول الله صلی الله علیه وسلم فی صلوٰة العتمة شهراً يقول فی قنوته اللهم نج الوليدبن الوليد اللهم نج سلمة بن هشام اللهم نج المستضعفين من المؤمنين اللهم اشددو وَطَأْتَكَ علىٰ مضراللهم اجعلها عليهم سنين كسنى يوسف قال ابو هريره وَ اصبح رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم فلم يدع لهم فذكرت ذلك له فقال وماتراهم قد قدموا ))

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز میں قنوت پڑھا ایک مہینہ تک اور اپنے قنوت میں اسی طرح فرمارہے تھے اے اللہ! تو ولید بن ولید کو نجات دلا اے اللہ سلمہ بن ہشام کو نجات دلا

اے اللہ مؤمنین میں سے جو کمزور ہیں ان کو نجات دے، اے اللہ تو اپنی پکڑ کر مضر قبیلے پر اور اپنی سزا ان پر سخت کر اور اس سزا کو ان کے اوپر قحط نازل کر جس طرح یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قحط نازل ہوا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا نہیں مانگی، پھر میں نے عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے واپس آگئے ہیں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قنوت نازلہ کی دعا بلند آواز سے پڑھنی ہے اور جب وہ ضرورت پوری ہو جائے تو ترک کر دی جائے اور مذکورہ دونوں احادیث ابو داؤد کی ہیں۔ ان کی اسناد صحیح ہیں اور ابو داؤد میں حسن سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( قنت رسول الله صلى الله عليه وسلم شهراً متتابعاً فى الظهر والعصر والمغرب والعشاء والصلوٰة الصبح فى دبر كل صلوٰة اذا قال سمع الله لمن حمده من الركعة الآخرة يدعوا عَلىٰ اَحيَاءٍ من بني سليم على رعل وذكوان وَعصية ويؤمن من خلفه ))

یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پے درپے ایک ماہ تک مغرب عشاء فجر میں قنوت پڑھتے رہتے تھے نماز کے آخر میں جب سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو پھر بددعا کرتے تھے چند قبائل پر یعنی رعل، ذکوان، عصیہ پر اور آپ کے پیچھے لوگ آمین کہتے تھے اس حدیث سے پانچوں نمازوں میں قنوت نازلہ کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کے کہنے پر آمین کہنا ہے اور ابوداؤد میں صحیح سند سے انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: (( ان النبى صلى الله عليه وسلم قنت شهراً ثم تركه )) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ تک قنوت پڑھا پھر چھوڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب ضرورت ختم ہو جائے تو قنوت نازلہ ترک کر دے، قنوت نازلہ کی دعا ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے۔ مسند احمد وغیرہ میں صحیح سند سے مروی ہے کہ جب کوئی ضرورت پڑتی تو قنوت پڑھتے تھے۔ صحیح ابن خزیمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( لايقنت الا ان يدعو لاحد اويدعوا على احد )) [الحديث]

"بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے لیے دعا کرنے کے لیے یا کسی پر بددعا کے لیے قنوت پڑھتے تھے۔"

اس حدیث کی سند صحیح ہے اسی طرح صحیح ابن خزیمہ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبى صلى الله عليه وسلم كان لايقنت الا اذا دعا لقوم اودعا علىٰ قوم ))

"بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب قنوت پڑھتے تو کسی کے لیے دعا کرتے یا کسی پر بددعا کرتے قنوت سے فارغ ہونے کے بعد اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے تھے۔"

جس طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت سنن نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں حسن سند سے مروی ہے۔ قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھا کر بددعا کرتے تھے جس طرح امام احمد کی مسند میں صحیح سند سے انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( فلقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی صلوٰۃ الغداۃ رفع یدیہ فدعا علیھم )) [الحدیث]

''میں نے رسول اللہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صبح نماز میں ہاتھ اٹھا کر (مشرکین پر بددعا فرما رہے تھے)۔'' یہ حدیث سنن الکبریٰ للبیہقی میں بھی موجود ہے۔

وتر کی آخری رکعت میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قنوت پڑھنا ثابت ہے جیسا کہ نسائی میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین رکعات پڑھتے تھے۔ پھر تینوں رکعات میں جو سورتیں پڑھتے تھے ان کا ذکر کیا۔ پھر کہا ''ویقنت قبل الرکوع'' یعنی پھر تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے مذکورہ حدیث کی سند صحیح ہے۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح سند سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر فیقنت قبل الرکوع ))

''بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔''

بہرحال دعا قنوت یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خواہ رکوع کے بعد ثابت ہے لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ وتر میں دعا قنوت اکثر طور پر رکوع سے پہلے اور قنوت نازلہ میں فرضی نمازوں میں رکوع کے بعد پڑھنا ثابت ہے باقی وتر میں کونسی دعا قنوت پڑھنی چاہیے اس بارے میں سب سے زیادہ صحیح حدیث وہ ہے جو نسائی، ابو داود، ترمذی معجم الکبیر طبرانی، مسند احمد اور بیہقی وغیرہم میں صحیح سند سے سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے:

(( علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمات اقولھن فی قنوت الوتر ))

''مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات قنوت وتر میں پڑھنے کے لیے سکھلائے۔'' وہ کلمات یہ ہیں:

(( اللھم اھدنی فیمن ھدیت وعافنی فیمن عافیت وتولنی فیمن تولیت وبارك لی فیما اعطیت وقنی شرما قضیت فانك تقضی ولا یقضیٰ علیك انه لایذل من والیت ولا یعز من عادیت تبارکت ربنا وتعالیت ))

نسائی کی ایک ضعیف روایت کے آخر میں ''صلی اللہ علی النبی محمد'' وارد ہے لیکن یہ زیادتی حافظ ابن حجر وغیرہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اس روایت میں انقطاع ہے یعنی ان کلمات میں آخر والی زیادتی صحیح نہیں ہے صحیح صرف یہی کلمات ہیں جو تعالیت پر ختم ہوئے اور دوسری بات کہ اس دعا میں صحیح سند

سے جو روایات ثابت ہیں ان میں واحد کے صیغے وارد ہوئے ہیں۔لیکن وہ روایت سنداً صحیح نہیں۔اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ اگر کوئی اکیلا وتر پڑھے خواہ جماعت کے ساتھ جس طرح رمضان المبارک میں ہر کسی کو چاہیے امام ہو یا مقتدی وتر کی آخری رکعت میں یہی دعا پڑھنی ہوگی۔بخلاف قنوت نازلہ کے کہ وہ صرف امام پڑھے گا مقتدی آمین کہیں گے۔باقی حنفی حضرات وتر میں ''اللھم انانستعینك الخ'' پڑھتے ہیں،اس کے لیے کسی مرفوع حدیث میں ثبوت نہیں ملتا اس لیے سب سے اولیٰ وافضل بات یہی ہے کہ وتر میں دعا قنوت وہی پڑھنی چاہیے جو صحیح سند سے نبی ﷺ سے ثابت ہے اور جو خود نبی ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کو سکھلائی تھی اور اس کی معنی و مطلب میں بھی بڑی جامعیت ہے۔دین و دنیا دونوں کا خیر اس میں سمایا ہوا ہے۔اس لیے ایسی بابرکت دعا کو تو زیادہ اشاعت دینی چاہیے تاکہ ہمیں بھی دنیا آخرت کا خیر و بھلائی حاصل ہو سکے۔

اسی طرح وتر میں قنوت پڑھنے کے وقت ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر پھر قنوت پڑھنا اس کا بھی نبی کریم ﷺ کی کسی حدیث میں ثبوت نہیں ملتا۔واللہ اعلم

اس کے بعد چوتھی رکعت بھی اسی طرح پڑھے جس طرح پہلے سمجھایا گیا ہے۔پھر جب آخری رکعت کے آخری جلسہ میں بیٹھے خواہ دو رکعتیں نماز ہو یا تین رکعات یا پھر چار رکعات والی ہو اس میں سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھنا ہوگا جس طرح ابو داؤد وغیرہ میں ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہما آخری جلسہ کے متعلق اس طرح مروی ہے کہ:

(( حتٰی اذا کانت السجدة التی یکون فیها التسلیم ))

اور صحیح ابن حبان میں اس طرح ہے: (( التی تکون خاتمة الصلوٰة )) پھر دونوں میں ہے۔ ''اخرج رجله الیسریٰ وقعد مُتورکاً علی شقه الایسر'' یعنی یہاں تک کہ جب آخری رکعت کا دوسرا سجدہ ہوتا جس میں سلام کہنا ہے یا وہ رکعت جو نماز کا اختتام ہے تو اپنے بائیں پاؤں کو نکال دیتے اور سرین کے بائیں حصہ پر بیٹھ جاتے جسے تورک کہا جاتا ہے۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تورک صرف چار رکعتی نماز سے خاص نہیں بلکہ ہر نماز کے اختتام جس میں سلام کہنا ہے خواہ دو رکعات والی ہو یا تین رکعات والی پھر چار رکعات والی اس میں تورک کرنا ہے،یعنی اس طرح آپ ﷺ نے درمیانے اور آخری تشہد میں فرق کیا۔اسی طرح صحیح ابن خزیمہ میں حسن سند سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یجلس فی آخر صلوٰته علی ورکه الیسریٰ ))

''بے شک سیدنا رسول اکرم ﷺ نے اپنی ہر نماز کے آخر میں تورک کرتے تھے۔''

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی نماز کے دونوں جلسات کے بیٹھنے میں فرق مروی ہے جس طرح

نسائی میں پہلے تشہد میں بیٹھنے کے متعلق اس طرح مروی ہے کہ:

(( من سنة الصلوٰة ان ینصب الیمنیٰ ویجلس علی الیسریٰ ))

''نماز میں بیٹھنے کا طریقہ مسنون یہ ہے کہ بائیں پاؤں کو کھڑا کیا جائے اور دائیں پاؤں پر بیٹھا جائے۔''

مؤطا امام مالک میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ التحیات میں بیٹھنا اس طرح مروی ہے کہ سیدھا پیر کھڑا کیا جائے اور بائیں پاؤں موڑا جائے اور سرین کے بل بیٹھا جائے اور بائیں پاؤں پر نہ بیٹھا جائے۔ مؤطا میں ایک اور روایت میں تصریح ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بیٹھنا آخری تشہد میں ہے آخری تشہد میں بیٹھنے کے تین طریقے مروی ہیں:

① ایک وہ جو ابتدا میں ذکر ہو چکا کہ بائیں پاؤں کو آگے نکال کر اپنے بائیں حصہ پر بیٹھا جائے۔

② دوسرا طریقہ اس طرح مروی ہے کہ: (( یفضی بورکه الیسری الی الارض ویخرج قدمیه من ناحیة واحدة )) یعنی بائیں حصے کو زمین پر پہنچائے اور اپنے دونوں پاؤں ایک طرف نکال آئے یہ حدیث ابوحمید رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے صحیح ابن حبان، ابوداؤد اور بیہقی میں مروی ہے۔

③ تیسرا طریقہ صحیح مسلم وغیرہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے مروی ہے کہ: (( انه صلی الله علیه وسلم اِذَا قَعَدَ فِی الصَّلوٰةِ جَعَلَ قدمه الیسریٰ بین فخذه وساقه و فَرَشَ قدمه الیمنیٰ ))

''جب نماز میں بیٹھتے تو بائیں پاؤں کو ران اور پنڈلی کے بیچ میں کر لیتے اور داھنا پاؤں بچھاتے۔''

آخری تشہد میں بھی پہلے کی طرح صلوٰۃ پڑھے لیکن اس بیٹھنے میں التحیات پڑھنا مزید مؤکد اور ضروری بن جاتا ہے کیونکہ اس میں دیگر ادعیہ بھی پڑھنی ہیں اور دعا سے پہلے صلوٰۃ پڑھنا ضروری ہے، جیسا کہ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد، نسائی، مسند احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں مروی ہے کہ:

(( سمع رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم رجلاً یدعوا فی صلوٰته لم یمجد الله ولم یصل علی النبي صلی الله علیه وسلم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم عجل هذا ثم دعاه فقال له اَوْ لغیره اذا صلی احدکم فلیبدأ بتمجید ربه والثناء علیه ثم یصلی علی النبی صلی الله علیه وسلم ثم یدعوا بما شاء ))

''نبی ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تمجید بیان کیے اور نبی ﷺ پر درود پڑھے بغیر ہی دعا مانگ رہا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے جلدی کی ہے پھر اس کو بلایا اور فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے رب کی تمجید بیان کرے اور پھر نبی ﷺ پر

درود پڑھے پھر جو چاہے دعا مانگے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری تشہد میں صلوٰۃ (درود) پڑھنا ضروری ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے۔ اس کے وجوب کی طرف امام شافعی رحمہ اللہ بھی گئے ہیں اور امام احمد کے آخری قول کے مطابق یہی ثابت ہے بلکہ اس حدیث سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز سے باہر بھی جب انسان ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو اسے رب تعالیٰ کی حمد کے چند الفاظ اور نبی ﷺ پر درود پڑھ کر پھر دعا مانگنی چاہیے۔ اسی سلسلہ دوسری حدیث نسائی شریف میں صحیح سند سے فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( وسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلاً يصلي فَمَجَدَ الله وحمده وصلى على النبي صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ادع تجب وسل تعط ))

"رسول اکرم ﷺ نے ایک شخص کو سنا اس نے نماز میں اللہ تعالیٰ کی تمجید وتعریف بیان کی اور نبی ﷺ پر صلوٰۃ پڑھی تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا آپ دعا مانگیں اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ نے جامع میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت بیان کی ہے کہ:

(( كنت اصلي والنبي صلى الله عليه وسلم وابوبكر وعمر معه فلما جلست بدأت بالثناء على الله تعالىٰ ثم صلوٰة على النبي صلى الله عليه وسلم ثم دعوت لنفسي فقال النبي صلى الله عليه وسلم سل تُعْطَ سل تُعْطَ ))

"میں نماز پڑھ رہا تھا اور نبی کریم ﷺ اور ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے جب میں نماز میں بیٹھا تو اللہ تعالیٰ حمد وثناء اور نبی ﷺ پر درود پڑھا پھر اپنے لیے دعا مانگی تو نبی ﷺ نے فرمایا آپ دعا مانگیں آپ کی دعا قبول کی جائے گی آپ مانگیے آپ کو دیا جائے گا۔"

اس آخری جلسہ میں دوسری دعا سے پہلے چار اشیاء سے پناہ طلب کرنے کا وجوب مسلم، ابوعوانہ، نسائی وغیرہم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ:

(( اذافرغ احدكم من التشهد الآخر فليستعذ بالله من اربع يقول اللهم انى اعوذبك من عذاب جهنم ومن عذاب القبر ومن فتنة المحياوالممات ومن شرفتنة المسيح الدجال ثم يدعوا لنفسه بما بدأ ))

"تم میں سے کوئی جب آخری تشہد (التحیات) سے فارغ ہو چکے تو اسے چاہیے کہ ان چار چیزوں سے پناہ طلب کرے، یعنی اس طرح کہے اے اللہ! میں تجھ سے جہنم کے عذاب سے پناہ طلب کرتا

ہوں اور قبر کے عذاب سے اور زندگی اور موت کے فتنہ سے اور دجال کے فتنہ کی برائی سے اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔"

یعنی مذکورہ دعا ضروری طور پر پڑھنی ہے اس کے بعد قرآن وحدیث میں جو مأثور دعائیں ہیں ان میں سے جو پسند آئے پڑھ سکتا ہے۔ ابو داؤد، احمد میں صحیح سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں ان چار اشیاء سے پناہ طلب کرنے والی دعا پڑھتے تھے۔ اسی طرح مسلم اور ابوعوانہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ یہ دعا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اسی طرح سکھلاتے تھے جس طرح قرآن مجید کی سورت سکھلاتے تھے۔

ذیل میں چند مأثور ادعیہ لکھی جاتی ہیں:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری ومسلم میں اس طرح دعا وارد ہے:

(( اللهم انى اعوذبك من عذاب القبر واعوذبك من فتنة المسيح الدجال واعوذبك من فتنة المحيا والممات اللهم انّى اعوذبك من الماثم والمغرم ))

اس روایت میں مأثم اور مغرم کے الفاظ زائد میں مأثم کا مطلب ہے کہ ایسی بات جس کے کرنے سے انسان گناہ گار ہو جائے اور مغرم سے مراد قرض ہے۔

② صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی دعا سکھلائیے جو میں نماز میں پڑھا کروں آپ نے فرمایا، تو کہہ:

(( اللهم انى ظلمت نفسى ظلماً كثيراً ولا يغفرالذنوب الا انت فاغفرلى مغفرة من عندك وارحمنى انك انت الغفور الرحيم ))

③ ابوداؤد، نسائی، احمد، ابن خزیمہ میں بریدۃ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو التحیات پڑھتے ہوئے سنا وہ کہہ رہا تھا:

(( اللهم انى اسئلك بِاَنَّكَ اَنتَ اللّٰهُ الاحد الصمد الذى لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً احد انت تغفرلى ذنوبى انك انت الغفور الرحيم ))

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: " قدغفر له قد غفر له" یعنی اس کو معاف کر دیا گیا اسی کو معاف کر دیا گیا۔

④ مسلم، ابوعوانہ، ابن خزیمہ میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم التحیات اور سلام کے درمیان یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

(( اللهم اغفرلى ما قدمت وماأخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما

انت اعلم به منى انت المقدم و انت المؤخر لااله الاانت ))

قرآن اور حدیث میں کئی ادعیہ وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے دنیا اور آخرت کی خیر اور بھلائی کے لیے جسے جو بھی دعا پسند آئے تو وہ پڑھ سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً تشہد کے متعلق روایت وارد ہوئی ہے کہ:

" ثم يتخير من الدعاء اعجبه فيدعوا"

"التحیات کے پڑھ لینے کے بعد اسے جو دعا پسند آئے پڑھ سکتا ہے۔"

❁❁❁❁

# سلام

اور اس کے بعد نماز سے خارج ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سلام کہے جس طرح ابتدا میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث جو ابوداؤد، ترمذی، حاکم وغیرہ میں مروی ہے حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( مفتاح الصلوٰۃ الطهور تحريمها التكبير و تحليلها التسليم ))

''یعنی نماز کی چابی طہارت ہے اور اس میں جو کام حرام ہیں مثلاً کلام وغیرہ ان کو حرام کرنے والی تکبیر ہے۔'' اور وہ کام جو نماز سے باہر جائز اور حلال ہیں ان کو نماز میں دخول کے بعد حلال کرنے والا صرف سلام ہے یہ حدیث جس طرح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نماز کا دروازہ بند ہے اسے بندہ صرف طہارت ہی سے کھول سکتا ہے، اس طرح یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس نماز کی حرمت میں داخل ہونا تکبیر کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا۔ اس سے خارج ہونا بھی سلام کے بغیر نہیں ہو سکتا اور یہی مذہب جمہور علماء کا ہے اور اسی طرح صحیح بخاری وغیرہ میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ: ''كان اذا سلم الخ'' یعنی جب سلام پھیرتے تھے۔ اس سے بھی وجوب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ''كان اذاسلم'' سے مداومت اور ہمیشگی معلوم ہوتی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں: ''صلوا كما رأيتمونی اصلی'' یعنی جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح پڑھا کرو یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے الجامع میں مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے باقی رہی یہ روایت کہ:

(( اذا احدث وقد جلس فی آخر صلوٰته قبل ان یسلم فقد جازت صلوٰته ))

''جب کوئی شخص نماز کے آخر میں بیٹھا پھر سلام سے پہلے بے وضو ہو گیا تو اس کی نماز مکمل ہو گئی۔''

یہ حدیث ضعیف ہے حدیث کے حفاظ نے اس کی تضعیف کی ہے ایسی ضعیف روایات سے صحیح احادیث کا موازنہ کرنا علمی شان سے بعید ہے۔

سلام دونوں اطراف پھیرنے ہیں، جیسا کہ نسائی وغیرہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے اس طرح روایت مروی ہے کہ:

(( أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يسلم عن يمينه السلام عليكم ورحمة الله حتى يرىٰ بياض خَدِّ الايمن وعن يساره السلام عليكم ورحمة

الله حتٰی یریٰ بیاض حذه الایسر ))

''نبی کریم ﷺ اپنے دائیں بائیں سلام پھیرتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے چہرے کی سفیدی نظر آنے لگتی۔''

اس طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں ان الفاظ سے روایت مروی ہے:

(( کنت اریٰ رسول صلی الله علیه وسلم یسلم عن یمینه ویساره حتٰی اریٰ بیاض خَدِّہٖ ))

''میں رسول اکرم ﷺ کو دیکھتا تھا کہ آپ دائیں بائیں سلام پھیرتے تھے یہاں تک میں آپ ﷺ کے چہرے کی سفیدی کو دیکھتا۔''

بہر حال رکوع اور سجدہ والی نماز میں صحیح طریقہ دونوں اطراف سلام پھیرنا ہی ہے۔ یعنی اس نماز میں ایک طرف سلام پھیرنے پر اکتفاء نہیں کیا جائے گا۔ اس بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ امام عقیل اور امام ابن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ وہ حدیث معلول ہے اور ضعیف ہے جس میں ایک سلام پر اکتفاء کرنا مذکور ہے اور حافظ ابن عبدالبر نے اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

اور کبھی کبھی پہلے سلام یعنی دائیں جانب سلام پھیرنے کے وقت و برکاتہ بھی زیادہ پڑھتے تھے جیسا کہ ابوداؤد میں صحیح سند سے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( صلیت مع النبی صلی الله علیه وسلم فکان یسلم عن یمینه السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وعن شماله السلام علیکم ورحمة الله ))

ابتدا میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سلام پھیرنے کے وقت ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے لیکن پھر اس سے منع کیا گیا۔ جیسا کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں مروی ہے ہم صحیح ابن خزیمہ کے الفاظ لکھتے ہیں۔ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(( کنا اذا صلینا خلف النبی صلی الله علیه وسلم قلنا بایدینا السلام علیکم یمیناً وشمالاً فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم مالی اراکم رافعی ایدیکم کانها اذناب خیل شمس یسکن احدکم فی الصلوٰة ))

''جب ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور جب سلام پھیرتے تو دائیں بائیں جانب ہاتھوں سے اشارہ کرتے تھے تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے کیا ہوا کہ تمہیں دیکھتا ہوں کہ شریر گھوڑوں کی طرح ہاتھوں کو ہلاتے ہو تم میں سے ہر کسی کو نماز میں سکون اختیار کرنا چاہیے۔''

صحیح ابن خزیمہ میں ایک دوسرے طریق یہ الفاظ زائد ہیں۔ ''اما یکفی احدکم ان یضع یده

علیٰ فخذه ثم یسلم عن یمینه وعن شماله " "کیا تم میں سے ہر کسی کو یہ بات کافی نہیں کہ ہاتھوں کو ران پر رکھے پھر دائیں بائیں سلام پھیر دے۔"

جب امام سلام پھیرے تو مقتدی بھی سلام پھیریں جیسا کہ صحیح بخاری میں عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :

(( صلینا مع النبي صلی اللہ علیه وسلم فسلمنا حین سلم ))

"ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر ہم نے سلام پھیر دیا جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا۔"

❁❁❁❁

# سلام کے بعد کے اذکار

سلام پھیرنے کے بعد مقتدیوں اور امام دونوں کو اللہ اکبر کہنا چاہیے جیسا کہ صحیح بخاری، مسلم اور نسائی وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

(( کنت اعرف انقضاء صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالتکبیر ))

''میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختتام تکبیر (اللہ اکبر) سے جان لیا کرتا تھا۔''

اس کے بعد ثوبان رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں اس طرح مروی ہے کہ :

(( کان رسول اللہ اذا انصرف من صلوٰتہ استغفر ثلاثاً وقال اللھم انت السلام ومنك السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام))

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے جب فارغ ہوتے تین بار استغفر اللہ کہتے پھر "اللھم انت السلام الخ" پڑھتے تھے باقی اس دعا میں جو مزید الفاظ پڑھے جاتے ہیں وہ قصہ گو لوگوں نے بنائے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔'' واللہ اعلم بالصواب

نسائی، احمد، ابوداؤد میں صحیح سند سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( اخذ بیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لاحبك یا معاذ فقلت وانا احبك یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فلا تدع ان تقول فی دبر کل صلوٰۃ رب اعنی ))

اور سنن ابوداؤد میں : ((اللھم اعنی علیٰ ذکرك وشکرك وحسن عبادتك ))''معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام کر فرمایا اے معاذ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔'' تو میں نے بھی کہا اے اللہ کے رسول میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر ہر نماز کے بعد "رب اعنی الخ "دعا پڑھنا نہ چھوڑیں۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

((لاالہ الا انت وحدہ لاشریك لہ لہ الملك ولہ الحمد وھوعلیٰ کل شیء قدیر،اللھم لامانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا لجد منك الجد ))

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے سلام

پھیرتے تھے تو بلند آواز سے اس طرح کہتے:

(( لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ لہ الملك و لہ الحمد وھوعلیٰ کل شئي قدیر لاحول ولا قوۃ الا باللہ لاالہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ لہ النعمۃ ولہ الفضل ولہ الثناء الحَسَنُ لا الہ الا اللہ مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرُوْنَ ))

جامع ترمذی میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے حسن سند سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص فجر نماز کے بعد بیٹھا رہا اور بات نہ کی اور یہ کلمات دس مرتبہ کہے تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی اور دس برائیاں مٹائی جائیں گی اور اس کے دس درجات بلند ہوں گے اور وہ سارا دن شیطان کے شر سے محفوظ رہے گا وہ کلمات یہ ہیں:

(( لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریك لہ لہ الملك و لہ الحمد یحیی ویمیت وھو علیٰ کل شئی قدیر ))

مسند احمد میں ابوایوب رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ کلمات پڑھنے کا امر مغرب نماز کے بعد بھی وارد ہوا ہے۔ لیکن اس میں یحیی ویمیت کے الفاظ نہیں۔ ابوداؤد ابن حبان میں مسلم بن الحارث رضی اللہ عنہ سے حسن سند سے روایت ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر اور مغرب کی نماز کے بعد "اللھم اجرنی من النار" 7 مرتبہ پڑھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول مبارک تھا کہ سلام کے بعد کچھ دیر بیٹھے رہتے پھر مڑ کر صحابہ سے متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ جس طرح صحیح بخاری میں سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

(( کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلّی صلوٰۃ اقبل علینا بوجھہ))

"جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو جاتے تو ہم سے متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے۔"

سیدھی طرف مڑنے کی روایت صحیح مسلم میں بھی ہے اور نسائی میں صحیح سند سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ میں نے اکثر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب سے مڑتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہمیشہ دائیں جانب سے مڑتے تھے اور بائیں جانب سے نہیں مڑتے تھے بلکہ کبھی کبھی بائیں جانب سے بھی مڑتے تھے۔ جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بائیں جانب سے کئی مرتبہ مڑتے ہوئے دیکھا۔ [بخاری و مسلم] اور صحیح ابن حبان اور نسائی کی سنن الکبریٰ اور طبرانی کبیر میں صحیح سند سے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( من قرأ آیۃ الکرسی دبر کل صلوٰۃ مکتوبۃ لم یکن بینہٗ و بین الجنۃ ان یدخل الجنۃ الا ان یموت ))

"جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اس کے اور جنت میں داخل ہونے میں

رکاوٹ صرف موت ہی ہے۔"

اور اس باب میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ابونعیم اصبہانی کی کتاب حلیۃ الاولیاء میں حسن سند سے روایت مروی ہے۔ اس طرح حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے طبرانی کبیر میں بھی اسی مضمون کی روایت مروی ہے۔ علامہ منذری نے اسے حسن کہا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے ہر نماز کے بعد سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ، الحمدللہ ۳۳ مرتبہ، اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ اور ۱۰۰ کو پورا کرنے کے لیے (( لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہٗ الحمد وھو علیٰ کل شيء قدیر)) پڑھا تو اس کے گناہ معاف کیے جائیں۔ اگرچہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ [مسند احمد، ابوداوٗد، نسائی، بیہقی] دعوات الکبیر میں حسن سند سے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم کیا کہ میں ہر نماز کے بعد "قل أعوذ برب الفلق قل اعوذ برب الناس" پڑھتا رہوں۔

## فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے:

خاص طور پر فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت ہے اس لیے فرض نماز کے بعد جتنی ہو سکے دعا مانگنے میں کوشش کیا جائے۔ جیسا کہ جامع الترمذی میں ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے حسن سند سے روایت ہے کہ:

(( قیل یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أی الدعاء أسمع قال جوف اللیل الآخر و دبر المکتوبات ))

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کونسی دعا زیادہ سنی جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ دعا جو رات کے آخری حصہ میں اور فرض نمازوں کے بعد۔

## مرد اور عورت کی نماز میں فرق نہیں:

نماز کے طریقہ کے متعلق جو کچھ گزر چکا اس میں خواتین و حضرات برابر ہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں کوئی بھی ایسی چیز وارد نہیں ہوئی جس کی یہ اقتضاء ہو کہ نماز کے احکامات میں سے کسی حکم میں سے عورت مستثنیٰ یا خارج ہے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: (( صلو کما رأیتمونی اصلی)) اپنے عموم سے عورتوں کو بھی شامل ہے۔ ابراہیم نخعی سے ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے منقول ہے کہ:

((تفعل المرأۃ فی الصلوٰۃ کما یفعل الرجل ))

"عورت نماز میں اس طرح کرے جس طرح مرد کرتے ہیں۔"

باقی وہ روایت جو ابوداوٗد میں ہے کہ عورت مرد کی طرح نہیں ہے وہ سجدہ میں اپنے آپ کو گھٹنوں اور رانوں سے ملائے۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ مرسل وضعیف ہے اور ضعیف روایت سے استدلال لینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند عبداللہ رحمہ اللہ نے اپنے والد سے جو مسائل نقل کیے ہیں ان

میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے:

(( انهٗ كان يأمر نسائهٗ يتربصن فى الصلوٰة ))

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی عورتوں کو حکم فرماتے تھے کہ وہ نماز میں بیٹھیں۔'' اس کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری ہے جو کہ ضعیف ہے۔ امام بخاری اپنی کتاب تاریخ صغیر میں صحیح سند سے ام الدرداء رضی اللہ عنہا جو کہ مشہور صحابی ابوالدرداء کی اہلیہ محترمہ ہیں سے روایت ہے:

((انها كانت تجلس فى صلوٰتها جَلْسَةَ الرجل و كانت فَقِيْهَةً ))

یعنی ام الدرداء رضی اللہ عنہا نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور بی بی صاحبہ فقیہ تھی۔ مسند براز میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( إنما النسآء شقائق الرجال ))

''عورتیں اعمال کے اعتبار سے مردوں کی ہی مثل ہیں۔''

انھیں بھی اسی طرح کرنا ہے جس طرح مرد کرتے ہیں۔ یہ روایت احمد ابو داوٗد، ترمذی نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے مگر مشہور محدث ابن القطان فرماتے ہیں کہ یہ روایت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے ضعیف ہے اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے طریق سے صحیح ہے لیکن یہ ضعیف روایت بھی صحیح روایت کی تائید میں لائی جاسکتی ہے۔ مطلب کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز وغیرہ اعمال میں عورتوں کو مردوں کی طرح عمل کرنا ہے۔

## نماز کے متعلق بعض فوائد کا بیان:

### فائدہ نمبر ا:

معیقیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا جو نماز میں کنکریوں کو ہٹا رہا تھا کہ اگر کنکریوں کو ہٹا رہے ہو تو ایک مرتبہ ہٹا دو۔ یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے۔

صحیحین میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( رأيت النبى صلى الله عليه وسلم يؤم الناس وامامة بنت ابى العاص علىٰ عاتقهٖ فاذا ركع و ضعها واذا رفع السجود اعادها ))

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا کہ نماز پڑھا رہے تھے اور حال یہ ہے کہ اپنی نواسی امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھائے ہوئے ہیں، پھر جب رکوع کرتے تو اس کو اتار دیتے اور جب دوسرے سجدے سے سر مبارک اٹھاتے تو پھر اسے اٹھا لیتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں بچہ اٹھانا درست ہے۔ اس سے ان ماؤں کے لیے زیادہ آسانی پیدا ہوتی

ہے جن کے بچے چھوٹے ہوتے ہیں اور نماز کے وقت ان کو چھوڑتے بھی نہیں وہ عورت نماز ہی میں اپنے بچے کو اٹھا سکتی ہے۔

**فائدہ نمبر ۲:**

صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( اذا تثاؤب احدکم فلیکظم ما استطاع فان الشیطان یدخل فی فمه ))

''جب تم میں سے کوئی شخص جمائی لے اسے چاہیے کہ اسے روکے جتنی طاقت رکھتا ہو، بے شک شیطان اس کے منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔''

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( التثاؤب من الشیطان فاذا تثاءب احدکم فلیرده ما استطاع فان احدکم اذا قال "ھا" ضحك الشیطان ))

''جمائی شیطان کی طرف سے ہے جب تم میں کوئی جمائی لے اسے چاہیے کہ اسے روکے جتنی طاقت رکھتا ہو پس بے شک تم میں کوئی ایک جب (جمائی کے وقت) ہا، ہا کے الفاظ نکالتا ہے تو شیطان اس پر ہنستا ہے۔''

نیز ترمذی میں صحیح سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( التثاؤب فی الصلوٰۃ من الشیطان فاذا تثاؤب احدکم فلیکظم ما استطاع ))

''نماز میں جمائی شیطان کی طرف سے ہے، پس جب تم میں سے کوئی جمائی لے تو اسے چاہیے کہ مقدور بھر اسے روکے۔''

ترمذی کتاب الادب میں حسن سند سے روایت مروی ہے۔ اس میں یہ الفاظ زائد ہیں: " فلیضع یدهٗ علی فیه" یعنی اگر اسے روک نہ سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ دے۔

**فائدہ نمبر ۳:**

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( من نابهٗ شیءٌ فی صلوٰته فلیسبح فانما التصفیق للنساء ))

'' جب تمھیں نماز میں کوئی بات پیش آئے تو اسے چاہیے کہ وہ سبحان اللہ کہے۔ کیونکہ تالی بجانا عورتوں کے لیے ہے۔''

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ:

(( التسبیح للرجال والتصفیق للنساء )) "یعنی مردوں کے لیے سبحان اللہ کہنا اور ہے عورتوں

کے لیے تالی بجانا۔" یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے۔

**فائدہ نمبر ۴:**

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں ہوتے اور کوئی سلام کہتا تو آپ سلام کا جواب کس طرح دیتے تھے۔ تو بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھ کے اشارہ سے۔ یہ روایت امام ترمذی رحمہ اللہ لائے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نفلی نماز پڑھ رہے تھے اور دروازہ بند تھا (اور دروازہ قبلہ کی طرف تھا):

(( فجئت فاستفتحت فمشی ففتح لی ثم رجع الی مصلاہ ))

"میں آئی اور دروازہ کھولنے کی طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل کر آئے اور میرے لیے دروازہ کھول دیا اور پھر واپس جا کر اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے۔"

یہ روایت احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند حسن صحیح ہے۔

**فائدہ نمبر ۵:**

**جماعت، اس کی فضیلت اور اس کی ضرورت:**

صحیح بخاری اور مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( صلوٰۃ الجماعۃ تفضل مِنْ صلوٰۃ الْفَذِّ بسبع و عشرین درجۃ ))

"منفرد کی نماز سے جماعت والے کی نماز (۲۷) مرتبہ افضل اور بہتر ہے۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( والذی نفسی بیدہٖ لقد هممت ان آمر بحطب فیحطب ثم آمر بالصلوٰۃ فیؤذن لھا ثم آمر رجلاً فیؤم الناس ثم اخالف الی رجال لایشھدون الصلوٰۃ فاحرق علیھم بیوتھم والذی نفسی بیدہٖ لو یعلم احدھم انہٗ یجد عرقاً سمینا او مرماتین حسنتین لشھد العشاء ))

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، البتہ تحقیق میں چاہتا ہوں کہ لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم دوں کہ جمع کی جائیں۔ تم ایک شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں وہ لوگوں کو نماز پڑھائے، پھر میں آؤں ان لوگوں کے گھروں کی طرف جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے پس میں ان کو ان کے گھروں سمیت جلا دوں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان

ہے اگر ان میں کسی کو علم ہو جائے کہ انھیں گوشت بھری ہوئی ہڈی مل جائے گی یا دو اچھے والے پائے ملیں گے تو وہ ضرور عشاء نماز میں حاضر ہوں۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک نابینا شخص حاضر ہوا اور عرض کیا (اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کوئی نماز کے لیے مسجد کی طرف لے جانے والا نہیں ہے، اس لیے یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں کہ وہ گھر میں نماز پڑھ لیا کروں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دے دی، پھر جب وہ واپس ہونے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا پھر فرمایا کہ:

﴿ هل تسمع النداء بالصلوٰة قال نعم قال فاجب ﴾

''کیا تو نماز کے لیے اذان سنتا ہے اس نے جواب دیا، جی ہاں سنتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تو اس بلاوے کا جواب دے یعنی مسجد میں آجایا کر۔'' یہ روایت صحیح مسلم میں ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات سخت سردی اور تیز ہوا والی تھی اس میں نماز کے لیے اذان دی، پھر اذان کے بعد یہ الفاظ کہے:

(( اَلَا صَلُّوْا فِي الرِّحَالِ )) ''اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔''

پھر کہا کہ بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی سخت سردی اور بارش والی رات ہوتی تو مؤذن کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ اس طرح اعلان کرے:

(( اَلَاصَلُّوْا فِي الرِّحَالِ )) ''نمازیں اپنے گھروں میں پڑھو۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( اذا وضع عشاء احدكم واقيمت الصلوٰة فابدؤ بالعشاء ولا يعجل حتٰى يفرغ منه وكان ابن عمر يوضع لهٗ الطعام وتقام الصلوٰة فلا يأتيها حتٰى يفرغ منه وانهٗ يسمع قرأة الامام ))

''جب تم میں سے کسی کا کھانا حاضر ہو جائے اور نماز کی اقامت بھی ہو جائے تو تم کھانے سے ابتدا کرو اور جلدی نہ کرے یہاں تک کہ اس سے فارغ ہو جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کھانا رکھا جاتا اور نماز بھی قائم ہو جاتی تو آپ رضی اللہ عنہ نماز پڑھنے نہ آتے یہاں تک کہ فارغ ہو جاتے اور وہ اس وقت امام کی قرأت سن رہے ہوتے تھے۔''

فائدہ نمبر ۶:

صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

(( لا صلوٰة بحضرة الطعام ولا وهو يدافعه الاخبثان ))

''کھانے کے حاضر ہونے اور دونوں پیشابوں کو روکے ہوئے ہونے کی حالت میں نماز نہیں ہوگی۔''

**فائدہ نمبر ۷:**

صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا أُقيمت الصلوٰة فلا صلوٰة اِلّا المكتوبة ))

''جب نماز کی اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی اور نماز نہیں۔''

اس سے محدثین نے یہ دلیل بھی لی ہے کہ اگر کسی نے پہلے نفل شروع کر دیا ہے اور پھر نماز کی تکبیر بھی ہو گئی اور وہ بالکل نفل نماز کے اختتام پر نہیں تو اس کا وہ نفل پڑھنا ختم ہو گیا اور وہ فرض میں شامل ہو جائے اس کی وہ نفل نماز نہیں ہوئی۔ اس پر یہ دلیل بھی ہے کہ قرآن کریم میں سورۂ محمد میں ہے کہ:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾

[محمد : ٣٣]

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔'' یعنی اگر تم اطاعت نہیں کرو گے تو اعمال برباد اور ضائع ہو جائیں گے۔ لہٰذا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اقامت ہو جائے تو اس کی نماز نہیں ہوگی، پھر اس کے باوجود بھی اگر کوئی نفلی نماز پڑھے گا تو اس کا وہ عمل برباد ہو جائے گا۔ اس حدیث کا عموم یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ حکم پانچوں نمازوں کو شامل ہے۔ صبح کی سنتوں کو خارج کرنے کے لیے کوئی بھی صحیح دلیل نہیں۔ بلکہ حافظ ابو احمد بن عدی اپنی کتاب الکامل میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ:

(( قيل يا رسول الله( صلى الله عليه وسلم ) ولا ركعتي الفجر قال ولا ركعتي الفجر ))

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا گیا کہ کیا فجر کی دو رکعت ( سنت بھی ) نہیں ہوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صبح کو دو رکعات بھی نہیں ہوں گی۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد حسن ہے۔ حدیث کی اس تصریح کے بعد اب کسی کے لیے یہ عذر نہ رہا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ایک اور طریقہ سے مسند احمد اور طحاوی کی معانی الآثار میں ان الفاظ سے وارد ہوئی ہے: (( اذا أُقيمت الصلوٰة فلا صلوٰة الا الّتيْ اقيمت لها )) اس کی سند حسن ہے، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی فرض نماز کی اقامت ہو جائے تو دوسری کوئی نماز نہیں ہوگی۔ صرف وہ فرض نماز جس کی اقامت ہو چکی ہے یعنی مثلاً عصر کی نماز کی اقامت ہوئی ہے اب اسی

امام کے پیچھے کوئی بھی مقتدی ظہر نماز کی نیت سے شامل نہ ہو بلکہ اسے عصر نماز ہی کی نیت سے شامل ہونا چاہیے۔

**فائدہ نمبر ۸:**

**جو شخص نمازی کے سامنے سے گزرے اسے کتنا گناہ ہوگا؟**

صحیح بخاری، سنن کبریٰ وغیرہ میں صحابی ابو نعیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( لو يعلم المار بين يدى المصلى ماذا عليه من الاثم لكان ان يقف اربعين خيرلهٗ من ان يمربين يديه قال ابو النضر لاادرى قال اربعين يوماً او شهراً او سنةً ))

''اگر نماز کے سامنے والے کو معلوم ہو جائے کہ اسے کتنا گناہ ہوگا تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ چالیس وہاں رکا رہے۔ راوی ابوالنضر کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ راوی نے (اس کے استاذ نے) چالیس دن کہا یا چالیس ماہ یا پھر چالیس سال کہا۔''

**مسئلہ:**

نمازی کے سامنے سے گزرنے کا گناہ ضرور ہے لیکن اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گزر جائے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ کتا، گدھا یا عورت بھی گزر جائے اگرچہ بعض صحیح روایات میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کتے، گدھے اور عورت کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جائے گی۔ خاص طور پر کالا کتا مگر یہ اوائلی حکم ہے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ کسی چیز کے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سنن دار قطنی میں حسن سند سے انس رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ:

(( ان رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى بنا الناس فمر بين ايديهم حمار فقال عياش بن ابى ربيعة سبحان الله، سبحان الله، سبحان الله فلما سلم رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من المسبح القىٰ سبحان الله قال انا يا رسول الله انى سمعت ان الحمار يقطع الصلوٰة قال لا يقطع الصلوٰة شيءٌ ))

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی تو ان کے سامنے ایک گدھا آ کر گزرا صحابی ابوعیاش بن ابی ربیعہ نے تین مرتبہ سبحان اللہ کہا، پس جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو دریافت فرمایا کہ ابھی سبحان اللہ کہنے والا کون تھا تو انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں تھا، میں نے سن رکھا تھا کہ گدھے کے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کو کوئی چیز بھی نہیں توڑتی۔''

**فائدہ نمبر ۹:**

اگر نماز میں کھڑے ہونے اور کچھ پڑھنے کے بعد نمازی کو معلوم ہو جائے کہ میرے کپڑوں وغیرہ کو

نجاست لگی ہے تو اگر ممکن ہو تو اتار دے یعنی ٹوپی، چپل وغیرہ اگر ممکن نہ ہو تو لباس اتارنے والی صورت میں اتارنے سے پہلے والی نماز ہو گئی۔ جیسا کہ سنن الکبریٰ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول الله صلى الله عليه وسلم فى نعليه فصلى الناس فى نعالهم ثم القى نعليه فالقى الناس نعالهم وهم فى الصلوٰة فلما قضى صلوٰتهٗ قال ما حملكم على القاء نعالكم فى الصلوٰة قالو يا رسول الله رأيناك فعلت ففعلنا فقال ان جبرئيل عليه السلام اخبرنى ان فيها اذىً فاذا اتى احدكم المسجد فلينظر فان رأى فى نعليه اذىً اَلْقِهُمَا والافليصل فيهما ))

''رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ جوتی پہن کر نماز پڑھی تو لوگوں نے بھی پہن رکھی، پھر نماز ہی میں آپ ﷺ نے جوتی اتار دی تو لوگوں نے بھی اتار دی، پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ تمھیں کس چیز نے جوتیاں اتارنے پر ابھارا؟ تو انھوں نے جواب دیا، اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنی جوتی اتار دی تو ہم نے بھی اتار دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک جبرائیل علیہ السلام نے مجھے اطلاع کی کہ میری جوتی میں گندگی ہے اس لیے میں نے اتار دی پس جب تم میں کوئی ایک مسجد میں آئے تو چاہیے کہ دیکھے اگر اس کی جوتی میں گندگی لگی ہوئی نہیں تو جوتی پہن کر نماز پڑھ لے۔''

اس حدیث کے دوسرے طریق میں یہ الفاظ زائد ہیں:

(( فان وجد خبثا فليمسحَهُمَا بالارض ثم ليصل فيها ))

''جب اپنی جوتی میں گندگی دیکھے تو اس زمین سے مسل دے پھر اس میں نماز پڑھے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جوتی پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر کوئی ضرورت ہو تو جوتا پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے، مگر نماز کے دخول سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ جوتی میں گندگی تو نہیں لگی اگر لگی ہے تو اسے زمین پر مسل کر نماز پڑھ لے اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کو گندگی کا علم اس وقت ہوا جب وہ کچھ نماز پڑھ چکا ہو تو اس کی پڑھی ہوئی نماز کا حصہ فاسد نہیں ہو گا۔ باقی اس چپل وغیرہ کو نجاست کے لگے ہوئے ہونے کے علم ہونے سے اتار دے۔

**فائدہ نمبر ۱۰:**

صحیح مسلم میں سیدہ زینب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ سے روایت ہے کہ:

(( قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا شهدت احداكن المسجد فلا

تمس طیبا ))

''تم میں سے کوئی بھی عورت جب مسجد میں آئے تو وہ خوشبو کو نہ چھوئے۔''

اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( ایما امرأة اصابت بخورا فلا تشهد معنا العشاء الآخرة ))

''جو عورت خوشبو استعمال کرے وہ ہمارے ساتھ مسجد میں حاضر نہ ہو۔''

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے عمدہ سند سے ابوداؤد میں روایت مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( لا تمنعوا نساؤكم المساجد وَ بيوتهن خير لهن ))

''اپنی عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے مت روکو اور ان کے گھر ان کے لیے مساجد سے بہتر ہیں۔''

اور ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( كل عين زانية وَ المرأة اذا استَعطَرَتْ فمرت بالمجلس فمن كذا وَكذا يعني زانية ))

''ہر آنکھ زنا کرنے والی ہے (یعنی عملاً کسی غیر محرم کو دیکھنے کی وجہ سے) بے شک کوئی (غیر محرم) عورت خوشبو لگا کر کسی مجلس سے گزری وہ اس طرح ہے، یعنی زانیہ ہے۔''

یہ روایت امام ترمذی لائے ہیں اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

**فائدہ نمبر ۱۱:**

عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا أقيمت الصلوٰة و وجد احدكم الخلاء فليبدأ خلاء ))

''جب اقامت ہو جائے اور تم میں سے کوئی بیت الخلاء کا ارادہ کرتا ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے اس سے فارغ ہو کر پھر نماز پڑھے۔''

یہ روایت امام ترمذی رحمہ اللہ لائے ہیں اور فرمایا کہ یہ روایت حسن صحیح ہے۔

**فائدہ نمبر نمبر ۱۲:**

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :

(( امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كنتم في المسجد فنودي بالصلوٰة فلا يخرج احدكم حتى يصلي ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا کہ جب ہم مسجد میں ہوں تو پھر اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نہ

نکلیں، یہاں تک کہ نماز پڑھ لیں۔"

یہ روایت مسند احمد میں حسن سند سے موجود ہے اور تابعی ابو الشعثاء فرماتے ہیں کہ ایک شخص اذان کے بعد مسجد سے نکل گیا تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

(( اما ھذا فقد عصیٰ ابا القاسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم )) [مسلم]

"اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ لہٗ الامن عذر ))

"جس شخص نے اذان سنی پھر نماز کی طرف نہ آیا اس کی نماز نہیں ہوتی مگر عذر کی وجہ سے۔"

یہ روایت ابن ماجہ، دارقطنی اور ابن حبان میں صحیح سند سے موجود ہے۔

**فائدہ نمبر ۱۳:**

① جماعت وغیرہ میں شامل نہ ہونے کا پہلا عذر یہ ہے کہ بیمار ہے، جماعت میں شمولیت کی طاقت نہیں رکھتا، اس لیے دلیل یہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت آخر میں ناساز تھی، اس لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔

② کھانا سامنے آجائے اور اسے کھانے پر اشتیاق ہو تو پہلے کھانا کھا کر بعد میں نماز پڑھے۔ اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے۔

③ کسی شخص سے بھول ہوگئی یا نیند آگئی جس کی وجہ سے وقت نکل گیا تو جس وقت اسے جاگ ہوئی یا یاد آیا تو اس وقت نماز پڑھ لے۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ حنین سے لوٹ کر رات کو چلتے رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نیند کا غلبہ ہوگیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتر گئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ آج رات آپ ہماری حفاظت کرنا۔ پھر بلال رضی اللہ عنہ کو جتنی طاقت تھی نفل پڑھتے رہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سو گئے، پھر جب صبح کا وقت قریب ہوا تو بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی سواری سے ٹیک لگائی اور صبح صادق کو معلوم کرنے کے لیے اس طرف دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ بلال رضی اللہ عنہ کو نیند آگئی اور حال یہ تھا کہ اپنی سواری کو ٹیک لگا کر بیٹھے ہی تھے پھر صحابہ رضی اللہ عنہم۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بلال رضی اللہ عنہ میں سے کسی کو جاگ نہ ہوئی یہاں تک کہ سورج کی روشنی آکر انھیں لگی تو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاگے اور پھر خوف زدہ ہوئے اور فرمایا: اے بلال یہ کیا؟ تب بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے بھی وہ چیز لے گئی جو آپ کو لے گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی سواریوں کو ہانکو جب آگے

روانہ ہوئے تو (کسی جگہ پر) آپ ﷺ نے فرمایا وضو کرو، پھر نبی ﷺ نے وضو کیا اور بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نماز کے لیے اقامت کہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ: (( من نَسِیَ الصلوٰۃ او نام عنها فلیصل اذ اذکرها فان اللہ تبارك و تعالیٰ قال اقم الصلوٰۃ لذکری )) یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس سے نماز بھول گئی یا نیند آ گئی تو پھر اسے جب یاد آئے تب پڑھے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے، میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

④ کوئی شخص بہت زیادہ موٹا ہو نماز پر آنے سے معزور ہو۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک شخص جو بہت زیادہ موٹا تھا، اس نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ:

" انّی لا أستطیع الصلوة معك فلو اَتَیْكَ منزلی فصلیت فیه فَاَقْتَدِیْ بك وَضَعَ الرجل لهٗ طعاماً ودعاه الی بیتہٖ فبسط لهٗ طرف حصیر لَهُمْ فصلی علیه رکعتین " ❶ [الحدیث]

"میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا تو پھر آپ میرے گھر آئیں اور وہاں نماز پڑھو تو میں آپ کی اقتدا کروں، پھر اس شخص نے طعام تیار کروایا اور آپ کو اپنے گھر بلایا اور آپ ﷺ کے لیے چٹائی بچھائی۔ آپ ﷺ نے وہاں دو رکعت نماز پڑھی۔"

⑤ جس شخص کو مسجد کی طرف آنے میں مال یا جان کے متعلق خوف ہو اس کے متعلق صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے محمود بن الربیع الانصاری سے روایت ہے کہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ انصار میں سے تھے اور جنگِ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میری آنکھ خراب ہو گئی ہے اور میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں۔ پھر جب بارش ہو جاتی ہے تو وہ ریت جو میرے اور میری قوم کے (گھروں) کے درمیان ہے بہہ پڑتی ہے اور مجھے یہ طاقت نہیں ہوتی کہ میں جا کر ان کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھوں۔ اس لیے مجھے یہ بات پسند ہے کہ آپ میرے گھر آ کر نماز پڑھیں تاکہ میں اسی جگہ کو نماز کے لیے خاص کر دوں۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے جواب دیا کہ میں عنقریب ایسا ہی کروں گا۔ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر دوسرے دن رسول اکرم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے۔ آپ ﷺ نے اجازت طلب کی، میں نے اجازت دی، پھر جس وقت گھر میں داخل ہوئے تو بیٹھے نہیں، پھر فرمایا کہ کونسی جگہ پر پسند کرتے ہو کہ میں وہاں نماز پڑھوں، میں نے گھر کے ایک طرف اشارہ کیا، پھر آپ ﷺ نے

❶ ابن حبان۔ کتاب الصلاۃ۔ جلد ٥ جلد ٤٢٦۔ رقم الحدیث : ٢٠٧٠

تکبیر کہی پھر ہم پیچھے کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے دو رکعات پڑھیں اور سلام پھیر دیا۔ الخ

⑦ سخت سردی اور تکلیف دینے والی چیز کی وجہ سے جماعت میں شامل نہ ہو سکے۔ نافع مولیٰ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فجنان والی جگہ پر آئے، وہاں سردی تھی پھر ان کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر نماز پڑھیں اور ہمیں حدیث سنائی کہ رسول اکرم ﷺ جب ٹھنڈی رات میں کسی جگہ اترتے تو پھر حکم فرماتے تھے کہ (لوگ) وہاں (اپنے گھروں میں) نماز پڑھیں۔

رواہ ابن حبان بسند صحیح

⑧ بارش کا ہونا۔ اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس بات کی دلیل کہ تھوڑی بارش ہو تو پھر گھروں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان میں معتبر سند سے اسامہ بن عمیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ صلح حدیبیہ میں ساتھ تھے تو بارش ہو گئی لیکن بہت کم تو آپ ﷺ نے مؤذن کو حکم دیا کہ: "الا صلوا فی الرحال" کا اعلان کرے۔

⑨ ایسا کوئی سبب ہو کہ آدمی اپنے مرنے کا ڈر ہو۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے اور اندھیری اور بارش والی رات تھی تو رسول اکرم ﷺ کا مؤذن اعلان کرتا تھا کہ: "الا صلوا فی الرحال" یعنی اپنی جگہوں پر نماز پڑھیں۔

**فائدہ نمبر ۱۴:**

جو شخص پیاز یا لہسن بدبودار چیز کھائے تو وہ مسجد میں نہیں آ سکتا۔ صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اکل من ھذہ الشجرة فلا اتین المسجد ))

"جس شخص نے ان اقسام جس طرح پیاز، لہسن کھائے تو وہ مسجد میں نہ آئے۔"

صحیح ابن حبان میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بسند حسن روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس لہسن اور پیاز کا ذکر کیا گیا، پھر پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ان میں سے لہسن زیادہ بدبودار ہے، کیا پھر ہم ان کو حرام کر دیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا، حرام نہیں ہیں، تم کھا سکتے ہو لیکن اگر کوئی کھائے تو جب تک بدبو ختم نہیں ہوئی مسجد میں نہ آئے اور صحیح ابن حبان میں عمدہ سند سے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس قسم کی چیز نباتات میں سے کھائے وہ ہماری مساجد کے قریب ہی نہ جائے کیونکہ جس طرح لوگوں کو بدبو کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح فرشتوں کو بھی اس بدبو سے ایذا ہوتی

ہے۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے روایت ہے کہ معدان بن ابی طلحہ الیعمری تابعی نے فرمایا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا (اس خطبہ میں کئی باتوں کا ذکر فرمایا) ان میں سے ایک بات یہ بھی بیان فرمائی، اے انسانو! تم دو ایسی گندی چیزیں کھاتے ہو یعنی پیاز اور لہسن اور بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص سے اس طرح کی بدبو آتی تھی تو حکم فرماتے تھے کہ اسے مسجد سے نکال کر بقیع تک چھوڑ کر آجاؤ۔ لہٰذا اگر تمھیں یہ چیزیں کھانی ہی ہیں تو پھر پکا کر کھاؤ، پکانے سے بدبو ختم ہو جائے گی۔ بقیع تک کے الفاظ صحیح مسلم میں بھی ہیں۔ جیسا کہ ابن حبان میں بسند صحیح مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے لہسن کھایا، پھر میں آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یعنی نماز کے لیے پھر میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے پہلے ایک رکعت پڑھ چکے تھے پھر جب میں اس چھوڑی ہوئی رکعت کے لیے کھڑا ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لہسن کی بدبو محسوس ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے اس قسم کی سبزیوں میں کھایا ہو وہ ہماری مسجد کی طرف نہ آئے اور نہ ہی قریب ہو یہاں تک کہ اس کی بدبو ختم ہو جائے۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نماز پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے عذر ہے پھر مجھے ہاتھ مبارک ملائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ ملایا پھر اللہ کی قسم کہ ہاتھ مبارک مجھے بہت سہل اور آسان محسوس ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مجھے پٹی باندھی ہوئی ہے، پھر فرمایا کہ ہاں بے شک تجھے عذر ہے۔ جب اس لہسن اور پیاز کی طرح اشیاء کو کھا کر مسجد کی طرف آنا ممنوع ہے تو پھر ہمارے مسلمان بھائی سگریٹ نوشی کر کے مسجد میں آتے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو کتنی ایذا پہنچتی ہو گی اور اللہ تعالیٰ کی کتنی ناراضگی ہوتی ہو گی، اس کا اندازہ ہر ایک سلیم العقل شخص لگا سکتا ہے، اس لیے نمازی شخص کو ایسی تمام اشیاء سے قطعی طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔

**فائدہ نمبر ۱۵:**

اگر نماز میں قرأت کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آئے تو قاری خواہ سامع پر محققین کے مسلک کے مطابق ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے۔ یعنی صرف اتنا کہے اس پر جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں حسن سند سے مروی وہ روایت ہے جس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اشخاص پر بددعا فرمائی۔ ان میں سے تیسرے شخص کے متعلق فرمایا:

(( رغم انف رجل ذکرت عندہٗ و لم یصل علی ))

''اس شخص کا ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر ہو لیکن اس نے مجھ پر درود نہ پڑھا۔''

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت جو صحیح ابن حبان میں ہے اس سے بہت سخت الفاظ سے مروی ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر کے تین زینوں پر آمین کہا پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ جبریل میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ تین اشخاص اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ پھر آپ کہیں آمین

تو میں نے آمین کہی۔ ان میں سے تیسرے شخص کے متعلق یہ الفاظ وارد ہیں:

(( من ذکرت عِندَہٗ فلم یصل علیك فمات دخل النار فابعد الله قل آمین قلت آمین ))

''تیسرا وہ شخص جس کے پاس آپ کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے پھر مر جائے جہنم میں داخل ہو پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور کرے آپ کہیں آمین تو میں نے آمین کہی۔''

جبریل علیہ السلام کسی شخص کے متعلق بد دعا کریں اور نبی ﷺ اس پر آمین کہیں تو سب کوئی سمجھ سکتا ہے کہ وہ دعا یقیناً قبول ہوگئی اور حدیث کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کے نام لینے کے وقت درود نہ پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکارا ہوا ہے اور وہ جہنم کی آگ میں داخل ہوسکتا ہے۔ مطلب کہ آپ ﷺ کے ذکر کے وقت صلوٰۃ پڑھنا لازم اور فرض اور اس حدیث میں اس حکم کو کسی خاص جگہ یا وقت یا محل و موقع یا نماز سے باہر یا اندر کسی سے بھی خاص نہیں بنایا گیا بلکہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کا ذکر ہوگا تو صلوٰۃ پڑھنی ہوگی اور صلوٰۃ نماز میں نماز کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ تشہد اور التحیات میں صلوٰۃ پڑھی جاتی ہے اگر یہ کام نماز کے منافی ہوتا تو اس جگہ پر درود ہرگز نہ پڑھا جاتا جب نماز میں چھینک دینے والا ((الحمد لِلّٰہِ حمداً کثیراً الی آخر)) کہنے کی اجازت ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، تو درود بالتم والی وجہ پر پڑھی جائے گی، صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اوپر برکت اور رحمت بھیجنا۔ صلوٰۃ کا مطلب ہے بندہ عرض کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ پر برکات اور رحمت نازل فرما، پھر یہ دعا ہی کہی جائے گی اور نماز دعاؤں سے بھرپور ہے، لہٰذا صحیح بات یہ ہے کہ نماز میں اگر نبی ﷺ کا اسم گرامی لیا جائے تو درود پڑھا جائے مگر درود آہستہ پڑھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

**فائدہ نمبر ۱۶:**

**سجدہ سہو کا بیان:** صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو اس کے پاس شیطان آتا ہے، پھر اس کو مشکوک بات بتا دیتا ہے یہاں تک کہ اسے خبر نہیں پڑتی کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے:

(( فاذا وجد ذالك احد کم فَلْیَسْجُدْ سجدتین وھو جالس ))

''جب کسی کو اس طرح کا واقعہ پیش آئے تو اسے چاہیے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے ادا کرے۔''

صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کو نماز میں شک میں پڑ جائے، پھر اسے معلوم نہ ہوسکے کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔ تین رکعات پڑھیں یا چار تو پھر اسے چاہیے شک کو دور پھینک دے اور اس بات پر بنا کرے اس بات پر جو یقینی ہو (یعنی شک ہے

کہ چوتھی میں تو چوتھی کو چھوڑ کر بنا کرے تین پر ایک رکعت پڑھے) پھر دو سجدے ادا کرے سلام پھیرنے سے پہلے پھر اگر اس نے پانچ رکعات پڑھی ہوں گی تو وہ دو سجدے اس کے لیے کفارہ بنیں گے اور اگر اس نے چار رکعات پڑھی ہوں گے تو وہ دو سجدے شیطان کے لیے رسوائی کا باعث بنیں گے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے ظہر نماز پانچ رکعات پڑھائی، پھر کہا گیا کہ کیا نماز میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا معاملہ ہے تو جواب دیا گیا کہ آپ نے پانچ رکعات پڑھائی ہیں۔ پھر دوبارہ آپ ﷺ سلام کے بعد دو سجدے ادا کیے اس طرح ایک روایت میں اس طرح ہے کہ میں بھی تمھاری طرح انسان ہوں: "انسیٰ کَمَا تنسون" جس طرح تم بھول جاتے ہو تو میں بھی بھول جاتا ہوں: "فاذا نسیتُ فذکرونی" پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلاؤ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں شک کرے تو:

((فلیتحری الصواب فلیتم علیه ثم یسلم ثم یسجد سجدتین))

"اسے چاہیے کہ صحیح بات تلاش کرنے کی کوشش کرے پھر اسے پورا کرے پھر سلام پھیرے اور پھر دو سجدے ادا کرے۔"

نوٹ: پہلی صورت میں ایک رکعت کے متعلق شک تھا یعنی کم پر بنا تھا اسے شک ایک رکعت میں ہے کہ تیسری رکعت میں ہے یا چوتھی۔ دوسری صورت جو درست بات اور غور وفکر کی طلب ہے وہ صورت وہ ہے جس میں نماز کو معلوم ہی نہیں کہ میں نے کتنی پڑھی ہے اس صورت میں درست بات کو طلب کرنا ہوگا کیونکہ تحری کی معنیٰ لغت میں ایسی بات کی طلب کرنا ہے جو صواب اور صحیح بات کے زیادہ لائق ہو اس کے بعد جو نتیجہ اس پر زیادہ غالب اور راجح نظر آئے اس پر نماز کو مکمل کرے اور پھر سلام کے بعد دو سجدے ادا کرے۔ ان دونوں حدیثوں میں اس طرح کی تطبیق امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں پیش کی ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی کہ ثواب طلب کرنا اور پھر راجح بات پر نماز کو مکمل کرنا۔ اس کا یہی مطب ہے کہ کم پر یقین رکھے باقی نماز کو مکمل کرے لیکن ان کے ایسا کہنے پر اعتراض ہوگا کہ حدیث میں سجدہ سہو جو سلام کے پہلے وارد ہے۔ پہلی صورت میں یعنی تحری اور صواب کی صورت میں سلام کے بعد سجدہ سہو کا حکم ہے، لہٰذا دونوں ایک صورت کیسے صحیح بنیں گے۔ اس لیے جمع وتطبیق وہی درست ہے جو امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چار رکعتوں والی نماز کو پانچ رکعت بھول میں پڑھنا والی حدیث پر امام ابوالحسن السندھی رحمہ اللہ نے نسائی شریف میں حاشیہ لگایا ہے کہ ہمارے حنفی مذہب کے علماء اس حدیث کو اس طرح حمل کیا ہے کہ نبی ﷺ چوتھی

رکعت میں بیٹھے تھے کیونکہ آخری تشہد میں بیٹھنے کو ترک کرنا اس کے نزدیک نماز کو فاسد کرنے والا ہے، لیکن یہ بات مخفی نہ رہے کہ چوتھی رکعت کی ابتدا میں بیٹھنا یا تو اس گمان سے ہوگا کہ وہ چوتھی رکعت ہے یا یہ کہ وہ دوسری رکعت ہے یہ دونوں امور اس بات تک پہنچاتے ہیں کہ نبی ﷺ سے اس واقعہ میں ایک سے زیادہ سہو واقع ہوئے ہیں۔ اس بات کو دلیل کے بغیر ثابت کرنا مشکل ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے ظاہر ہے آپ ﷺ اس پہلی رکعت میں بیٹھے ہی نہیں وہ اس لیے کہ جب ہم گمان کریں کہ چوتھی رکعت ہے تو اس میں دوبارہ پانچویں کی طرف اٹھنا اس بات کی طرف محتاج ہے کہ آپ ﷺ کو چوتھی رکعت میں بیٹھنے کے بعد بھول ہوگئی یہ محسوس ہوا کہ یہ چوتھی نہیں ہے بلکہ تیسری ہے تو سوچا کہ بیٹھنے میں غلطی ہو گئی ہے اور اس وقت لائق یہ تھا کہ آپ سہو کے سجدے ادا فرما دیتے پھر سجدہ سہو کو ترک کرنا اس بات کی طرف احتیاج ہے کہ آپ ﷺ کو جو چوتھی رکعت کا خیال آیا کہ وہ چوتھی نہیں بلکہ تیسری ہے، اس کے بعد جب صحابہ رضی اللہ عنہم پوچھتے ہیں کہ نماز میں کچھ اضافہ ہوا ہے تو آپ ﷺ کہتے ہیں کہ کیا بات ہے؟ اس کی اقتضاء یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ایسی بھول ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یاد دلانے پر بھی متنبہ نہ ہوئے خود یہ بات دوری سے خالی نہیں اور اگر ہم کہیں کہ آپ ﷺ چوتھی رکعت پر اس گمان سے بیٹھے کہ وہ دوسری رکعت ہے تو پھر یہ بھول دوری کے باوجود اسی بات کی تقاضا کرتی ہے کہ آپ ﷺ پانچویں پر نہ بیٹھتے بلکہ چھٹی رکعت پر بیٹھتے پھر پانچویں رکعت پر بیٹھنا اس بات کی طرف احتیاج رکھتا ہے کہ آپ ﷺ کے متعلق دوسرے سہو کا اعتبار کیا جائے اور صحیح بخاری اور مسلم میں عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ ظہر نماز پڑھا رہے تھے اور پھر دو رکعتوں پر نہ بیٹھے بلکہ اٹھ کر تیسری رکعت میں چل دیے پھر جب نماز مکمل کی اور لوگوں نے آپ ﷺ کے سلام کا انتظار کیا کہ آپ بیٹھے ہی تھے کہ تکبیر کہہ کر دو سہو کے سجدے ادا کیے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سے درمیانہ تشہد بیٹھنا بھول گیا اور کھڑا ہو جائے تو وہ نماز مکمل کر کے سلام سے پہلے سہو کے دو سجدے ادا کرے پھر سلام پھیر دے اور صحیح ابن خزیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ) اس حدیث میں ) صحابہ رضی اللہ عنہم تسبیح یعنی سبحان اللہ بھی کہا چونکہ آپ اٹھ کر کھڑے تھے بیٹھے نہیں۔ یہ مسئلہ بھی اسی طرح ہے بشرطیکہ بالکل سیدھا ہو کر کھڑا ہو جائے لیکن اگر سیدھا کھڑا نہیں ہوا اور یاد آ گیا تو یا مقتدی بتائیں، یعنی سبحان اللہ کہہ کر تو پھر دوبارہ بیٹھ جائے تو اس پر سجدہ وغیرہ نہیں۔ جیسا کہ معانی الآثار طحاوی میں بسند حسن مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ دو رکعتوں پر اٹھ کھڑے ہوئے پھر لوگوں نے ان کے پیچھے تسبیح پڑھی۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اشارہ دیا کہ اٹھ جاؤ، پھر جب نماز مکمل ہوئی، سلام پھیر دیا اور سہو کے سجدے ادا کیے، پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(( اِذَا اسْتَتَمَّ اَحَدُکُمْ قَائِمًا فَلْیُصَلِّ وَلْیَسْجُدْ سَجْدَتَیِ السَّهْوِ وَاِنْ لَّمْ یَسْتَتِمَّ

قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ وَلَا سَهْسَ عَلَيْهِ )) [معانی الآثار۔ کتاب الصلوٰۃ باب سجود السھو فی الصلوٰۃ ھل ھو قبل التسلیم او بعدہٗ ]

''جب تم میں سے کوئی غلطی سے مکمل کھڑا ہو جائے پھر اپنی نماز مکمل کرے پھر سہو کے سجدے ادا کرے اور اگر ابھی مکمل سیدھا کھڑا نہیں ہوا تو پھر بیٹھ جائے اور اس پر کوئی سہو نہیں۔''

صحیح ابن خزیمہ میں ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی پھر دو رکعتوں پر کھڑے ہو گئے اور اس پر تسبیح بھی پڑھی گئی مگر آپ نے نماز جاری رکھی:

(( حتی فرغ من صلوٰتہٖ ولم یبق الا التسلیم فسجد سجدتین وھو جالس قبل ان یسلم ))

''یہاں تک کہ جب نماز سے فارغ ہوئے سلام پھیرا تو، پہلے بیٹھنے کی حالت میں دو سجدے ادا کیے۔ اگر چار رکعتوں والی نماز ہے تو دو رکعتیں پڑھنے کے بعد سلام پھیر دے تو اس کا حکم کیا ہے۔''

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی شام کی نمازوں میں سے کوئی نماز ظہر یا عصر میں سے کوئی ایک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کا نام لیا لیکن میں نے بھلا دیا۔ صحابی رضی اللہ عنہم نے کہا پھر ہیں دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا پھر اٹھے ایک لکڑی کی طرف جو مسجد میں رکھی ہوئی تھی گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوں اور اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا...... اور لوگ جلد مسجد سے نکل گئے اور پوچھا کہ نماز کم ہوئی ہے؟ اور قوم میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ انھیں ہیبت ہوئی کہ بات کر سکیں اور قوم میں ایک شخص تھا جس کے ہاتھوں میں طول تھا اسے ذوالیدین کہا جاتا اس نے کہا کہ اے اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول ہوئی ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمی کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں باتیں نہیں ہیں۔ تب اس نے کہا کہ ان دونوں باتوں میں ایک ضرور ہوئی ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اسی طرح ہے جس طرح ذوالیدین کہتا ہے، لوگوں نے کہا ہاں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور جو نماز بھول کر چھوڑ دی تھی وہ پڑھی پھر سلام پھیر دیا پھر تکبیر کہی سجدے ادا کیے اور سلام پھیر دیا۔ صحیح مسلم میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز ادا کی پھر تین رکعات پڑھنے کے بعد سلام پھیر دیا اور اپنے گھر میں داخل ہوئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا جسے خرباق کہا جاتا تھا اور اس کے ہاتھوں میں طوالت تھی، پھر اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! پھر جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اس کا ذکر کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ سے نکلے اور چادر کھینچ رہے تھے، یہاں تک کہ لوگوں تک پہنچے، پھر فرمایا کیا یہ سچ کہتا ہے تو لوگوں نے کہا ہاں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقیہ ایک رکعت پڑھی پھر سلام پھیر دیا۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نماز میں بھول سے ایک دو رکعتیں کم پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہو گی

اگر چہ سلام بھی پھیر دیا جائے اور کلام کیا تب بھی بھول کر چھوڑی ہوئی نماز پڑھا کر سلام پھیر دے پھر سہو کے دو سجدے ادا کرے پھر سلام پھیرے۔ اس کی نماز میں کوئی نقص نہیں آئے گا تمام محدثین کا یہی مسلک اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے اس مسئلہ میں صرف حنفی علماء اختلاف کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ بھول کر بھی کلام کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور نبی ﷺ کے اس کا جواب دیتے ہیں کہ وہ نماز میں کلام کی تحریم سے قبل کا واقعہ ہے۔ اس پر کوئی ایسی مضبوط دلیل پیش نہیں کی جاتی، حالانکہ ہم نے جو پہلی حدیث صحیحین سے ذکر کی ہے اس کا راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے جو سات ہجری میں اسلام سے مشرف ہوا ہے اور نماز میں کلام بہت پہلے ممنوع ہو چکا تھا۔ احناف حضرات ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ میں موجود نہیں تھے، یہ انھوں نے کسی متقدم صحابی سے خبر سنی تھی۔ جب انھیں کہا جاتا ہے کہ ابو ہریرہ رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ: "صلی بنا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور بعض روایات میں ہے: "صلی لنا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی آپ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود اس واقعہ میں موجود تھے اس کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں یہاں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجاز سے کام لیا ہے اس کا مطلب کہ مسلمانوں کو نماز پڑھائی انھیں کہنا تھا: "صلی بالمسلمین" کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا" صلی بنا یالنا "لیکن صحیح مسلم امام احمد کی مسند وغیرہا میں ایک دوسری روایت میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں کہ: "بیننا انا اصلی مع رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم" "ایک مرتبہ میں نماز پڑھ رہا تھا تو یہ واقعہ پیش آیا۔"

ناظرین خود ملاحظہ کیجیے کہ یہاں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ میں موجود ہونے کی صراحت کر رہے ہیں اس میں مجاز کو کوئی بھی دخل نہیں ہو سکتا مگر سینہ زوری کرنے والوں نے یہاں یہ حیلہ بھی بنایا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کسی راوی سے وہم ہو گیا ہے اور اس نے جمع کو مفرد کے صیغہ سے بیان کیا ہے لیکن اس پر کوئی بھی دلیل پیش نہیں کی۔ دلیل کے بغیر زبردستی ایک ثقہ راوی کو وہم کا شکار بنایا گیا ہے۔ "فانا للّٰہ وانا الیہ راجعون" کبھی تو اپنے موقف کو درست کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ بعض روایات میں ذوالیدین کے بجائے ذوالشمالین ہے۔ اور وہ ذوالشمالین جنگ میں شہید ہو گئے تھے، پھر اسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کیسے پہنچ سکتا ہے؟ کہتے ہیں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" بھی وہی بات ہے، دراصل جس روایت میں ذوالشمالین مروی ہے کہ اس میں امام زہری رحمہ اللہ سے غلطی ہو گئی ہے اس جگہ پر۔ تمام ائمہ حدیث نے امام زہری کی تغلیط کی ہے۔ کیونکہ امام زہری کے علاوہ دوسرے کئی ثقہ راوی ذوالیدین کا ذکر کرتے ہیں۔ اس لیے ذوالشمالین کی روایت اصل حدیث موجب شاذ بن جائے گی، کچھ ایک مقامات پر بڑے بڑے حفاظ سے بھی غلطیاں ہو گئی ہیں، اس لیے اس جگہ پر اگر امام زہری سے غلطی ہو گئی تو اس پر کچھ تعجب کی بات نہیں اس طریقہ سے خواہ مخواہ جلیل القدر

صحابی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تغلیط بھی کرنی نہیں پڑے گی اور نہ ہی بغیر دلیل کے اٹکل پچو کے تیر چلانے پڑیں گے اور نہ ہی اس کلام کو مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث جو صحیح مسلم میں کچھ پہلے نقل کر چکے ہیں وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ آپ ﷺ کا گھر میں جا کر پھر واپس آئے اور تحقیق کرنے کے بعد ایک رکعت کو مکمل کر کے پھر سجدہ سہو کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں پانچ رکعات کا ذکر ہے وہ بھی پہلے ذکر ہو چکی ہے، اس میں یہ وضاحت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا نماز میں کچھ اضافہ ہوا ہے آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ انھوں نے جواباً کہا کہ آپ ﷺ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، تب آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر دو سجدے ادا کیے پھر سلام پھیر دیا۔ ایک منصف مزاج آدمی کے لیے یہ دلائل زیر بحث مسئلہ کے لیے اطمینان بخش اور تسلی دینے والے ہیں باقی جسے بلا وجہ اور بلا دلیل اپنے موقف کو جبراً درست کرنے کا تکلف ہو گا، اس کا تو کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ علقمہ بن قیس جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بڑا شاگرد ہے اسے بھی یہ معاملہ پیش آیا جس کی حافظ ابوعوانہ اپنی مسند میں عمدہ سند سے ابراہیم بن سوید النخعی سے روایت لاتے ہیں کہ اس نے کہا کہ علقمہ بن قیس نے ہمیں ظہر نماز پانچ رکعات پڑھائیں، پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو ان کو کہا گیا کہ آپ نے پانچ رکعات نماز پڑھائی ہے تو اس نے کہا کہ میں نے اس طرح نہیں کیا، ابراہیم بن سوید نے کہا کہ پھر مجھے کہا کہ کیا اس طرح ہے، میں نے کہا، ہاں! پھر جلدی آئے اور دو سجدے ادا کیے، پھر دوبارہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا کہ بے شک نبی ﷺ سے بھی اسی طرح ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے پانچ رکعات نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ کو بتلایا گیا تو آپ ﷺ نے دو سہو کے سجدے ادا فرمائے۔ اب اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب علقمہ بن قیس ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بڑا شاگرد ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان صحابہ سے ہے جو نماز میں کلام کی تحریم کے راوی ہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( کنا نسلم علی النبی وھو فی الصلوٰۃ فَلَیَرُدَّ علینا فلما رجعنا من عند النجاشی سلمنا علیه فَلَمْ یرد علینا وقال ان فی الصلوٰۃ شغلاً ))

''ہم نبی ﷺ کے پاس آتے رہتے تھے اور آپ ﷺ پر سلام کہتے تو سلام کا جواب دیتے تھے، پھر جب ہم نجاشی کے پاس سے آئے تو ہم نے سلام کیا، آپ ﷺ نے جواب نہیں دیا، پھر فرمایا کہ نماز مشغولیت ہے، دنیا کی بات نہیں کی جائے گی۔''

مطلب یہ ہوا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو نماز میں کلام کی تحریم کی خبر تھی۔ یہ حدیث جواب ہم لکھ کر آئے ہیں، اس میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی علقمہ بن قیس ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ علقمہ کو بھی نماز میں کلام کی تحریم کا علم تھا اور اس کے باوجود بھی کلام کرنے کے بعد نماز کو نہیں لوٹایا بلکہ سہو کے سجدے ادا کیے۔ اس پر

دلیل وہ روایت پیش کی جس میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے پانچ رکعات ادا کیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پانچ رکعتیں پڑھنے والا واقعہ کلام کی تحریم کے بعد کا تھا۔ فللہ الحمد

بعض علماء احناف نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے استدلال کیا ہے جو طحاوی نے اپنی کتاب معانی الآثار میں عطاء بن ابی رباح سے روایت کیا ہے کہ:

(( صلی عمر بن الخطاب باصحابه فسلم فی الرکعتین ثم انصرف فقیل لهٗ فی ذالك فقال انی جهزت عیداً من العراق باحمالها واقتابها حتٰی وردت المدینة فصلی بهم اربع رکعات))

''عمر رضی اللہ عنہ اپنے دوستوں کو نماز پڑھا رہے تھے، پھر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا، پھر انھیں کہا گیا کہ آپ نے دو رکعات میں سلام پھر دیا ہے، پھر کہا کہ میں نے نماز میں قافلہ کو تیار کروایا جو عراق سے نکلا اپنے بوجھوں کے ساتھ یہاں تک کہ مدینہ آکر پہنچا۔ پھر دوبارہ چار رکعتیں پڑھائیں۔''

احناف حضرات کا کہنا ہے کہ ذوالیدین کے واقعہ میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم دونوں موجود تھے، اگرچہ وہ واقعہ کلام کی تحریم کے بعد کا ہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ دوبارہ مکمل کیوں پڑھتے؟ یہ روایت سنداً ضعیف ہے، کیونکہ عطاء نے عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کو نہیں پایا، لہٰذا یہ روایت منقطع ہوئی۔ منقطع روایت ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے۔ علامہ طحاوی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے مگر کہتے ہیں کہ عمدہ ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ عمدہ مرسل نہیں بلکہ تمام ضعیف مراسیل میں سے ہے جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب المیزان میں عطاء کے ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ:

" قال احمد لیس فی المرسل اضعف من مرسل الحسن والعطاء یأخذان عن کل احد" انتهیٰ

امام احمد فرماتے ہیں کہ حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح کی مراسیل روایات سے بڑھ کو کوئی مرسل اتنی ضعیف نہیں کیونکہ وہ دونوں ہر کسی سے روایت کرتے ہیں چاہے ثقہ ہو یا ضعیف۔ جب یہ روایت عمدہ نہیں ہوئی بلکہ سخت ضعیف ٹھہری تو اس سے دلیل لینا بھی مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اگر بالفرض اس روایت کو معتبر قرار دے دیا جائے تو اس وقت عمر رضی اللہ عنہ سے ذہول ہوگیا ہو جس طرح غسل والے مسئلہ میں بھی ان سے ذہول ہوگیا، حالانکہ عمار رضی اللہ عنہ نے یاد بھی دلایا کہ ہم دونوں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، پھر ہم دونوں کو احتلام ہوگیا پھر میں نے اونٹ کی طرح مٹی میں الٹ پلٹ ہو کر نماز پڑھ لی، پھر یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تجھے اتنا ہی کافی تھا کہ زمین پر ہاتھ لگا، چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لینا لیکن عمر رضی اللہ عنہ کو یاد نہ آیا۔ یہ روایت صحیح بخاری میں ہے بہرحال ایسے کمزور دلائل سے صحیح مرفوع احادیث کو

رد کرنا بہت نامناسب ہے، نہ ہی ایسی ضعیف روایات صحیح احادیث میں تاویل کرنے کے لیے جواز کی وجہ بن سکتی ہیں۔ احناف اس طرح بھی کہتے ہیں کہ جسے شروع میں پہلی مرتبہ سہو ہو جائے تو ان کو نماز ابتدا سے لوٹانے کی ضرورت نہیں اور اس پر دلیل اس روایت سے لیتے ہیں جو طبرانی کبیر میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے مروی ہے کہ بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جس شخص کو اپنی نماز میں سہو ہو جائے تو پھر اسے علم نہ ہو سکے کہ کتنی نماز پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: « یعید صلوٰتہٗ و یسجد سجدتین قاعداً » کہ اپنی نماز دہرائے گا اور بیٹھے بٹھائے دو سجدے دے گا۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ

**اولاً:** عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس کو پوتا اسحاق بن یحییٰ بن عبادہ روایت کرتا ہے، علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اسحاق نے اپنے دادے عبادہ سے کچھ بھی نہیں سنا ہے، لہٰذا یہ روایت منقطع ہوئی جو صحیح احادیث کے معارضہ کے قابل نہیں۔

**ثانیا:** اس روایت میں الفاظ عام ہیں جسے سہو ہو وہ نماز لوٹائے مگر اسے صرف اس مخصوص لوگوں سے بنانا جسے پہلے وہ سہو لاحق ہوا ہو بالکل بے دلیل بات ہے اس روایت کے عموم کو خاص بنانے کے لیے کوئی دلیل ہونی چاہیے۔ بہر حال ایک تو یہ روایت ضعیف ہے اور دوسری بات یہ کہ دعویٰ خاص ہے اور دلیل عام ہے اپنے اس مسئلہ پر طبرانی سے ایک اور دلیل بھی لی گئی ہے۔ طبرانی رحمہ اللہ نے میمونہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت منقول نقل کی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرض کیا کہ ہمیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس مسئلہ کے متعلق فتویٰ دیں کہ ایک شخص جسے نماز میں سہو ہوا پھر اس کو علم نہ ہو سکا کہ کتنی نماز اس نے پڑھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوبارہ جا کر نماز میں کھڑا ہو یہاں تک کہ اسے معلوم ہو جائے کہ کتنی نماز اس نے پڑھی ہے کیونکہ یہ وسوسہ ہے یہ اس کو پیش آتا ہے اور غافل کر دیتا ہے نماز سے۔ ہماری گزارش ہے کہ اس روایت کی سند میں عبدالحمید بن یزید ہے کہ جو کہ مجہول ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں علامہ عراقی نے فرمایا ہے اور راوی کی جہالت بھی جروح شدیدہ میں سے ہے، لہٰذا یہ سند سخت ضعیف ہوئی، لہٰذا دلیل لینے کے قابل نہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعویٰ تمھاری تو خاص ہے اور دلیل میں حدیث وہ پیش کی ہے جو کہ عام ہے، لہٰذا دعویٰ اور دلیل کی مطابقت میں نہیں۔

**خلاصہ کلام:** اس مسئلہ میں علماء احناف کے پاس کوئی بھی صحیح روایت موجود نہیں باقی ضعیف روایات عرض استدلال میں پیش کرنا علماء کے شان سے بمراحل بعید ہے۔

جن صورتوں میں سلام کے بعد سہو کے سجدہ دیے جاتے ہیں ان کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سجدوں کے بعد التحیات پڑھے یا اسے طرح ہی سلام پھیر دے۔ اس بارے میں ترمذی وغیرہ میں ایک روایت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم فصلّی بهم فسهی فسجد سجدتین ثم تشهد ثم سلم ))

''بے شک نبی اکرم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی پھر آپ کو سہو ہو گیا پھر آپ ﷺ نے سہو کے سجدے دیے پھر دوبارہ التحیات پڑھا پھر سلام پھیر دیا۔''

لیکن حدیث کے حفاظ نے اس روایت کے شاذ قرار دیا ہے یعنی اس روایت میں التحیات کا ذکر محمد بن سیرین تابعی سے اشعث بن عبدالمالک نے کیا ہے اس لیے یہ التحیات والی زیادتی اشعث کا وہم قرار دیا گیا ہے کیونکہ التحیات کے ذکر میں منفرد ہے دیگر حفاظ حدیث جو محمد بن سیرین سے روایت کرتے ہیں ان کے ہاں محفوظ حدیث وہ ہے جس میں التحیات کا ذکر نہیں اس طرح خالد الحذاء جس سے محمد بن سیرین یہی روایت بیان کرتا ہے، اس میں التحیات کا ذکر نہیں اور یہ روایت صحیح مسلم میں بھی موجود ہے لہٰذا اشعث والی یہ التحیات والی زیادت شاذ ہوئی، اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ سجدہ سہو کے بعد التحیات کے بغیر ہی سلام پھیر دیا جائے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں ایک جامع حدیث وارد ہوئی ہے۔اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا زَادَ الرجل او انقص فلیسجد بسجدتین ))

''نبی ﷺ نے فرمایا، نماز میں کوئی اضافہ کرے یا کمی کرے تو دو سجدے ادا کرے۔''

علماء کے مابین اختلاف ہے کہ سہو کے سجدے سلام سے پہلے دیے جائیں یا بعد میں دیے جائیں۔اس سلسلہ میں امام ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ نے آٹھ مذاہب نقل کیے ہیں۔مگر علامہ شوکانی نے اپنی کتاب نیل الاوطار میں لکھا ہے کہ مجھے اس جگہ پر سب سے اچھی بات یہ نظر آتی ہے کہ جن جن مقامات پر نبی اکرم ﷺ نے پہلے سجدہ کیے ہیں ان مقامات پر سلام سے پہلے سجدہ کرنے چاہییں اور جن مقامات پر آپ ﷺ نے بعد میں سجدے دیے ہیں ان پر بعد میں سجدے دیے جائیں۔باقی ان مقامات پر سہو ہو جائے جن میں کوئی طریقہ مروی نہیں ہے تو اس مقام پر اختیار چاہے بعد میں سجدہ دے یا پہلے۔علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بھی تمام اقوال میں سے یہ قول یعنی علامہ شوکانی کا سب سے بہتر محسوس ہوتا ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہی قول راجح نظر آتا ہے۔قارئین کی سہولت کے لیے وہ احادیث میں پہلے یا بعد میں سلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

**پہلی صورت:**

یہ ہے کہ درمیانہ التحیات بھول جائے اور آدمی اٹھ کر کھڑا ہو جائے تو اس صورت میں نماز مکمل کرے اور سلام سے پہلے دو سجدہ سہو ادا کرے پھر سلام پھیر دے۔

**دوسری صورت:**

نمازی شک میں پڑ گیا کہ تیسری رکعت ہے یا چوتھی وغیرہ تو اس میں شک کو ترک کر کے یقین پر بنا کرے۔ مطلب کہ یقینی ہیں، لہٰذا ایک رکعت پڑھ کر پھر سلام سے پہلے سہو کے سجدے ادا کرے پھر سلام پھیر دے۔

**تیسری صورت:**

یہ ہے کہ نمازی کو بالکل ہی معلوم نہیں کہ کون سی رکعت پڑھ رہا ہے تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ غور وفکر کرے پھر جو بات زیادہ غالب نظر آئے اس کے مطابق نماز کو مکمل کرے اور پھر سلام کے بعد سہو کے سجدے ادا کرے پھر دوبارہ سلام پھیرے۔

**چوتھی صورت:**

دو رکعت پڑھ کر بھول میں سلام پھیر دے تو پھر اپنے اس سہو کے معلوم ہونے کے بعد بقیہ چھوٹی چھوٹی دو رکعات مکمل کرلے، پھر سلام پھیرے اور پھر سہو کے دو سجدے دے، پھر سلام پھیر دے۔

**پانچویں صورت:**

چار رکعتوں والی نماز میں تین رکعتوں پر بھول میں سلام پھیر دے تو اس کے لیے بھی وہی حکم ہے کہ بقیہ نماز مکمل کرے اور سہو کے سجدے ادا کر کے پھر سلام پھیر دے۔

**چھٹی صورت:**

بھول میں پانچ رکعتیں پڑھ جائے تو اس کا حکم بھی یہی ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد سہو کے سجدے ادا کرے پھر سلام پھیرے سلام کے بعد سجدہ سہو دینے والی صورت میں دوبارہ التحیات پڑھنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ اس کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ غلطی میں نماز مکمل کرنے سے پہلے سلام پھیرنے کے بعد سہواً جو کلام کیا اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی بلکہ چھوٹی ہوئی نماز مکمل کر کے سجدہ سہو ادا کرے۔ جس طرح اس کے متعلق تحقیق گزر چکی۔ باقی کچھ ان پڑھ جو یہ کہتے ہیں کہ سجدہ سہو سے پہلے جو سلام پھیرے وہ صرف ایک طرف سلام پھیرے اور پھر سجدہ سہو ادا کرے پھر سلام پھیر دے اس بارے میں ان کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں ہے بلکہ حدیث میں مسلم کے الفاظ آتے ہیں یعنی آپ ﷺ نے سلام پھیرا اور احادیث میں سے متعارف سلام ہے۔ وہ رکوع اور سجدہ والی نماز میں دونوں اطراف کے لیے ہے کسی بھی صحیح روایت میں صرف ایک طرف سلام پھیرنا دیکھنے میں نہیں آیا اس لیے سلام پھیرنے سے معنیٰ اور مطلب وہ لیا جائے گا جو احادیث میں متعارف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

# امامت کا مسئلہ

## مقتدی امام کے ساتھ کس طرح کھڑا ہو؟

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ میں نے رات گزاری اپنی خالہ ام المومنین سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور پھر نماز شروع کی۔ میں اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیٹھ کے پیچھے سے ہاتھ مبارک سے لیا اور اپنی پیٹھ مبارک کے پیچھے گھما کر سیدھے طرف کھڑا کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی اگر ایک ہے تو امام کے برابر میں دائیں جانب کھڑا ہو گا اور صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے کہ نماز پڑھیں پھر میں آیا اور الٹی جانب سے کھڑا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے دائیں طرف کھڑا کر دیا، پھر ایک اور شخص جبار بن صغیر رضی اللہ عنہ نامی آیا وہ آکر بائیں جانب کھڑا ہو گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دونوں کے ہاتھوں کو پکڑا اور ہمیں پیچھے دھکیلا یہاں تک کہ ہمیں پیچھے کھڑا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو مقتدی ہوں تو دو پیچھے کھڑے ہوں گے اور امام آگے کھڑا ہو گا اور صحیح مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور ایک یتیم بچہ ہمارے گھر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کر رہے تھے اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی تھی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چھوٹے کے ساتھ بڑا کھڑا ہو سکتا ہے اور دوسرے بات یہ کہ عورت مردوں کے پیچھے کھڑی ہوگی اور تیسری بات یہ کہ عورت اکیلی صف بن سکتی ہے۔ صحیح مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اور اس کی ماں یا خالہ کو نماز پڑھائی اور کہا کہ مجھے اپنے دائیں جانب کھڑا کیا اور عورت کو پیچھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مرد ایک ہو اور عورت بھی ایک ہو اگرچہ عورت محرمہ ہے پھر بھی وہ مرد امام کے دائیں طرف کھڑا ہو گا اور عورت پیچھے کھڑی ہوگی۔ ابوداؤد میں صحیح سند سے روایت ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ مداین شہر میں نماز پڑھی، پھر ابو مسعود رضی اللہ عنہ آگے بڑھے پھر جا کر حذیفہ رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھوں سے پکڑا پھر حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے چلے آرہے تھے کہ اسے اتار کر نیچے کھڑا کر دیا، پھر جب حذیفہ رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہوئے تو ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا آپ نے نہیں سنا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی کو امامت کروائے تو مقتدیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ سے بلند جگہ پر کھڑا نہ ہو۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تبھی تو آپ کے پیچھے لگا تھا۔ اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ لوگ بہت ہوں اور امام ان کو نماز کی تعلیم دے رہا ہو تو اس صورت میں بلند جگہ پر نماز پڑھی جا سکتی ہے تاکہ مقتدی نماز کا طریقہ دیکھ لیں جیسا کہ

صحیح بخاری اور مسلم میں سہیل بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ منبر پر چڑھے اور قبلہ رو ہوئے اور تکبیر کہی اور لوگ آپ کے پیچھے پیچھے کھڑے رہے، پھر آپ ﷺ نے قرأت فرمائی اور رکوع کیا اور لوگوں نے بھی پیچھے رکوع کیا پھر سر اوپر اٹھایا اور پھر پیچھے اتر کر سجدہ کیا، پھر دوسرا سجدہ ادا کیا پھر دوبارہ منبر پر چڑھے اور دوسری رکعت بھی ایسے ہی ادا کی، پھر جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اے لوگوں میں نے یہ اس لیے کیا ہے تاکہ تم میری اقتدا اور میری نماز کو معلوم کرو کہ میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ ابوداؤد اور بیہقی میں صحیح سند سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فرماتی ہیں:

(( صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجرته والناس ياتمون به من وراء الحجرة ))

''نبی ﷺ حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ حجرہ سے باہر آپ ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے۔''

اسے معلوم ہوا کہ امام اور مقتدی کے درمیان اگر کوئی حائل ہو اور ان کو نماز کے انتقالات کی خبر ہو سکتی ہے تو اس صورت میں امام کی اقتدا کر سکتے ہیں۔

## امامت کا مستحق کون ہے؟

صحیح مسلم میں ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( يؤم القوم اقراهم الكتاب الله فان كانوا في القرأة سواءً فاعلمهم بالسنة فان كانوا في السُّنَّةِ سواءً فَاَقْدَمُهُمْ هجرة فان كانوا في الهجرة سواء فَاَقْدَمُهُمْ سلماً ولايومن الرجل في سلطانه ولايقعد في بيته على تكرته الا باذنه ))

''امامت وہ شخص کرائے جو قرآن کریم زیادہ پڑھا ہو اور اگر پڑھنے میں سب برابر ہوں تو پھر زیادہ علم رکھنے والا اور اگر سنت کے علم میں بھی برابر ہوں تو پھر جس نے سب سے پہلے ہجرت کی، ہو پھر جب ہجرت میں بھی برابر ہوں تو پھر جو سب سے عمر میں بڑا ہو اور کوئی شخص دوسرے شخص کو اس کے حلقہ اثر میں امامت نہ کروائے اور نہ ہی اس کے گھر میں عزت کی جگہ پر بیٹھے مگر اس کی اجازت سے۔''

نماز پڑھنے یا پڑھانے کا علم جس شخص کو درست طور پر نہیں ہے، وہ اگر قرآن کریم کی تلاوت صحیح کرتا ہو تو بھی اس کی امامت درست ہے۔ تو پھر نبی ﷺ نے ہمیں اس طرح فرمایا ہے کہ جو زیادہ صحیح قراءت کر سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو اولین مخاطب تھے۔ ان کی زبان چونکہ عربی تھی اس لیے وہ اس کے مسائل کو قرآن اور نبی ﷺ کی حدیث سے براہ راست اخذ کر سکتے تھے، یعنی جو باتیں نماز پڑھنے اور پڑھانے کے لیے ضروری ہیں ان کا ان سب کو علم تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ امامت وہ کرائے جو قرآن زیادہ درست

پڑھ سکتا ہو باقی سنت کا زیادہ علم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی انھیں مسنون طریقہ علم ہونا چاہیے۔ صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا کانوا ثلاثۃ فلیؤمھم احدھم احقھم بالإمامۃ اقرأھم ))

''جب تین شخص نماز پڑھنے والے ہوں تو ان کی امامت کا مستحق وہ ہے جو قرآن مجید زیادہ پڑھا ہوا ہو۔''

ابوداؤد میں حسن سند سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( استخلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم یؤم الناس وھو اعمیٰ ))

ام مکتوم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ مقرر کیا وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے حالانکہ وہ نابینے آدمی تھے اور عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ وہ اپنی قوم کو امامت کرتے تھے حالانکہ ان کی آنکھوں میں خرابی تھی۔ جامع الترمذی میں حسن سند سے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین اشخاص ایسے ہیں جن کی نماز ان کے کانوں سے بھی اوپر نہیں جاتی، ایک وہ غلام جو اپنے مالک سے بھاگ گیا یہاں تک کہ واپس آجائے۔ دوسری وہ عورت جو اس حالت میں رات گزارتی ہے کہ اس کا شوہر اس پر ناراض ہے۔ تیسرا اس قوم کا امام کہ قوم اسے ناپسند کرتی ہے۔

## نابالغ کی امامت:

صحیح بخاری مین حضرت عمرو بن سلمۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جاہلیت میں ہمارا قیام ایک چشمہ پر تھا۔ لوگ سواریوں پر ہمارے پاس سے گزرتے تو ہم ان سے پوچھتے کہ لوگوں کا کیا حال ہے اور اس شخص (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال ہے؟ تو وہ سوار ہمیں جواب دیتے کہ اللہ نے انھیں اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے ان کی طرف اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے۔ وہ سوار کوئی آیت سناتے تو میں وہ فوراً یاد کر لیتا۔ آپ کی باتیں میرے دل کو لگتی تھیں۔ ادھر سارے عرب میں اپنے ایمان کو فتح مکہ پر موقوف کیا تھا کہ پہلے قریش اور ان کا معاملہ حل ہو جائے اگر یہ نبی قریش پر غالب آگیا تو یہ سچا نبی ہے پھر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے۔

پھر جب مکہ فتح ہوا تو ہر کسی قوم نے اسلام کے متعلق جلدی کی اور میرے والد نے اپنی قوم سے پہلے اسلام لانے میں جلدی کی اور اسلام قبول کیا پھر جب آئے تو کہا کہ اللہ کی قسم میں تمھارے پاس سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا ہوں۔ پھر کہا کہ نماز پڑھو فلاں فلاں وقت، پھر جب نماز کا وقت ہو تو ایک اذان کہے اور امامت کروائے جو قرآن کے اعتبار سے زیادہ حافظ ہو، پھر جب انھوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی حامل قرآن نہیں تو مجھے اپنے آگے کیا اس حال میں میں چھ سات سال سالوں کا تھا اور میرے اوپر ایسی چادر ہوتی تھی کہ جب میں سجدہ کرتا تو وہ جسم کے اوپر والے حصے کی طرف اٹھ جاتی، پھر قبیلے کی ایک عورت

نے کہا کہ تو ہم سے اپنے امام کے مقعد کو تو چھپاؤ پھر انھوں نے کپڑا خرید کیا پھر میرے لیے اس میں سے کاٹ کر قمیص بنوائی، پھر مجھے کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس قمیص پہننے سے ہوئی۔ امام بخاری اپنی صحیح میں اس مسئلہ پر باب قائم کیا ہے کہ:

(( باب امامة العبد والمولى والاعرابى و الغلام الذى لم يحتلم لقول النبى رسول الله صلى الله عليه و سلم يؤمهم اقرأهم لكتاب الله ))

''غلام اور آزاد کیا ہوا غلام اور اعرابی اور وہ بچہ جو بالغ نہیں ہوا امامت کر سکتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ امامت وہ کروائے جو قرآن مجید سب سے زیادہ پڑھ سکتا ہو۔''

یہ حکم عام ہے، یعنی غلام ہو یا اعرابی یا نابالغ بچہ ہو مگر دیگر تمام مقتدیوں سے وہ قرآن مجید صحیح پڑھ سکتے ہوں تو وہ امامت کروائیں۔ عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق بعض الناس نے اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں یہ مذکور نہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام بنانے کی اطلاع ملی تھی یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نزول وحی کے زمانہ میں کسی صحابی کے ایسے کام پر تقریر قائم ہو ہی نہیں سکتی جو ناجائز ہو اور یہی سبب ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ نے عزل کے جواز سے اسی سے دلیل لی ہے کہ وہ عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہوتا تھا یعنی ان کا مطلب یہ تھا کہ جب وہ کام ناجائز ہوتا تو قرآن میں اس کی ممانعت ضرور نازل ہوتی۔ اسی طرح جب عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی امامت صحیح اور درست نہیں تھی تو اس بارے میں وحی الٰہی کی طرف سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ضرور رہنمائی کی جاتی اس کے علاوہ وفد جس نے عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو آگے کیا وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم تھے اور ابن حزم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اس کے متعلق مخالفت کا علم نہیں ہوا۔ غلام کی امامت کے متعلق صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب پہلے مہاجرین عصبہ میں آئے (یہ قباء سے ایک جگہ ہے) رسول اکرم ﷺ کے آنے سے پہلے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مولیٰ جوان کو امامت کرواتا تھا اور وہ ان سب میں سے زیادہ قرآن کا حامل تھا اور یہی روایت امام بخاری رحمہ اللہ دوبارہ کتاب الاحکام میں بھی رائے ہیں، اس میں یہ زیادتی ہے کہ سالم رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ابوبکر، عمر، ابو سلمہ بن عبدالاسد اور زید بن حارث اور عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہم وغیرہ تھے۔ اس حدیث سے اس مسئلہ کے متعلق دلالت کی وجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے قریشی صحابہ کو سالم رضی اللہ عنہ کو اپنے آگے امام بنانے پر اجماع کیا اور وہ سالم انصار میں سے ایک عورت کا غلام تھا، پھر انھوں نے اس کو آزاد کیا اور سالم رضی اللہ عنہ کی امامت آزاد ہونے سے پہلے تھی باقی روایت میں جو ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کا غلام یا مولیٰ کہا گیا ہے وہ اس لیے کہ جب وہ آزاد ہوا کہ ابو حذیفہ سے ساتھ رہنے لگا اور ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنا متبنی بنایا تھا، پھر اس رسم کو قرآن کریم میں منع کیا گیا کہ سالم کو ابو حذیفہ کا مولیٰ کہا گیا اور حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ وہ زیادہ قرآن کا حامل تھا یہ اشارہ ہے اس کے آگے کرنے کے سبب کی طرف، اس کے باوجود اس کے پیچھے اقتدا کرنے والے

خاندانی اعتبار سے اشرف تھے۔

**مسئلہ:**

اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اس کی امامت کرانے کی نیت نہیں تھی اور نہیں ہے مگر پھر کچھ افراد آئے، انھوں نے اس کی اقتدا میں نماز پڑھی تو نماز درست ہوگئی۔ دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے اپنی خالہ کے ہاں رات گزاری پھر نبی ﷺ اٹھے رات کی نماز پڑھنے کے لیے پھر یہ بھی اٹھا کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھوں، پھر میں آپ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا پھر آپ ﷺ نے میرے سر کو پکڑا اور مجھے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی نیت امامت کرانے کی نہیں تھی پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما آکر کھڑے ہوگئے تو اسے غلط طرف سے بدل کر درست طرف پر کھڑا کر دیا۔

**دوسری حدیث:**

صحیح مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک میں نماز پڑھی پھر میں آیا۔ آکر سائیڈ میں کھڑا ہوگیا، پھر ایک اور شخص آیا وہ آکر میری طرف کھڑا ہوگیا یہاں تک کہ ہم ایک جماعت بن گئے، پھر جب نبی اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے نماز کو ہلکا کیا۔ اس حدیث سے بالکل ظاہر ہے کہ ابتداء نبی اکرم ﷺ کی امامت کی نیت نہیں تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود ہی اقتدا کی اور آپ ﷺ نے بھی ان کی اقتدا کو قائم رکھا اور کوئی شخص کہے کہ اس سے نفلی نماز میں امام کی امامت کی نیت کے علاوہ اقتداء کا ثبوت ملتا ہے مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ فرضی نماز بغیر نیت کے امامت کرائے تو پھر درست ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابوداود، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی اکرم ﷺ کی طرف ایک شخص آیا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہے جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے۔ پھر ایک شخص کھڑا ہوا پھر اس نے بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے، اس حدیث کی ایک بات ثابت ہوئی کہ اگر کوئی فرض نماز اکیلا پڑھ رہا ہو اور اس کی امامت کی کوئی نیت نہ ہو پھر بھی اس کی اقتدا جائز ہے اور دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ اگر ایک جماعت ہو چکی ہے اور اتفاق سے دو تین آدمی آجائیں تو وہ بھی جماعت کرے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ یعنی جماعت ثانیہ میں کسی بھی قسم کی قرأت نہیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے خود ہی سامنے جماعت کروائی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ لوگ جان بوجھ کر جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ہر وقتؒ دو تین جماعتیں کرواتے رہیں یا پھر جماعت باقاعدہ ہو رہی ہوں اور اپنے کام دھندے یا بے فائدہ باتوں میں مشغول ہوں یا فضول

بیٹھے رہے ہوں پھر جب باقاعدہ نماز جماعت سے مکمل ہوئی پھر آ کر الگ جماعت قائم کریں تو ایسے افراد کے اس نمونہ کے لیے مذکورہ حدیث سے جواز کی وجہ نہیں بن سکتی کیونکہ وہ جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں میں فتنہ پیدا کرنے کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں کیونکہ جس شخص کو جماعت کی فضیلت اور اجر وثواب کے حصول کی نیت ہوتی ہے اس سے کبھی اتفاقاً ہی جماعت فوت ہوتی ہے۔ باقی وہ اصل جماعت سے ہر وقت پیچھے رہے اور پھر آ کر اپنی دوسری یا تیسری جماعت قائم کرے تو ایسے اشخاص مفسدین کے لسٹ میں داخل ہیں۔

## مفتون اور مبتدع کی امامت:

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عدی بن خیار سے روایت ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت حاضر ہوا جب انھی باغیوں نے محصور کر رکھا تھا پھر عبداللہ نے عرض کیا کہ امامت کے حق دار تو آپ ہیں اور آپ کے اوپر جو مصیبت نازل ہوئی ہے وہ خود جانتا ہے کہ ہمیں وہ شخص نماز پڑھاتا ہے جو فتنہ میں مبتلا ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں حرج محسوس کرتے ہیں۔ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ:

(( الصلوٰۃ احسن مایعمل الناس فاذا أحسن الناس فأحسن معهم فاذا أساؤا فاجتنب أسائتهُم ))

"لوگ جو اعمال کرتے ہیں ان میں سے نماز بہترین عمل ہے، پھر جب لوگ اچھائی کا کام کریں تو آپ بھی ان کے ساتھ اچھائی کریں اور جب لوگ برائی کریں تو آپ ان کی برائی سے اجتناب کریں۔"

یعنی عثمان رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی ایسی مجبوری لاحق ہو جائے تو کبھی بھی جماعت کو ترک نہ کریں۔ ایسے مفتون امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہو۔

## امام کے اوپر مقتدیوں کے لحاظ سے کیا ذمہ داری ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( اذا صلی احدکم بالناس فلیخفف فان فیهم السقیم والضعیف والکبیر واذا صلی احدکم لنفسه فلیطول ماشاء ))

"اگر تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے تو اسے چاہیے کہ نماز کو ہلکا کرے کیونکہ لوگ بیمار اور ضعیف اور بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں اور جب اکیلا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے۔"

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ انسان نماز کے ارکان بھی مکمل نہ کرے اور بڑی جلد بازی سے نماز پڑھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز میں اتنی لمبی قرأت نہ کرے کہ مقتدی بیزار ہو جائیں اور صحیح بخاری میں

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے فرمایا کہ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں، پھر ارادہ کرتا ہوں کہ قیام طویل کروں، پھر بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، پھر اپنی نماز میں تخفیف کرتا ہوں۔ اس سبب سے کہ جانتا ہوں کہ اس بچے کے رونے کی وجہ سے اس کی ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔

**دوسری حدیث:**

صحیح بخاری اور مسلم میں ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بے شک ایک شخص نے کہا، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! بے شک میں فجر کی نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں اس لیے کہ فلاں شخص ہمیں طویل نماز پڑھاتا ہے۔ پھر صحابی رضی اللہ عنہ کہتا ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو اس دن وعظ کرتے ہوئے بہت غضبناک دیکھا جتنا اس سے پہلے نہ دیکھا تھا اور فرمایا کہ:

(( إنّ منكم منفرين فايّكم ماصلى بالناس فليتجوز فان فيهم الضعيف والكبير وزالحاجة ))

"بے شک تم میں سے کچھ نفرت پھیلانے والے ہیں پھر جب تم میں سے کوئی بھی جو بھی نماز لوگوں کو پڑھائے تو اسے چاہیے کہ نماز کو ہلکا کرے۔"

کیونکہ ان میں کمزور اور بڑی عمر کے اور کام دھندے والے لوگ ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( يصلونكم فان أصابوا فلكم وإن اخطاؤ فلكم وعليهم ))

"وہ ائمہ تمھیں نمازیں پڑھاتے ہیں پھر جب وہ صحیح طریقہ پر نماز پڑھائیں تو تمھارے لیے بہتر بات ہے۔"

لیکن اگر اس میں غلطی کرتے ہیں تو تمھیں اجر ملے گا اور غلطی کا بوجھ ان پر ہے۔

**نماز میں امام سے پہل نہیں کرنی چاہیے:**

اس سلسلہ میں ایک حدیث ابتدا میں گزر چکی ہے۔ دوسری حدیث مفصل جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند احمد اور ابوداؤد میں جید سند سے مروی ہے۔ عرض کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( إنما جعل الإمام ليؤتم به فاذا كبر فَكَبِّرُوا ولا تكبروا حتى يكبر و إذا ركع فاركعوا ولا تركعوا حتى يركع و إذا قال سمع الله لمن حمدهٗ فقولوا أللهم ربنا لك الحمد و إذا سجد فاسجدوا ولا تسجدوا حتى يسجد و إذا صلى قائماً فصلوا قياماً واذا صلى قَائِدًا فصلوا قعوداً اجمعون ))

"امام اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے پھر جب تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور تم

تکبیر نہ کہو یہاں تک کہ وہ تکبیر کہے اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور تم رکوع نہ کرو، یہاں تک کہ وہ رکوع نہ کرے اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہٗ کہے تو تم ربنا لك الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور تم سجدہ نہ کرو یہاں تک کہ وہ سجدہ نہ کرے اور جب وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی سب کے سب بیٹھ کر نماز پڑھو۔"

دوسری حدیث:

نبی کریم ﷺ کی آخری نماز صحیح بخاری اور مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( لما ثقل رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء بلال يؤذنهٗ بالصلوٰة فقال مروا ابابكر ان يصلى بالناس فصلى ابوبكر تلك الايام ثم ان النبى صلى الله عليه وسلم وجد فى نفسه خفة فقامَ يهادىٰ بين رجلين و رجلاهٗ تخطان فى الارض حتىٰ دخل المسجد فلما سمع ابوبكر حسهٗ ذهب يتأخر فأومأ إليه رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لايتأخر فجاء حتىٰ جلس عن يسار أبى بكر و كان أبوبكر يصلى قائمًا و كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى قاعداً يقتدى ابوبكر بصلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم والناس يقتدون بصلوٰة أبى بكر و فى رواية لهما يسمع ابوبكر الناس التكبير ))

"جب نبی اکرم ﷺ طبیعت بوجھل بن گئی تو بلال رضی اللہ عنہ آئے کہ آپ ﷺ کو نماز کی اطلاع دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہو کہ وہ نماز پڑھائے، پھر چند ایام ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے رہے، پھر نبی اکرم ﷺ کو اپنے نفس میں افاقہ محسوس ہوا پھر آپ ﷺ اٹھے دو آدمیوں کے سہارے سے اور چلے اس حال میں دونوں پاؤں سے زمین پر نشانات پڑتے آرہے تھے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہوئے، پھر جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آواز سنی تو پیچھے ہٹنے لگے، پھر آپ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کیا کہ آپ نہ ہٹیں اور پھر آپ ﷺ آئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں طرف آکر بیٹھ گئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے اور رسول اکرم ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے۔ صحیحین کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو تکبیر سنا رہے تھے۔"

بعض لوگوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلے جو حکم فرمایا تھا کہ جب امام پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو وہ اس حدیث سے منسوخ ہے۔ یعنی جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو

مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے، لیکن ہماری تحقیق کے مطابق یہ بات صحیح نظر آتی۔

اولاً: اس لیے کہ اس نماز میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ابتدا سے ہی سے کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہے تھے اور آپ ﷺ بعد میں آئے تھے جو جماعت پہلے کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ اس حال میں ہی رہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو بھی مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ اس سے تو ظاہر بات جو سمجھ میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اگر امام کھڑے ہو کر نماز پڑھا رہا ہو اور آگے چل کر اگر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ امام کو بیٹھنا پڑ جائے تو اس صورت مقتدی کھڑے رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا پہلا حکم کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو یہ فرض اور وجوب کے لیے نہیں بلکہ اس حدیث سے امام کے بیٹھنے کے باوجود مقتدیوں کے کھڑے نماز پڑھنے کا جواز ثابت ہو گیا۔ اس صورت میں مقتدیوں کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے استحباب اور ندب کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسبوق بھی امام ہو سکتا ہے۔ جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ پہلے نماز پڑھا رہے تھے اور نبی کریم ﷺ بعد میں آئے اور مسبوق تھے، تاہم امامت کروائی۔ باقی آپ ﷺ کے اس فعل کو خصوصیت پر محمول کرنے کے لیے کوئی بھی دلیل نہیں۔ آپ ﷺ کے تمام افعال مبارکہ میں امت کے لیے اقتدا کا بہترین نمونہ ہے مگر اس صورت میں جس کے متعلق آپ ﷺ سے واضح طور پر مروی ہو کہ یہ فعل آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ خصوصیت دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہو گی۔ اگر کوئی شخص فرضی نماز پڑھ چکا ہو اور دیکھے کہ جماعت تیار ہے تو اسے چاہیے کہ دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے وہ اس کے لیے نفل بن جائے گی۔ ترمذی، ابوداود اور نسائی میں صحیح سند سے یزید بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ حج میں حاضر تھا۔ پھر منیٰ کی مسجد خیف میں فجر کی نماز آپ کے ساتھ ہی ادا کی پھر جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے اور مڑ کر بیٹھے تو معلوم ہوا دو آدمی قوم کے آخر میں بیٹھے تھے، جنھوں نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو بلایا جب ان دونوں کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمھیں کس چیز نے ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے روکا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) ہم اپنی جگہوں پر نماز پڑھ کر آئے ہیں تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایسے نہ کرو جب تم نے اپنی جگہوں پر نماز پڑھی ہو پھر دوبارہ کسی جماعت والی مسجد میں آؤ تو ان کے ساتھ بھی نماز پڑھو کیونکہ یہ تمھاری نفل بن جائے گی۔ موطا مالک اور نسائی شریف میں صحیح سند سے محجن دیلی سے روایت ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا تھا، پھر نماز کے لیے اذان دی گئی اور آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھائی اور لوٹ آئے اور محجن رضی اللہ عنہ ابھی تک اپنی مجلس میں بیٹھے تھے، پھر آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ تجھے کس چیز نے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے

روکا، کیا تو مسلمان نہیں؟ پھر اس نے کہا ہاں اے اللہ کے رسول میں مسلمان ہوں لیکن میں پہلے اپنے اہل میں نماز پڑھ آیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ جب آپ مسجد کی طرف آئیں اور آپ نے پہلے نماز پڑھ لی ہو تو بھی جب نماز قائم ہو چکی ہو تو پھر بھی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ۔ اگرچہ آپ وہ نماز پہلے پڑھ چکے ہوں۔ پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ یہ حکم صبح کی نماز کے ساتھ ہے یعنی اگر صبح کی نماز اپنی جگہ پر پڑھ لی جائے، پھر مسجد کی طرف آئے اور صبح کی نماز قائم کی جائے تو اسے بھی دوبارہ جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔

## متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز:

دلیل: سنن دارقطنی میں صحیح سند سے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان معاذا كان يصلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم العشاء ثم ينصرف الى قومه فيصلى لهم تلك الصلوٰة هو لهٗ نافلة و لهم فريضة ))

”بے شک معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے ساتھ عشاء نماز پڑھتے تھے، پھر جا کر اپنی قوم کو وہی نماز پڑھاتے تھے۔ وہ نماز معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے نفل اور ان کے لیے فرض ہوتی تھی۔“

## نماز کے لیے لباس:

سورۂ اعراف میں ہے:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الاعراف : ٣١]

”اے آدم کی اولاد ہر مسجد کی طرف آتے ہوئے زینت اختیار کیا کرو۔“

پھر جب کسی شخص کے پاس مکمل لباس ہو تو اس میں نماز پڑھے لیکن اگر کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ ہے ہی نہیں تو پھر وہ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھے جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم اور ابن خزیمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی طرف کھڑا ہوا پھر پوچھا کہ کیا ہم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے ہر کسی کے پاس دو کپڑے ہیں؟ الحدیث۔ یعنی آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ جب ہر کسی کے پاس دو کپڑے ہیں ہی نہیں تو پھر کیا وہ نماز ہی ترک کر دے؟ ہرگز نہیں بلکہ اسے بھی ایک کپڑے میں نماز پڑھنی ہوگی۔ البتہ اگر کسی کے پاس ایک کپڑا لمبا ہے تو اسے چاہیے کہ اس کے اطراف دائیں بائیں موڑ دے جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح بن خزیمہ میں عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلى فى بيت ام سلمة فى ثوب واحد قد خالف بين طرفيه ))

”میں نے رسول اکرم ﷺ کو بی بی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں دیکھا کہ آپ ﷺ ایک کپڑے میں

نماز پڑھ رہے تھے اس حال میں کہ آپ ﷺ نے کپڑے کے دونوں اطراف کو دائیں بائیں طرف موڑ رکھا تھا۔"

لیکن اگر بڑا کپڑا نہیں تو وہ اس کپڑے سے تہ بند باندھ دے اور جس کے پاس کپڑے کشادہ ہے تو وہ اس سے اپنے کندھوں کو ڈھانپ دے جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح ابن خزیمہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( لایُصَلِّیَ احدکم فی الثوب الواحد لیس علیٰ عاتِقَیہِ شيء )) ❶

"تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں اس حال میں نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کچھ بھی نہ ہو۔" ظاہر ہے۔

ایک کپڑے سے کندھوں کو ڈھانپنا صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ جب کپڑا کشادہ ہو مگر جب کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اس کو کندھوں کی طرف کھینچا جائے گا تو سر کھل جائے گا اور اگر سر کو ڈھانپا جائے گا تو کندھے ننگے رہیں گے۔ اس لیے ایسے شخص کے لیے جس کے پاس تنگ کپڑا ہو تہ بند باندھ دے۔ بہر حال جس کے پاس کشادہ کپڑا یا دو چھوٹے کپڑے ہوں تو اس لیے کندھوں کو ڈھانپنا بھی ضروری ہے۔ باقی رہا مرد کا سر تو اس کو نماز میں ڈھانپنا اگرچہ فرض اور واجب نہیں تاہم اوپر ذکر کی گئی آیت:

﴿ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الاعراف: ۳۱]

سے سر کا ٹوپی وغیرہ سے ڈھانپنا مستحب اور مندوب ضرور ہے، کیونکہ یہ زینت میں شامل ہے اور جو رواج آج کل پڑ چکا ہے کہ اکثر طور پر سر ننگے نماز پڑھی جاتی ہے یہ بات مستحسن نہیں ہے۔ حج کے موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ احرام میں مرد کو سر ننگا کرنا ہے اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سر عام حالات میں ڈھانپے ہوئے ہوتے تھے، ورنہ اگر عام دستور سر ننگا رکھنے کا تھا تو پھر یہ کیوں فرماتے کہ احرام میں سر نہیں ڈھانپا کرو یہ بعینہٖ اسی طرح کہ عورتوں کو اس طرح حکم ہے کہ وہ احرام میں چہرے نہ ڈھانپیں اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ عورتیں عام حالات میں غیر محرم سے چہرہ ڈھانپیں گی۔ اس لیے یہ سمجھایا گیا کہ احرام میں عورتیں اپنا چہرہ نہ ڈھانپیں اگر وہ ہمیشہ چہرے ننگے کر کے گھومتیں تو احرام کے وقت ان کو چہرے ڈھانپنے کا حکم کوئی بھی معنیٰ نہیں رکھتا۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سر ننگے کر کے گھومتے تو انھیں احرام میں بھی سر ڈھانپنے کا امر ضروری نہ تھا۔ افسوس کہ مغربی تہذیب اور انگریزوں کی اندھی تقلید میں ہمارے مسلمان تعلیم یافتہ اور ان پڑھوں نے سر ننگا کر کے چلنے کو اپنا ہمیشہ کا معمول بنا دیا ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا کہ اگر کسی شخص کو برا بھلا کہنا ہوتا تو کہا کرتے تھے کہ وہ سر ننگا شخص ہے مگر آج سر کا ننگا رکھنا فیشن اور زندگی کا ایک معمول لازمی جز بن

---

❶ بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ، باب نمبر ۵۔ رقم الحدیث: ۳۵۹.

گیا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔
بعض حضرات تو باہر سر پر ٹوپی رکھے ہوئے ہوں گے لیکن جب مسجد میں داخل ہوں گے تو ٹوپی اتار دیتے ہیں اور بعد میں نماز شروع کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کو کہیں گے تو جواب ملے گا کہ کہ آپ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی ہے۔ سبحان اللہ قربان جاؤں ایسے استدلال پر۔ جس حدیث سے یہ بزرگ دلیل لیتے ہیں اس حدیث میں تو واضح ہے کہ آپ ﷺ ایک کپڑا پہنے ہوئے تھے پھر وہ حضرات جب اس سنت پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ گھر میں سے نماز کے لیے جب نکلیں تو تمام کپڑے اتار کر صرف تہ بند باندھ کر نماز پڑھیں۔ باقی شلوار موجود ہے اور قمیص اور جراب بھی پہنے ہوئے ہیں۔ جیکٹ بھی موجود اگر قصور ہے تو بیچا ٹوپی کا ہے؟ یہ عجیب دلیل بازی کا نمونہ ہے علاوہ ازیں کسی صحیح حدیث تو کیا کسی ضعیف حدیث میں بھی نہیں آیا کہ آپ ﷺ باہر سے ٹوپی یا عمامہ پہن کر آئے لیکن مسجد میں داخل ہوتے ہی اسے اتار کر پھر نماز پڑھی۔ جب ایسی کوئی حدیث بھی نہیں تو پھر ان حضرات کا اس فعل کو سنت قرار دینا سادہ لوح عوام کو گمراہی کے گڑھے میں پھینکنا نہیں تو کیا ہے؟ بہر حال سر ڈھانپنا اگرچہ فرض نہیں مگر اسے ڈھانپنے کو ہر صاحب عقل اور منصب مزاج آدمی مستحب اور مندوب اور مستحسن ضرور سمجھے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جس طرح مرد کے لیے نماز میں سر ڈھانپنا ضروری ہے مستحب ہے اس کے برعکس عورت کی نماز سر ڈھانپے بغیر نہیں ہوگی۔ جس طرح ابوداؤد، صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقبل اللہ صلاۃ امرأۃ قد حَاصتتُ الا بخمار ))

”بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی بالغہ عورت کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔“

مرد اس کپڑے میں جس میں اپنی گھر والی سے جماع کرتا ہے تو اس کپڑے میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ جس طرح ابوداؤد اور صحیح ابن خزیمہ میں حسن سند سے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا (جو ان کی ہمشیرہ تھیں) سے پوچھا کہ کیا نبی ﷺ جس کپڑے میں مجامعت کرتے تھے اس کپڑے سے نماز پڑھتے تھے؟ بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ: ”نعم اذا لم یر فیہ اذیً“ یعنی ہاں جب اس کپڑے میں گندگی، نجاست نہ دیکھی جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس صرف قمیص یا جبہ ہے دوسرا کوئی کپڑا نہ ہے وہ اس کپڑے میں نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اسے بٹن وغیرہ سے بند کر دے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند سے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( سألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم قلت أکون فی الصید ولیس علیَّ

إلاقميص واحد أوجبة واحدة فازره؟ قال نعم ولو بشوقة ))

"میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ میں شکار میں ہوتا ہوں اور میرے پاس ایک قمیص یا ایک جبہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

اس حدیث میں امام ابن خزیمہ کے دوسرے شیخ سے یہ الفاظ زائد ہیں۔ "فتحضر الصلوٰة "یعنی نماز کا وقت ہو جاتا ہے کیا پھر میں اس قمیص یا جبہ کو بٹن لگا کر نماز پڑھ لوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، لگا لے۔ اگرچہ کانٹے ہی سے۔ نماز میں شلوار وغیرہ کا نیچے لٹکانا ممنوع ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے فرمایا:

(( لا ينظر الله الى صلوة رجل يجر ازارهٗ بطراً ))

"اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے شخص کی نماز کو دیکھتا ہی نہیں جو اپنا ازار تکبر سے نیچے لٹکاتا ہے۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ مرد حضرات کے نماز میں خواہ نماز سے باہر اپنی شلوار اور کپڑا وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کے متعلق حدیث میں سخت ممانعت وارد ہوئی ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( ثلاثة لايكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم قال قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث مرار قال ابوذر خابوا و خسروا من هم يا رسول الله قال المسبل والمنان والمنفق سلعته بالحلف الكاذب )) [في رواية له المسبل ازارهٗ]

"آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی طرف نہیں دیکھے گا اور نہ ان سے بات کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار ارشاد فرمائے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں وہ نامراد اور نقصان میں پڑ گئے کون ہیں وہ اے اللہ کے رسول رضی اللہ عنہما؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وہ شخص جو اپنے کپڑے کو نیچے لٹکاتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو اپنا سودا جھوٹی قسم کھا کر فروخت کرتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو احسان جتلاتا ہے۔"

صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: (( ما اسفل من الكعبين من الازار ففي النار )) "جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہے وہ آگ کے حوالے ہوا۔" یعنی ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکنے کے اس حصہ کو دوزخ کی آگ جلائے گی۔ اس طرح ابوداؤد، ترمذی اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے ابوجری جابر بن سلیم ہجیری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ حدیث لمبی ہے جس میں کوئی باتیں آپ ﷺ نے سکھلائیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی آپ ﷺ نے ارشاد فرمائی کہ:

« وایاك و اسبال الازار فَاِنَّهٗ من مخیله » ''آپ ازار کو نیچے نہ لٹکائیں کیونکہ یہ تکبر ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، اگرچہ اس کی نیت تکبر کی نہیں پھر بھی کپڑے کا نیچے لٹکا کر گھومنا تکبر ہی ہے۔ ابو داؤد اور نسائی میں صحیح سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( الاسبال فی الازار والقمیص والعمامة من جرشیئاً خیلاء لم ینظر اللّٰه الیه یوم القیامة ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کپڑے کا گھسیٹنا تہ بند میں بھی ہے تو قمیص اور پگڑی میں بھی پھر جو شخص اپنے کپڑے کو تکبر سے گھسیٹے گا تو اس کی طرف اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا۔''

بہرحال صحیح احادیث سے معلوم ہوا اپنے کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ناجائز ہے۔ جب یہ فعل نماز سے باہر ناجائز ہوا تو پھر نماز میں تو بالاولیٰ اس کی ممانعت میں شدت پیدا ہوگئی۔

## نماز میں کپڑوں کو بل دینا یا باندھنا:

صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سجدہ سات اعضاء پر کروں اور اپنے بال اور کپڑوں کو نہ باندھوں۔ یعنی کپڑے کو باندھنا یا بل دینا ممنوع ہے۔

## جس اوقات میں نماز ممنوع ہے ان کا بیان:

صحیح مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے اور ان اوقات میں اپنے مردے دفن کرنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ ایک جس وقت سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک اوپر چڑھ آئے۔ دوسرا جس وقت سورج درمیان میں ہو اور تیسرا یہ کہ جس وقت سورج اترنے والا ہو یہاں تک کہ پورا اتر جائے۔ اسی طرح ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(( لا صلوٰة بعد الصبح حتیٰ ترتفع الشمس ولا صلوٰة بعد العصر حتیٰ تغیب الشمس ))

''فجر نماز کے بعد سورج کے بلند ہونے تک کوئی بھی نماز نہیں اور عصر کے بعد یہاں تک کہ سورج غائب ہو جائے تب تک کوئی بھی نماز نہیں۔''

اگر کسی شخص نے فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھیں اور جماعت مکمل تیار ہو تو فرض میں شامل ہو جائے اس کے لیے رخصت ہے کہ وہ فجر نماز کے بعد دو رکعت سنت پڑھ سکتا ہے۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم

میں حسن سند سے قیس بن قھد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( أنهٗ صلى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم الصبح ولم يكن رَكَعَ رَكعَتيِ الفجر فلما سلم رسول الله صلى الله عليه وسلم سَلَّمَ مَعَهٗ ثُمّ قام فَرَكَعَ ركعتي الفجر و رسول الله صلى الله عليه وسلم ينظر اليه فَلَمْ ينكر ذالك عَلَيْهِ )) ❶

''قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، حالانکہ اس فجر کے دو سنتیں نہیں پڑھیں تھیں۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور دو رکعتیں پڑھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن اس پر انکار نہیں کیا۔''

اس روایت کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو جامع الترمذی میں اسی طرح وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ جامع ترمذی والی روایت میں انقطاع ہے لیکن تاہم یہ منقطع روایت مذکورہ حسن سند والی روایت کی تائید اور تقویت کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے شواہد اور متابعات علامہ ابوطیب مرحوم نے اپنی کتاب ''اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر'' میں ذکر کیے ہیں۔ جسے اس مسئلہ کے متعلق مزید تحقیق کی طلب ہے وہ اس کے متعلق تفصیل اسی مذکورہ کتاب میں دیکھ سکتا ہے، یہ کتاب اس سلسلہ میں نہایت مفید ہے۔ اسی طرح مسند ابی داؤد طیالسی اور صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تصلوا بعد العصر اِلّا ان تصلوا والشمس مرتفعة ))

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم عصر کے بعد نماز نہ پڑھو۔ الا یہ کہ اس وقت نماز پڑھو کہ سورج بلند ہو تو پھر پڑھ سکتے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ عصر نماز کے بعد بھی اگر سورج زرد نہیں ہوا تو نفلی نماز پڑھی جا سکتی ہے اور پھر اس طرح کہا جائے گا کہ اوپر مذکورہ حدیث میں عصر نماز کے بعد جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ سد ذرائع کے لیے ہے۔ یعنی اگر عام چھٹی دی جائے گی تو لوگ سورج زرد ہو جائے گا پھر بھی نماز پڑھتے رہیں گے۔ اس لیے اس بات ہی کو بند کرنے کے لیے یہ منع کا حکم وارد ہوا ورنہ اگر سورج بلند ہو تو مذکورہ صحیح حدیث کے مطابق نماز پڑھی جا سکتی ہے اور صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب عصر نماز کے بعد میرے پاس آتے تو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور ان دو رکعات کے متعلق احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے وہ کسی طرح شروع ہوئیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ظہر نماز کے بعد والی دو رکعات کسی وفد وغیرہ سے مشغول ہونے کی

❶ ابن حبان۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب النوافل، رقم الحدیث: ۲٤٧١

وجہ سے نہ پڑھ سکے اس لیے ان کو عصر کے بعد قضا کیا اور پھر اپنے دستور کے مطابق آپ ﷺ جو عمل شروع کرتے تھے اسے ترک نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے۔ اس حدیث اور علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ عصر نماز کے بعد اگر سورج کچھ بلند ہو تو نفلی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ البتہ عوام کو رخصت نہ دی جائے کہ عوام سورج زرد ہونے کے بعد بھی پڑھتی رہے گی۔

اوقات ممنوعہ جن میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اوپر کی سطور میں بیان ہوئے لیکن یہ بھی ہر جگہ کے لیے عام نہیں بلکہ مسجد حرام میں ہر وقت نماز پڑھنے کی رخصت ہے جیسا کہ صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت ہے۔ میں نے رسول اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے کہ یا بنی عبد مناف:

(( لا تمنعوا احداً طاف بهذا البيت وصلى اية ساعة شاء من ليل اَوْ نهار ))

''اے عبد مناف کی اولاد تم کسی کو بھی اس گھر یعنی مسجد حرام میں دن اور رات کے کسی بھی وقت طواف اور نماز پڑھنے سے نہ روکو۔''

اسی طرح جمعہ کے دن بھی دوپہر کے وقت (زوال کے وقت) نفلی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جمعہ کے دن لوگوں کو جلد ہی مسجد میں آنے کی ترغیب دلاتے تھے اور یہ بھی ترغیب دلاتے کہ جب تک امام نہ آئے (منبر پر) تب تک نماز پڑھتے رہیں۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

(( لا يغتسل رجل يوم الجمعة ويتطهر ما استطاع من الطهر ويدهن من دهنه او يمس من طيب بيته ثم يخرج فلا يفرق بين اثْنَيْنَ ثم يصلى ما كتب لهٗ ثم ينصت اذ اتكلم الامام الاغفر لهٗ ما بينهٗ وبين الجمعة الاخرىٰ ))

''جو آدمی جمعہ کے دن غسل نہیں کرتا اور طہارت کی جتنی وسعت ہے اتنی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور تیل لگائے اور اپنے گھر سے خوشبو لگائے، پھر نکلے اور دو آدمیوں میں تفریق نہ ڈالے، پھر وسعت کے بقدر نماز پڑھے پھر خاموش ہو جب امام کلام کرنا شروع کرے تو اس کے لیے اس جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امام کا خطبہ کے لیے آنے سے قبل جو شخص مسجد میں ہو وہ نماز پڑھتا رہے یا پڑھ سکتا ہے۔ اور امام سورج کے ڈھل جانے کے متصل ہی آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لامحالہ سورج کے ڈھلنے سے پہلے جو مسجد میں لوگ موجود ہوں گے انھیں نماز پڑھنے کی رخصت ہے۔ اس لیے سورج کے ڈھلنے پہلے ان کی نماز لازمی طور پر نصف النہار یا ڈھلنے کے وقت ہی ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مسجد میں جلدی آنے والے

لوگوں کے لیے نفلی نماز کی غایت اور انتہاء امام کا نکلنا بتائی ہے اور نبی اکرم ﷺ جمعہ کے دن سورج کے ڈھلتے ہی سے مسجد میں تشریف فرما ہوتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس ))

''آپ ﷺ جمعہ کی نماز سورج کے ڈھلنے کے وقت پڑھتے تھے۔''

جب آپ ﷺ سورج کے ڈھلتے ہوئے پہنچ جاتے تھے تو اس سے پہلے نفل پڑھنے والوں کی نماز لازمی طور پر نصف النہار ہی میں ہوئی۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ امام احمد کی مسند میں نبیشۃ الھذلی رضی اللہ عنہ سے اس جمعہ والی روایت میں الفاظ ہیں کہ: ''فان لم یجد الامام خرج صلی ما بدالہٗ'' یعنی جب مسجد میں داخل ہو اور دیکھے کہ امام ابھی نہیں آیا جتنی نماز پڑھ سکتا ہو پڑھے۔ یہ حدیث شواہد اور مشابہات کے لحاظ سے حسن ہے اوپر پڑھ کر آئے ہیں کہ امام سورج کو ڈھلنے کے وقت آئے گا۔ لہٰذا اس حدیث کے مطابق پہلے جو جتنی نماز پڑھے گا اس کا کچھ حصہ ضرور نصف النہار میں آئے گا اور یہ بالکل واضح ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

(( اذا کان یوم الجمعة وقفت الملائکة علیٰ باب المسجد یکتبون الاول فالاول ومثل المهجر کمثل الذی یهدی بدنة ثم کالذی یهدی بقرة ثم کَالَّذِیْ کَبْشًا ثم کَالَّذِیْ دَجَاجَةً ثم کَالَّذِیْ بیضة فاذا خرج الامام طوروا صحفهم ویستمعون الذکر ))

''جب جمعہ کے دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں اور سب سے پہلے آنے والے اشخاص کے نام ترتیب وار درج کرتے ہیں اور سب سے پہلے آنے والے کی مثال اس طرح ہے گویا کہ اس نے اونٹ ذبح کیا اور پھر اس کے بعد والے کی مثال گائے کی اور اس کے بعد بھیڑ اور پھر مرغی اور پھر انڈے کی مثال ہے۔ پھر جب امام نکلتا ہے تو رجسٹر بند کر کے اللہ کے ذکر کو سنتے ہیں۔''

اس حدیث سے بھی اوپر ذکر کی گئی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی جو آخری وقت میں آئے گا وہ سورج کے ڈھلنے سے تھوڑا پہلے آئے گا اور اس وقت میں پہنچ کر پھر نماز پڑھے گا اور ظاہر ہے وہ نماز نصف النہار کے وقت ہوگی۔

ایک شخص نیند سے اس وقت بیدار ہوا کہ سورج کے طلوع ہونے میں بہت کم ٹائم تھا یا پھر عصر نماز کسی سبب کی وجہ سے نہیں پڑھی یہاں تک کہ وقت اتنا تنگ ہو گیا کہ سورج کے غروب ہونے میں بہت کم وقت باقی رہ گیا تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اگر دونوں نمازوں میں سے ایک رکعت سورج کے طلوع یا غروب

ہونے سے پہلے پڑھ سکتا ہے تو پھر وہ نماز کو پہنچ گیا اور باقی نماز مکمل کرے۔ جیسا کہ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( من ادرك ركعة من الصبح قبل طلوع الشمس فقد ادرك الصلوة من ادرك ركعة من العصر قبل غروب الشمس فقد ادرك الصلوٰة ))

''جب آدمی کو سورج کے طلوع سے قبل اور سورج کے غروب سے قبل ایک رکعت مل گئی تو تحقیق اس نے نماز پالی۔''

اور صحیح ابن حبان میں جید سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( من ادرك ركعة قبل ان تطلع الشمس ثم طلعت الشمس فليصل اليها اخرىٰ ))

اگر کسی شخص نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ایک رکعت پالی، پھر سورج طلوع ہوا تو دوسری رکعت اس کی طرف ملالے۔''

اور صحیح ابن حبان کی دوسری روایت میں صحیح سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

(( من ادرك ركعة الفجر قبل ان تطلع الشمس و ركعة بعد مَا تطلع الشمس فقد ادركها ))

''جب آدمی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ایک رکعت پڑھے اور پھر سورج طلوع ہو اور پھر ایک رکعت پڑھ لی تو وہ بھی نماز کو پہنچ گیا۔''

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( اذا ادرك احدكم سجدة من صلوٰة العصر قبل ان تغرب الشمس فليتم صلوٰتهٗ واذا ادرك سجدة من صلوٰة الصبح قبل ان تطلع الشمس فليتم صلوٰتهٗ ))

''تم میں سے کوئی سورج کے غروب ہونے سے پہلے ایک رکعت کو پہنچ گیا اسے چاہیے کہ اپنی بقیہ رکعت پوری کرے اور جب کوئی فجر کی ایک رکعت سورج کے طلوع ہونے سے قبل پالے اس کو چاہیے کہ اپنی نماز مکمل کرے۔''

## نماز کے اوقات کا بیان:

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظہر نماز کا وقت سورج کے ڈھلنے کے وقت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جائے تو وقت ختم ہوا اور عصر نماز کا وقت ہر چیز کے سائے اس کے برابر ہو جانے کے وقت سے شروع ہو کر سورج کے زرد نہ ہونے

تک اور مغرب کا وقت سورج کے غروب ہونے سے لے کر جب تک شفق غائب نہ ہو (شفق کا مطلب سورج کے غروب ہونے کے بعد آسمان پر پھیلنے والی زردی ہے) اور عشاء نماز کا وقت شفق کے غائب ہونے سے نصف اللیل تک اور فجر نماز کا وقت طلوع فجر سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک۔ الحدیث۔ اور صحیح مسلم میں بریدہ الحصیب الاسلمی سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے نماز کے وقت کے متعلق پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارے ساتھ دو دن نماز پڑھیں پھر جب سورج ڈھلا تو بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ اذان دیں پھر تکبیر کا حکم فرمایا اور پھر عصر نماز کی اقامت کا حکم دیا کہ ابھی سورج اوپر اور صاف تھا اور پھر جب سورج غروب ہوا تو حکم فرمایا کہ مغرب کی اقامت کہیں اور پھر جب سرخی غائب ہوئی تو حکم کیا کہ اقامت کہیے پھر طلوع فجر کے وقت حکم فرمایا کہ اب فجر کی نماز کے لیے اقامت کہیں اور پھر دوسرے دن حکم کیا کہ ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کریں، پھر اچھے طریقے سے اسے ٹھنڈا کیا اور عصر نماز اس وقت پڑھی جب سورج ابھی اوپر تھا ابھی سرخ نہیں ہوا تھا پھر گزشتہ دن سے کچھ دیر کے بعد مغرب کی نماز شفق کے غائب ہونے کے کچھ دیر پہلے پڑھی اور عشاء کی نماز اس وقت ادا کی جس وقت رات کا تیسرا حصہ گزر چکا تھا اور فجر کی نماز اس وقت پڑھی جس وقت بالکل روشنی ہوگئی، پھر فرمایا کہ نماز کے اوقات کے متعلق پوچھنے والا کہاں ہے۔ اس شخص نے کہا میں ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمھاری نمازوں کا وقت جو آپ نے دیکھا اس کے درمیان میں ہے۔ یعنی پہلے دن نمازوں کے ابتدائی اوقات کا بیان ہے اور دوسرے دن ان کی انتہا کا یعنی مستحب وقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں صحیح سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کے نزدیک دو مرتبہ امامت کروائی پھر ظہر نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈھلا اور عصر نماز اس وقت جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوا اور مغرب نماز اس وقت پڑھائی جب روزے دار روزہ کھولیں، یعنی سورج کے غروب ہونے کے وقت اور عشاء نماز شفق کے غائب ہونے کے وقت اور فجر، طلوع فجر پر اور جب دوسرا دن ہوا تو ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہوا اور عصر اس وقت جب سایہ دو مثل ہوا اور مغرب نماز جب روزہ دار روزہ افطار کرے اور عشاء نماز رات کے تیسرے حصے تک پڑھائی اور فجر نماز اس وقت پڑھائی جب مکمل روشنی ہوئی اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اے محمد ﷺ یہ ہے آپ سے پہلے انبیاء کا وقت۔ اور نمازوں کا وقت دونوں وقتوں کے درمیان ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں محمد بن عمرو بن الحسن بن علی تابعی روایت ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کی نماز کے متعلق پوچھا پھر انھوں نے جواب دیا کہ آپ ﷺ ظہر نماز دوپہر کے وقت اور عصر نماز اس وقت کے سورج ابھی زندہ اور روشن ہوتا تھا اور مغرب جب سورج غروب ہوتا تھا اور عشاء جب لوگ زیادہ ہوتے تھے جلدی کرتے اور جب کم ہوتے تو دیر سے پڑھتے اور فجر نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صحیحین میں انس رضی اللہ عنہ

سے روایت ہے کہ ہم جب نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو گرمی سے بچنے کے لیے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے اور صحیحین میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ عصر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے، جب سورج اوپر زندہ ہوتا تھا۔ پھر ہم میں سے کوئی مدینہ کے اوپر والے حصوں میں جاتا تھا، پھر جب ان کے پاس واپس آتا تھا تو ابھی سورج اوپر ہوتا تھا۔ بعض اوپر والے حصے مدینہ سے چار میل کے فاصلے پر ہوتے تھے۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ عصر نماز پڑھتے تھے، پھر اونٹ ذبح کرتے تھے اور دس حصے کرتے پھر اسے پکاتے اور پھر پکا ہوا گوشت کھاتے تھے۔ سورج کے غروب ہونے سے پہلے فارغ ہو جاتے اور مغرب پڑھتے پھر ہم میں سے کوئی لوٹتا تھا کہ اس حالت میں اپنے تیروں کے نشانات کو دیکھ سکتا تھا۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ مؤذن نے ارادہ کیا کہ ظہر نماز کے لیے اذان دے آپ ﷺ نے فرمایا ٹھنڈا کرو، پھر ارادہ کیا کہ اذان دے پھر حکم فرمایا کہ ٹھنڈا کریں دو یا تین مرتبہ کہا یہاں تک کہ ہم نے ٹیلوں کے سائے دیکھے اور پھر فرمایا کہ سخت گرمی جہنم کا سانس ہے پھر جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو۔ صحیح ابن حبان وغیرہ میں عمدہ سند سے خباب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو ریت کی گرمائش کی شکایت کی مگر آپ ﷺ نے ہماری شکایت دور نہ فرمائی یعنی اول وقت میں پڑھتے رہے۔ صحیحین میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ فجر کی نماز سے فارغ ہوتے تو آپ ﷺ کے پیچھے چادروں میں لپٹی عورتیں لوٹتی تھیں۔ اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے ابو سعد رضی اللہ عنہ سے اوقات نماز سے متعلق طویل حدیث وارد ہے اس میں صبح کی نماز کے متعلق فرمایا کہ:

(( صلی الصبح بغلس ثم صلی مرة بغلس ثم صلی مرة اخری فاسفر بها ثم کانت صلوٰتهٗ بعد ذالك حتی مات صلی الله علیه وسلم لم یعد الی ان یسفر ))

''آپ ﷺ نے فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھی۔ پھر ایک مرتبہ روشنی میں پڑھی، پھر اس کے بعد آپ ﷺ ہمیشہ اندھیرے میں نماز پڑھتے تھے اور دوبارہ کبھی رحلت فرمانے تک روشنی میں نماز نہ پڑھی۔''

اور ابوداؤد، دارمی، ترمذی، نسائی میں صحیح سند نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ:

(( أنا اعلم بوقت هذه الصلوٰة صلوٰة العشاء الآخرة کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلیها سکوت القمر لثالثة ))

''مجھے عشاء نماز کے وقت کا زیادہ علم ہے۔ رسول اکرم ﷺ مہینہ کی تیسری تاریخ کا چاند جب غائب ہو جاتا تو پڑھا کرتے تھے۔''

صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا کیا حال ہوگا

جب تیرے اوپر ایسے امراء آئیں گے جو نماز کو ضائع کریں گے یعنی نماز کو اپنے اوقات سے ہٹ کر بعد میں پڑھتے تو میں نے کہا آپ مجھے حکم فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

(( صل صلوٰۃ لوقتھا فان أدر کتھا معھم فصل فانھا لك نافلة ))

''آپ اصل وقت پر نماز پڑھ لیں اور پھر اگر ان کو بعد میں نماز پڑھتے ہوئے پاؤ تو ان کے ساتھ بھی پڑھ لو یہ آپ کے لیے نفل ہوگی۔''

ابو داؤد میں سند حسن سے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت ہمیشہ خیر اور بھلائی پر رہے گی یا فرمایا کہ دین فطرت پر رہے گی جب تک کہ مغرب نماز کو اتنا پیچھے نہ کریں کہ بہت ستارے نظر آنے لگیں۔ اور امام حاکم اپنی کتاب المستدرک میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے:

(( ماصل رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوٰۃ لوقتها الآخر مرتين حتىٰ قبضها الله تعالیٰ ))

''رسول اکرم ﷺ نے کسی بھی نماز کو دو مرتبہ آخری وقت میں نہیں پڑھا۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنے پاس بلا لیا۔''

جمع بین صلاتین:

صحیح ابن حبان وغیرہ میں صحیح سند سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک نبی ﷺ جنگ تبوک میں سورج کے ڈھلنے سے پہلے سفر شروع کرتے تھے تو ظہر کو مؤخر کرتے تھے اور یہاں تک کہ عصر کے ساتھ اس کو پڑھتے تھے اور اگر سورج کے ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز کرتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ جمع کر کے پڑھ لیتے تھے۔ اسی طرح صحیح ابن حبان میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ایک دوسرے طریق سے مروی ہے جس میں یہ الفاظ اضافی ہیں کہ ابو الطفیل ان کا نام عامر بن واثلہ تھا۔ جو معاذ رضی اللہ عنہ سے راوی ہے وہ کہتا ہے کہ مقصد کیا ہے معاذ رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ آپ ﷺ کا ارادہ تھا کہ لوگوں پر مشقت نہ ہو۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور صحیح ابن خزیمہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( ان النبى صلى الله عليه وسلم اذا جد به السير جمع بين المغرب والعشاء ))

''بے شک نبی ﷺ کو جب سفر جلدی کرنا ہوتا تو مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھتے تھے۔''

سفر میں کوئی شخص کسی منزل پر پہنچ بھی گیا تب بھی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی رخصت ہے جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ تبوک والے سال نبی ﷺ کے ہمراہ نکلے تو نبی ﷺ سفر میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء نمازیں جمع کر کے پڑھتے تھے۔ پھر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے نماز کو مؤخر کیا۔ پھر اپنی جگہ سے نکلے اور ظہر اور عصر جمع کر کے پڑھی، پھر اپنی جگہ میں داخل ہوئے۔ اس

کے بعد پھر اس جگہ سے نکلے اور مغرب اور عشاء جمع کر کے پڑھیں، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے آگے طویل حدیث ذکر کی۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ سفر اگر جاری نہیں اور مسافر اپنی منزلوں میں موجود ہے تو اس صورت میں بھی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھ سکتا ہے۔ ان احادیث کے برعکس احناف حضرات کہتے ہیں کہ سفر میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا ناجائز ہے لیکن ان کے پاس اس کی ممانعت کوئی بھی دلیل نہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ امت پر آسانی پیدا کریں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، تو کسی اور کو کیا حق ہے کہ دین میں تنگی پیدا کرے۔ ان حضرات کو اگر کہا جاتا ہے کہ عرفات اور مزدلفہ میں تم لوگ جمع بین صلاتین کے قائل ہو تو پھر دیگر اسفار میں اس کے جواز سے کیوں انکار کرتے ہو تو اس کا کوئی بھی معقول جواب نہیں دے سکتے ہیں۔ سمجھ میں یوں آتا ہے کہ یہ محض مذہبی اندھی تقلید کی وجہ سے ہے، عرفات اور مزدلفہ ان کے ائمہ و بزرگان جمع بین صلاتین کو جائز سمجھتے ہیں اس لیے کہتے ہیں یہ جائز ہے اور دوسرے مقامات پر وہ اسے ناجائز کہتے ہیں تو ان کے مقلدین بھی اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صحیح احادیث میں اس کی رخصت موجود ہے، کچھ بزرگ تو اس جمع کو جمع صوری پر محمول کرتے ہیں حالانکہ جمع صوری والی صورت میں امت پر آسانی کے بجائے مشقت پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس بات کا ہمیں کیسے علم ہو سکتا ہے کہ مثلاً ظہر پڑھیں گے تو وقت ختم ہو گیا اور عصر نماز کا وقت آ گیا۔ علاوہ ازیں یہ محمول جمع تقدیم ہیں یعنی ظہر کے وقت میں عصر پڑھنے اور مغرب کے وقت میں عشاء کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں یہ حمل ممکن ہی نہیں۔ یہ جمع تقدیم والی صورت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی اور ایک مرتبہ نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں بھی دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھا جیسا کہ صحیح مسلم اور ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( صليت مع النبى صلى الله عليه وسلم بالمدينة ثمانيًا و سبعًا جميعًا ))

''میں نے نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ میں آٹھ رکعات یعنی ظہر اور عصر اور سات رکعات یعنی مغرب اور عشاء جمع کر کے پڑھیں۔''

اس حدیث میں ایک طریقہ سے یہ الفاظ زائد ہیں کہ: ((فى غير خوف ولا سفر)) ''نہ خوف تھا اور نہ ہی سفر کی حالت۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے راوی سعید بن جبیر ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو کہا کہ: (( لم فعل ذالك )) ''آپ ﷺ نے اس طرح کیوں کیا؟'' تب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((اراده ان لايحرج امتهٗ )) ''آپ ﷺ نے ارادہ کیا کہ امت کو مشقت نہ ہو اور اس لیے کہ حضر میں کبھی کبھی ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے وہ ظہر کے لیے اٹھ کر نماز پڑھے اور عصر کے وقت دوبارہ اٹھے اس پر اس کو کافی مشقت پیش آئے گی۔ پھر اگر اسے اجازت ہو گی کہ ظہر کے وقت میں عصر بھی پڑھ لے یا عصر کے وقت میں ظہر پڑھے تو نسبتاً اس کے

لیے کافی آسانی ہوگی۔ اس طرح اگر بارش چل رہی ہو تو اس حالت میں بھی وقتاً فوقتاً جماعت اکٹھی ہو تو کافی مشقت پیش آئے گی لیکن اگر ان کو یہ اجازت ہوگی تو کافی آسانی پیدا ہوگی۔ اس بعض دیگر صورتیں بھی جن کی وجہ سے بعض اوقات حضرت میں بھی دو نمازوں کو جمع کرنے پر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لیے نبی ﷺ جو مومنوں کے لیے رؤف رحیم ہیں ان کی ایسی مشکلات کے اوقات کے لیے یہ آسان راستہ دکھلایا ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر کسی مشغولیت کی وجہ سے دو نمازوں کو جمع کیا اس روایت کی تخریج علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ارواء الغلیل میں کی ہے۔

## صبح صادق کے متعلق معلومات:

مولانا محمد عثمان کوروای نے اپنی تفسیر تنویر الایمان سندھی میں سورۂ البقرہ کی تفسیر میں رمضان المبارک کے روزوں کے بیان کے تحت لکھا ہے کہ سورج غروب ہونے سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک رات تصور کرے۔ دیکھے کہ کتنے گھنٹے بنتے ہیں ان گھنٹوں کا ساتواں حصہ صبح صادق کا وقت بن جائے گا۔ موسموں کے اختلاف کی وجہ سے راتوں میں بھی کبھی زیادتی ہوتی ہے، یعنی موسم سرما کی راتیں طویل ہوتی ہیں۔ اس لیے صبح صادق کا وقت بھی طویل ہوگا۔ مثلاً فرض کریں کہ کسی جگہ پر سخت سردی ہے وہاں دسمبر یا جنوری کے مہینے میں سورج کے غروب سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک رات (۱۴) گھنٹوں کی ہوتی ہے تو اس صورت میں چودہ گھنٹوں کا ساتواں حصہ ۲ گھنٹے ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا: 'علی ھذا القیاس' دیگر موسموں میں بھی اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ گرمی کے موسم میں چونکہ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں، اس لیے سورج کے طلوع ہونے سے طلوع فجر بھی کم ہوگا۔ ہم نے اپنی جگہ کا اندازہ لگایا ہے کہ گرمی کے موسم میں طلوع فجر سورج کے طلوع ہونے سے ایک گھنٹا ۲۷ یا ۲۸ منٹ پہلے ہوتا ہے۔ مگر سردی کے موسم میں ایک گھنٹا ۵۶ منٹ پہلے طلوع فجر ہوتا ہے۔ چونکہ ملک کے سورج کے طلوع اور غروب مختلف ہوتا ہے، اس لیے ہر ملک کے سورج کے طلوع اور غروب کے اوقات کو دیکھ کر اس کے مطابق طلوع فجر کا وقت متعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہمارے پاس کراچی سے آٹھ، نو منٹ پہلے سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے اور وہاں آٹھ نو منٹ بعد یعنی ہمارے ہاں سورج طلوع ہوگا تو کراچی میں ۸، ۹ منٹ ہوں گے۔ اس لیے ہر ملک کے طلوع اور غروب کے تفاوت کی وجہ سے وہاں کے طلوع فجر کی تعین میں فرق ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

## سفر کی نماز کا بیان:

صحیح بخاری اور مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم من المدينة الى مكة فكان يصلي ركعتين ركعتين حيث رجعنا الى المدينة قيل لهٗ اقمتم بمكة بشيء؟

قال اقمنا بها عشراً ))

''ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور آپ ﷺ دو دو رکعتیں پڑھتے رہے یہاں تک ہم واپس مدینہ آ گئے۔ انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ کیا مکہ میں کچھ قیام بھی کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ دس دن قیام کیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سفر میں چار رکعتوں والی نماز کو دو دو رکعت کر کے پڑھنا نبی ﷺ کی سنت ہے اور مندوب ہے اور یہ دوسری بات معلوم ہوئی کہ شہر یا گاؤں کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد قصر نماز شروع ہو گی اور پھر جب واپس شہر یا گاؤں کی حدود میں داخل ہو گا، پھر سفر ختم ہو جائے گا۔ یعنی کوئی شخص سفر سے واپس لوٹتا ہے اور اسے شہر یا گاؤں نظر آ رہا ہے تو بھی اسے قصر پڑھنی ہو گی۔ یہاں تک کہ شہر کی حدود میں داخل ہو جائے۔ ہمارے اس بیان پر علی رضی اللہ عنہ کا وہ اثر بھی دلالت کرتا ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں تعلیقاً بالجزم بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں یہ اثر امام حاکم اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے موصولاً بیان کیا ہے۔ امام بیہقی کے الفاظ اس طرح ہیں:

((خرجنا مع عَلی متوجهين ههنا واشار بيدهٖ الى الشام فصلّى ركعتين ركعتين حتّٰى اذا رجعنا ونظرنا الى الكوفة حضرت الصلوة قالوا ياامیرا المؤمنين هذه الكوفة اتم الصلوٰة قال لا حتّٰى ندخلها))

''ہم علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے اس طرف اور اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا اور پھر علی رضی اللہ عنہ دو دو رکعتیں نماز پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم واپس ہوئے اور کوفہ کی طرف دیکھ رہے تھے تو نماز کا وقت آ گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اے امیر المومنین کوفہ یہ تو ہے اب تو نماز مکمل پڑھیں۔ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں یہاں تک کہ کوفہ کی حدود میں داخل ہوں۔''

اور حاکم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

(( خرجنا مع علی بن ابی طالب فقصرنا الصلوٰة ونحن نری بيوتنا ثم رجعنا فقصرنا الصلوٰة ونحن نری البيوت ))

''ہم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر پر نکلے تو ہم نے نماز قصر کی حالانکہ ہم اپنے گھروں کو دیکھ رہے تھے۔''

صحیح بخاری اور مسلم میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

(( أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى الظهر بالمدينة اربعا و صلى العصر بذی الحليفة ركعتين )) ''بے شک نبی ﷺ نے مدینہ میں ظہر نماز چار رکعتیں پڑھیں اور ذوالحلیفہ میں

نماز عصر دو رکعتیں پڑھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ سے ذوالحلیفہ دیکھنے میں آتا ہے، وہ صحیح حدیث اس کی تائید کرتی ہے جو اوپر ذکر ہو چکی ہے۔

## مسافر سفر میں کتنے دن تک قصر کرتا رہے؟

اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں اور احادیث میں بھی دنوں کا مختلف انداز وارد ہے۔ بعض میں ہے کہ نبی ﷺ مکے میں دس دن رہے جیسا کہ اوپر انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک سفر کیا جس میں ۱۹ دن رہے مگر دو دو رکعتیں پڑھتے رہے اور سنن ابی داؤد میں صحیح سند سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(( اقام رسول الله صلی الله علیه وسلم بتبوك عشرین یوماً یقصر الصلوٰة ))

"آپ ﷺ جنگ تبوک میں بیس دن رہے نماز کو قصر کرتے رہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ اقامت کا انداز ہے۔"

جو صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے۔ حافظ ابن حزم نے اپنی کتاب محلی میں بھی اس انداز کو ترجیح دی ہے اور اس کے قائل ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری تحقیق یہی ہے کہ ایک مقام پر بیس دن تک نماز کو قصر کرنے اور اس سے زیادہ رہے تو مکمل پڑھے۔ سفر میں نماز کو قصر کرنا اگرچہ مسنون اور مستحب اور افضل ہے، تاہم اگر سفر میں بھی نماز مکمل پڑھے تو اس نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا۔ جیسا کہ سنن دارقطنی میں صحیح سند سے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

(( خرجت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فی عمرة رمضان فافطر رسول الله صلی الله علیه وسلم وصمت وقصر واتممت فقلت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم بابی وامی افطرت وصمت قصرت واتممت۔ فقال احسنت یا عائشة ))

"میں نبی ﷺ کے ساتھ رمضان المبارک میں عمرہ پر نکلی پھر آپ ﷺ نے روزہ نہیں رکھا اور میں نے روزہ رکھا اور آپ نے نماز قصر کی اور میں نے مکمل پڑھی، پھر میں نے کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ نے روزہ نہیں رکھا جبکہ میں نے روزہ رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے نماز قصر کی میں نے مکمل پڑھی (یعنی میرے لیے کیا حکم ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ تو نے بھی اچھا کام کیا۔"

### فائدہ:

سفر کی نماز کے متعلق امام اگر مسافر ہو تو اسے چاہیے کہ مقیم اور مقتدیوں کو بتائے کہ تم اپنی نماز مکمل کرو ہم

مسافر ہیں۔ یہ حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں عمران رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔
اسی طرح مسند علی بن جعد میں صحیح سند سے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:
(( انهٗ اِنْتَهٰى الىٰ مكّة فصلى بالناس ركعتين ثم قال يا اهل مكة اتموا فانا قوم سفر))
"اے اہل مکہ اپنی نماز مکمل پڑھو ہم مسافر ہیں۔"

❁❁❁❁

**المقالة الثانية**

# حیاز الصلوٰۃ من بیان أدعیة الصلوٰۃ

## نماز کی مسنون دعائیں

کراچی کا مشہور پریس ''شفیق پریس'' کے مالک جناب عتیق صاحب نے شاہ محبّ اللہ صاحب سے عرض کی کہ آپ دعاؤں کے متعلق ایک مختصر رسالہ تحریر کریں تا کہ اس کو چھپوا کر استفادہ عام کے لیے تقسیم کیا جائے۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے تھابت مختصر اور احادیث صحیحہ سے مزین ایک رسالہ بنام ''حیاز الصلوٰۃ'' تیار کیا، جو کہ قارئین کرام کے لیے پیش خدمت ہے۔ ''الازہری''

الحمد لله الذى يكشف السوء، و يجيب المضطر إذا دعاه و يقبل على صلوٰة العبد مادام يناجيه فيها بالخضوع ويلازم الخشوع ويرعاه۔ والصلوٰة والسلام على من علمنا كيف ندعوالله تعالىٰ فى عباداتنا لاسيما فى الصلوٰة وفى الأمور كلها على كل حال سيدنا محمد رسول ربنا الكبير المتعال وعلى آله و اصحابه الذين بلغونا سنة نبينا فى جمع الأمور والأحوال فلم يبق لأحد فى دين الله القيم بحال قيل و قال۔

**امابعد:**

بندہ حقیر پر تقصیر ابو القاسم محبّ اللہ شاہ الراشدی عرض پرداز ہے کہ مجھے ''شفیق پریس کراچی'' والوں کی طرف سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ میں ''نماز کی دعاؤں کے متعلق ایک کتابچہ تحریر کروں، اس ارشاد کی تعمیل کے لیے بسم اللہ کر کے کام شروع کر دیا اور نماز کی دعائیں جو اُحادیث صحیحہ سے ثابت ہیں وہ بمع حوالہ کتاب حدیث اور بمع نام اس صحابی کے جو اس حدیث کا راوی ہے حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

قارئین کرام اپنی نیک دعاؤں میں راقم الحروف کو یاد فرماتے رہیں۔ جزاکم اللہ خیراً

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

**ابو القاسم محبّ اللہ شاہ الراشدی**

۱۹۸۸ء

# نماز کا طریقہ

سب سے پہلے تکبیر تحریمہ ''اللہ اکبر'' کہنا ضروری اور فرض ہے جیسا کہ مسئ صلوٰۃ کو نبی ﷺ نے فکبر کہہ کر اُمر فرمایا تھا۔ [بخاری و مسلم]

اگر نماز فرضی ہے تو اس کے لیے اقامتاً یعنی اللہ اکبر اللہ اکبر اِلیٰ آخرہ کہنا بھی ضروری ہے، خواہ اکیلا ہی ہو جیسا کہ مسئ صلوٰۃ کی حدیث میں ''اَقِمْ'' اقامت کہہ سے اس کا امر فرمایا۔ [فتح الباری]

اسی طرح نبی ﷺ نے فرمایا:

(( صلوا کما رایتمونی أصلی ))

''نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔''

[بخاری وغیرہ عن مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ اس کا بھی تقاضا ہے کہ فرض نماز میں اقامت کہنی چاہیے]

## تکبیر تحریمہ:

اللہ اکبر کہہ کر سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانے کے بعد اول دعائے استفتاح ''یعنی قرأت سے پہلے کی دعا پڑھنی چاہیے۔''

## دعائے استفتاح:

استفتاح کی مختلف دعائیں اُحادیث صحیحہ میں وارد ہیں، کچھ لمبی ہیں کچھ چھوٹی ہیں، جن کی تعداد میرے مبلغ علم تک ''نو (۹)'' ہے، لیکن اس جگہ میں عوام وخواص کی سہولت کے لیے صرف تین دعائیں تحریر کروں گا۔

## پہلی دعا:

(( اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِىْ وَ بَيْنَ خَطَايَایَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ۔ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ )) [بخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ]

''یا اللہ میرے اور میرے گناہوں کے درمیان اتنی دوری کر جتنی دوری مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔ اے اللہ مجھے گناہوں سے اس طرح صاف کر جیسے سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے، یا اللہ میرے گناہوں کو دھو کر صاف کر دے اپنی رحمت کے پانی سے برف سے اور اولوں سے۔''

## دوسری دعا:

(( سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ ))

[ ابوداؤد و ترمذی عن عائشة رضی الله عنهما]

'' تیری پاکی بیان کرتا ہوں اے اللہ تیری حمد وثنا کے ساتھ اور بڑی برکت والا ہے تیرا نام اور تیری شان بلند و بالا ہے اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔''

## تیسری دعا:

(( اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ )) [ صحیح مسلم و نسائی ]

''سب حمد وثنا اللہ کے لیے ہے بہت زیادہ پاک اور بابرکت ہے۔''

## تنبیہ:

یہ استفتاح کی دعا صرف ابتدائی رکعت میں پڑھنی چاہے۔ بقیہ رکعات میں نہیں پڑھی جائے گی، بعد ازاں قرأت سے پہلے اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کرنا چاہیے اور استعاذہ کے جو الفاظ حدیث نبوی ﷺ میں وارد ہیں وہ یہ ہیں:

(( اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه و نفخه و نفثه ))

[ ابو داؤد عن جبیر من مطعم ]

''پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سننے جاننے والے سے دھکارے ہوئے شیطان کے جنون، اس کے تکبر اور اس کے شعر سے۔''

پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے لیکن جہری نماز میں یہ آہستہ پڑھنی ہے جیسا کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند أحمد میں صریح اور واضح الفاظ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ و ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہراً نہیں پڑھتے تھے۔ بہر حال بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ضروری ہے۔

## سورت فاتحہ پڑھنا ضروری ہے:

سورۂ فاتحہ امام، مقتدی اور اکیلے اور اسی طرح فرضی نماز یا نفلی یا جنازہ نماز سری ہو، جہری ہو ہر رکعت میں پڑھنی فرض ہے، اگر کسی نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو نماز نہ ہوگی جیسا کہ مسیئ صلواۃ والی حدیث مسند احمد وغیرہ میں وارد ہے اور عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری وغیرہ میں وارد ہے۔

## فاتحہ کے بعد آمین جہراً کہنا:

آمین یعنی ہماری یہ دعا قبول فرما۔ امام و مقتدی دونوں کہیں اگر جہری نماز ہے تو امام اور مقتدیوں دونوں کو جہراً کہنا چاہیے۔

## رکوع:

جب قرأت سے فارغ ہو تو اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائیں اور احادیث مبارکہ سے جو اذکار وارد ہے وہ پڑھے رکوع میں بہت سے اذکار اور دعائیں وارد ہیں لیکن ہم یہاں صرف چار دعائیں ذکر کرتے ہیں۔

### پہلی دعا:

(( سبحانك اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللهُمَّ اغفرلی ))

[ بخاری مسلم عن عائشة رضی الله عنهما ]

''تیری پاکی بیان کرتا ہوں اے اللہ، ہمارے رب اور تیری ثنا کے ساتھ اے اللہ مجھے بخش دے۔''

### دوسری دعا:

(( سبحان رَبّی العظیم )) [ ابو داؤد، مسلم، ترمذی عن حذیفة رضی الله عنه]

''پاکی بیان کرتا ہوں میرے رب عظیم (بڑے) کی۔''

### تیسری دعا:

(( سُبُّوح قُدُّوس رَبُّ المَلَائِكَةِ وَالرُّوح ))

[ صحیح مسلم عن عائشة رضی الله عنها ]

''تو پاک ہے اپنی ذات میں ہر نقص سے تو منزہ ہے اپنی صفات میں ہر عیب سے۔''

### چوتھی دعا:

(( سُبحان ذِی الجبروتِ والمَلَكُوتِ والكِبرِيَاء والعظمَةِ ))

[ نسائی عن عوف بن مالك رضی الله عنه]

''پاکی بیان کرتا ہوں اس (ذات) کی جو صاحب ہے غلبہ کا بادشاہی کا بڑائی کا اور بزرگی کا۔''

### تنبیہ:

ان دعاؤں میں سے کوئی ایک کم از کم تین بار رکوع میں پڑھیں، پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو جائیں (اللہ جو اس کی حمد کرتا ہے اس کو سنتا ہے) یہ الفاظ صرف امام کہے یا اگر وہ اکیلا ہے تو لیکن مقتدی کو (راجح یہی ہے) ربنا ولك الحمد...... الی اخرہ کہنا چاہیے۔ پھر کہے:

(( ربنا ولك الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه ))

[ بخاری رفاعة رافع ]

''اے ہمارے رب تیرے لیے حمد وثنا ہے، ایسی حمد جو بہت زیادہ ہو پاک ہو جس میں برکت ہو۔''

اس قیام میں اور بھی اُدعیہ وارد ہیں آسانی کے لیے صرف یہ دعا تحریر کر دی ہے۔

**سجدہ:**

پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں چلا جائے، سجدہ میں بھی بہت سی دعائیں مروی ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر صرف چار ذکر کرتے ہیں۔

**پہلی دعا:**

(( سبحانك اللّٰھُمَّ رَبنا وَ بِحَمْدِكَ اللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی ))

[ صحیح بخاری و مسلم عن عائشة رضی الله عنها]

**دوسری دعا:**

(( سبوح قدوس رب الملائکة والروح )) [ صحیح مسلم عن عائشة رضی الله عنها]

**تیسری دعا:**

(( سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء و العظمة ))

[ سنن نسائی عن عوف بن مالك رضی الله عنه]

ان تینوں دعاؤں کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔

**چوتھی دعا:**

(( سبحان رَبی الأعلیٰ )) [ صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی عن حذیفة رضی الله عنه ]

"پاک ہے میرا رب جو بلند و بالا ہے۔"

**تنبیہ:**

ان اُدعیہ میں سے کوئی ایک کم از کم تین بار سجدہ میں پڑھیں، پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ سے سر اٹھا کر اطمینان سے بیٹھ جائیں اور جلسہ میں یہ دعا پڑھیں۔

**جلسہ کی دعا:**

(( اَللّٰھُمَّ اغفرلی وارحمنی وعافنی واجبرنی وارفعنی واھدنی وارزقنی ))

[ ابوداؤد، ترمذي، ابن ماجة، مسند امام احمد المستدرك عن عبدالله بن عباس رضی الله عنهما]

"اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر اور مجھے عافیت دے اور میرے نقصان کو پورا کر میرا مال اچھا کر اور میرے درجات میں بلند کر اور مجھے ہدایت کر اور مجھے رزق دے۔"

یہ دعا ایک بار پڑھ لینا کافی ہے اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ میں یہ مختصر دعا بھی وارد ہے۔

(( ربّ اغفرلی رب اغفرلی )) [ صحیح مسلم ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجه عن حذیفة رضی الله عنه]

حدیث میں اسی طرح یہ دعا دوبارہ مذکور ہے، لیکن سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو نبی ﷺ نے متعدد بار دہرایا۔

اس کے بعد پھر اللہ اکبر کہہ کر دوسرے سجدہ میں جائے اور اس میں بھی مذکورہ اذکار میں سے کوئی پڑھے۔

پھر اللہ اکبر کہہ کر اطمینان سے بیٹھ جائے لیکن اس جلسہ میں کوئی مسنون ذکر یا دعا وارد نہیں ہے پھر دونوں ہاتھوں سے زمین پر ٹیک لگاتے ہوئے دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے، اس دوسری رکعت میں اور اس طرح بعد والی رکعات میں استفتاح کی دعا پڑھنی نہیں ہے۔ بس سیدھا کھڑا ہو کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۂ فاتحہ شروع کر دے، میری تحقیق کے مطابق ان دوسری رکعات میں استعاذہ بھی نہیں پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو قرأت ''الحمد للہ رب العالمین'' سے شروع فرماتے اور خاموش نہ ہوتے۔ (( ولم یسکت )) امام حاکم اسے المستدرک کی جلد اول میں لائیں ہیں اور فرمایا ''ھذا حدیث صحیح'' امام بخاری اور امام مسلم کی شرط پر ہے اور (وافقہ الذھبی) حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی امام حاکم کی بات بحال رکھی۔

ابتدا میں استعاذہ کے الفاظ ہم ذکر کر چکے ہیں اگر نبی ﷺ دوسری رکعت میں بھی استعاذہ پڑھتے تو صحابی رضی اللہ عنہ اس طرح نہ فرماتے کہ آپ سکوت نہ کرتے تھے، کیونکہ استعاذہ کے جو الفاظ حدیث میں وارد ہیں، ان کے پڑھنے کے لیے لامحالہ سکوت ہونا چاہیے تھا کیونکہ ان کے پڑھنے میں چند سیکنڈ تو لگ ہی جاتے ہیں البتہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور پڑھتے تھے، کیونکہ اس کے پڑھنے میں ایک سیکنڈ بھی مشکل سے صرف ہوتا ہے۔

پھر دوسری رکعت میں اسی طرح پڑھے اور اس میں بھی وہی اذکار و ادعیہ پڑھے جو پہلی رکعت میں پڑھ چکا تھا۔

دوسری رکعت میں امام سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورۂ بھی پڑھے، اگر جہری نماز نہیں ہے تو مقتدی بھی سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سنن دارقطنی میں صحیح سند سے وارد ہے۔

اگر جہری نماز ہو تو مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت نہیں پڑھنی چاہیے۔

## تشہد:

پھر دوسرے سجدہ کے بعد تشہد بیٹھ جائے ہر دو رکعت ''سوائے وتر'' کے فرضی خواہ نفل نماز میں تشہد ضروری ہے جیسا کہ حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مسیٔ صلوٰۃ والی حدیث میں سنن ابی داؤد اور سنن الکبریٰ للبیہقی میں حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

(( فَاِذَا جلست فی وسط الصلوٰۃ فاطمئن وافرش فخذک الیسریٰ ثم تشھد ))

"درمیان نماز میں بیٹھو تو اطمینان سے بیٹھو اپنی بائیں ران کو بچھا دو، پھر التحیات پڑھو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ درمیان والے جلسہ میں بھی تشہد "التحیات" پڑھنی ہے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

(( فی کل رکعتین التحیة ))

"یعنی ہر دو رکعت میں التحیات ہے۔"

اور اس کا امر بھی فرماتے تھے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

(( اِذَا قَعَدتُم فِی کل رکعتین فقولوا التحیات ))

[ نسائی، احمد، طبرانی، صحیح سند سے مروی ہے ]

"جب تو ہر دو رکعت میں بیٹھو تو کہا کرو "التحیات" الیٰ آخرہ۔"

امام نسائی نے اپنی سنن میں ایک دوسری صحیح سند والی روایت ذکر کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

(( قولوا فی کل جلسة التحیات ))

"ہر جلسہ میں التحیات کہا کرو۔"

البتہ اگر پہلی دو رکعتوں میں نسیان کی وجہ سے التحیات پڑھ نہ سکا تو دو سجدے سہو ادا کرے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے اور ان قعدوں میں ہر درود و سلام سے پہلے التحیات پڑھنی ہے جیسا کہ صحیح مسلم اور سنن الکبریٰ بیہقی میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

احادیث مبارکہ میں تشہد (التحیات) کے مختلف صیغے وارد ہیں۔ ہم یہاں وہ تشہد تحریر کرتے ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیحین [ بخاری و مسلم ] وغیرہم میں وارد ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں کہ میری ہتھیلی ان کی دو ہتھیلیوں کے درمیان تھی اسی طرح تشہد سکھایا جس طرح مجھے قرآن کی سورۂ سکھائی۔

(( التحیات للّٰه والصلوٰة والطیبات السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبرکاته السلام علینا وعلی عبادالله الصالحین اشهد ان لا اله الا اللّٰه وأشهد ان محمداً عبده ورسوله ))

"جملہ ثنا و تعریف کے الفاظ و محامد اور جسمانی عبادات اور مالی عبادات اللہ کے لیے ہی ہیں اور اے نبی! تم پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں سلام ہو تم پر اور اللہ کے جملہ صالح بندوں پر، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الصلوٰۃ میں تشہد کے یہی الفاظ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے لیکن کتاب الاستیذان میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی روایت کیا ہے کہ:

(( وَهُوَ بَيْنَ ظهرانِنَا فلما قبض قلنا : السلام على النبى ))

ہم صحابہ رضی اللہ عنہم السلام علیک ایھا النبی اس وقت کہتے تھے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں زندہ موجود تھے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ہم نے السلام علی النبی پڑھنا شروع کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد جو تشہد سکھاتی تھیں اس میں بھی "السلام علی النبی" ہے۔ اس حدیث کو ابو العباس الاسم نے اپنے مسند میں اور "المخلص" نے اپنی کتاب "الفوائد" میں صحیح سندوں سے ذکر کیا ہے۔ (ذکرہ العلامۃ الالبانی فی صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اسی طرح مصنف عبدالرزاق میں امام عطاء بن ابی رباح سے صحیح سند کے ساتھ روایت ہے کہ:

(( ان الصحابة كانوا يقولون والنبى صلى الله عليه وسلم حَيٌّ "السلام عليك ايها النبى ) فلما مات قالوا السلام على النبى ))

"صحابہ رضی اللہ عنہم السلام علیک ایھا النبی اس وقت کہتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو انھوں نے السلام علی النبی پڑھنا شروع کیا۔"

**ملحوظہ نمبر ۱:**

صحابہ سے مراد اس روایت میں حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اس سے مراد جمیع صحابہ نہیں ہے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

**ملحوظ نمبر ۲:**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو روایت اوپر نقل کر چکے ہیں وہ امام بیہقی کی سنن کبری میں بھی ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو صحیح مسلم، صحیح ابی عوانۃ، مسند شافعی اور سنن نسائی میں وارد ہے اس کے تشہد میں (( السلام عليك أيها النبى )) کے الفاظ ہیں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو تشہد مروی ہے اس میں بھی (( السلام عليك أيها النبى )) کے الفاظ ہیں، یہ روایت مرفوع ہے اور ابو داؤد دارقطنی نے اس کو روایت کیا ہے اور دارقطنی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

اس طرح مسلم، ابو عوانہ، ابو داؤد اور ابن ماجہ میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوع ہے، اس میں بھی (( السلام عليك أيها النبى )) کے الفاظ ہیں۔

امام مالک اور امام بیہقی سنن کبریٰ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ

وہ منبر پر لوگوں کو تشہد سکھاتے تھے اور اس میں بھی ((السلام علیک)) کے الفاظ ہیں۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد تشہد میں ((السلام علی النبی)) پڑھنے پر سب صحابہ رضی اللہ عنہم متفق نہیں تھے کچھ ((السلام علی النبی)) تو کچھ ((السلام علیك أیها النبی)) پڑھتے تھے۔ اس لیے راقم الحروف کا عمل تو ((السلام علی النبی)) پڑھنے والوں کے مطابق ہے لیکن جو "السلام علیك ایها النبی" پڑھتا ہے اس کو بھی ناجائز قرار نہیں دیتا۔ واللہ اعلم بالصواب

## درود شریف:

تشہد کے بعد (ہر جلسہ درمیان والے خواہ آخری میں) نبی ﷺ پر ماثور صلوٰۃ بھی پڑھنی ہے، درمیانی تشہد کے بعد درود پڑھنے کے دلائل حسب ذیل ہیں:

### ا۔ پہلی دلیل:

مسند ابی عوانہ اور سنن الکبریٰ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ آپ ﷺ کی رات کی نماز (وتر) کا بیان ہے۔ اس میں ہے کہ آپ نو رکعات وتر کی پڑھتے تھے، ان نو رکعات میں آٹھویں اور نویں پر بیٹھتے تھے، آٹھویں میں بیٹھ کر تشہد وصلوٰۃ پڑھتے پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے اور پھر نویں پر بیٹھتے اور تشہد صلوٰۃ وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دیتے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ خود نبی ﷺ بھی سلام سے پہلے والے قعدہ میں صلوٰۃ پڑھتے تھے، نماز فرضی ہو یا نفلی صلوٰۃ مبارکہ پڑھنے کے متعلق کسی دوسری حدیث میں تفاوت مذکور نہیں ہے، لہٰذا اگر نوافل کے درمیان والے قعدہ میں صلوٰۃ مروی ہے تو یہ فرائض میں بھی پڑھی جاسکتی ہے۔

### دوسری دلیل:

صحیح مسلم سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ میں حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں تھے تو مبشر بن سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا۔

((أمرنا الله ان نصلی علیك یا رسول الله فکیف نصلی علیك...... ثم قال قولوا: اللهم صل...... الخ))

''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر صلوٰۃ پڑھنے کا امر فرمایا ہے۔'' یعنی:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴾ [الاحزاب: ٥٦]

پھر ہم کس طرح آپ پر صلوٰۃ پڑھتے تو آپ ﷺ نے فرمایا، کہو: ((اللھم صلی الخ)) السنن الکبریٰ للبیہقی اور السنن للدارقطنی نے اس روایت کو ابو مسعود عقبۃ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، جس کی امام حاکم نے

تصحیح کی ہے اور امام دار قطنی نے اس کی تحسین فرمائی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

(( أقبل رجل حتی جلس بین یدی رسول الله صلی الله علیه وسلم و نحن عنده فقال یا رسول الله اما السلام علیك فقد عرفناه فكیف نصلی علیك...... اِذ صلینا علیك فی صلوٰتنا صلی الله علیك...... ثم قال اذا انتم صلیتم علی فقولوا اللهم صل علی الخ ))

''ہم نبی ﷺ کے پاس تھے تو ایک آدمی آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا، پھر کہا، اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام کی کیفیت تو ہم نے معلوم کر لی (یعنی تشہد میں السلام علیک ایھا النبی) پھر ہم آپ پر درود کس طرح پڑھیں، جب ہم نماز میں ہوں (صحابی رضی اللہ عنہ کا مقصد تھا کہ اللہ نے صلوٰۃ وسلام دونوں کا امر فرمایا ہے سلام تو معلوم ہوا اب بتائیں کہ صلوٰۃ کس طرح پڑھیں) اللہ آپ پر اپنی رحمت بھیجے؟ تو آپ نے فرمایا کہ کہو ''اللهم صل علی محمد الخ''

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ ہم پر نکلے، ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ!

(( قد علمنا كیف نسلم علیك فكیف نصلی علیك فقال قولوا اللهم صلی علی الخ ))

''اے اللہ کے رسول! آپ پر کس طرح سلام کہیں وہ تو ہمیں معلوم ہو گیا، پھر یہ بتائیں آپ پر کس طرح صلوٰۃ پڑھیں آپ ﷺ نے فرمایا: کہو! ''اللهم صلی علی محمد الخ''

حدیث نمبر۲ سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سوال نبی ﷺ سے نماز میں سلام وصلوٰۃ کے متعلق تھا اور نماز میں سلام تشہد میں ہی ہے، لہٰذا صلوٰۃ کے متعلق سوال بھی اسی نماز کے بارے میں ہے اور یہی مطلب امام بیہقی وغیرہ نے اخذ کیا ہے۔ دیکھیے (سنن کبریٰ)

ان احادیث سے بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سوال نبی (ﷺ) سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں آپ پر صلوٰۃ وسلام دونوں پڑھنے کا امر فرمایا ہے آپ نے ہمیں سلام تو سکھایا ہے (یعنی تشہد میں جیسا کہ گزر چکا) اب ہمیں بتائیں کہ آپ پر صلوٰۃ کس طرح پڑھیں پھر آپ ﷺ نے ان کو صلوٰۃ پڑھنے کا طریقہ بتا دیا، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان '' صلوا علیه وسلموا تسلیمًا'' کی تعمیل اسی طرح ہو سکتی ہے کہ جب بھی تشہد پڑھا جائے تو صلوٰۃ بھی پڑھی جائے، ورنہ اگر تشہد کے بعد ہر قعدہ تشہد میں صلوٰۃ ضروری نہ ہوتی تو جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز میں صلوٰۃ کے بارے میں پوچھا تو آپ صلوٰۃ کا طریقہ نہ بتاتے بلکہ فرماتے کہ ہر سلام کے بعد صلوٰۃ ضروری نہیں ہے، بہر حال صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہر تشہد ''درمیانی ہو یا

آخری'' کے ساتھ صلوٰۃ بھی پڑھنی ہے اور یہی مذہب امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب ''الأم'' میں اس پر تنصیص ذکر کی ہے اور اصحاب شافعیہ کے ہاں بھی صحیح ہے، جیسا کہ امام نووی نے ''المجموع'' میں اس کی تصریح کی ہے اور ''الروضۃ'' میں اس کی تائید کی ہے اور وزیر بن ہبیرۃ حنبلی نے افصاح میں اسی کو اختیار کیا ہے جیسا کہ ابن رجب نے ذیل الطبقات میں نقل کیا ہے۔

محقق العصر علامہ ناصر الدین الالبانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ دیکھیے (صلوٰۃ النبی ﷺ) اور مولانا عبدالقادر حصاروی رحمہ اللہ کی بھی یہی تحقیق تھی اور یہی بات صحیح ہے کہ صلوٰۃ پہلی اور آخری تشہد کے ساتھ پڑھنی ہے جو پہلی تشہد میں صلوٰۃ پڑھنے سے منع کرتے ہیں ان کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

صلوٰۃ مبارکہ کے بھی متعدد صیغے احادیث صحیحہ سے مروی ہے لیکن اسی جگہ ہم وہ صیغے تحریر کرتے ہیں جو صحیح بخاری و مسلم، مسند حمیدی اور سنن کبریٰ بیہقی وغیرہ میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کی صحت پر اجماع ہے اور یہی زیادہ مشہور و معروف ہے۔

(( اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ))

''اے اللہ تو حضرت محمد اور آل محمد (ﷺ) پر اپنی رحمت بھیج اور ان کی تعظیم کر جس طرح تو نے حضرت ابراہیم و آل ابراہیم (علیہ السلام) پر اپنی رحمت بھیجی تھی اور ان کی تعظیم کی تھی، بے شک تو بلند صفات اور بلند بزرگی والا ہے۔ اے اللہ حضرت محمد و آل محمد (ﷺ) پر برکتیں نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم و آل ابراہیم (علیہ السلام) پر برکتیں نازل فرمائیں، بے شک تو عظیم صفات اور بلند شان والا ہے۔''

پھر اگر یہ قعدۂ اولی ہے تو تشہد و صلوٰۃ کے بعد اور کچھ نہ پڑھے بلکہ اللہ اکبر کہتا ہوا تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو جائے۔

تیسری اور چوتھی رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پر اکتفا کرنا بھی ثابت ہے۔ (بخاری و مسلم میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے عیاں ہے) اور اگر چاہے تو ان میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور سورتیں بھی پڑھ سکتا ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی مرفوع حدیث جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔

پھر پہلی رکعت کی طرح ان بقیہ رکعات کو بھی ادا کرے اور پھر آخری قعدہ میں بیٹھے اس آخری قعدہ میں بھی تشہد (التحیات) اور صلوٰۃ کے بعد چار چیزوں سے پناہ مانگنا واجب ہے۔

جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ فرماتے تھے:

(( اِذَا فَرَغَ اَحَدُكُمْ من التشهد الآخر فليستعذ بالله من اربع يقول: اللهم انى اعوذ بك من عذاب جهنم ومن عذاب القبر ومن فتنة المحيا والممات، ومن شرفتنة المسيح الدجال )) [مسلم، مسند ابو عوانة، نسائی]

''جب تم میں سے کوئی آخری تشہد (التحیات وصلوٰۃ) سے فارغ ہو جائے تو وہ اللہ سے چار چیزوں سے استعاذہ کرے (یعنی پناہ مانگے) اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، جینے اور مرنے کے فتنوں سے اور مسیح ودجال کے فتنے کے شر۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے تشہد سے فراغت کے بعد ان چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا امر فرمایا ہے اور امر بلا قرینہ صارفہ وجوب کے لیے ہوتا ہے، لہٰذا یہ استعاذہ کی دعا پڑھنی واجب اور ضروری ہے اس استعاذہ والی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

(( ثم يدعوا لنفسه عما بداله ))

''پھر اس استعاذہ کے بعد وہ اپنے لیے جو دعا بھی اس کے خیال میں آئے کرے۔''

ان الفاظ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ان چار چیزوں سے استعاذہ کے بعد نماز میں اپنے لیے دنیا و آخرت کی بہتری و بھلائی کے لیے کوئی بھی دعا جو اس کے خیال میں آئے کر سکتا ہے۔

احادیث مبارکہ میں بہت سی جامع دعائیں مروی ہیں اس جگہ ہم دو دعائیں ذکر کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب تشہد سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

## پہلی دعا:

(( اللهم اغفرلى ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما أعلنت وما أسرفت وما أنت أعلم به منى أنت المقدم وأنت المؤخر لا إله إلا انت ))

[مسلم و ابو عوانة]

''اے اللہ بخش دے میرے وہ گناہ جو میں نے آگے کیے اور جو پیچھے کیے اور جو کچھ میں نے چھپا کر کیے اور جو کچھ ظاہر کیے اور جو کچھ میں نے بیجا مصلحت کی ہو اور جو کچھ تو مجھ سے زیادہ جانتا، تو ہی آگے کرنے والا اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

## دوسری دعا:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا سکھلائیں جو میں نماز میں پڑھتا رہوں، تو آپ ﷺ نے انھیں یہ دعا سکھلائی:

(( اَللّٰهُمَّ اِنِّی ظلمتُ نَفسِیُ ظلمًا کَثِیرًا وَلَا یَغفِرُ الذنوبَ اِلَّا اَنتَ فاغفرلی

مَغْفِرَۃً مِن عِندك وارحَمْنِیْ انك اَنْتَ الغفور الرحیم))

''اے اللہ بے شک میں نے اپنے اوپر بہت زیادہ ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہ بخش نہیں سکتا پھر تو مجھے بخش دے ایسی بخشش جو خاص تیرے پاس سے ہو اور مجھ پر رحم کر بے شک تو ہی بخشنے والا اور رحم والا ہے۔''

(( رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَفِی الآخِرَۃِ حسنۃ وَقِنَا عذاب النار))

''اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی نیکی مرحمت فرما اور آخرت میں بھی نیکی عطا کر اور دوزخ کی آگ سے بچا دے۔''

﴿ ربِّ زِدْنِیْ علماً ﴾ [طٰہٰ]

''اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر۔''

بہرحال اور بھی جو دعا کسی کو پسند ہو وہ نماز میں سلام سے قبل پڑھ سکتا ہے۔

**سلام:**

اس کے بعد پہلے اپنی دائیں جانب، پھر بائیں جانب یہ الفاظ کہہ کر نماز سے نکل آئے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً صحیح سند کے ساتھ مروی ہے:

(( السلام علیکم ورَحمۃ اللہ )) [مسند احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ]

''تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت۔''

**دعائے قنوت:**

قارئین کرام کے افادہ کے لیے اس جگہ دعائے قنوت جو وتر میں پڑھی جاتی ہے وہ لکھی جاتی ہے۔

وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے متعلق نسائی میں صحیح سند سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے پہلی دعائے قنوت پڑھتے تھے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رکوع کے بعد بھی قنوت پڑھنا ثابت ہے۔

دعائے قنوت کے الفاظ وہی صحیح ہیں جو حضرت حسن بن علی ابن طالب رضی اللہ عنہ سے حسن سند کے ساتھ مروی ہیں:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چند کلمات سکھائے ہیں جو میں وتر میں پڑھتا ہوں وہ یہ ہیں:

(( اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ فِیْمَنْ ھَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیمَنْ عَافَیْتَ وَ تَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْتَ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا اَعْطَیْتَ وَقِنِیْ شَرَّ مَا قَضَیْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ اِنَّہٗ

لَا یَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ وَلَا یَعِزُّ مَنْ عَادَیْتَ تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ ))

[ مسند احمد، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمه، سنن کبری، الطبرانی ]

''اے اللہ! مجھے ہدایت کر ان کے ساتھ جن کو تو نے ہدایت دی اور مجھے عافیت دے ان کے ساتھ جن کو تو نے عافیت دی اور مجھے دوست رکھ ان کے ساتھ جن کو تو نے دوست رکھا اور جو کچھ تو نے مجھے دیا ہے اس میں برکت ڈال اور بچا مجھے اس شر سے جو تو نے فیصلہ کیا ہے، کیونکہ (ہر بات کا) تو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے اوپر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک جس کو تو نے دوست رکھا وہ ذلیل نہیں ہو سکتا اور جس سے تو نے دشمنی کی وہ عزت نہیں پا سکتا تو برکت والا ہے اے ہمارے رب اور بلند شان والا۔''

بعض لوگ اس دعا کے آخر میں ''وصلی اللہ علی النبی'' بھی پڑھتے ہیں، لیکن جس روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں اس کی سند منقطع وضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''امالی'' وغیرہ میں اور امام قسطلانی رحمہ اللہ وغیرہما نے اس کی تضعیف کی تصریح کی ہے، لہٰذا ان الفاظ کو پڑھنا نہیں چاہیے۔

هَذَا مَا تيسرلنا فى هذا المقام والعلم عندالله العلام وهو أعلم بالصواب واليه المرجع المآب فالحمد لله الذى نعمته تتم الصالحات وصلى الله على خير خلقه محمد و آله وأصحابه أجمعين

وَأنا احقر العباد محب الله شاه

❀❀❀

**المقالة الثالثة**

# المغتريات

## سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کا الزام اور اس کی حقیقت:

خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ایک مظلوم خلیفہ تھے جس پر غیر تو غیر اپنے مسلمانوں نے بھی بے جا اعتراضات کر کے لوگوں کے ذہنوں کو مشکوک بنا دیا۔ حالانکہ یہ سب اعتراضات جھوٹ کا پلندہ ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس محترم منصور صاحب نے ایک مضمون ارسال کیا جس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر چند اعتراضات کیے گئے تھے تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مقالہ میں ان پر اقرباء پروری اور دیگر اعتراضات کے انتہائی احسن انداز میں جوابات دیے ہیں۔ ''الازہری''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

گرامی قدر برادرم وعزیزم منصور صاحب

السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اما بعد! مکتوب ملا یاد فرمائی کا شکریہ۔ جو اوراق آپ نے ارسال کیے ہیں ان کے متعلق میری گذارشات حسب ذیل ہیں: ان اوراق کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو غالباً مولانا مودودی صاحب کی کتاب خلافت وملوکیت سے متاثر ہے۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ خود ہمارے سنی بھائی سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلفاء راشدین میں شمار کرنے کے باوجود اور آپ کے اسم گرامی کے عقب میں رضی اللہ عنہ لکھنے کے باوجود ایسے بے ہودہ اور واہی اعتراضات کرنے سے گریز نہیں کرتے: (( فانا للہ وانا الیہ راجعون)) تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، مختصراً گذارش ہے کہ مروان کو افریقہ کی فتح سے خمس دینے والا واقعہ جھوٹ کا پلندا ہے کیونکہ ان تاریخی واقعات کی بنیاد جن روایات پر ہے وہ قطعاً صحیح نہیں کیونکہ ان کے راوی واقدی، کلبی، ابو مخنف جیسے متروک اور وضاع وکذاب ہیں ایسے دشمنان اسلام کی روایات کے بل بوتہ پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جیسے عظیم پاکباز صحابی پر اس قسم کا غلیظ اور پلید الزام دھرنا انتہائی درجہ کی بددیانتی اور سنگین جسارت ہے جس پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے، ان روایات کا ایسے متروک اور واہی تباہی رواۃ پر انحصار کے باوجود ان کے متون میں بہت زیادہ اضطراب بھی ہے جس وجہ سے یہ روایات خود آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں (معنی کے اعتبار سے) اور اس پر مستزاد یہ کہ بلوایوں نے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر الزامات تھوپے تو ان میں بھی اس الزام کا ذکر نہیں۔ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ نے تحفہ اثنا عشریہ اور علامہ ابوبکر بن العربی نے "العواصم من القواصم" میں توضیح فرمائی ہے کہ یہ واقعات سفید جھوٹ اور بہتان ہیں۔ روایت تو دور کی بات ہے، لیکن از روئے روایت بھی یہ واقعات ثابت کرنا محال اور نا ممکنات میں ہے۔

اس طرح 2 یہ الزام کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال میں سے انعامات دیتے تھے یا اقرباء نوازی کرتے تھے، یہ الزام بھی محض جھوٹ اور واضح بہتان ہے کوئی بھی صحیح روایت اس قسم کی موجود نہیں، ایسی باتیں محض مذکورہ بالا واہی رواۃ بیان کرتے ہیں جن کے بیان کو لے کر ہمارے نیم شیعہ سنی حضرات الزامات لگانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔ ذیل میں ایک تاریخی روایت جس میں خود سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے نقل کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس الزام کی کیا حقیقت ہے؟ اس روایت کا ترجمہ مولانا حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر "الاعتصام" (مدیر شعبہ تصنیف وتالیف دارالسلام

لاہور) اپنی کتاب میں اردو ترجمہ دیا ہے۔ یہاں میں وہی ترجمہ نقل کررہا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ کہتے ہیں میں اپنے خاندان سے محبت کرتا اور انھیں عطیات سے نوازتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے جذبات محبت نے مجھے دوسروں پر ظلم ستم کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ میں ان کے حقوق جائز حد تک ادا کرتا رہا ہوں ان کو جو عطیات دیے گئے، وہ میرے ذاتی مال ہیں سے تھے۔ میں مسلمانوں کے مال کو نہ اپنے جائز سمجھتا ہوں نہ دوسرے لوگوں کے لیے نیز آپ کو یاد ہوگا کہ میں رسول اللہ رضی اللہ عنہ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دور میں اپنے رشتہ داروں کو گراں قدر عطیے دیا کرتا تھا، حالانکہ اس وقت فطری طور میں دولت کا خواہش مند تھا اب جب کہ عمر طبعی کو پہنچ گیا ہوں میرا وقت بھی پورا ہوگیا ہے اور اپنا سارا اثاثہ بھی اہل خاندان میں تقسیم کردیا ہے تو یہ بے دین لوگ اس قسم کی بے سروپا باتیں بیان کررہے ہیں۔ لہٰذا میں نے کسی شہر پر مناسب حد سے زیادہ خراج نہیں لگایا کہ کسی کو لب کشائی کی گنجائش ہو پھر ہر شہر کا خراج بھی انھی کی ضروریات پر صرف کیا جاتا رہا ہے، جہاں سے وصول کیا گیا۔ میرے پاس صرف خمس آتا رہا ہے اس میں سے میں نے اپنے لیے ایک جبہ بھی جائز نہیں سمجھا۔ خود مسلمانوں نے ہی اس کو اپنی صواب دید کے مطابق جہاں مناسب سمجھا خرچ کیا۔ میری رائے تک اس میں شامل نہ ہوئی تھی۔ اللہ کے مال سے ایک پائی بھی غلط جگہ پر خرچ نہیں کی گئی۔ میں نے اس میں سے اپنا گزارہ بھی نہیں لیا۔ اپنے ہی خرچہ پر اپنی گزراوقات کررہا ہوں۔ (تاریخ طبری ص 348-347 ج 4) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس صداقت پر مبنی بیان کے بعد اگر کوئی مرغی کی ایک ٹانگ کا ورد کرتا رہے تو اسے اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دے۔

بہر حال سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اوپر یہ یا اس طرح کے دوسرے الزامات یا بہتان روافض و دیگر دشمان اسلام کی تراش دہ ہیں۔ جن کا علمی دنیا میں ذرہ برابر بھی وزن اور قدر و قیمت نہیں۔ باقی مضمون نگار نے جو سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایات نقل کی ہیں یا متعدد جلیل القدر وعشرہ مبشرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی املاک کے متعلق جو تاثر دینے کی سعی نا مشکور کی ہے وہ نہایت بے ہودہ اور اصولی طور پر بلکہ غلط ہے تفصیل درج ذیل ہے۔

یہ حقیقت ہے کی سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعتاً یہ خیال تھا کہ کمیٹی کو چاہیے کہ ضروری اور اہم ضروریات سے فاضل مال رکھنے کی بجائے (غرباء ومساکین وغیرہ میں) خرچ کردیا جائے لیکن اس نظریہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی جماعت میں سے ایک فرد بھی ان کے ساتھ متفق نہ تھا خود مضمون نگار نے سیدنا زبیر بن عوام، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف، سیدنا سعد بن ابی وقاص وغیرہ رضی اللہ عنہم کی املاک کا تذکرہ کیا ہے یہ صحابہ کرام عشرہ مبشرہ میں سے اور بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے، جب ایسے بزرگ لوگ بھی کتاب وسنت اور اسلام کے برخلاف املاک جمع کریں تو پھر باقی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کونسا ایسا فرد باقی رہا جس نے اسلام کی رہنمائی کے مطابق عمل کیا تھا؟ صحابہ کے ان بلند ترین افراد کو مطعون بنانے والا اہل سنت تو نہیں ہوسکتا بلکہ یہ بات کرنے

والا دشمن صحابہ رافض ہی ہوسکتا ہے۔

ثانیاً: کتاب وسنت کے نصوص صریحہ و ثابتہ بھی سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے اس موقف کے خلاف ہیں۔ کتاب وسنت ذاتی ملکیت کے قطعاً خلاف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حد بندی کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ حلال و جائز طریقہ وسائل کے ساتھ حاصل کی گئی ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق رکھے ہیں وہ پوری طرح ادا کیے گئے ہوں تو اس ملکیت کی بالکل حلال ہے اور اس کے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں نہ تو اللہ تعالیٰ نے اور نہ ہی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں کوئی حد بندی کی ہے۔ ذیل میں ذکر کیے گئے چند پوائنٹس پر غور کریں۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے اور زکوٰۃ اسلام میں نماز کے بعد دوسرا نمبر رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں نماز و زکوٰۃ کو متعدد مواضع پر یکجا لایا ہے۔ اور ظاہر ہے اگر ملکیت اپنے پاس رکھنی ہی نہیں تو زکوٰۃ کس پر عائد ہوگی؟ زکوٰۃ کی بنیاد ہی ذاتی ملکیت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مصدقین مقرر تھے جو سرمایہ داروں سے شرعی طور پر لاگو ہونے والی زکوٰۃ لینے اور اسے مستحقین میں بانٹنے پر مامور تھے، انھیں یہ حکم نہ تھا کہ وہ ان کی ساری کی ساری ملکیت لے کر حاضر کر دیں۔ شرعی طور پر چالیس بکریوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں، اگر چالیس ہوگئیں تو پھر ایک بکری زکوٰۃ دی جائے گی، پھر 120 تک ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دی جائے گی اور پھر دو سو تک دو بکریاں لاگو ہوں گی اسی طرح اونٹوں یا گائے کا نصاب بھی احادیث مبارکہ میں مقرر ہے کیا 200 بکریاں کم ملکیت ہے؟ مصدقین کو یہ حکم تو نہ تھا کہ ضرورت سے زائد سارے کا سارا مال لے کر آجائیں اسی طرح سونے و چاندی کا نصاب بھی واشگاف الفاظ میں احادیث میں بیان ہوا ہے سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے ہے، جب کہ چاندی کا نصاب 52-50 تولہ ہے ان سے کم پر زکوٰۃ فرض نہیں، پھر جب ان دونوں کا نصاب مکمل ہوگا تو اس سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ دی جائے گی یہ سب مسائل صحیح احادیث میں وارد ہوئے ہیں اسی نوعیت کی دوسری بھی کئی باتیں ذکر کی جاسکتی ہیں۔

(ب) قرآن کریم میں سورۃ النساء کے دوسرے رکوع میں وصیت اور ورثہ کے مسائل و قوانین بیان ہوئے ہیں اور اسی سورۃ کے آخری رکوع کی آخری آیت بھی وراثت کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے اور ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ذاتی ملکیت شجر ممنوعہ تھا تو یہ ورثہ و ترکہ اور وصیت وغیرہ کے مسائل بالکل بے کار و فضول ہیں کیونکہ ذاتی ملکیت ہوگی ہی نہیں تو ورثہ کس چیز کا اور وصیت کس چیز سے؟

(ج) قرآن کریم فرماتا ہے کہ جو لوگ یتامیٰ کا مال ظلم کے ساتھ کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں (بطون) میں جہنم کی آگ کھاتے ہیں۔ النساء۔ اگر متوفی کی ذاتی ملکیت ہی نہ ہوتو یتیموں کو یہ مال کہاں سے ملتا؟

(د) صحیح حدیث میں وارد ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ

علیہم اجمعین کو چندہ کی ترغیب دلائی تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا کہ میری طرف سے ایک سو اونٹ اپنے مکمل ساز و سامان سمیت حاضر ہیں۔ دوسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دلائی تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا میری طرف سے ایک سو اونٹ مکمل ساز و سامان سمیت حاضر ہیں تیسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی تو اس بار بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک سو اونٹ سامان سمیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیئے یعنی اس وقت اس جلیل القدر صحابی نے 300 اونٹ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ اگر اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کوئی بھی نیک کام (نفلی) نہ بھی کرے تو اس کا یہ کام اخروی نجات کے لیے کافی ہے۔ کیا 300 اونٹوں کی کم ملکیت ہے ہر گز نہیں، بلکہ بہت زیادہ ملکیت ہے آخر اتنی ملکیت ان کے پاس موجود تھی تب ہی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں حاضر کر دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ کو زجر و توبیخ نہ فرمائی کہ تو نے اتنی ملکیت کیوں جمع کر کے رکھی ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی ملکیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے پر خوش ہوئے آخر دیئے ہوئے مال کے علاوہ بھی ان کے پاس ملکیت ہو گی لیکن اسے خرچ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ واضح ہو کہ جنگ تبوک سن 9 ہجری میں ہوئی تھی جس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی آخری عمر کا ہے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی زیادہ ملکیت پر ناراضگی کا اظہار نہیں فرماتے تو ہمیں کیا اختیار ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کے ماتحت اسے ناجائز قرار دیں۔

(ھ) مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو پانی کی تکلیف تھی۔ میٹھا پانی کا کنواں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ یہ کنواں ذر کثیر خرچ کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اگر فاضل رقم یا ملکیت رکھنا ناجائز ہوتی تو پھر یہ نیک کام اور دیگر فی سبیل اللہ کے کام اور عام مسلمانوں کی بھلائی کا کام کس طرح انجام پا سکتے ہیں؟ یہی سبب ہے کہ دیگر مالدار صحابہ رضی اللہ عنہم زکوۃ، صدقات اور اقربہ وغیرہ کو دینے اور ہنگامی ضروریات میں لاکھوں بھی لٹا دیتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ:

﴿ وَ مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ ۚ وَ ہُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴾ [سبا : ۳۹]

یعنی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اللہ تعالیٰ تمھیں اس کا عوض دے گا۔ اس کے بمصداق جب یہ نفوس قدسیہ رضی اللہ عنہم ایک ہی مجلس میں اتنے لاکھوں کی تعداد میں اللہ کی راہ میں لٹا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بھی دنیا میں اس کا عوض بے حساب و بے انداز خزانہ انھیں دیا تھا۔ اس سے معلوم ہو کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ سفید جھوٹ ہے کیونکہ جو شخص ایک ہی مجلس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اتنا خرچ کر سکتا ہے جس کا صاف نتیجہ ہے کہ ان کا پاس وافر مقدار میں ملکیت موجود تھی پھر جس کے پاس اس قدر سرمایہ موجود ہو وہ کسی بندہ کو انعام دیتا ہے واقعتاً انعام و اکرام کا مستحق ہے کیا

اسے اپنا مال چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے مال (بیت المال) میں تصرف کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس باوجود معاذ اللہ اگر اس نے اپنی ملکیت چھوڑ کر بیت المال میں ایسا تصرف کیا ہے تو وہ قطعی طور پر خلفاء راشدین میں سے نہیں ہوسکتا اور یہ بات بداہنت باطل ہے۔ دوم خود نبی اکرم ﷺ کی اہلیہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سنن ابی داؤد میں حسن اور عمدہ سند کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے نبی اکرم ﷺ کو عرض کیا کیا یہ سونے کے زیورات کنز میں شامل تو نہیں ہوتے؟ (یعنی وہ خزانہ جس کے رکھنے پر قرآن کریم میں وعید آئی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ زیورات اتنی مقدار میں رکھنا جن پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہو پھران کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو ان کا شمار ممنوعہ کنز میں نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ زیورات انسانی زندگی کی ضروریات میں شامل نہیں بلکہ یہ فاضل مال ہیں لیکن آپ ﷺ نے انھیں اپنے گھر سے نکالنے کا حکم فرمایا، فرمایا اگران کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو کنز ممنوعہ میں شامل نہیں ہوں گے۔

(ز) ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان کا بھتیجا قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سونے کی انگوٹھی پہنتی تھیں۔ اس طرح دیگر امثلہ بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے روز روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ ذاتی ملکیت کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس سے شرعی حقوق ادا کیے جائیں، پھر اگر اللہ تعالیٰ مزید اس میں برکت ڈالے تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ باقی نبی اکرم ﷺ کا اپنے لیے ملکیت نہ رکھنا اور اس فانی دنیا سے خالی ہاتھوں رحلت فرمانا، یہ آپ ﷺ کا اپنا ذاتی معاملہ تھا آپ ﷺ نے دنیا کو پسند نہ فرمایا، لیکن اپنے اس نمونہ مبارکہ کو قانونی حیثیت ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہ دی اور نہ ہی دوسروں کو ملکیت رکھنے سے منع فرمایا دیگر انسان جن میں فطرتاً اپنے علاوہ اپنی اولاد و اہل وعیال اور ورثاء حقہ کا خیال رہتا ہے، اس لیے ہر کوئی چاہتا ہے میرے اس دنیا سے جانے کے بعد میری اولاد وغیرہ پریشان نہ ہو اس لیے چاہتا ہے کہ اس کے پاس اتنی ملکیت ہو کہ ورثاء اولاد و اہل وعیال دکھی دن نہ دیکھیں بلکہ خوشحال رہیں۔ جابر رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف فرما ہوئے جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میری وارث صرف ایک بیٹی ہے کیا میں اپنے مال میں سے دو تہائی حصہ کی وصیت نہ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں دوبارہ انہوں نے عرض کیا آدھے مال کی وصیت کرسکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں تیسری بار جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ایک تہائی کی وصیت کرسکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ایک تہائی وصیت کر سکتے ہوئے، لیکن تہائی بھی زیادہ ہے۔ آپ اپنے ورثاء کو غنی اور دوسروں سے بے پرواہ چھوڑ کر جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ آپ انھیں

ایسی حالت پر چھوڑ کر جائیں کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلاتے پھریں دو پر اللہ کے نام پر۔

واضح ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ کا معاملہ یہ نہ تھا کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام ترکہ میں کچھ چھوڑ کر جاتے تو بھی وہ کسی وارث کو نہ ملتا، باقی اس فانی زندگی میں جتنی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ پوری کر رہا تھا مزید ملکیت کیونکر جمع کرتے، لہٰذا یہ معاملہ آپ ﷺ کا اپنا ذاتی معاملہ تھا جو کہ آپ کے اعلیٰ وارفع مقام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اسے دلیل بنا کر ذاتی ملکیت کی یکسر نفی کر دینا پر لے درجہ کی جہالت ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: اگر آپ کہیں کہ پہاڑ سارے کا سارا آپ کے لیے سونے کا بنا دوں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ! نہیں بلکہ ایک دن دے تاکہ کھا کر تیرا شکر ادا کروں اور دوسرے دن نہ دے کہ تجھ سے مانگوں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ سے ناجائز بات یا غیر شرعی بات کی پیش کش کیوں کرتا آپ ﷺ نے ایسے نہ فرمایا کہ اس ناجائز ملکیت کی اے اللہ! آپ کیسے پیش کش کرتے ہو بلکہ فرمایا کہ نہیں اے اللہ! مجھے اتنی ملکیت کی ضرورت نہیں۔ ایک مرتبہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! اگر میں چاہوں تو مدینے کے گرد جتنے پہاڑ ہیں وہ سب سونے کے بن جائیں، جہاں جاؤں وہاں پیچھے پیچھے چلتے آئیں لیکن مجھے ایسی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ آخر ایک ناجائز بات یا چیز کی چاہت تو ہرگز نہ فرماتے، لہٰذا ملکیت کوئی ناجائز نہیں ہے، البتہ آپ ﷺ کو ذاتی طور پر یہ پسند نہ آئی تو یہ الگ بات ہے دونوں میں فرق نہ کرنے والے جاہل مطلق ہیں۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ والی روایت کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار کو ڈنڈا مار دیا۔ روایتاً و درایتاً دونوں طرح ضعیف ہے، لہٰذا اس سے استدلال لینا اہل علم کے شان سے بعید ہے۔ یہ روایت امام احمد کی سند میں بتحقیق احمد محمد شاکر مرحوم موجود ہے، اس کی سند میں ''مالک بن عبداللہ الزیادی'' ہے جو کہ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتا ہے اس کا کتب رجال میں کہیں کوئی حال احوال نہیں ملتا۔ خود محقق محترم احمد شاکر مرحوم نے بھی اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یہ راوی مشہور (یعنی مجہول الحال) ہے۔ لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ راوی مجہول العین ہے۔ کیونکہ اس سے صرف ایک راوی ابو قبیل روایت کرتا ہے بہر حال مجہول العین یا مجہول الحال لیکن جب اس کی عدالت کچھ بھی معلوم نہیں، یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تعجیل المنفعۃ'' میں اسے ذکر کیا ہے لیکن جرحاً و تعدیلاً کچھ بھی نہیں فرمایا لہٰذا ایسے راوی کی روایت سے دلیل اخذ کرنا اصولی طور پر بھی غلط ہے، لہٰذا یہ روایت اصول کے مطابق ضعیف ہے۔ اسی طرح درایتاً بھی یہ روایت ضعیف و منکر ہے۔ کعب الاحبار سے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے خود جواب دیا وہ کتاب و سنت کی روشنی میں درست تھا، لہٰذا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی برہمی کی کوئی وقعت نہیں لیکن اگر یہ جواب ابو ذر رضی اللہ عنہ کے نظریہ کے مطابق نہ بھی تھا تو اسی صورت میں وہ انھیں سمجھاتے کہ یہ جواب درست نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے لیکن اس کے بجائے وہ

اتنے برہم ہوئے کہ اس غریب کو ڈنڈا مار ڈالا۔ اس روایت کو پیش کرنے والے ذرا سوچیں کہ اس طرح ہمارے سامنے ابوذر رضی اللہ عنہ کا کیسا گھناؤنا نقشہ آتا ہے اور معاذ اللہ بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنے والا نظر آرہا ہے کہ ایک انسان کو محض درست اپنے خیال کے مطابق جواب نہ دینے پر خلیفۃ المسلمین کی موجودگی میں صرف ترش زبان پر ڈنڈا دے مارا۔ یا للعجب۔

ہم سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کو ایسے بے جا اور ناشائستہ رویہ کے اظہار سے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ بالکل بری جانتے ہیں اور یقین ہے کہ یہ روات منکر اور بے سروپا ہے۔ بہرحال مضمون نگار نے نہ کوئی صحیح روایت پیش کی ہے اور نہ ہی کوئی ٹھوس دلیل جس کے سبب صحابہ کرام ایسی مثالی جماعت پر کوئی حرف آسکے۔ باقی دشمنان اسلام کو خوش کرنے والوں کے لیے محض زبانی جمع خرچ میں چند اوراق سیاہ کیے گئے ہیں اور البتہ باقی بعد میں بعض بنو امیہ اور بنو عباس کچھ خلفاء ہونے جو کچھ کیا یا جو اور جتنا غلط راستہ اور بجا رویہ اپنایا تھا تو اس کے جواب کے ذمہ دار بھی وہی خود ہوں گے، ان کے غلط کاموں کے بسبب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کوئی بھی الزام نہیں آسکتا۔ اور نہ ہی معقول، اور صحیح طور پر اسلام کا پیرو اس طرح جرات تو کیا بلکہ ایسا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مضمون نگار نے شعوری یا لاشعوری طور پر روافض کی ورک کی ہے۔

کاش اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت عطا فرمادے۔ اللھم امین۔ میرے خیال میں کوئی اور بات نہیں جس کے جواب کی زحمت اٹھائی جائے۔ واللہ اعلم

❀❀❀❀

**المقالة الرابعة**

# عون الولی الحمید فی الرد علی عبدالوحید

## نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور اسلام

ڈارون کا نظریہ ارتقاء ایک پرانا مسئلہ ہے جس پر عرصہ دراز سے بحث و مباحثہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو ڈارون کا نظریہ ارتقاء کے قائل ہیں اور انسان کو اسی ارتقائی سلسلہ کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک شخص بنام عبدالوحید جنھوں نے قرآن پاک کی طرف غلط نسبت کرتے ہوئے قرآن ہی سے اس نظریہ کو ثابت کرنے کی ناپاک جسارت کی جس پر شاہ صاحب نے ان کی اس غلطی پر توجہ دلائی جس پر انہوں نے بجائے غلطی کے اعتراف کے انھیں خط لکھ ڈالا جس کے جواب میں شاہ صاحب نے " عون الولی الحمید فی الرد علی عبدالوحید " کے نام سے جواب الجواب لکھا اور آخر میں ان سے چند سوالات بھی کیے ہیں۔ ''الازہری''

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عن العبد الفقیر اِلی اللہ محب اللہ الی جلیل القدر محترم المقام جناب عبدالوحید صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ!

مجھے امید تھی کہ میرے گذشتہ خط کا نہایت معقول اور دل نشین جواب آئے گا، لیکن افسوس! آپ کے خط پڑھنے کے بعد یقین ہوگیا کہ یہ ایں خیال ومحال است۔ آپ نے اپنی آنے والی کتاب کا حوالہ دے کر اور عنوان قائم کر کے میری سمجھ کے مطابق مجھ پر رعب ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مگر میرے دوست! آپ کی پوری تحریر بس اس شعر کی مصداق ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں جس کا جو چیرا تو ایک قطرہ خون نکلا

گذارش یہ ہے کہ میں نے اپنے طویل خط میں تنقید سے قبل قرآن کریم کی طرف غلط نسبت کے متعلق جو تمھیں توجہ دلائی تھی اس کے جواب سے اس طرح پہلو تہی کر گئے ہو کہ گویا یہ بات میرے خط میں ہے ہی نہیں تھی۔ یا اس پر جواب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یا اپنی اس غلطی کے اظہار وتسلیم سے اپنی ساکھ کو نقصان پہنچتا۔ میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے اور اخبار میں چھپواتے کہ اس بیگانی کی نسبت قرآن حکیم کی طرف غلطی سے چھپ گئی ہے لیکن بے بس آرزوں کہ خاک شدہ۔ میری یہ توقع سراسر بیکار تھی۔ افسوس! تم نے اس بات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ جب آپ واقعی اور حقیقی غلطیوں کے تسلیم کرنے میں عار محسوس کرتے ہو تو باقی باتوں کے متعلق آپ سے کوئی توقع رکھنا سراسر عبس ہے۔ آگے چل کر آپ قرآن کریم کے متعلق جن خیالات کا اظہار کرتے ہو ان سے یہ جھلک نظر آئی ہے کہ کچھ نہ کچھ آپ کے دل میں اس کتاب حکیم کے متعلق احترام ہے۔ مگر کیا یہ افسوس ناک حقیقت نہیں ہے کہ جس کتاب کا تم احترام کرتے ہو اسی کی طرف جھوٹی نسبت کرنے سے ڈرتے ہو علاوہ ازیں اگر کوئی متنبہ کرے تو اس کے جواب سے پہلو تہی کر کے اصل جواب کو ہضم کر دیتے ہو۔ دراصل میرے خط لکھنے کا اولین محرک یہی تھا، یعنی قرآن کریم کی طرف غلط نسبت جس کو میں برداشت نہیں کر سکا۔ تنقید تو تبعاً آ گئی۔ آپ نے جو یہ تحریر کی ہے کہ قرآن کریم سے علم الحیوانات اور علم الارضیات کی تلاش کرنا درست نہیں ہے۔ اس میں میں آپ سے متفق ہوں مگر اول تو اس کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا؟ نہ میں نے خط میں ان علوم کی نسبت قرآن کریم کی طرف کی اور نہ ہی میں نے ﴿والارض و.... الافی کتاب مبین﴾ والی آیت لکھی تھی۔ پھر اتنی بھڑکیا مارنے کا مقصد محض بحث کو دبانا یا موضوع سے ہٹ کر اِدھر اُدھر میں الجھانے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم یقیناً سائنس کی کتاب نہیں ہے لیکن اگر کچھ سائنسی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرے تو تمھیں چڑ کیوں لگتی ہے۔ بلکہ یہ تو خود نبی ﷺ

کی صداقت کی دلیل بنے گی۔ آگے چل کر آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کریم کو فلسفہ یا سائنس کی ایک کتاب سمجھ کر اس کی آیات سے آغاز اور انجام کے متعلق تجربات چھیڑنے کے رجحانات کو میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت محمدیہ کے سراسر خلاف سمجھتا ہوں الخ۔ تعجب ہے۔ اتنے بلند وباگ دعوے مگر تھوڑے وقت کے لیے اتنا تو سوچتے کہ تمہارا یہ دعویٰ قرآن کے اعتبار سے کس قدر غلط ہے۔ قرآن کریم دنیا کے انجام کے متعلق بھرا پڑا ہے۔ واشگاف الفاظ موجود ہیں مگر آپ کو وہ نظر نہیں آئے۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ انجام کے متعلق جو بھی قرآن میں مذکور ہے وہ محض ایک خیال تمثیل ہے جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ اس کے تین حصے تو محض خیال تمثیل اور مجاز کا ہیں۔ جن کی واقفیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے باقی ایک حصہ ہے جس میں "اوامر و نواھی" ہیں۔ جس کے پیچھے بھی آپ جیسے محقق ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔ پھر اس کا بھی خدا ہی حافظ ہے پھر قرآن کریم کسی نام کا نہیں رہتا اللہ کے بندے محقق علماء کرام نے تو اس کے حروف مقطعات کو بھی نہیں چھوڑا ہے اس کے بھی معانی اور مطلب بیان کیے ہیں۔ آپ ہی ہو جو یہ کوشش کرتے ہو کہ جو کچھ ہے وہ محض تمثیل ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ نہیں کئی جگہوں پر آغاز کے متعلق حضرت آدم علیہ السلام کا احوال بیان کیا ہے، میں دعوے سے کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے ان واہیات نظریات سے خالی الذہن ہو کر دوسری تمام کتابوں کو چھوڑ کر ہماری موافقت کو بھی ترک کر کے اور انسانی آبا واجداد کو بندروں میں شامل کرنے والوں کی بھی۔ پیروی کو چھوڑ کر اندھی تقلید سے آزاد ہو کر اور پھر غیر جانبدار ہو کر ان مقاصد کا مطالعہ کریں تو یقیناً آپ انسانی نوع کی پیدائش کے متعلق اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ جس پر عام و خاص علماء اور اکابرین سب متفق ہیں۔ مگر کیا کریں آپ کے ذہن پر داروینزم نے آکر ڈیرہ جمالیا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ زبردستی قرآن مجید کو ان کا احمقانہ نظریات کے تابع بنانا چاہتے ہو۔ اگر آپ کا ذہن مبارک ان خیالات اور شیخ چلی کے تصورات سے مکدر نہ ہوتا تو قرآن حکیم سے ہی آغاز انسانیت کے متعلق احوال آپ کو معلوم ہو جاتا۔ اور اس وقت یقیناً آپ آدم علیہ السلام سے پوری انسانیت مراد لینے کے لیے اقوال نقل کرنے کی زحمت ہرگز نہ کرتے۔ تفصیلاً وہ الفاظ اور آیتیں چونکہ یہاں پر نقل نہیں کی جاسکتیں۔ علاوہ ازیں آپ خود ان کو دیکھ سکتے ہو، لہٰذا ان کی سرِدست نقل نہیں کیا جاتا۔ آپ کے علم مبارک کا مبلغ بھی یہی ہے کہ آغاز کے ساتھ انجام کو بھی ملائے جا رہے ہو۔ جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے قرآن کا وہ تیسرا حصہ جو انجام کے متعلق بیان ہیں وہ بھی آپ کی نظر میں محض تمثیل یا خیال تصورات اور صرف مجاز ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن کے کسی حصہ کو نازل کرنے میں عوام اکثر حصہ اہل اسلام حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کیا فائدہ ہوا۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت تو ان تمام آیات کو حقیقت پر ہی محمول کرتی ہے، ماسوائے چند منکرین اور ملحدین اور اس صدی کے آپ جیسے محققین کے۔ تمام اہل اسلام نے ان آیات سے انجام ہی سمجھا ہے اگر قرآن کو آپ اللہ کی کلام سمجھتے ہو تو کیا

وہ اس پر قادر نہیں کہ یہ حقیقت دوسرے واضح الفاظ میں بیان کرتے خواہ مخواہ ایسے مجاز الفاظ کیوں استعمال کیے، جن سے اکثر مسلمان غلط مطلب لیے رہے۔ اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ اولین مخاطب تھے وہ بھی غلط فہمی میں اپنا وقت صرف کر گزرے ان کو بھی یہ سمجھ نہ آئی کہ یہ محض خیال تمثیل ہے۔ خدا کی قسم! تمہارا دماغ ان بیہودہ نظریات سے خالی ہوتا تو کبھی بھی آپ قرآنی آیات میں بیجا تاویلات، بلکہ تحریفات کے مرتکب نہ ٹھہرتے۔ کیا یہ ایمان ہے کہ قرآن کو آپ اللہ کی کتاب تو مانیں لیکن پہلے اپنے ذہن میں ملحدین و منکرین کے غلط نظریات بٹھا کر پھر قرآنی آیات کو بھی اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔ پھر افسوس ہے ایسی سمجھ پر جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایمانی تقاضا تو یہ ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے۔ غلط اور صحیح نظریات کا موازنہ کرے۔ انسانی نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو نظریات تھے، ان کو بیسویں صدی کے منکرین نے ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ پھر ایسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والوں کے نظریات پر یقین رکھنا آپ جیسے محقق یا تحقیق سند کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ ہاں اگر قرآن پر آپ کا ایمان ہی نہیں ہے تو پھر آپ سے۔ آپ کے قائم کیے نظریات پر دوسری طرح کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق پہلے خط میں گذارش کی تھی۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں بھی واضح الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ تمام انسانیت کے باپ آدم ہیں مگر تمہارے ہاں مستند حدیث کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث ڈارون کے نظریات یا منکرین و ملحدین کے نظریے کے موافق ہو یا کم از کم ان کی مخالفت میں نہ ہو۔ باقی اگر کوئی حدیث ان کے مخالف ہوگی تو وہ تمہارے یہاں صحیح یا مستند نہیں ہوگی۔ گویا کہ آپ الٹی گنگا قائم کرنا چاہتے ہو۔ دراصل ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم کتاب و سنت کے پیچھے چلتے لیکن تم یہ چاہتے ہو کہ کتاب و سنت کو اپنے پیچھے چلائیں ﴿فَإِلَى اللَّهِ المشتكى﴾

یا اس کے علاوہ سیدھا وں نہ کہہ دو کہ قرآن و سنت بالکل بیکار ہیں، قرآن نہ کوئی اللہ کا کلام ہے اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ وہ بھی محض مصلحین میں سے ایک مصلح تھے اور پھر بات ختم ہو جائے۔ اور پھر ہم بھی تمہارے نظریات کو دیکھیں اور تمہارے ساتھ بحث یا کلام بھی اسی کے مطابق کریں۔ مگر تمہارے اندر یہ جرأت ہی نہیں ہے کہ صاف صاف اعلان کریں کہ یہ دونوں ماخذ غلط ہیں۔ گو دل میں ان پر یقین نہیں ہے لیکن ظاہری کلام سے اپنے دل کی حالت کو پردہ میں رکھنے کی خاطر یہ ڈھنگ (طرز) رچایا ہے۔ ورنہ تو نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور نہ اس کی قدرت پر نہ جزا اور سزا پر، نہ رسالت پر اور نہ وحی پر تو پھر یہ وتیرہ کیوں اپنایا جاتا ہے؟ آپ نے میرے دلائل کے متعلق جو گل افشانی کی ہے وہ بھی قابل داد ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ یہ اشکالات نہ میرے خیال میں تھے نہ ہی یہ فرسودہ طریقہ عمل میں لانے کا خیال تھا مگر کیا کریں۔ افسوس! ''بلی کو خواب میں چھیچھڑے'' والا معاملہ ہے۔ پھر اس کے لیے کیا کیا جائے۔ میں نے دلائل میں ایک

عام فہم طریقہ اختیار کیا تھا۔ اگر میں یوں کہوں کہ آپ نے میرے دلائل کو ہی نہیں سمجھا یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے تو آپ کو سخت چڑ اور غصہ آئے گا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ بلاشبہ آپ کی آنکھوں پر مغربیت کا چشمہ چڑھا ہوا ہے اور ڈارون کا بھوت بری طرح سوار ہے تو صحیح حقیقت کا ادراک اور سمجھ کہاں سے آئے گی؟ باقی آپ نے جو خچر اور باقی جانوروں اور نباتات کی مثالیں دی ہیں۔ تو اس کے لیے میں کیا عرض کروں۔ سندھی کہاوت ہے ''رڈن اگیان رباب وچائندی ورھ تیا'' خدارا! انصاف کا خون مت کریں علم ودانش کو مسخ نہ کریں۔ ان مثالوں سے تمہارے اس خود ساختہ نظریے کا سراغ کہاں سے ملتا ہے۔ اور ان مثالوں کا اس نظریہ کے ساتھ کس قسم کا لزوم آتا ہے۔ کیا عادی، عقلی، تجرباتی یا شرعی؟ جب ان مثالوں سے اس نظریہ کا لزوم قطعاً ثابت نہیں کر سکتے تو پھر ایسی مثالیں دے کر بیجا طور پر قرطاس کالے کر رہے ہو اور تو کچھ نہیں کر سکتے۔

علاوہ ازیں! ان مثالوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دو مختلف نوع کے امتزاج سے دوسری صفات والی نوع کا وجود ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ دو مختلف نوع کے جانوروں کا امتزاج ہوتا ہے جس سے ایسی نوع پیدا ہوتی ہے جو بالکلیہ ان سے مختلف ہوتی ہے۔ خچر تو ہے لیکن کافی حد تک گھوڑے اور گدھے کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ ان کو بھی دم ہے تو اس کو بھی دم ہے۔ تو جسامت میں بھی دونوں مشابہ ہے۔ علی ہذا القیاس دوسری مثالوں کو بھی اسی طرح سمجھیں۔ زیر بحث مسئلہ میں ایک تو مثال ایسی دینی چاہئے تھی کہ جس میں یہ ہو کہ بندر سے بندر ملے یا بندر سے اور کوئی جانور جفتی کرے تو اس سے ایسا جانور پیدا ہو جو دم سے بندر ہو اور شکل وشبہ میں ان سے بالکلیہ مختلف ہو۔ یا یوں کہا جائے کہ اصل دم کے بغیر جانور تھا جس کے بندر سے جفتی ہو گئی جس سے انسانی بندر پیدا ہوا لیکن اس بات کو آپ مانو گے کہ ایک جانور پہلے ہی بغیر دم کے پیدا شدہ تھا تو وہ کیسے بے دم پیدا ہو گیا؟ اگر کارگزاری اللہ تعالیٰ کی تھی۔ تو پھر کیا جو ہستی ایک بے دم نوع پیدا کر سکتی ہے، وہ ہستی اس انسان جیسی نوع کے پیدا کرنے پر کیونکر قادر نہیں تھی؟ اگر کہا جائے کہ قادر تو تھی لیکن یہ اس کی مرضی تھی کہ اس طرح پھیر گھیر کے انسان کو وجود میں لایا جائے تو اس کے لیے الہامی کتابوں سے کوئی دلیل دو ورنہ محقق کے بجا مفترع بنو گے۔ میرا سوال ہی ابتدائی حیثیت رکھتا ہے کہ جب سارے بندر دم والے ہوتے ہیں تو ان کے امتزاج سے ایک بے دم انسان کیسے پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو دو نوع کے امتزاج سے نیا وجود آتا ہے وہ مصنوعی عمل ہے۔ آپ ایسی کوئی مثال پیدا کریں کہ بغیر بناوٹی عمل کے ایک پھول چند ہزار سال بعد یا سینکڑوں صدیاں بعد اپنا اصلی رنگ روپ چھوڑ کے نئے رنگ روپ میں پیدا ہو گیا ہو۔ گھوڑے اور گدھے کے امتزاج سے خچر پیدا ہوتا ہے یہ محض معمولی اختلاف میں الگ قسم کا جانور لکھا جاتا ہے مگر ہیئت بعینہ وہی ہے۔ اس مثال کو انسانی پیدائش کے لیے چسپاں کرنا آپ جیسے بیسویں صدی کے محققین کی کم علمی کا اُدنی کرشمہ ہے۔ میں گذشتہ خط میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ میرے پیارے بھائی! اگر یہ بات ہے کہ

انسان کا وجود میں آنا اللہ کی مرضی کے مطابق ہوا۔ یا اللہ کی مرضی کے برخلاف ہوا (پھر جس بھی عنوان پر ہمارے کہنے کے مطابق یا تمہارے جیسے محققین کی رائے کے مطابق) اللہ کے ارادے سے ہوا یا نہیں؟ اگر اللہ کے ارادے سے ہوا تو وہ تم نے کس طرح معلوم کیا۔ اگر کہو گے کائنات کا مشاہدہ کر کے تو پھر وہی سوالات دوبارہ لوٹ آئیں گے۔ کیونکہ مشاہدے میں ایسی مثالیں آئی ہوئی نہیں ہیں باقی صدیاں پرانی فطری کا راہ گزاریاں اندھی فطرت اور بنا شعور مادہ میں ایسی تبدیلیاں لانے کے تصور آپ جیسے محقق اور ارسطو کی قبر کو لات مارنے والے ہی مانتے ہیں۔ ہم جیسے فرسودہ خیالات رکھنے والے (آپ کے کہنے کے مطابق) اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ خدارا انصاف کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا قادر مطلق ہونے پر یقین ہے تو بتائیں کہ انسان کو ایک مستقل نوع میں پیدا ہونے میں کون سی مشکلات دیکھتے ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں تھا؟ یا قادر ہوتے ہوئے بھی اپنی مرضی سے انھیں فطری تبدیلیوں کے ذریعے اس نوع کو وجود میں لائے۔ تو اس کے لیے بھی ثبوت کے دو ذرائع ہیں۔ نمبر ایک مشاہدات کے ذریعہ یا وحی کے ذریعے مشاہدات کا دعویٰ تو کوئی نہیں کر سکتا۔ باقی وحی میں بھی اس طرح انسانی وجود کا پتہ نہیں پڑتا۔ پھر آپ اس پر "امنا و صدقنا" کس طرح کہہ سکتے ہو؟ جو دلائل بھی آپ پیش کرتے ہو وہ ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ آثار میں سے معین مؤثر پر دلیل لینے کے طریقے ہیں اور یہ استدلال مؤثر اور نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے خط میں ذکر کیا پانی کے دیکھنے سے اس کے خاص مؤثر (مثلاً آگ) پر دلیل لینا صحیح نہیں ہے یہ عرض رکھا تھا۔ اگر بالفرض انسانی وجود کے آغاز کے متعلق آپ کو کتاب و سنت میں کوئی قطعی بات معلوم نہ ہو سکتی ہے۔ (حالانکہ اس میں اس کے متعلق کھلم کھلا حقائق موجود ہیں) تو آپ کا یہ فرض بنتا تھا کہ اس پر سکوت اختیار کرتے اور کہتے کہ ہمیں اس کے متعلق کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ پردہ غیب کی بات ہے، اس کے متعلق انسانی علم سوائے تخمینوں کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر خواہ مخواہ انکار بالغیب کے مرتکب ٹھہرے ہو اور کیوں بلاسبب اندھیرے میں تیر مارتے ہو، بظاہر آپ کا ان احمقانہ نظریات کو اس رنگ میں رنگنا (یا ڈھلنا) واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ ان پر ایمان لا چکے ہو۔ حالانکہ قیامت کے دن تک ایسے مشاہدات پیش نہیں کر سکتے تو پھر صرف تخمینوں اور ظنون فاسدہ پر نا اعتماد ہو کر ان بیہودہ اوہام کو قطعی جاننا اور ان پر ایمان رکھنا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ جیسے سمجھدار آدمی کا یہ حال کیونکر ہوا ہے۔ شاید مغربی مغربیت کو راضی رکھنے اور ان کی ہر الٹی اور نئی بات کو وحی کا درجہ دیے بغیر آپ کی صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔ میں نے یہ بات بھی عرض کی تھی کہ جناب انسانی رشتہ بندروں سے ملانے کے باوجود آخر تم نے اس سے انسان کی، کیا خدمت کی کیا انسان کے لیے یہ جاننا (دینی یا دنیاوی طور پر) ضروری یا ناگزیر ہے۔ ہمارے اجداد اول بندر تھے پھر ہم اس حالت میں آئے؟ یا کیا اگر یہ علم انسان کو نہ ہو سکا تو وہ ہم صفحہ ہستی پر کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ نظریاتی اعتبار

سے تو آپ سے پہلے ہی ڈارون اس نظریہ کی ترجمانی کر چکا ہے۔ پھر تمھیں کیوں اس کی ضرورت پیش آئی؟ کیا اس کو بیان کرنا آپ کا فرض تھا؟ یا کیا ڈارون نبی یا رسول تھا؟ جس کی واہیات اور بیہودہ باتوں کی اشاعت کرنی تھی؟ یا اس نظریہ کے بیان کیے بغیر اور ثابت کیے بغیر دنیا کو درپیش مسائل حل نہیں ہو سکتے تھے؟ خدارا کچھ سمجھنے کی کوشش کریں کیوں خواہ مخواہ اپنی فطری استعدادات کو بلاسبب تلف کر رہے ہو۔ باقی جو آپ نے اپنی آنی والی کتاب کا حوالہ دیا ہے اور اس میں ہرزہ گوئی کی ہے کہ اس میں مسکت جواب ہوں گے جس کے بعد مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں ملے گا، لیکن میری گذارش ہے کہ پیارے دوست آپ جیسے سمجھدار انسان کی نگاہوں سے یہ آیت نہیں گزری؟ (وفوق کل ذی علم علیم) میں آپ کو کامل یقین دلاتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کی ان بھونڈی باتوں سے مرعوب ہونے والا نہیں ہو بلکہ اس کتاب کا بیتابی سے منتظر ہوں۔ ان شاء اللہ العزیز! آپ کی مبارک کتاب کا جواب با صواب عرض رکھیں گے۔ اگر آپ کو میرے دلائل فرسودہ نظر آئے تو ماشاء اللہ ہمارے پاس ایسے بی۔ ایس۔ سی B.S.C علمائے کرام موجود ہیں جو آپ کی کتاب کا بفضلہ تعالیٰ سائنسی روپ میں دندان شکن جواب دیں گے۔ اس لیے کسی خوش فہمی میں مت رہنا وحی الٰہی سے ٹکر تم جیسوں کی بساط سے کافی اوپر ہے۔ پہاڑ کو ٹکر مارنے سے سر پھٹے گا پہاڑ کو کچھ نہیں ہو گا۔ آخر میں جو آپ نے گلاب کے پھول بکھیرے ہیں۔ وہ اگر نہ بکھیرتے تو اچھا ہوتا۔ آپ نے لکھا کہ آسمانی پہاڑوں سے برسات برستی ہے۔ سورج چوتھے آسمان میں پھنسا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ پتہ نہیں۔ یہ لکھتے وقت آپ کے ہوش و حواس ٹھکانے پر تھے یا نہیں؟ کیا یہ انصاف ہے کہ ایک ضعیف موضوع، منقطع و مرسل وغیرہ حدیث کے نام سے کسی کتاب سے دیکھ کر اور پھر وہ لا کر ہمیں الزام دے؟ ہمیں اگر منوانا ہے تو ایسی حدیث پیش کرو جو مستند اور مرفوع ہو۔ سند بالکل صحیح ہو معلول نہ ہو، متصل ہو۔ انقطاع و تدلیس کے عیوب سے پاک ہو اور نہ ہی شاذ و نادر ہو اور آپ ﷺ سے مروی ہو اس میں یہ ہو کہ بارش آسمانی پہاڑوں سے نازل ہوتی ہے۔ اور سورج چوتھے آسمان میں پھنسا ہوا ہے۔ تو پھر ہم آپ کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ باقی بے سند حدیث کے نام سے کوئی قول دیکھ کر میدان میں لاؤ گے تو اپنے وقار کو نقصان پہنچاؤ گے۔ آپ نے ہمیں فلاں فلاں کا مقلد اور متبع کب سے سمجھا ہے۔ یاد رکھو کہ ہمارے ہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ دوسری کوئی ہستی نہیں ہے جس کی بات حجت ہو۔ تمھیں حدیث کا علم نہیں پھر کیوں اس معاملہ میں کود پڑتے ہو۔ باقی آپ نے ساتوں آسمانوں کا طبقہ وار ہونے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا قرآن پر یقین نہیں ہے۔ آخر اس سے کون سی مصیبت لازم آتی ہے۔ قرآن و حدیث نے یوں تو نہیں کہا کہ آسمان مٹی کا بنا ہوا ہے۔ یا لوہے اور لکڑی سے بنا ہوا ہے؟ کیا اوپر کی خلاء میں سات طبقات نمبر وائز اللہ کے علم میں ہی ہوں اور ان کی حد بندی بھی اس کو ہی معلوم ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے۔ اس طرح پوچھنے سے سائنس

کے کون سے مشاہدہ اور تجربہ کی مخالفت لازم آتی ہے؟ پتہ نہیں کیا سبب ہے کہ آپ ہر ایک بات پر قلم اٹھا کر اس کو تختہ مشق بنانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ اب رہا دادی حواء کا آدم کی پسلی سے پیدائش کا مسئلہ تو اولاً: آپ کو اس طرح اصل بحث سے الگ ہونا (side line) کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ دستور ہے کہ جب کوئی آدمی زیر بحث موضوع میں اپنا پلڑا ہلکا ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو مچل کر دوسری بات کرتا ہے تاکہ مدمقابل کو اس میں پھنسا کر اصل موضوع سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنی غیر معقول بات کو واصل پردہ کیا جائے۔ ثانیاً: تمہارے ہاں اندھی فطرت اور مادہ میں وہ عجیب وغریب تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ باقی تمہارا سمجھا ہوا وہ خدا اتنا عاجز اور مجبور ہے جو کسی بھی طرح اپنی مرضی سے کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کا خدا کوئی اس طرح کا ہے تو ہمارا اس کو دور سے سلام ہے۔ دادی حواء کا وجود دادا آدم کی پسلی سے ہوا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت شامل تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اس کے لیے تو اس میں کوئی مشکلات نہیں ہے۔ باقی جو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہی نہیں ہے اس کے آگے یہ سوالات آہی نہیں سکتے۔ سوال صرف اس بات کا ہے کہ یہ حقیقت مستند طور پر معلوم ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر مستند طور پر معلوم ہوئی ہے کہ واقعی اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ دادی حواء کی پیدائش اس طرح ہوئی ہے تو اللہ پر ایمان رکھنے والے کے لیے اس میں کوئی عجوبہ نہیں ہے کہ آج کل کے سائنسی کرشموں کے مشاہدے کرنے کے بعد بھی آپ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اتنا گھٹیا قسم کا تصور رکھتے ہو جو افسوس ناک ہونے کے ساتھ ساتھ مضحکہ خیز بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو اتنی قدرت بھی حاصل نہیں ہے جو آج کے ایک سائنٹ کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے۔

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ ﴾ [الانعام: ۹۱]

اسی طرح جو آپ نے آدم علیہ السلام قد (انچائی) کے متعلق لکھا ہے وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کا قرآن کریم پر ایمان ہے بھی یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو قرآن کریم قوم عاد کے متعلق فرماتا ہے:

﴿ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ [الحاقۃ: ۷]

ظاہر ہے کہ ان کو کھجور کی مثل گرنے کی مشابہت دینے کا یہی مطلب ہے کہ آج کل کے انسانوں کے مقابلے میں ان کا قد غیر معمولی اور قدرتاً بڑا تھا۔ اسی طرح قرآن نے نوح علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ کیا آج کوئی اتنی عمر کا تصور کرسکتا ہے۔ تو اس وقت لوگوں کی اتنی بڑی عمریں ہوتی تھیں تو اس وقت کے لوگوں کے قد غیر معمولی ہونا۔ آخر کس سبب سے قابل اعتراض ہے، آخر کیوں آپ نے اللہ کی قدرت کی انسانی قدرت سے بھی کم کرنے کا ٹھیکا اٹھایا ہوا ہے؟ اگر قرآن پر ایمان نہیں ہے تو پھر آپ سے بات کرنے کا رنگ روپ الگ تھلگ ہوگا۔ باقی جو آپ نے ابتداءِ خلق کا مسئلہ چھیڑا ہے وہ بالکل بیکار ہے۔ میں نے یہ کب کہا کہ انسان بالکل پردہ عدم سے ظاہر ہوا ہے۔ البتہ قرآن کریم نے آسمان

وزمین کے متعلق فرمایا ہے کہ:

﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ [البقرہ: ۱۱۵]

اور انسان کا متعلق فرمایا:

﴿ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴾ [السجدہ: ۷]

''انسان کی پیدائش کی شروعات مٹی سے ہوئی اور اسی سے تخلیق ہوئی۔''

اگر اس کا تمہاری خود ساختہ تبدیلیوں سے کیا تعلق؟ باقی جو آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے؟ کہ ہر بات کا جواب قرآن مجید سے اور ہر مسئلہ کا حل سنت رسول سے یہ طریقہ دین کی ارفع کے خلاف اور مقصد رسالت سے بعید ہے۔ تو اس عبارت میں جو ''ہر بات اور ہر مسئلہ'' کے الفاظ ہیں ان میں جو عموم ہے اس سے مراد اگر دنیاوی علوم یا محض دنیاوی امور ہیں تو اس بات میں ہم آپ سے متفق ہیں۔ لیکن اگر اس عموم کا یہ مطلب ہے کہ انسانی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں مثلاً عبادات، معاملات، اقتصادیات، سیاسیات، رہن وسہن اور بین الاقوامی معاملات کے مسائل کا حل کتاب وسنت میں ہیں۔ ان شعبوں کے متعلق ان ماخذ (یعنی قرآن وحدیث) میں حل تلاش کرنا رسالت کے مقصد کے خلاف ہے تو اس بات میں تو کیا ہر سچا مسلمان قطعی طور پر آپ کا مخالف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح چمگادڑ کے لیے سورج فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ وہ دن کو دیکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح آپ جیسے محققین اور وحی سے اپنے آپ کو اور بالاتر سمجھنے والوں کو اس مسئلہ کا حل نظر نہ آئے تو اس میں ہم کیا کرسکتے ہیں۔ باقی آپ انسانی حیات کی رہبری کے لیے کوئی بھی شعبہ پیش کرو ان شاء اللہ العزیز ایسے برگزیدہ انسان آج بھی موجود ہیں جو آپ کو اس کا حل کتاب وسنت نکال کر دیں گے۔ واقعی اگر اس سے آپ کی یہ مراد ہے تو مجھے نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے آپ نے ہی مقصد رسالت خصوصاً عمومی اور آخر رسالت کے مقصد کو نہیں سمجھا ہے اور نہ ہی سمجھ سکو گے۔ تفصیل کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے اور مجھے پختہ یقین ہے میرے یہ الفاظ آپ کی طبع نازک پر گراں گزرے ہوئے ہوں گے اور آپ اس کو فرسودہ اور دقیانوس قرار دیتے ہو اور دو گے مگر مجھے یقین ہے۔ وہ بھی روز روشن کی طرح ایک وقت آئے گا جب میرے یہ الفاظ آپ کو یاد آئیں گے اور آپ محسوس کرو گے کہ ایک ناصح بھائی نے مجھے چند خیرخواہی کے الفاظ کہے تھے لیکن ......آگے میرے قلم کو بھی طاقت نہیں ہے۔ جو تحریر کرسکوں۔

﴿ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾

[المؤمن ٤٤]

آخر میں چند سوالات لکھتا ہوں جن کے جواب کی زحمت دوں گا جو بالکل واضح صاف اور لکھے ہوئے نمونے پر دیں گے۔

① آپ ایسی ہستی کے قائل ہو یا نہیں جو قادر مطلق ہو اور تمام مخلوق کی خالق و مالک ہو؟
② مثبت جواب کی صورت میں قرآن کریم کو اس ہستی کا کلام سمجھتے ہو یا نہیں؟
③ حضرت محمد ﷺ کو اللہ کے رسول برحق اور نبوت کے سلسلہ کی آخری کڑی تسلیم کرتے ہو یا نہیں؟
④ آخرت کے بارے میں آپ کا بعین وہی عقیدہ ہے جو کہ قرآن حکیم نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے یا سرے سے ہی اس عقیدے سے فراغت حاصل کر چکے ہو؟
⑤ سنت الرسول ﷺ کو اسلامی قانون کا ماخذ اور مصدر ماننے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟
⑥ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ کے نزدیک اس سنت کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہے؟
⑦ کتاب وسنت کے الفاظ کو ان کے ظاہری اور حقیقی معنی پر محمول کرنے کے قائل ہو یا یہ دونوں محض مجاز کا پلندہ ہیں؟

یہ کل سات سوالات ہیں۔ اگر واقعی آپ میرے ساتھ خط و کتابت کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے خواہش مند ہو تو ان سوالات کے جوابات بالکل وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کرنا۔ ابہام کو اختیار نہیں کرنا اور اگر اس سلسلہ خط و کتابت کو ختم کرنا چاہتے ہو تو بس زیادہ جواب دینے کی زحمت نہیں کرنا۔ باقی اتنا ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو قرآن کریم کی طرف غلط نسبت کی جس پر میں نے آپ کو متنبہ بھی کیا مگر آپ نے اس کو ڈاکار لیے بغیر ہضم کر دیا۔ اور اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا تو اس کے متعلق یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ اس غلطی کی تصحیح کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو مجھے حیرانگی ہے کہ میں آپ کی اس غلطی کو اخبار میں اس ہیڈنگ ''مسٹر عبدالوحید کی طرف کھلا خط'' سے شایع کرادوں؟ اس کا ضرور جواب دینا۔

باقی رہا آپ کا ''نظریہ ارتقاء'' تو اس کے بارے میں مزید خط و کتابت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب صرف آپ کی اس ''بے نظیر کتاب'' کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔ جس کے متعلق آپ نے ''فوق کل ذی علم علیم'' کی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس میں میرے سوالات کے مسکت جوابات ہوں گے۔ ماشاء اللہ نظر بد دور۔ اتنی بڑی دعا آپ کے لیے موزوں تو نہیں ہے۔ بہر کیف کیسے بھی ہو میں اس بے نظیر کتاب کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ مطبوع سے مزین ہوتے ہی ایک کاپی فوراً اپنے اس پرانے دوست کی طرف ضرور ارسال کریں گے۔

والسلام

العبد محب الله شاه عفى الله عنه

❁❁❁

المقالة الخامسة

## اظهار الغواية الواقعة فی کتاب پیغام هداية

### علامہ مشرقی کی کتاب پر تبصرہ

علامہ عنایت اللہ مشرقی تحریک ''خاکسار'' کے بانی اپنے وقت کے عظیم سکالر ومفکر نے بہت سی کتب تحریر کیں۔ ان کی ایک کتاب ''پیغام ہدایت'' کے مطالعہ کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ کو چند نظریات اسلام کے خلاف نظر آئے تو انھوں نے ان کے رد میں یہ مقالہ تحریر کیا۔ ''الازہری''

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے۔

اما بعد! آپ کا بھیجا ہوا رسالہ ''پیغام ہدایت'' ملا شکریہ۔ رسالہ دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس میں کتنی ہی عبارات اور کتنی ہی باتیں جن کے ساتھ نہ صرف اتفاق کرنا مشکل ہے بلکہ وہ باتیں تاریخ و سیرت۔ قرآن و حدیث کے بھی قطعی خلاف ہیں جن پر تنبیہ کرنا اشد ضروری ہے، اس لیے کہ ① اس رسالہ کا نام ''پیغام ہدایت'' رکھا گیا ہے حالانکہ اس کے مندرجات سے کتنے ہی غیر واقف اور قرآن و حدیث کے سے نابلد لوگوں کے گمراہی میں پڑنے کے قریبی امکانات ہیں ② موجودہ نسل کی دینی علوم سے بے رغبتی بلکہ تنفر اور مغربی تعلیم کی طرف جنون کی حد تک میلان نے انھیں اس قابل ہی رہنے نہیں دیا کہ وہ راہ راست قرآن و حدیث سے خود استفادہ کر سکیں یہی سبب ہے کہ وہ اگر کوئی دینی معلومات حاصل کرنا بھی چاہتے ہیں تو وہ مستشرقین کی تصانیف سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان مستشرقین کی اسلام اور حامل قرآن سے عداوت اور بیجا تعصب اور عناد کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ اس لیے وہ اپنی تصانیف میں دین اسلام کے متعلق وہ زہر قاتل ڈال دیتے ہیں کہ قارئین اسلام سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں اور اسلام کو لانے والی بابرکت ہستی سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی کتنی بدگمانیوں کا شکار ہو کر اپنے ایمان اور اسلام کو برباد کر دیتے ہیں: (( انا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون)) بہر حال یہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ نہیں کرتے۔ الا ماشاء اللہ۔ ان کا مبلغ علم صرف یہی مستشرقین ہیں جو کہ اسلام کے اول صف کے دشمن ہیں انھی کے لیٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں یا کچھ رسائل جوان کی اپنی مادری زبان میں یا انگلش میں ہوتے ہیں انھیں دیکھ کر اپنے عقائد و تصورات و نظریات کی تشکیل کرتے ہیں اور انھی تصورات کی بنیاد پر اپنی عملی زندگی کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ کہ اس صورت حال میں ان کا ایمان کیا ہوگا اور ان کی عملی زندگی کا رنگ کیسا ہوگا اس کا اندازہ لگانے کے لیے کسی بڑی سوچ و فکر و گہرائی کی کوئی ضرورت نہیں کم فہم شخص بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خشت اوی چوں نہد معماج تاثر یا مے رود دیوار کج

لہٰذا ایسے دین اسلام سے نابلد لوگ جب آپ کا ترجمہ کیا ہوا رسالہ دیکھیں گے، وہ اپنے اذہان پر یہی تصور جمالیں گے کہ واقعتاً یہی قرآن ہے اور یہی دین اسلام ہے اور اسلامی عقائد مسلم کا یہی مطلب و مقصد ہے۔ جوان رسائل میں ہے اور اس کا نتیجہ اتنا اندوناک نکلے گا کہ جس کا تصور بھی ہمارے لیے بڑی ذہنی

کوفت کا باعث ہے۔ میں بذاتِ خود اگرچہ علامہ مشرقی کا احترام کرتا ہوں لیکن یہ نہیں سمجھ سکا کہ ایسا شخص باوجود اتنے علم کے اور باوجود اس حقیقت کے کہ جو قرآن کی نئی ترجمانی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کیونکر ایسی غلط باتیں صفحہ قرطاس کر سکتا ہے۔ جس کے متعلق قرآن کریم میں ہی دیگر مقامات پر بالکل صراحت موجود ہے اور اس کے متعلق واضح الفاظ میں توضیح ہے، اگر علامہ صاحب نے ان آیات کو دیکھے بغیر ہی یہ کچھ لکھا ہے تو یہ انتہائی فاش غلطی ہے کیونکہ قرآن تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، پھر دوسری کسی کتاب کی ترجمانی بھی پوری کتاب دیکھنے کے بعد بھی بڑا افسوسناک معاملہ ہے کیونکہ صاحب کتاب کہیں پر ایک بات اجمالی طور پر لکھتا ہے تو کہیں اس کی تفصیل بیان کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی صرف اس اجمالی کو دیکھے اور اس کی تفصیل و توضیح سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کا ترجمہ یا تشریح کرے گا تو اس کا ترجمہ اور تشریح بالکل غلط بن جائے گا۔ مترجم کا فرض تھا کہ وہ ترجمہ وہ کرے جو خود مصنف نے کیا یا بیان کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابل ان الفاظ یا عبارت کے اوپر اپنے خیال نظریہ کو مسلط کر دینا یہ ترجمہ نہیں بلکہ خیانت ہے۔ اگر علامہ صاحب نے یہ آیات دیکھیں تھیں پھر بھی ان کے برخلاف بلکہ ان کو رد کرنے کی سعی کی تھی تو اس صورت میں میں اپنی طرف سے اس عمل کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ہر اہل علم خود سوچ سکتا ہے۔ کسی ہستی و بزرگ کا احترام و عزت اس کی اپنی جگہ پر لیکن اس کے باوجود کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں تنقید سے بالاتر صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کا رسول مقبول ﷺ ہے ان کے علاوہ کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں ہے علاوہ ازیں یہاں پر تو معاملہ علامہ صاحب اور عالم الغیب والشھادۃ رب العالمین کے کلام کے متعلق ہے۔ ایک علامہ صاحب تو کیا لیکن پوری دنیا کے مفکرین یا اہل علم کی بات ایک طرف اور کتاب اللہ وقرآن مجید کی دوسری طرف۔ اگر ایمان ہے تو اس کا یہی تقاضا ہے کہ بات وہی صحیح ہے اور حقیقت وہی ہے جو قرآن مجید میں ہے یا رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے، دیگر لوگوں کی بات ان کے مقابلہ میں غلط ہے۔ دنیا کے مفکرین تو وقتاً فوقتاً اپنے تصورات ونظریات کو گرگٹ کی طرح بدلاتے رہتے ہیں کیا ایسے بے علم مفکرین کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی اٹل حقیقت کو کس طور پر بدل سکتے ہیں؟ اصل ایمان اور حقیقت علم کی بات صرف قرآن وحدیث کی ہی ہے باقی دیگر لوگوں کی بات اگر ان دو سرچشموں کے موافق ہے یا ہوگی وہ بسر وچشم قبول اور جو بات ان کے مخالف ہے وہ رد و باطل۔ ہمارا یہی عقیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کاش ہمیں دنیا و آخرت میں اس عقیدہ پر مستقیم رکھے، تاکہ جینا اور مرنا اس عقیدہ کی روشنی میں ہو۔ اللھم آمین

بہرصورت یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے میں قلم اٹھانے پر مجبور ہوا۔ ورنہ عام طور پر خوامخواہ کسی پر تنقید، بحث برائے بحث کا نہ میں قائل ہوں اور نہ ہی فاعل، اس لیے امید ہے کہ آپ میری گزارش سے برا تاثر نہ لیں گے اور اس پر ٹھنڈے دماغ سے غور وفکر کریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کریں گے اور ان کی غلطیوں

کی اصلاح کے ضروری اقدامات اٹھائیں گے۔

## کیا دین اسلام کو زوال ہوا ہے؟

① رسالہ کے پہلے صفحہ پر ''پیش لفظ'' کی ابتدا میں علامہ صاحب نے لکھا ہے کہ ''دین اسلام کے زوال کے کتنے ہی سالوں کے بعد......'' اسی طرح تیسرے صفحہ کی ابتدا میں یہ الفاظ درج ہیں ''کا زوال اسلام کا بنیادی سبب ہے......'' مجھے حیرت ہے کہ ''دین اسلام'' کا زوال آخر کیسے ہوا؟ کیا ''دین اسلام'' قرآن کریم اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ میں جو کچھ مندرج ہے اس کے علاوہ بھی کسی اور چیز کا نام ہے؟ دین اسلام سے مراد الٰہی قانون اور خدائی دستور العمل ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے قانون اور بیان کیے ہوئے دستور العمل کو بھی کبھی زوال آسکتا ہے اگر جواب اثبات میں ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہو کہ قرآن مجید میں جو کچھ سمجھایا گیا ہے یا جو ابدی حقائق بیان کیے گئے ہیں وہ بھی ابدی نہ رہے اور اس صورت میں علامہ صاحب لوگوں کو قرآن کی طرف بلانے کی کوشش کر رہے ہیں او یہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ترقی تب ہی ملے گی جب قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح قرآن کی رہنمائی پر عمل کریں گے، قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو رسول اکرم ﷺ نے جو اعلیٰ نصب العین دیا تھا اسے اختیار کریں گے اس لحاظ سے ان کا یہ لکھنا بالکل غلط ثابت ہوا۔ جس چیز کو زوال لاحق ہو چکا اسے اپنانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ نصب العین جسے قرآنی نصب العین سمجھ کر علامہ صاحب اس کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس کی طرف دعوت تب ہی درست ہو سکتی ہے، جب وہ اپنی اصلی صورت میں باقی ہو اور اپنے طور پر اٹل حقیقت ہو اس پر کسی طور پر بھی زوال نہ آسکے اور جب اسی طرح ہے اور واقعتاً اسی طرح ہی ہے۔ تو پھر اس پر زوال آیا ہی نہیں پھر ''دین اسلام کا زوال'' کے الفاظ کیسی فاش غلطی ہے۔ اگر واقعتاً جو کچھ قرآن کریم نے فرمایا ہے (کیونکہ دین اسلام اس کا نام ہے) اس پر معاذ اللہ زوال آچکا ہے تو پھر اس کی طرف دعوت دینا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ ایسی بے سودہ دستور العمل کی طرف دعوت کی کیا ضرورت؟ ذرا سوچیں کہ یہ الفاظ بعینہٖ اسی غلط تصور کی عکاسی کر رہے ہیں جو آج کل ملحد یا کمیونسٹ ذہنیت اور الحاد اور اخلاقی انا کی طرف مائل طبیعت والے لوگ ہر جگہ عام کر رہے ہیں اور پروپیگنڈا کے سارے میسر وسائل اور ذرائع استعمال کر رہے ہیں اور دن رات یہی زہر افشانی کر رہے ہیں کہ وہ اسلام اب فرسودہ ہو چکا ہے اور یہ دین یا قانون یا دستور العمل اس نام نہاد اور ترقی یافتہ دور میں قابل عمل بالکل نہیں رہا۔ لہٰذا قرآن وغیرہ کو صرف یادگار کے طور پر کسی میوزم کی زینت بنایا جائے باقی رہا عمل وہ ''نعوذ باللہ'' تو وہ اس وقت اس قابل ہی نہیں رہا۔ کیا قرآن اور دین اسلام بالکل ہم معنیٰ نہیں؟ حالانکہ قرآن کے متعلق اسلام دشمنوں کی یہ رائے ہے کہ جس کتاب کو جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تھا وہ بعینہٖ ہے۔ اس میں ایک شوشہ کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ اسے اللہ کی کتاب تسلیم بھی نہ کریں۔ اگر دشمنوں کے بقول بھی قرآن اپنی اصلی شکل

میں موجود ہے تو پھر دین اسلام کو زوال کہاں سے آ گیا؟ کچھ سمجھائیں تو سہی غالباً اس سے علامہ صاحب کی مراد مسلمان ہی ہے کیونکہ مسلمانوں میں واقعتاً ان کے بداعمالی اور ترک قرآن کی وجہ سے زوال آیا ہے لیکن اس صورت میں علامہ صاحب زوال دین اسلام کی جگہ مسلمانوں کا زوال یا اہل اسلام کا زوال کے الفاظ استعمال کرتے تو بہتر تھا۔ گو آپ کو اس غلطی کا احساس بھی نہ ہوا۔ لیکن سوچیں کہ قارئین کی ذہانت اور فہم وفراست مختلف ہوا کرتی ہے لہٰذا اگر کوئی قاری معمول سے زیادہ ذہین اور زیادہ حساس ہوگا تو اس کے ذہن میں رسالہ کے الفاظ سے ہی غلط تاثر بیٹھ جائے گا یعنی اگر دین اسلام خود زوال پذیر ہو چکا ہے تو اس کی طرف علامہ صاحب کیوں دعوت دے رہے ہیں؟ دعوت تو اسی چیز کی طرف دی جاتی ہے جو خود من وعن محفوظ ہو، اگرچہ اس کے پیروکار اسی کی پیروی ترک کرنے کی وجہ سے سیدھی راہ سے ہٹ کر گمراہی میں جا پڑے ہوں لیکن اگر اس کے مقابل اصل چیز ہی زائل ہو چکی ہے تو اس کی طرف دعوت دینا تو مجنونوں کا کام ہی ہو سکتا ہے نہ کہ اہل دانش کا۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ ''بسم اللہ'' بھی غلط جس رسالہ کی ابتدا کے الفاظ سے ہی غلط تاثر بیٹھ جائے، اس سے آگے قارئین کو کوئی زیادہ نتیجہ خیز فائدہ حاصل ہونے کی توقع بہت کم ہو سکتی ہے۔ کسی بھی بات کے متعلق ابتدا میں جو تاثر بیٹھ جاتا ہے، اچھا یا برا بہرحال آگے بھی عام طور پر وہی تاثر مسلسل چلتا رہتا ہے، آپ کو چاہیے تھا کہ آپ ترجمہ کر کے اس کی اصلاح کر دیتے تو یہ علمی خیانت نہیں کہلائے گی کیونکہ غالباً علامہ صاحب کی مراد بھی یہی ہے اور لکھنے میں یہ فروگزاشت ہو گئی ہے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کی کتب میں کئی اختلافات اور غلطیاں ملتی ہیں اور ابتدا کتاب کی غلطی کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ میں اپنا احوال آپ کو سناتا ہوں کہ یہ الفاظ پڑھنے سے ایسے محسوس ہوا کہ دل زخمی ہو چکا ہے یعنی یہ خیال ذہن میں آ جاتا ہے کہ جو شخص یہ لکھ رہا ہے کہ دین اسلام زوال پذیر ہو چکا ہے وہ آگے چل کر ہمیں کسی ہدایت کی رہنمائی کرے گا۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ جو قرآن مجید کی تصریح کے مطابق کامل ومکمل ہے ابدی اور اٹل حقیقت ہے یوم الدین تک باقی رہنے والا ہے اس کے پیروکار کتنا ہی صراط مستقیم سے ہٹ جائیں لیکن صراط مستقیم اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں۔ پاکستان نیشنل ہائی وے جو کراچی سے پشاور جا رہی ہے کوئی بیوقوف اسے چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے تو وہ سیدھی راہ سے ہٹا ہوا اور زائل ہے لیکن کوئی اور عقل مند ودانش ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ یہ شاہراہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور زوال پذیر ہو چکی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟

## اُمی ہونا آپ ﷺ کا بے نظیر معجزہ ہے یا بے اَدبی؟

صفحہ نمبر 6 پر ''حضور ﷺ'' کی اعلیٰ قابلیت کے عنوان کے تحت جو کچھ علامہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے اور آگے چل کر دوبارہ اسے دہرایا ہے اس میں علامہ صاحب نے حد کر دی ہے تاریخ، سیرت، قرآن، صحیح احادیث سب کی مخالفت کر گزرے ہیں اور محض ایک فرضی خیال کے ماتحت ایک حقیقت سے انکار کیا گیا ہے

اور اسے ثابت کرنے کے لیے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ علامہ صاحب جیسے مشرقی اور مغربی علوم کے جامع سے صادر ہونا بہت ہی تعجب کی بات ہے، اگر ان کا یہ سب کچھ مرقوم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے تو یقین کرنا مشکل ہو جائے کہ علامہ صاحب جیسی شخصیت بھی ایسی غلطی کی مرتکب ہو سکتی ہے اور اتنی غلط بات کو بڑے شدومد اور یقینی اضافہ کے ساتھ تحریر فرما سکتی ہے۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں ''حضور ﷺ کے متعلق عام طور پر امی کا معنیٰ ان پڑھ کیا جاتا ہے اور عقیدت کی بنا پر دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ آپ ان پڑھ تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے......'' یہ عبارت ص 7 تک یعنی ان الفاظ تک ''الغرض حضور ﷺ کے متعلق یہ گمان رکھنا کہ آپ ان پڑھ تھے بے بنیاد ہے۔'' اس مکمل اقتباس کو ملاحظہ کرتے ہوئے صفحہ نمبر 44 کے اس اقتباس کو ملاحظہ فرمائیں ''قرآن حکیم کو دنیا کے سامنے پیش کرنے والے...... یہ عبارت چلتی ہوئی صفحہ 45 پر ان الفاظ پر ختم ہوئی ہے ''ایسی حالات میں حضور ﷺ کو ان پڑھ سمجھنا بڑی نادانی ہے۔ آپ ان دونوں اقتباسات کو سامنے رکھتے ہوئے میری گزارش کو مطالعہ میں لائیں۔ جو شخص ہمارے زمانہ سے بہت پہلے گزر چکا ہو۔ اس کے متعلق معلومات کا ذریعہ صرف مستند تاریخی مواد ہی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً سرور کونین ﷺ کے متعلق اس کے علاوہ دو اور ماخذ بھی ہمارے پاس ہیں۔ ایک قرآن مجید دوسرا آپ ﷺ کی صحیح احادیث جو آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واسطے سے صحیح اسانید کے ساتھ مروی ہوں مذکورہ مآخذ کے علاوہ رسول اکرم ﷺ کی ذات کچھ کہنا یہ انتہائی نازک معاملہ ہے، یہاں کسی عام سی بات نہیں بلکہ یہاں اس ہستی کے متعلق کچھ کہنا ہے جو انسانیت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہے اور وہ ہستی ہے اس لیے آپ کے بارے میں محض خیالی مفروضوں اور اپنی طرف سے کچھ غلط تصورات قائم کر کے ان کی بنیاد پر کچھ کہنا ایسی سنگین جسارت ہے جس کا نتیجہ یہاں تو گمراہی ہو گی لیکن آخرت میں بھی انتہائی ہولناک اور سخت تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آپ کے متعلق یہ طے کرنا کہ آپ تعلیم یافتہ تھے یا ان پڑھ تھے مذکورہ بالا مآخذ میں سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ باقی ان سے صرف نظر کر کے بیٹھے بیٹھے رجم بالغیب کرنا افسانہ گوئی اور محض دماغی تفریح ہی ہو سکتی ہے، لیکن اسے حقیقت کی ترجمانی کہنا بالکل غلط ہے آپ ﷺ کی بابرکت ہستی کے متعلق افسانہ گوئی انتہاء درجہ کی سوء ادبی ہے اور نہایت سنگین جسارت ہے بہر حال آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ زندگی کے یہی تین مآخذ ہی ممکن ہیں ① کتاب اللہ یعنی قرآن کریم ② کتب التاریخ والسیر ③ احادیث صحیحہ کی مستند اور مختلف کتب۔ اب جب ہم ان ماخذ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نبوت سے پہلے بالکل ان پڑھ تھے۔ سیرت اور تاریخ کی جو مستند کتب ہیں ان کی تفصیل دیکھنا بلا ضرورت ضلالت کا باعث بنے گا۔ آپ خود ان میں دیکھ سکتے ہیں آپ ﷺ ان پڑھ تھے۔ ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں ہو (بشرطیکہ وہ کسی مسلم کی لکھی ہوئی ہو۔ باقی مستشرقین اور دین کے دشمنوں کو یہود نصاریٰ کی بکواس ہمارے لیے حجت نہیں) کہ آپ ﷺ پڑھے ہوئے

تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

④ ماخذ صحیح احادیث تو اس کے باقی ذخیرہ کو چھوڑ کر صرف صحاح ستہ اور صحاح ستہ میں سے بھی صرف ایک کتاب جو اصح الکتب میں کتاب اللہ ہے، یعنی صحیح بخاری کی ابتدا میں باب کیف کان بدء الوحی کا مطالعہ کریں۔ آپ کو وہ صحیح حدیث ملے گی جس میں ہے کہ پہلی مرتبہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام کے اقراء کہنے پر آپ ﷺ نے جواباً فرمایا: ''ما انا بقارئ'' میں پڑھا ہوا نہیں، تیسری مرتبہ جبریل علیہ السلام نے گلے لگا کر دبوچا اور سورۂ فلق کی ابتدائی پانچ آیات القاء کر کے چلا گیا۔ کیا یہ صحیح احادیث قابل اعتماد نہیں؟ افسوس علامہ صاحب کتنے ہی واقعات ادھر ادھر سے غیر مستند تاریخ سے لے کر اپنی تصانیف میں بیان کرتا چلا گیا ہے حالانکہ ان کی کوئی بھی سند مذکور نہیں لیکن انھیں لے کر اور مستند صحیح احادیث کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے حالانکہ ان احادیث مبارکہ کی یہاں ہم سے لے کر کتاب کے مصنف ''مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ'' تک موجود ہیں اور مصنف کتاب سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک میں موجود ہیں اور ان اسانید کے رواۃ کے متعلق الگ الگ کتب فن رجال میں تصنیف کیے ہوئے موجود ہیں جن میں ان کا احوال دیکھا جا سکتا ہے کہ راوی معتمد علیہ تھا یا نہیں ثقہ تھا یا ضعیف سچا تھا یا مفتری اور کذاب، ان کے علاوہ احادیث کی صحت کے لیے ایسے زبردست اور عقل اور نقل کی کسوٹی پر پورے اترنے والے اصول وضع کر کے کتب اصول حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ جنھیں عمل میں لا کر کسی بھی حدیث کو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہے یا کمزور اور ناقابل حجت۔ افسوس اتنے انتظام کے بعد بھی علامہ صاحب صحیح احادیث کو نظر انداز کر کے محض ایک خیالی مفروضے کی بنیاد پر (اس کی حقیقت بھی آگے چل کر بیان کروں گا) یہ قطعی فیصلہ صادر کر رہا ہے کہ ''یقیناً آپ ﷺ پڑھے ہوئے تھے۔'' اللہ اکبر! اس سے بڑھ کر حقائق کا بے دردی سے خون کیا ہو سکتا ہے؟ ایک طرف ان صحیح احادیث کو کوئی اہمیت نہ دے کر ایک غلط فیصلہ کر رہا ہے تو دوسری طرف آگے چل کر ایک موضوع اور من گھڑت حدیث پیش کر رہا ہے یعنی ''کنت کنزاً مخفیا الخ'' دیکھیے دس...... کا صفحہ نمبر 42،43 حالانکہ اس روایت کی کوئی سند ہی نہیں۔ صرف کسی گمنام کتاب میں یہ الفاظ حدیث طور لکھے ہوئے دیکھ کر ان کو بطور حدیث بے جا نقل کر دیا یہ علامہ صاحب کی بہت بڑی جسارت ہے کیا اسے بارگاہ رسالت کا یہ ارشاد یاد نہ تھا کہ ''جو بھی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنا لے'' علامہ صاحب تو اب ہمارے درمیان موجود نہیں مرحوم ہو چکا ہے، لیکن ہم آپ کو بلکہ ان کے تمام معتقدین اور مداحوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ ان الفاظ کو حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں دکھا دیں محض کچھ قصہ گو اور داستانیں بیان کرنے والوں یا مغفل صوفیاء کی کتب میں اس کا وجود اسے حدیث قطعاً نہیں بنا سکتا۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ایک طرف صحیح احادیث سے کنارہ کشی کرتے ہوئے محض خیالی مفروضہ کی بنیاد پر آپ ﷺ کے پڑھے ہوئے ہونے کا قائل ہو رہا ہے اور دوسری طرف محض اپنے مفروضہ کو ثابت

کرنے کے لیے بے دھڑک وہ روایات لے کر میدان میں اتر آیا ہے کہ جن کا نہ سر ہے نہ پیر یعنی ان کی اسانید کی صحت تو دور کی بات سرے سے ان کی اسانید ہی نہیں ہیں۔ کیا انصاف اسی کا نام ہے؟ کیا یہی طرز عمل ہمارے لیے پیغام ہدایت ہوگا؟ چلو آخری اور قطعی اور سب سے زبردست اور ناقابل تردید ماخذ خود قرآن کریم ہے۔ علامہ صاحب نے تو لفظ "امی" کو لے کر عالم اسلام کو الزام دیا ہے کہ انہوں نے اس لفظ کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ مجھے خوامخواہ بحث کو طول نہیں دینا ورنہ یہ فیصلہ بھی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا کہ دراصل غلطی پر خود علامہ صاحب ہے اس لفظی بحث کو چھوڑ کر میں قرآن کریم سے کچھ آیات لکھتا ہوں پھر آپ خود فیصلہ کریں کہ اس جگہ پر اور اس مسئلہ میں علامہ صاحب نے کیسی گمراہ کن غلطی کی ہے قرآن انسانیت کے لیے ابدی دستور العمل ہے۔ لہٰذا اس نے صرف لفظ ''اُمی'' پر قناعت کر کے علامہ صاحب جیسے جدید مجتہدین کے لیے مجادلہ اور مکابرہ کا موقع مہیا نہیں کیا بلکہ اسی مسئلہ کے متعلق بھی صراحت کر دی ہے اور یہ حقیقت بیان فرما دی ہے کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کتابی علم پڑھے ہوئے نہیں تھے بلکہ آپ کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ (الف)

﴿ وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴾

[العنکبوت: ۴۸]

اس آیت میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ قرآن یا وحی سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ باطل پرست شک میں پڑ جاتے اور یہ باطل پرستوں کے لیے شک کا بہت بڑا موقعہ پیدا ہو جاتا جب اس طرح نہیں بلکہ آپ ﷺ ان پڑھ تھے لہٰذا ضد اور عناد کے علاوہ شک کا ان کے لیے کوئی موقع نہ رہا۔

﴿ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَٰبُ وَلَا الْإِيمَانُ ﴾

[الشوریٰ: ۵۲]

اس آیت کریمہ نے تصریح کر دی کہ رسول اکرم ﷺ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ قرآن کریم ایسی مستند کتاب تو یہ وضاحت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ نے نبوت سے مشرف ہونے سے پہلے نہ تو کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی کچھ لکھا کرتے تھے اور آپ کو کتاب کے متعلق کچھ معلومات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ مذکور ہے سیدنا جبریل علیہ السلام کو آپ نے یہی فرمایا تھا کہ: ((ماانا بقاری)) کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ لیکن علامہ صاحب نے خود قرآن کی تصریحات سے بھی مستغنی ہو کر یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ آپ ﷺ لکھنے پڑھنے کے ماہر تھے۔ کیا قرآنی آیات ان کے سامنے نہ تھیں اگر نہ تھیں تو پھر بے خبری اور عدم علم کے باوجود ایسے اہم مسئلہ کے متعلق پورے عالم اسلام سے الگ ہو کر فتویٰ کیوں دے دیا اور اگر یہ

آیات ان کے سامنے تھیں تو پھر اس کے باوجود یہ رائے ظن کر دی تو اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں آپ خود اپنے ایمان کی تقاضا اور ضمیر کی آواز پر کان دھر کر خود ہی بتائیں کہ کسی مسئلہ یا معاملہ کے متعلق قرآن حکیم ایک طرح ارشاد فرمائے لیکن کوئی شخص کہے اس طرح نہیں صحیح اس طرح ہے تو وہ شخص کیا ہوا؟ ایک مسلمان کے لیے تو یہ بنیادی طور پر ضروری کہ وہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سمجھے اس کے خلاف تصور بھی نہ کرے اس ایمانی تقاضا کی روشنی انصاف سے جواب دیں کہ یہ علامہ صاحب کی کتنی بڑی غلطی ہے۔

﴿وَقَالُوٓا اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِىَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيلًا﴾ [الفرقان : ٥]

یعنی کفار مکہ نے کہا کہ قرآن اگلے لوگوں کی داستانیں ہیں۔ جو انہوں (محمد ﷺ) نے کسی سے لکھوا کر رکھی ہیں اور پھر صبح وشام اس پر املا کی جاتی ہیں۔ مطلب واضح ہے وہ کفار آپ ﷺ کو ابتدا ہی سے جانتے تھے آپ ﷺ کی زندگی کا (نبوت کے اعلان تک) ہر لمحہ ان کے سامنے تھا اور ان کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ کہیں بھی پڑھے نہیں اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ اختیار کیا ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لہٰذا یہ کسی دوسرے سے لکھوا کر پھر صبح وشام املاء کروا کر، سن کر، یاد کر کے پھر ہمیں اللہ کی کتاب کہہ کر سنا رہا ہے۔ افسوس! کافر تو (جو آپ ﷺ کی پوری زندگی سے واقف تھے) آپ ﷺ کے لکھنے پڑھنے کی نفی کریں لیکن آج ساڑھے تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد علامہ صاحب جیسے ہستی اسے رد کر کے یہ فیصلہ صادر کر رہا ہے کہ نہیں نہیں بلکہ آپ ﷺ پڑھے لکھے اور حساب دانی کے ماہر تھے یا للعجب! علامہ صاحب کو چاہیے تھا کہ آپ ﷺ جس کے پاس پڑھے تھے یا لکھنے پڑھنے کی تعلیم سیکھی (اس کے خیال مفروضے کے مطابق) اس کا نام بھی دے دیتے تاکہ ہم بھی دیکھتے کہ اس بے بنیاد دعویٰ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ شاید مستشرقین اور یہود ونصاریٰ کی تقلید میں علامہ صاحب بھی انہی کے ہم خیال ہیں کہ کچھ نصاریٰ راہبوں وغیرہ سے آپ ﷺ نے تعلیم حاصل کی تھی لیکن عمداً یہ بات تحریر نہیں کی۔ اس کے علاوہ تاریخ اور سیرت کی کتب اور صحیح احادیث میں یہ توضیح موجود ہے کہ آپ ﷺ پر جو وحی نازل ہوا کرتی تھی وہ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے لکھ دیا کرتے تھے۔ اگر آپ ﷺ ہی لکھنا پڑھنا جانتے ہوتے تو پھر دوسرے کاتبین کی کیا ضرورت تھی آپ ﷺ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی وحی پر کون امین تھا، آپ ﷺ خود ہی لکھ دیتے، پھر دوسروں کو دکھلاتے پھر جو کوئی نقل کرنا چاہتا نقل کر دیتا۔ اسی طرح آپ ﷺ دعوت اسلام کے لیے خطوط بھیجے وہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی سے لکھوائے تھے آپ ﷺ نے اپنے نام مبارکہ کے دستخط بھی نہیں لکھتے تھے، بلکہ اس کے لیے ایک انگوٹھی بنوائی تھی۔ جس پر ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کا نقش تھا اور اس خط کے آخر میں جو کسی کی طرف بھیجتے تھے وہ مہر لگاتے تھے۔ ان سب حقائق و واقعات سے صرف نظر کرتے ہوئے علامہ صاحب آپ کے لکھے پڑھے ہونے کی مہارت کو بغیر دلیل و برہان ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرنے کی جسارت کر رہے ہیں اور ان کے معتقدین بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق و

تفتیش کے ایسے غلط دعویٰ پر آنکھیں بند کر کے "آمنا و صدقنا" کہہ رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ علامہ صاحب پورے عالم اسلام (یعنی ساڑھے تیرہ سو سال کے مسلمانوں) جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، فقہاء امت، صلحائے علماء، فضلاء بے شمار گزر چکے ہیں ان سب کی تغلیط کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: آپ ﷺ کو ان پڑھ سمجھنا بڑی نادانی ہے۔ ص نمبر ۴۵ حالانکہ عالم اسلام کا یہ موقف ٹھوس دلائل پر مبنی تھا اور ہے جن میں سے مختصراً کچھ اوپر کی سطور میں ذکر کر چکا ہوں اور خود ایسا دعویٰ کر رہا ہے جس کے لیے ایک دلیل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اور اس طرز عمل کو علم اور دانشمندی سمجھ رہا ہے اگر وہ دعویٰ جو مضبوط اور محکم دلائل پر مبنی ہو وہ نادانی ہے اور بے دلیل دعویٰ دانشمندی اور علم وفہم پھر تو دنیا میں نادانی کا وجود ہی نہیں۔ آپ ﷺ ہم سے تقریباً چودہ سو سال پہلے گزر چکے ہیں۔ آخر آپ کے احوال وکوائف زندگی کی معلومات جاننے کے لیے ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے جو بھی ذرائع وسائل ممکن ہو سکتے ہیں۔ وہ سب کے سب عالم اسلام کے موقف کی تائید کرتے ہیں اور اس کے لیے روشن دلائل ہیں۔ باقی علامہ صاحب کے پاس ان ذرائع میں سے کوئی ایک دلیل بھی نہیں:

﴿ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [البقرہ: ۱۱۱]

ہاں علامہ صاحب اگر یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ مجھے اس حقیقت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوئی اور بات ہے لیکن اسی دعویٰ کے بعد ان کی حیثیت بالکل مختلف ہو جائے گی۔

محترم سلیم صاحب! آپ ہی انصاف کریں کہ ایسی بے بنیاد دعویٰ کی کیا دلیل ہے اور قرآن وحدیث اور تاریخی مآخذ کو نظر انداز کرنے کا کیا مطلب ہے باقی جو عقلی دلائل علامہ صاحب نے لکھے ہیں، ان کا مفصل ذکر اگرچہ آگے آرہا ہے لیکن بیجا طرف داری سے الگ ہو کر آپ سوچیں کہ اس مسئلہ میں نقلی دلائل کی ضرورت ہے یا عقلی دلائل کی؟ عجب ہے کہ اتنی موٹی بات سمجھ نہیں سکا کہ گذشتہ زمانہ کے کسی شخص کے متعلق کسی بات کو طے کرنے کے لیے کہ وہ اس طرح تھا اور اُس طرح تھا۔ اس کے لیے نقلی دلائل (مثلاً تاریخی مواد وغیرہ) کی ضرورت ہوتی ہے یا محض عقلی گھوڑے دوڑا کر اور قیاس آرائی سے کام لے کر کہا جائے کہ فلاں اس طرح تھا اور فلاں اُس طرح تھا۔ افسوس! علامہ حضرات کا یہ حال ہے تو پھر ہم ہیچمند انوں کا کیا قصور! اس بے بنیاد ظن اور محض تخمین کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سالوں سے سب کے سب مسلمان بالکل ایک غلط عقیدہ پر تھے اور ایک بے ثبوت موقف پر ڈٹے رہے۔ اچھا ہوا کہ چودھویں صدی میں اللہ تعالیٰ کو رحم آگیا اور علامہ صاحب جیسے محقق کو صحیح علم عطا فرمایا اور اس نے آکر حقیقت کو آشنا کیا ورنہ آگے بھی خلق خدا معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا کر پہنچ جاتی۔ لیکن گذشتہ ادوار کے مسلمانوں کے متعلق بھی اپنا فیصلہ سنا دیتے کہ وہ کیا ہوئے اور ان کا حشر کیا ہوگا؟ صرف یہ لکھنا کافی نہیں کہ یہ بڑی نادانی ہے کیونکہ جو شخص ایسی بابرکت ہستی (ﷺ) کے

متعلق ایسا غلط عقیدہ رکھتا ہے اور لوگوں کو اس عقیدہ کی تبلیغ کرتا رہتا ہے یہ نہایت سنگین جرم کا مرتکب ہو رہا ہے اور علامہ صاحب کے خیال کے مطابق یہ آپ ﷺ کی سوء ادبی بھی ہے کہ وہ ان پڑھ ہو۔ وحی کے شایان شان بھی نہیں کیا ایسے جرم کے مرتکب کو صحیح طور پر مسلمان بھی کہا جا سکتا ہے؟ معاملہ کی سنگینی کی وجہ سے کچھ تطویل ہو گئی ہے۔ ان دلائل کا جائزہ لیا جاتا ہے جو علامہ صاحب نے اپنے بے ثبوت دعویٰ کے اثبات پیش کیے ہیں۔

''ایک شخص جس نے ۲۸ سالوں تک ہزار ہا بلکہ لاکھوں روپیہ کے مال کا مختلف گھروں میں کاروبار کیا ہو جو مال اس تاجر کو نفع ونقصان کا اطمینان بخش حساب کتاب دے سکے اس کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ ان پڑھ تھا قابل اعتبار نہیں۔'' ص نمبر ۴۵ پر مذکور ہے۔ ''ایک شخص جس نے اپنی عمر کے ۲۵ سال عرب اور شام کے ایک وسیع علاقہ لاکھوں کروڑوں روپیہ کے کامیاب اور نفع بخش تجارت سے گزرے ہوں اور دور دراز کے اسفار کیے ہوں وہ شخص ان پڑھ کیسے ہو سکتا ہے؟'' افسوس! آج کل علم گھٹتا جا رہا ہے اور اندھی تقلید اور بے جا عقیدت مندی زور پکڑ رہی ہے۔ تبھی ایسے کمزور اور ناتواں دلائل ایک ثابت شدہ حقیقت کو رد کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں کیا یہ سب کچھ علامہ صاحب نے عالم بیداری میں تحریر کیا تھا یا عالم خواب میں؟ ایک جگہ لکھتے ہیں ۲۸ سال شادی مبارک کے بعد (اس طرح تو علامہ صاحب کو بھی تسلیم ہے) آپ تجارت کے لیے سفر پر نہیں نکلے، دوسری جگہ پر ۲۵ سال لکھا ہے۔ خیر ۲۸ یا ۲۵ سال۔ سلیم صاحب ذرا دماغ پر زور دے کر بتائیں کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ ۲۵ سال کی عمر مبارک میں آپ ﷺ کی شادی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی ہے اور شادی کے بعد سفر تجارت نہیں ہوا، اب اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے مثلاً ۲۵ سال تجارت میں گزارے ہیں تو دیگر الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کی والدہ محترمہ کے بطن مبارک سے باہر نکلتے ہی سفر تجارت شروع کر دیا۔ کیا یہ بات مرفوع القلم شخص کے علاوہ کوئی اور کہہ سکتا ہے کہ ایسی دلیل کی بنیاد پر ایک بے بنیاد اور غلط دعویٰ کا اثبات کیا جا سکتا ہے اگر تاریخی مواد کوئی اہمیت اور وزن نہیں رکھتا تو آپ کا شام کی طرف سفر دو یا تین بار کے علاوہ ثابت نہیں ہو سکتا ایک مرتبہ اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ شام کی طرف گئے اور اس تاریخی مواد مطابق آپ ﷺ کی عمر ۱۲ سال تھی لیکن اس وقت اس سفر کے دوران بحیرہ راہب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ بصرہ ہی سے واپس لوٹے تھے اگرچہ اس سفر اور اس ملاقات پر چند قوی اعتراضات ہیں لیکن بحث کو طول نہ دینے کی وجہ سے اس سفر کو تسلیم کیا جاتا ہے اس کے بعد ۱۵۔ ۱۶ سال بلکہ اس سے بھی کچھ سالوں کے بعد تک تجارت کے کسی سفر کا تذکرہ نہیں ملتا، ہاں بس بائیس سالوں کے بعد آپ ﷺ کو تجارت کا خیال آیا، لیکن آپ ﷺ کے پاس ذاتی اتنی رقم نہ تھی کہ کاروبار کر سکیں۔ اسی خیال ہی میں تھے کہ سیدتنا ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کو خیال آیا کہ آپ ﷺ کو مطلوبہ رقم دے کر سفر پر روانہ کریں کیونکہ

آپ ﷺ کی صداقت اور امانت عرب بھر میں مشہور و معروف تھی آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی بھی سچا اور امانتدار نہ تھا۔ اسی وجہ سے ''صادق'' اور ''امین'' کے القاب کا آپ ہی کو مستحق اور لائق سمجھا گیا۔ لہٰذا بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا آپ کی اس سچائی اور امانت داری سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کے ساتھ اپنے غلام میسرہ کو تجارت کے لیے روانہ کر دیا۔ واقعتاً اس سفر میں اور اس تجارت میں کافی نفع حاصل ہوا اور میسرہ آپ ﷺ کی امانت داری اور دیانت و سچائی و صیانت کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا جب واپسی لوٹے تو بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ نے پوری حقیقت سے انھیں آگاہ کیا اور اس حقیقت سے متاثر ہو کر بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا خود آپ ﷺ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے خواہاں اور آمادہ ہوئی اور شادی ہو گئی، اس کے بعد تجارت کے لیے کوئی بھی سفر نہیں ہوا۔ ہم اگر مزید ایک دوسرے سفر کی گنجائش نکالیں اس طرح صرف دو تین اسفار ثابت ہو رہے ہیں۔ آخر علامہ صاحب نے یہ افسانہ کس کتاب یا کون سے علمی مآخذ سے نکالا ہے کہ 25 سال آپ نے تجارت میں گزار دیئے یا بے ثبوت باتوں کے بیان کرنے کا علامہ صاحب نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ صاحب تو بے انداز تجارت کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن مجھے صرف چار پانچ اسفار بھی مستند تاریخی کتب سے دکھائے جائیں۔ ان کا کمال تصور کروں گا۔ پھر لاکھوں کروڑں روپے کی تجارت کی ''محض افسانہ'' یا تفریح مجلس میں ''داستان سرائی'' سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ کے بندے! اپنی کسی دعویٰ کا ثبوت پیش کرنے کے لیے مزاحمت تو کرتے ہو کیا علامہ صاحب کی بات وحی ہے۔ بس زبان سے نکالی آپ اور ہم خاموشی سے آمنا و صدقنا کہہ دیں؟

(ii) فرماتے ہیں ''لاکھوں کروڑوں روپے کی تجارت کا اطمینان بخش حساب دینے کا کام صرف وہی کر سکتا ہے جو لکھنے پڑھنے کا ماہر ہو'' اول تو لاکھوں کروڑوں روپیہ کی تجارت من گھڑت افسانہ ہے کیونکہ اس کے لیے کوئی بھی دلیل پیش نہیں کہ گئی (ثانیاً) جس بابرکت ہستی (ﷺ) کو اتنا قابل اعلیٰ لیاقت کا ملک سمجھ رہے ہو اس کا حافظہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیے یقیناً ہو گا کیا لکھنے پڑھنے کا علاوہ آپ نہیں بتا سکتے تھے۔ افسوس! اتنی بابرکت ہستی (ﷺ) کے متعلق آپ کے نزدیک قدر اور اندازہ بھی یہی ہے؟ میں آپ کو اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ میرے پاس اپنی گاؤں والی زمین پر دو کسان تھے، ایک محمد ابراہیم ساند جو کہ کچھ وقت پہلے فوت ہو چکا ہے اور دوسرا جھنڈو ھا جانو۔ دونوں بالکل ان پڑھ تھے لیکن حساب زبانی طور پر ہزاروں تک بتاتے رہتے تھے۔ ملک میں ہزار ہا کسان ہیں جو ان پڑھ ہیں لیکن وڈیروں کے ساتھ زبانی حساب کتاب کرتے رہتے ہیں۔ کیا بارگاہ رسالت کا حافظہ ان سے بھی کم تھا؟ کیا ان ایک یا دو اسفار کی تجارت کو اپنے حافظہ میں ذہن نشین کر کے نہیں بتا سکتے تھے؟ کیا آپ ﷺ کی مہارت اور علمی قابلیت کو ثابت کرنے والوں کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت یہی ہے؟ علاوہ ازیں اگر خواہ مخواہ آپ نے احتیاط کی خاطر کسی دوسرے سے لکھوا دیا ہو۔ باقی علامہ

صاحب کا یہ فرمان کہ ''حضور ﷺ کے ساتھ تجارت کے دوران کسی نائب کے موجود ہونے کا تذکرہ تاریخ میں مذکور نہیں'' یہ بھی تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور ہے۔ کیا عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم ہے؟

علامہ صاحب تو منطق وغیرہ میں مہارت رکھتے ہوں گے کیا یہ موٹی بات بھی سمجھ نہ سکے۔ علاوہ ازیں آپ کا یہ سفر صرف دو افراد آپ بابرکت ہستی (ﷺ) اور میسرہ پر مشتمل نہ تھا، اس وقت کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تجارتی سفر قافلوں کی صورت میں ہوتے تھے جیسا کہ خود قرآن میں ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کا ذکر ہے:

﴿ وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ﴾ [الانفال: ٤٢]

اور ان قافلوں میں مختلف ذہنیتوں اور مختلف استعدادات کے لوگ ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ بات بالکل قرین قیاس اور دل کو بھانے والی بات ہے کہ ان قافلوں میں بھی ضرور کوئی منشی ہوگا۔ اگر بقول آپ کے مکاتبت کی ہی ضرورت تھی تو آپ نے ان سے مکاتبت کر لی ہوگی۔ پھر بھی اگر علامہ صاحب کو ضد ہے کہ تاریخ میں اس کا پتہ نہیں چلتا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ تاریخی مآخذ کو علامہ صاحب تسلیم کرتے ہیں اور ان کو اہمیت دیتے ہیں، لہٰذا مہربانی فرما کر علامہ صاحب اینڈ کمپنی یہ بتائیں کہ علامہ صاحب نے یہ جو افسانہ تراشا ہے یہ کسی تاریخی مصدر میں موجود ہے؟ کسی مستند تاریخی کتاب میں اس کا تذکرہ ہے؟ ہم اگر کوئی قرینہ وعقل وقیاس کی بات پیش کریں تو علامہ صاحب ''تاریخ میں اس کا پتہ نہیں چلتا'' کا ہتھیار اٹھا کر میدان میں نکل آتے ہیں، لیکن خود اگر تخمینہ اور قیاس آرائی فرمائیں اور کوئی افسانہ تراش کر کریں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو کہ حضرت صاحب! ان ''گل افشانیوں'' کا تاریخ کے کس مصدر میں ذکر ہے۔ کیا اسی قسم کا رویہ ''خورا فضیحت دیگران را نصیحت'' کا مصداق نہیں؟ خود انصاف فرمائیں خود ہی فیصلہ کریں۔ ''ہم اگر عرض کریں تو شکایت ہوگی''

(iii) فرماتے ہیں ''اس کے علاوہ وحی کے شایانِ شان ہے کہ جو شخص ان پڑھ ہو اسے وحی اقرأ (پڑھ) کا حکم سناتے'' افسوس! مجھے معمولی فہم میں آنے والی باتوں کے متعلق بھی خامہ فرسائی کرنی پڑ رہی ہے۔ علامہ صاحب ایسی گھٹیا درجہ کی باتیں تحریر فرماتے یہ بات تعجب انگیز ہونے سے زیادہ افسوس! ہے اللہ کے بندے کوئی کتاب تو اٹھا کر آپ ﷺ کے آگے پیش تو نہیں کی گئی۔ کہ اسے پڑھنے کا امر آپ کو عجیب سا محسوس ہو رہا ہے یہاں زبانی چند آیات بتانی ہیں کہ انھیں پڑھیں۔ ہم سب مکاتب میں پڑھ کر یہاں پہنچے ہیں اپنی اولاد اور دوسروں کو پڑھایا ہے۔

استاد یا حافظ شاگرد کو کہتا ہے کہ بیٹے پڑھو: (( بسم الله الرحمن الرحيم پڑھو الحمد لله رب العالمين )) اس طرح باب اور پارہ پڑھنے سے پہلے ہی یا اس سے کچھ کم شاگرد اس سے کچھ کم یاد کر لیتا ہے، حالانکہ اس وقت استاد تو صرف ''پڑھ'' کا لفظ ہی کہتا ہے اور آگے قرآن کریم کی آیت شروع کرتا ہے اور

شاگرد یاد کرتا ہے کچھ ذہین طلبہ پہلے ہی دن سورۂ فاتحہ بلکہ مزید یاد کر لیتے ہیں بھلا اس میں کونسی استعداد ہے اور کون سی بات باعث تعجب علامہ صاحب کو نظر آئی ہے کیا تمام شاگرد جو پڑھنے آتے ہیں وہ پہلے سے پڑھ کر آتے ہیں اور اسی طرح معلم کا انھیں ''پڑھ'' کا لفظ'' کہنا بھی اسی طرح کرتا ہے۔

مجھے تو علامہ صاحب کی اس عجیب منطق سے کچھ سمجھ نہیں آئی واللہ اعلم کیا مقصد ہے؟ بلکہ یہی درحقیقت آپ کا بے نظیر معجزہ ہے کہ امتی ہونے کے باوجود ایسی بے مثال اور بے نظیر دنیا کو عاجز کرنے والی پیش کی اگر آپ ﷺ پڑھے لکھے ہوتے تو دنیا کہتی کہ یہ تو آپ کی ذہانت کی پیداوار ہے اور آپ کے دماغ کی ایجاد ہے اللہ کی طرف سے وحی نہیں ہے جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت میں گزر چکا ہے۔ اس صورت میں آپ کا اُمّی ہونا ذرہ برابر بھی آپ کی شان ''ارفع و اعلیٰ'' والی نقص کا باعث نہیں بلکہ اگر عقل اور صحیح دماغ ہے اور تعجب و بیجا حمیت سے سالم ہے تو اس سے آپ کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ اور آپ کے شرف اور قدر و منزلیں کو چار چاند لگ جاتے ہیں کیونکہ پڑھے لکھے کے کسی بھی کارنامہ میں اس کی ذہانت کو بھی دخل ہوتا ہے لیکن اُمّی ہونے کی صورت میں خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ معلم ہوئے پڑھے لکھے استاد تو دنیا کا آدمی ہی ہوتا ہے۔ مگر اس بابرکت ہستی (ﷺ) کا معلم کون ہے؟ اللہ رب العالمین سبحانہ وتعالیٰ، اب تقابل کریں۔

بین تفاوت رہ از کجاس تا بکجا! اور چہ نسبت خاک را باعالم پاک

کیا آپ کو اللہ تعالیٰ معلم کا ہونا ناپسند ہے۔ اور آپ نہیں چاہتے کہ وہ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ اور بے نیاز ہستی آپ کا معلم بنے اور اتنے اور اعلیٰ مقام سے اتار کر خواہ مخواہ دنیا کے لوگوں کو آپ کا معلم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو؟ اور کیا اس طرح تم آپ کی شان کی رفعت بیان کرتے ہو؟ کیا اُمت پر احسان کی یہی قدر شناسی ہے؟ کیا اس طرح آپ کی شان اور مقام و مرتبہ آسمان کی بلندی سے زمین کی پستی کو نہیں آپہنچا؟ کیا یہی شایان شان وحی والی ہے۔ جو علامہ صاحب قارئین کے ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں؟ آپ کی صداقت اور اللہ کے سچے رسول ہونے اور حامل وحی ہونے اور قیامت تک کی انسانیت کا رہبر ہونا، یہی واضح دلیل ہے کہ مشرف بالنبوت ہونے سے ایک دن یا ایک گھنٹے پہلے کسی بھی انسان نے زبان مبارک سے کسی مسئلہ پر بات کرتے سنا اور نہ ہی زندگی کے آمدہ مختلف مسائل کا کوئی حل پیش کیا اور نہ ہی ملک بھر میں کسی نے ایک لمحہ کے لیے معلم کی شان کا آدمی تصور کیا ہو، وہی مقدس انسان مشرف بالنبوت ہونے کے بعد معارف وحقائق کے سمندر رواں کر دے، انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق حل پیش کرے اور پوری دنیا کی راہنمائی کا تاج آپ کے سر پر رکھا جائے اور ایسا بے نظیر کلام پیش کرے کہ اس جیسا کلام پیش کرنا انسان کیا جن کے بس کی بھی بات نہ ہو کیا آپ کی ایسی شان کوئی کم ہے؟ کیا ایسا انسان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہنمائی اور اس مالک الملک کی تعلیم کے بغیر ایسا مقام حاصل کر سکتا؟ ہرگز نہیں باقی خواہ مخواہ تمھیں اگر آپ کا دنیاوی

معلم تجویز کرنے کا شوق ہے تو جی ماشاء اللہ کیجئے طبع آزمائی۔ آخر اللہ تعالیٰ کے آپ کے معلم ہونے میں کونسا استبعاد نظر آیا ہے اگر ایسا ہی ہے تو پھر بتایئے وحی کے قائل کیونکر بنے ہو اللہ کی طرف سے ایک انسان کی طرف وحی کیسے آسکتی ہے، اگر ایک انسان کی طرف اللہ کی طرف سے وحی آسکتی ہے تو اللہ کی طرف سے اس کی ایسی تعلیم کا ہونا وہ سب کچھ معلوم کرلے جو اسے پہلے معلوم نہ ہو کیسے ناممکن بات ہے۔ ان دونوں باتوں میں آخر کونسا فرق اور تفاوت ہے؟ یہاں حقیقت قرآن نے بھی بیان فرمایا ہے ملاحظہ کیجئے :

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ [يونس : ١٦]

یعنی یہ اللہ کی چاہت تھی کہ میں اللہ کی کتاب تمہارے سامنے تلاوت کر رہا ہوں ورنہ اگر اللہ کی چاہت نہ ہوتی (تو تمہاری پہچان رہتی اور تمہاری ہدایت کا کوئی سامان نہ ہوتا) کہ میں نہ اس کی کتاب تمہارے سامنے اور نہ ہی اس کے متعلق تمھیں معلومات دیتا (تم خود ہی دیکھو) کہ میں اپنی عمر کا ایک حصہ تمہارے اندر بسر کر چکا ہوں (کیا اس طویل عرصہ ۴۰ سال کے دوران کبھی تم نے مجھ سے ایسا کوئی ایک مسئلہ سنا)؟ یا میری زبان پر کبھی کتاب کا کوئی ذکر آیا؟ یعنی اگر کتاب میں نے گھڑی ہوتی تو پہلے ہی تم مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کچھ سن لیتے اور ضرور میری پہلی زندگی کے طور طریقہ میں کوئی نمایاں تبدیلی معلوم ہو جاتی ورنہ انسانی فہم کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں کہ آدمی ۴۰۔۵۰ سال خاموش بیٹھا ہو، اس طویل عرصہ بعد ایک ہی دن علم کا سمندر بہا دے اور ایسا دستور العمل پیش کرے کہ دنیا حیران رہ جائے۔ ایسی صورت صرف اس شخص کی ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ نے مشرف بالوحی کیا ہو کیا پھر بھی تمھیں عقل نہیں۔ (القرآن) اور یہ دل کو بہلانے والی بات بھی ہے کیونکہ جو خانہ ساز نبوت کے مدعی گزرے ہیں انہوں نے بھی ایک ہی رات میں نبوت کی دعویٰ نہیں کیا بلکہ آہستہ درجہ بدرجہ آگے قدم بڑھائے برصغیر پاک و ہند میں اس کی مثال مرزا قادیانی کی موجود ہے۔ پہلے علمی باتیں کرنے لگا، پھر پیری مریدی کی دکان چمکائی، پھر خود امام مہدی کہلانے لگا اور مسیح موعود آخر میں مستقل نبی کیا اس سے خانہ ساز نبوت کی ذہنیت کا منہ بولتا ثبوت نہیں ملتا؟ سچے نبی کو اس طرف خیال بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ دل میں نبوت کے بارے میں خیال تک ہی رکھتا ہے خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر نظر دوڑایئے تو معلوم ہوگا کہ ناموس اکبر (جبریل علیہ السلام) کے آنے سے قبل اس طرف کوئی خیال بھی نہ تھا بلکہ پہلی دفعہ جبریل علیہ السلام کے آنے کے بعد آپ کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے، آپ کو آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے تسلی دی کہ یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ آپ میں یہ یہ خوبیاں اور کمالات ہیں اور پھر ورقہ بن نوفل کے پاس بھی لے گئے۔ انہوں نے بھی تصدیق کی کہ آپ نبی بننے والے ہیں۔ یہ مکمل واقعہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ نبی بننے والا اخلاقی

اعتبار سے یا دیگر رہنما معاملہ کے اعتبار سے اس قوم میں عظیم درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی نبوت سے پہلے اخلاق فاضلہ، دیانت، صداقت، ایمانداری، مہمان نوازی، ضعیف و کمزور اور بیوہ کی مدد کرنا اور دیگر خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ یہ سب کمالات آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ ان اخلاقیات کے لیے نہیں کہ وہ پڑھا لکھا یا عالم ہو یا پڑھنے لکھنے میں ہوشیار اور ماہر ہو، ہمارا یہ معاملہ ہے کہ کتنے ہی بالکل ان پڑھ ایسے نیک اور اخلاق فاضلہ کے حامل ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر رشک پیدا ہوتا ہے، دوسری طرف کتنے ہی ایسے پڑھے لکھے ایسی ایسی بداعمالیوں اور اخلاقی برائیوں میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر علماء کے بارے میں سب تاثرات دل میں جنم لیتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، مطلب یہ تھا کہ قرآن خود بتا رہا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر مبارک کا بڑا حصہ اس طرح گزارا کہ زبان پاک سے کسی کتاب کا نام بھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی مسائل پر کبھی کوئی رائے پیش فرمائی تھی جس کے معارف کے بعد نبوت کے دریا بہا دیے۔ خدارا انصاف کے ساتھ بتایئے کہ پڑھے ہوئے عالم اور ہوشیار آدمی عمر کا اتنا بڑا حصہ اسی طرح گزارتے ہیں جس طرح آپ ﷺ نے گزارا؟ تو پھر پڑھے ہوئے اور حساب دانی کی مہارت کا شوشہ کس طرح چھوڑا؟ اس کے بعد ص ۷ پر خود علامہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ عرب کی مخلوق ان پڑھ تھی (پوری کی پوری نہیں تو اکثریت) لہٰذا یہ بتایئے کہ ان پڑھوں میں کونسے اور کتنے ایسے فضلاء تھے جن سے آپ نبوت پہلے استفادہ کر کے لکھنے پڑھنے کے ہوشیار بنے؟ کیا اس طرح کی تضاد بیانی علامہ صاحب کو زیب دیتی ہے؟ یعنی عرب کے لوگ تو ان پڑھ البتہ اسی خاندان ایک فرد جو اسی معاشرہ میں رہتا ہے۔ وہ عالم فاضل کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کا کسی تعلیمی درسگاہ میں داخل ہونا تو ثابت نہیں اور نہ دور دراز سفر اختیار کر کے کسی فاضل کے ہاں جا کر تعلیم حاصل کی پھر ایسے ان پڑھوں کے ماحول میں کونسا فاضل تھا جس کے پاس پڑھ کر لکھنے پڑھنے کے ماہر بنے؟ جتنا غور اور تحقیق کی جاتی ہے اتنا علامہ صاحب کی دعویٰ غلط اور بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔

(iv) علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''اس کے علاوہ مختلف ممالک کی زبانوں سے کافی واقفیت اور ان ممالک کے باسیوں کی رسوم و عادات جانتے تھے۔ ایسا شخص ہر کسی ملک کے تاجروں سے مل کر اپنے تجارتی مال کی فروخت کرنے کی پوری معلومات حاصل کرتا ہوگا وغیرہ وغیرہ'' یہ جو لکھا ہے یہ سب اسی مفروضہ کی بنیاد پر کہ آپ ﷺ کئی سال تجارت میں صرف کیے۔ حالانکہ اوپر عرض کیا گیا کہ ایسے تجارتی اسفار 4-5 بھی علامہ صاحب تاریخی حوالاجات سے پیش کرتے ہیں لہٰذا اسی پر بنیاد رکھا گیا ہے جو کہ غلط ہے باقی رہی زبانوں کی بات سو آپ کا سفر شام کی طرف ہوا تھا وہاں کی زبان عربی تھی جو کہ آج بھی عربی ہے دیگر آخر کن ممالک کی طرف آپ نے سفر کیے کہ وہاں کی زبانیں بھی سیکھ کر ماہر ہوگئے، خدارا کوئی دلیل اور ثبوت تاریخی مصادر میں سے تلاش کر کے پیش کیا جاتا۔ صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں سیدنا زید بن

ثابت رضی اللہ عنہ کو امر فرمایا کہ آپ جا کر یہودیوں کی زبان اور ان کی زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھیں کہ ہمیں خطوط و کتابت میں وقت پیش آتی ہے ان کی طرف لکھنا پڑتا ہے یا ان کے خطوط آتے ہیں وہ پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ان زبان جاننے والا ہو۔ تو آپ یہ کام کریں۔ وہ صحابی بہت کم عرصہ میں ان یہودیوں کی زبان سیکھ آیا اگر آپ کتنی ہی زبانوں کے واقف تھے تو پھر یہودیوں کی زبان ضرور جانتے ہوتے۔ کیونکہ یہودی عرب میں بہت رہا کرتے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو زبان سیکھنے کا حکم کیوں فرماتے؟ آپ خود وہ زبانیں جانتے ہوئے اور خط و کتابت بھی خود ہی کر سکتے؟

(v) آگے لکھتے ہیں ''کہ جو پیغام اس عظیم الشان شخص کے ذہن میں کئی سالوں سے غور اور فکر کے بعد آیا کہ انسان کے لیے قلم ایک بہترین ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے انسان ذات کو علم سے مالا مال کیا جا سکتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس طرح سوچنے والا شخص ان پڑھ ہو سکتا ہے؟ ص ۷ کے اخیر اور ص ۸ کی ابتدا سلیم صاحب سمجھیں علامہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ یعنی قلم کی یہ فضیلت سالوں کے غور و فکر کا نتیجہ تھی گویا یہ بیان وحی نے نہیں بتایا بلکہ انہی کے غور فکر کا نتیجہ ہے، حالانکہ اس سے تھوڑا پہلے یہ لکھ کر آتے ہیں کہ پہلی وحی میں قلم کی فضیلت و برتری مذکور ہے۔ کیا اس سے ہم یہ مطلب نکالیں کہ وحی کوئی خاص شے اللہ تعالیٰ کی طرف روح الامین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں آئی بلکہ وحی وہی خیال تھا جو آپ کے ذہن مبارک میں سالوں کے غور فکر کر کے بعد پیدا ہوئی اس طرح تو نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی وغیرہ سب باتیں ختم ہو گئی گویا دبے الفاظ میں علامہ صاحب نے ان اعداء دین کی تصدیق کی ہے کہ جو قرآن کریم کو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ گویا علامہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ہونے کی دعویٰ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ ''نقل کفر کفر نباشد'' محض ایک ڈھونگ تھا کہ اپنی قیادت کے لیے رچایا گیا۔ استغفر اللہ!

حیرت ہے اپنی طرف سے غور و غوض کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ذہنی خیال کو وحی قرار دے کر پھر نتیجہ بھی خود ہی نکالتا ہے کہ اس طرح سوچنے والا شخص امی کیسے ہو سکتا ہے' ماشاء اللہ نظر بد دور کتنی مظبوط دلیل ہے' یہ علامہ صاحب کی ذہنیت بھی عجیب ہے کہ مدعی بھی خود گواہ بھی خود اور آخر میں جج بن کر خود ہی فیصلہ کر دیا۔

(لطیفہ) کہتے ہیں ایک آخوند جس کا نام صمد تھا مسجد کے قریب رہتا تھا اور امامت بھی کرواتا تھا اس کے گھر کے قریب کسی کسان کی گنے کی فصل تھی، ایک مرتبہ میاں آخوند کو کوئی خیال آیا۔ گنے کی فصل میں جا نکلا اندر جا کر کہنے لگا السلام علیکم میں پھر خود نے ہی جواب دیا وعلیکم السلام آخوند پھر کہنے لگا کوئی ایک چھڑی گنے کی توڑ لوں، خود ہی کہنے لگا ایک کیوں چار توڑ، اس طرح آخوند باقاعدہ اپنا کام شروع کر دیا، پھر ہر روز آتا گنے کی کئی چھڑیاں توڑ جاتا کسان بھی بھانپ گیا کہ یہ کوئی چکر ہے جو دن بدن گنا کم ہوتا جا رہا ہے بالآخر کسان بھی

چھپ چھپا کر بیٹھ گیا، آخوند صاحب بھی حسب معمول اپنے کام پہ آ گیا سلام کلام کے بعد کہنے لگا گنے کی اتنی اتنی چھڑیاں توڑ وں؟ پھر خود ہی کہنے لگا جتنی چاہو توڑ ڈالو۔ اس ارادے سے ابھی ایک آدھ توڑی ہی تھی کہ کسان جو سب کچھ سن رہا تھا نکل آیا پھر کیا تھا اس نے آتے ہی آخوند کی پگڑی اتار کر اس کے گلے میں ڈالی اور آخوند کو گھسیٹنے لگا، گھسیٹتے ہوئے قریب دریا کے کنارے لے آیا دریا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا السلام علیکم دریا لہری خود ہی جواب دیا کر و علیکم السلام کسان قہری پھر کہنے لگا آخوند کو ایک دو غوطے دوں خود ہی جواب دیا ایک کیوں چار غوطے دو بس پھر کھینچ کر دریا میں ڈالا ایک دو غوطے دے کر اوپر نکالتا پھر غوطہ دیتا الغرض! اس نے آخوند کے ساتھ وہ کی جو بیان سے باہر ہے۔ بڑی مشکل سے آخوند نے جان چھڑائی اسی طرح علامہ صاحب مدعی ہیں کہ آپ ﷺ پڑھے لکھے تھے، پھر گواہ پیش کیا کہ سالہا سال کے غور وفکر کے بعد یہ عظیم الشان خیال پیدا ہوا گویا کہ گواہ بھی خود کیونکہ یہ دلیل خود ہی کی ''اعلیٰ ذہنیت'' کی اختراع ہے۔ اس لیے کہ یہ قطعاً غلط اور بری بات ہے کہ یہ آپ ہی کا خیال تھا جو سالہا سال کے غور وفکر کے بعد آپ کو حاصل ہوا آپ کا تو اس طرف خیال بھی نہ تھا اور نہ ہی ان باتوں سے واقف تھے ورنہ اتنا طویل عرصہ بعد اتنی اعلیٰ قابلیت اور علمیت کو چھپا بیٹھے تھے؟ کیونکہ اتنی طویل مدت میں کبھی اس بارے میں کوئی لفظ ادا بھی نہ کیا؟ کیا جو اس نہج سوچتے ہیں وہ ایسے ہی خاموش بیٹھے رہتے ہیں؟ کیا علامہ صاحب کا انسانی زندگی کے متعلق اتنا مطالعہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اتنا عرصہ آپ اس کے متعلق سوچتے رہے اس کا تاریخی ثبوت۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی مرتبہ وحی نے آ کر اس سب سے آگاہ کیا اور یہ علم بے نظیر ہے۔ ساری دنیا قیامت تک آپ کی رہنمائی محتاج ہوئی اور آپ کو ثقلین جن وانس کی امامت سپرد کی گئی بہر حال دلیل بھی سراسر غلط اور پھر......؟ یہ غیر معتمد گواہ پیش کر کے نتیجہ نکالنا کہ ایسا شخص امی کیسے ہو سکتا ہے؟ (یعنی نہیں ہو سکتا)۔

اگر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواھد شد!

(vi) ص ۸ ''کہ وہ بھی اس پیغام پر غور کرے جو آپ کو ۴۰ سال اور ۷ ماہ کے غور وفکر کے بعد ملا'' کیا آپ ﷺ نے پیدا ہوتے ہی غور وفکر شروع کر دیا تھا؟ کہ چالیس سال تک غور فکر کرتے رہے حتیٰ کہ ۴۰ سال ۷ ماہ کو پیغام الٰہی پہنچا۔ علامہ صاحب جیسا ایسی فاش غلطیاں کرے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ واللہ اعلم

(vii) ص ۴۰ ''اس سے ظاہر ہوتا ہے قرآن حضور کے ذہن پر نازل ہوا اور اس کے وحی ہونے میں ذہن اور عقل کو بڑا دخل تھا''

① ''دوسری جگہ آیا ہے:

﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴾ [الحاقة : ٤٠]

یعنی درحقیقت قرآن رسول کریم ﷺ کا قول ہے''

④ کسی شاعر یا جادوگر کا قول نہیں ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے وحی ہونے میں آپ کی اپنی زبان مبارک سے کہنے میں بھی بڑا دخل ہے۔“

⑤ ”ایسے حالات میں حضور ﷺ کو 'امی' سمجھنا بڑی نادانی ہے۔“

یہ فقرہ واضح طور پر دلالت کررہا ہے کہ قرآن کے وحی ہونے میں آپ کا دخل، یعنی یہ آپ کے اعلیٰ ذہن اور سوچ کا نتیجہ تھا کہ قرآن وحی ہو گیا گویا کہ قرآن آپ کے ہی ذہن کی پیداوار ہے اور اسی کی کارستانی ہے ورنہ یہ وحی بھی نہ ہوتا (انا للہ وانا الیہ راجعون) علامہ صاحب نے تو نبوت ورسالت کا کام ہی تمام کردیا کہ قرآن حضور ﷺ کے ذہن کی پیداوار ہے اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ (یہ اللہ کی طرف سے وحی ہے) یہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جھوٹ تھا افسوس جو کام اسلام کے دشمن نہ کرسکے وہ کام مسلمانوں کے ایک علامہ نے دو لفظوں میں ادا کردیا۔ ایسا تو ہے کہ اس وحی کو سمجھنے کی صلاحیت واستعداد اللہ تعالیٰ عطا فرمائی تھی لیکن یہ کہنا کہ وحی کے وحی ہونے میں آپ کے ذہن کو دخل تھا، ایک بہت ہی سنگین بہتان ہے۔ جو علامہ صاحب نے بارگاہ رسالت پر باندھا ہے کیا اتنی موٹی بات بھی آپ کی سمجھ میں نہ آئی؟ علامہ صاحب نے قرآن کی آیت:

﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴾ [الحاقة : ٤٠]

کو اپنے بے بنیاد اور غلط مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ کیا علامہ صاحب کی عربی دانی کا مبلغ علم بھی یہ ہے کہ کلام اور قول میں فرق بھی نہیں کیا اگر واقعتاً عربی سے اس قدر ناواقف تھے تو قرآن جیسی فصیح وبلیغ کتاب پر لب کشائی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر معلوم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر اس کا معنی ومطلب غلط بیان کی تو یہ علمی خیانت اور قرآن کی تحریف معلوم ہوئی۔

فان کنت تدری فتلك مصیبة     وان کنت لاتدری فالمصیبة اعظم

درحقیقت عربی زبان میں لفظ قول عام ہے کسی شخص کے اپنے الفاظ کو بھی قول کہا جاسکتا ہے اور کسی دوسرے کے الفاظ کوئی دوسرے تک پہنچائے تو اسے بھی اس ناقل کا قول کہا جاتا ہے۔ یہاں البتہ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ فلاں کا کلام ہے تو وہ الفاظ ومعانی دونوں اسی کے ہوں گے جس کے بارہ میں کہا جائے گا مثلاً آپ شاہ عبداللطیف کے اشعار میں سے کوئی شعر پڑھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلیم صاحب فلاں موقع پر فلاں شعر کہا (اور کہا لفظ ”قال“ کا ترجمہ ہے) تو ہمارا یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا اگر کلام کا لفظ استعمال کریں تو اسے صرف صاحب کلام کی طرف منسوب کیا جائے گا، یعنی یہ کہا جائے گا کہ یہ شاہ عبداللطیف کا کلام ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ سلیم صاحب کا کلام ہے بالکل غلط ہوگا دوسری مثال آپ کسی مقرر کی تقریر کا کوئی اقتباس یاد کرکے کسی مجلس میں پیش کریں یا کسی کتاب کی عبارت من وعن نقل کریں اب سننے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سلیم صاحب نے فلاں مجلس میں یہ کہا یا آپ کا یہ کہنا تھا۔ سننے والوں کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے لفظ ”قول“ ایک دوسرے مفید معنی

میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً ایک مقرر تقریر کر رہا ہے اور لیکچر میں کتنی ہی کتب کے اقتباسات پیش کرتا ہے۔ کتنے ہی فضلاء وحکماء کے کلمات پیش کرتا ہے۔ پھر جو اہل علم ہوتے ہیں وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس تقریر میں کونسا اس مقرر کا اپنا کلام اور کونسا دوسروں کا نقل تھا (کیونکہ ہر وقت اور ہر جگہ اصل مصنف کا نام تقریر میں نہیں لیا جاتا بسا اوقات اس کا نام ذہن میں نہیں ہوتا۔ کتاب کا نام زیادہ عرصہ گزرنے کی وجہ سے ذہن سے نکل جاتا ہے) لیکن جو ناواقف ہوتے ہیں جن کو معلوم نہیں ہوتا کہ مقرر کی تقریر کا فلاں کا کلام ہے تو یہ غلطی ہوگی لہٰذا اس غلطی سے بچنے کے لیے یہ کس فلاں مقرر نے یہ کہا یا اس کا کہنا یہ تھا تو یہ صحیح ہے کیونکہ کہنا (قول) دونوں صورتوں کو شامل ہے یعنی لفظ قول ایسی غلط نسبت سے بچنے کا سبب ہے۔ میں نے اس تنقید میں موقع محل کی مناسبت سے کتنے ہی اشعار لائے ہیں لیکن بنانے والوں کا نام نہیں لیا لہٰذا اگر کوئی کہے کہ محبّ اللہ نے اس تنقید میں یہ یہ کہے ہیں تو یہ ہرگز غلط نہ ہوگا ہم عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اشعار کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں لیتا کہ یہ اشعار اس کے خود کے ہیں بلکہ خود کیے ہوں یا دوسروں کے اس لفظ میں (کہہ رہا ہے) میں کوئی بھی خرابی نہیں لیکن لفظ ''کلام'' میں ایسا نہیں بلکہ اس کا اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں مضمون اور الفاظ کہنے والے کے ہوں اگر ہم کہیں کہ یہ شاہ صاحب کا کلام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قالب اور مافیہ الفاظ اور اس کے معانی میں شاہ صاحب کے ہی ہیں ایسے تو اس لفظ (شاہ صاحب کا کلام) سے کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ اس کے معانی تو شاہ صاحب کے ہیں الفاظ کسی دوسرے کے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''قول'' اور ''کلام'' کا فرق اچھی طرح آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا باقی کلام نفسی اور لفظی تفریق بعد کی پیداوار ہے جو معتزلہ نے اپنے بدعتی عقائد اور غلط تصورات کو زبردستی ثابت کرنے کے لیے گھڑے تھے جو واقعات و محاورات سے بھی متفق نہیں اگر اپنے دل میں چند خیالات وتصورات رکھے بیٹھے ہوں تو کیا ہمارا کہنا درست ہو گا کہ ''سلیم صاحب باتیں کر رہے ہیں'' بلکہ یہ کہنا تب ہی درست ہوسکتا ہے جب آپ اپنے مافی الضمیر کے معانی کو ٹھوس الفاظ کے قالب میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کریں گے۔ اب اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد قرآن کریم کو سمجھیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یعنی معانی، مضمون یا اور الفاظ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہیں قرآن مجید کو کسی دوسرے کا کلام سمجھنا غلط بلکہ کفر ہے قرآن حکیم میں خود قرآن کریم کو ''کلام اللہ'' کے الفاظ آئے ہیں۔

﴿ وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰی یَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [التوبہ: ٦]

﴿ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا كَلٰمَ اللّٰهِ ﴾ [الفتح: ١٥]

وغیرہ لہٰذا قرآن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے ہاں یہ کلام جبریل روح الامین نے اللہ تعالیٰ سے سن کر محمد ﷺ تک پہنچایا اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل علیہ السلام سے اخذ فرما کر امت تک پہنچایا، لہٰذا یہ (قرآن کریم)

جبریل علیہ السلام کا بھی (باعتبار تبلیغ) قول ہوا جیسا کہ سورہ تکویر پ ۳۰ میں واضح طور پر جبریل علیہ السلام کا قول کہا گیا ہے اس جگہ محمد ﷺ کا قول کہنا قطعاً صحیح نہیں۔

آپ خود سیاق سباق کو نظر میں رکھ کر فیصلہ کریں۔ لہٰذا علامہ صاحب کے مطابق جبریل علیہ السلام کی زبان کو بھی دخل تھا تو اسے صرف محمد ﷺ کی زبان مبارک کا دخل سمجھنا صحیح نہ ہوا۔ باقی سورۃ الحاقہ پ ۲۹ اگر چہ:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴾ [الحاقة : ٤٠]

جبریل علیہ السلام کا مراد ہونا ہی صحیح ہے تاہم، علامہ صاحب اس نے نبی علیہ السلام مراد لیں تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ قرآن آپ کا قول باعتبار تبلیغ الی الامۃ ہے جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے، پھر علامہ صاحب کا اس سے یہ مراد لینا کہ یہ آپ کا قول اس لیے ہے کہ اس میں آپ کی زبان کو دخل ہے محض سینہ زوری اور اللہ کے کلام پر گمراہ کن جسارت ہے۔ علامہ صاحب کی عبارت کا وہ حصہ جس پر نمبر ۳ لگایا گیا ہے وہ صاف طور پر بتلایا ہے کہ قرآن وحی اس اعتبار سے ہے کہ اس کا مضمون اللہ کی طرف سے جبریل علیہ السلام کے قلب اطہر پر نازل ہو۔ باقی اسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنا اس میں آپ کی زبان کو دخل۔ اسی لیے

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴾ [الحاقة : ٤٠]

نقل کر کے اپنے مفروضہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ مضمون کے بارے میں علامہ صاحب نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ ''یہ سال ہا سال کے غور و فکر کا نتیجہ تھا'' جیسا کہ ص ۶ پر تحریر کیا ہے علامہ صاحب کے اس دعویٰ کے مطابق قرآن کریم اللہ کا کلام نہ رہا بلکہ یہ رسول اکرم ﷺ کا کلام ہوا حالانکہ یہ دعویٰ قطعاً غلط اور ضلالت ہے اور سخافت سے پر ہے۔ اس سے پہلے قرآن حکیم کی دو آیات پیش کی جا چکی ہیں۔ مزید ملاحظہ فرمائیں:

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة : ٧٥]

ان آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اگر علامہ صاحب کی بات کو لیا جائے تو قرآن آپ ﷺ کا کلام ہوگا اور قرآن کی تکذیب لازم آئے گی۔

ثانیاً: قرآن میں کتنے مقامات پر کفار عرب کو مقابلہ کا چیلنج دیا گیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تمھیں یقین نہیں آتا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بلکہ اسے تم محمد ﷺ کی تصنیف سمجھتے ہو تو تم اس جیسی کوئی ایک سورت بنا کر دکھاؤ صاف ظاہر ہے کہ محمد ﷺ کتنے ہی قابل ہوں اور زبان کے کتنے ماہر ہوں بالآخر ہیں تو انسان اور انسان کی بنائی ہوئی چیز کا دوسرا انسان مقابلہ کر سکتا ہے اور اس جیسی چیز ایجاد کر سکتا ہے، لہٰذا اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو وہ عرب جو دشمنی میں ہر طرح کی کوششیں اسلام کی تحریک کو ختم کرنے کے لیے عمل میں

لاتے وہ اس قسم کا جو (نسبتاً آسان طریقہ تھا اس لیے کہ زبان دانی پر انھیں ناز تھا اور زبانی اشعار وغیرہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ ان کا معمول تھا) چیلنج کیسے نہ قبول کرتے اگر یہ کلام آپ ﷺ کا ہی نہیں بلکہ اللہ رب العالمین سبحانہ وتعالیٰ کا ہو تو اس کا مقابلہ کرنے کی ہمت ان میں کہاں سے آئی اور وہ چیلنج قبول کرنے کا انھیں دم کہاں تھا۔

ثالثاً: قرآن میں دنیا بھر کے انسانوں اور جنوں کو بھی چیلنج دیا گیا ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ [بنی اسرائیل: ۸۸]

دنیا میں کتنے ہی نظم ونثر کے ماہر فصاحت و بلاغت میں بلند مقام پر فائز گزرے ہیں، مگر کسی نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا کہ میرے جیسا کلام کوئی دوسرا لانے سے قاصر ہے کیا کوئی انسان اعلیٰ درجہ کی قابلیت اور لسانی مہارت کے باوجود دنیائے کائنات کے جنوں اور انسانوں کو اتنا بڑا چیلنج کر سکتا ہے؟ کتنے ہی علماء، فضلاء، خطباء، شعراء گزرے ہیں لیکن کسی کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ اس جیسا کلام کسی نے بھی نہیں بنایا اور نہ ہی بنا سکتا ہے بلکہ بڑے بڑے شعراء، خطباء کے کلام سے نقاد کتنی ہی غلطیوں، فنی اور زبانی خامیوں اور خرابیوں کی مثالیں پیش کرتے رہے ہیں۔ مگر قرآن کریم کا اعلان اپنی جگہ اٹل حقیقت بنا ہوا ہے اعداء ان کی سازشوں، الزامات اور تہمات کے کئی طوفان آئے مگر اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کو کوئی ہلا نہ سکا۔ عربی ایک زندہ زبان ہے جس کے ناطق صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کتنے ہی یہود ونصاریٰ کی مادری زبان عربی ہے۔ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت ہے اور ان کی زبان عربی بلکہ پوری دنیا میں بے شمار غیر مسلم عربی دان ہیں بلکہ کچھ عیسائی عربی زبان پر ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر درس نظامی کے تحصیل یافتہ کو بھی ایسی مہارت حاصل نہیں ہے۔ ان کی عربی لغت اور عربی ادب پر بے شمار کتب موجود ہیں مختلف فنون پر ان کی عربی میں تصانیف موجود ہیں ایک عیسائی مصنف کی کتاب ''دائرۃ المعارف'' عربی زبان گیارہ جلدوں میں موجود ہے۔ آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کتنا بڑا علم اس میں جمع کیا ہے کہ ایک عیسائی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں قرآن کا یہ چیلنج قبول کرتا ہوں اور اس جیسا کلام بنا کر دکھاتا ہوں عالم اسلام کے خلاف دوسری سازشوں میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے لیکن اس اعلان زبانی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا کسی انسان کی وسعت میں یہ بات تھی یا اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ ایسا کلام پیش کر سکتا یا ایسا اعلان پوری دنیا کو پیش کر کے انھیں عاجز کر دے؟ رسول اکرم ﷺ کا کلام صحیح احادیث میں موجود ہے اگرچہ وہ بھی جوامع الکلم میں سے ہے اور فصاحت و بلاغت سے پر ہے لیکن جب اس کا قرآن سے تقابل کیا جاتا ہے تو زمین آسمان کا تفاوت نظر آتا ہے۔ آخر قرآن اور قولی احادیث میں اتنا تفاوت کیوں ہے؟ غور کرو کہ قرآن جیسی بے نظیر شاہکار پیش

کرنے والا اپنے دوسرے کلام میں اتنا تفاوت کیوں رکھتا؟ حقیقت میں ایک شخص اپنے کلام میں اتنا تفاوت نہیں رکھ سکے۔ لیکن اگر تسلیم کیا جائے کہ کوئی شخص تھا جس نے اپنے کلام میں اتنا بڑا تفاوت رکھا تو لازم یہ سوال سامنے آئے گا کہ آخر اتنا بڑا تفاوت رکھنے کی ضرورت پیش کیوں آئی؟ نبی اکرم ﷺ کے متعلق اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ آپ نے دانستہ طور پر دونوں میں تفاوت رکھا ہے تو مذکورہ سوال پیدا ہوگا اور اس سوال کا جواب سوائے اس کے کوئی نہیں کہ یہ تفاوت اس لیے رکھا کہ یہ (قرآن) اللہ کا کلام سمجھا جائے اور دوسرا اپنا کلام لیکن یہ جواب ایک ملحد کافر اور آپ کی نبوت کا منکر ہی دے سکتا ہے اور ایک مسلمان کے لیے اس قسم کا تصور ہی مشکل ہے، لیکن علامہ صاحب کی ہمت طرازی پر مذکورہ سوال لازم آتا ہے اور اس کا جواب بھی اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہوسکتا آپ کہہ سکتے ہیں کہ احادیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الفاظ ہیں آپ ﷺ کے نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ کچھ احایث آپ کے ارشاد مبارک کو اپنے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے، تاہم ایسی احادیث کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جن میں آپ کے الفاظ مبارک کو پیش کیا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو آپ سے محبت تھی آپ کی جو عزت و احترام ان کی دلوں میں تھی اس نے ہر نقل حرکت ہی قول و فعل ہی فرمان و ارشاد کو محفوظ رکھنے پر مجبور کیا اور انہوں نے واقعتاً آپ کے ہر قول فعل کو محفوظ کیا، ذہنی اعتبار سے خواہ عملی اعتبار سے اگر صحابہ کرام کے حافظہ پر آپ کو اعتبار نہیں تو قرآن کے حفظ کے بارے میں انہیں کیسے اعتبار کرتے ہو؟ کیونکہ قرآن کریم بھی تو صحابہ کرام کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے اگر کہو گے کہ قرآن کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تو یہی جواب احادیث کے بارے میں بھی ہے صحابہ میں سے کتنے ہی ایسے تھے جو آپ کے فرمودات قلمبند کرتے جاتے تھے جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ کچھ نے تو آپ سے فرمودات لکھ دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر ایک صحابی ابوشاہ رضی اللہ عنہ نے تو آپ نے فرمایا کہ: "اکتبوا لابی شاہ" ابوشاہ کو لکھ کر دو (صحیح البخاری) بہر حال اللہ نے اپنے کامل مکمل دین کی حفاظت کرنی تھی۔ اسی لیے قرآن کے ساتھ آپ کے ارشادات گرامی احادیث کی بھی (جو قرآن کی تشریح و بیان اور تفصیل ہے) حفاظت کی ورنہ قرآن کی تشریح کے محفوظ رہنے کے سوا صرف قرآن کی حفاظت فائدہ مند نہ تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے "ذکر" کے نزول اور حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹]

یہ اس لیے کہ لفظ ذکر مکمل دین کو شامل ہے، یعنی قرآن و حدیث دونوں اس میں آجاتے ہیں، اگر ان سب باتوں سے اغماض بھی کیا جائے تو بھی یہ سوال ہر حال میں پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کلام آپ کا تھا تو آپ نے اس کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کی، دنیا کو اس کتاب کا تعارف "کلام اللہ" سے کیوں کرایا کیا یہ جھوٹ نہیں؟ افسوس! بارگاہ رسالت علمی قابلیت اور اعلیٰ لیاقت کے بیان کے لیے آپ کی عزت و احترام کو بھی نظر

انداز کر دیا گیا اور اس سے آپ کی صداقت و امانت، دیانت اولوا العزمی بھی مجروح ہو رہی ہیں۔ مگر ان کو کوئی بھی اہمیت اور وزن نہیں دیا گیا، کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی دوسرا علم و انصاف کا خون تصور میں آسکتا ہے؟ خلاصہ کلام یہ کہ علامہ صاحب کے اس اقتباس سے ان اسلام دشمنوں کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے جو قرآن کو آپ ﷺ کی تصنیف سمجھتے ہیں کیونکہ علامہ صاحب کے ظن اور رائے کے مطابق الفاظ تو آپ ﷺ کے ہیں باقی رہا مضمون جو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے وہ علامہ صاحب کے خیال میں جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے قلب (علامہ قلب کے معنی ذہن کرتے ہیں) پر نازل کیا، مگر ان الفاظ یا مضمون کے مضمرات میں طویل عرصہ کے سوچ و بچار کو بڑا دخل تھا لہٰذا نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ قرآنی الفاظ میں جو مضامین پوشیدہ ہیں ان میں بھی کچھ تو آپ کے طویل غور و فکر کا نتیجہ میں باقی اللہ کی طرف سے وحی لیکن اس اسٹیج پر پہنچنے کے بعد کوئی ملحد یہ کہہ سکتا ہے جس قابل اور اعلیٰ استعداد کے انسان نے قرآن جیسی بے نظیر پیش کش کی ہے، کیا اس میں لیاقت نہ تھی کہ ان الفاظ پر شاندار مضامین بھی اپنی طرف سے مضمن رکھتے؟ یہاں یقیناً رکھ سکتے تھے لہٰذا قرآن کے الفاظ اور ان کے مضامین اور ہدایت کے جو بے مثل اصول پیش کیے گئے ہیں وہ بھی آپ ﷺ کی اپنی ذہانت کا نتیجہ ہیں۔ باقی ''اللہ کی طرف سے'' ''اللہ کا کلام'' یا وحی الٰہی'' یہ سب محض خاکی بدن اپنے آپ کو اللہ کا نمائندہ ظاہر کرنے کے لیے کہے گئے ہیں۔ اللہ اکبر! علامہ صاحب نے تو نبوت و رسالت کا کام ہی تمام کر دیا آپ کو یہ الفاظ گو بھاری محسوس ہو رہے ہوں گے لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ علامہ صاحب جیسے ہزاروں انسان اس بابرکت ہستی رحمۃ للعالمین خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی ناموس پر قربان ہیں (بہر کیف) علامہ صاحب نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پڑھے لکھے ہونے کے اثبات کے لیے جو دلائل دیے ہیں ان میں کتنا وزن ہے وہ کس قدر وقیع اور دعویٰ یا مفروضہ کے مثبت ہیں وہ آپ معلوم کر چکے ہیں اور اس تحریر کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بھی ہم عرض کر چکے ہیں اب فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ علامہ صاحب کی یہ تحریر ''پیغام ہدایت'' یا ''اوہام ضلالت''، لیکن میں بھی اتنا عرض کر دوں کہ اگر یہ ہدایت ہے تو پھر ضلالت کا لفظ عربی ڈکشنری سے ہی نکال دیجیے گا، کیونکہ پھر ضلالت کا کوئی وجود ہی نہیں۔ واللہ اعلم

(۳) صفحہ ۹ کے آخر میں لکھا ہے:

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ [البقرہ: ۹۷]

کا معنی ہے جو آپ کے آگے ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ گذشتہ صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے اس لیے گذشتہ صحیفے تو محرف ہو چکے تھے اور ان ناقص صحیفوں کی تصدیق سے کوئی مطلب نہیں نکلتا ﴿ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ کا معنی ہے ''جو آگے ہیں'' یہ معنی نہیں کہ ''گذشتہ وقت کے'' اس بھی گذشتہ صحیفوں کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو صحیفہ...... کائنات آپ کے سامنے ہے اس کی تصدیق

کرتا ہے اس جگہ علامہ صاحب نے قرآن کی جن دیگر تصریحات کو نظر انداز کیا ہے چند آیتیں ملاحظہ کیجیے:

① ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ [البقرہ: ۲۸۵]

② ﴿ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ [النساء: ۱۳۶]

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ایمان والے اللہ پر ملائکہ پر اللہ کی کتابوں پر اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ اسی طرح دوسری آیت کریمہ میں ہے جو اللہ کے ملائکہ اللہ کی کتابوں، اللہ کے رسول اور قیامت کو نہیں مانتے وہ بڑی بعید کی گمراہی میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں پہلے صحیفے مراد ہیں کیونکہ اگر اللہ کی منشاء صحیفہ فطرت ہوتی تو وہ کتاب مفرد کے صیغہ سے فرماتی نہ کہ جمع کے صیغہ سے اور تصدیق وایمان میں کوئی فرق نہیں علاوہ ازیں "کتبہ" کے ساتھ "رسلہ" کہ الفاظ بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، یعنی جس طرح "رسلہ" سے مراد تمام اللہ کے رسول ہیں اسی طرح "کتبہ" سے مراد بھی تمام آسمانی صحیفے ہیں، یعنی پہلے صحیفوں سے آخری صحیفہ (قرآن کریم) تک ورنہ پہلے صحیفے محرف ہونے کی وجہ سے تصدیق سے مانع قرآنی ہیں تو گذشتہ رسولوں کا دور بھی ختم ہو چکا ہے ان کی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں اب صرف قرآنی شریعتیں باقی ہے۔ پھر کیوں قرآن گذشتہ انبیاء ورسل علیہم الصلوۃ والسلام پر ایمان لانے کا زور دے رہا ہے، بلکہ رسولوں پر ایمان کے اعتبار سے فرق کرنے (کسی کو ماننے کسی کو نہ ماننے) کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴾

[النساء: ۱۵۰۔۱۵۱]

''اگر کہو گے کہ رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ سب سچے اور برحق تھے اور اپنے اپنے وقت میں اپنی امتوں کو اللہ کا پیغام اللہ کا سچا پیغام پہنچایا اور ان پر جو نازل ہوا وہ اللہ کی طرف سے اور حق تھا تو کتابوں کی تصدیق کی بعینہ یہی معنی ہے کہ گذشتہ کتب اپنے اپنے وقت میں برحق تھیں اور اللہ کی طرف سے وحی اور آسمانی ہدایت تھیں (اگرچہ وہ بعد میں محرف ہوگئیں کیونکہ وہ ہمیشہ کے لیے نازل نہیں ہوتی تھیں) اس تصدیق میں کون سی خرابی ہے؟ علامہ صاحب کی یہ عجیب بات ستم ظریفی کسی لفظ کی مثلاً، قول، تصدیق، وغیرہ کی اپنی خیالی رائے سے ایک معنی متعین کر کے اعتراض کر دیتے ہیں اور اپنے مزعومہ اور فرضی دعویٰ کی دلیل لیتے ہیں۔ اس کا نام تحقیق ہرگز نہیں رکھا جاسکتا اسے Pychalogical exhibitionsum کا نام دیا جا سکتا ہے

درحقیقت قرآن جو تمام رسل اور انبیاء کرام اور تمام صحف پر ایمان اور ان کی تصدیق پر زور دیتا ہے، اس لیے کہ وہ تمام ایک ہی دین لے کر آئے (ایمان اور عمل صالح) اس طرح نبوت کا پورا سلسلہ جڑی ہوئی زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہے ان میں سے ایک کڑی بھی جدا نہیں کرتی ورنہ منقطع ہو جائے گا سلسلہ نبوت کی پہلی کڑی سیدنا آدم علیہ السلام تھے اور آخری کڑی تاجدار نبوت خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہے اسی طرح تمام صحف صحف ابراہیم تورات وانجیل وزبور وغیرھا سے لے کر قرآن کریم (آخری کتاب) تک ایک منبع اور سرچشمہ سے آئے ہوئے ہیں وہ سرچشمہ ہے اللہ کا علم اس لیے تصدیق کرتی ہے تو سب کی کرتی ہے نہ کہ صرف کسی ایک کی مثلاً کوئی دس آدمی ہیں وہ سب ایک بات کرتے ہیں اور انھیں کوئی اختلاف بھی نہیں تو اس صورت میں تصدیق کریں گے یا سچا کہیں گے تو سب کو ورنہ اگر نو کی تصدیق کی اور ایک کی نہ کی تو خود بخود اس ایک کی تکذیب سے بقیہ نو کی بھی تکذیب ہو جائے گی اسی طرح جملہ انبیاء اور جملہ صحف کو سمجھ کی کوشش کریں، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جابجا یہ بیان ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ آپ ان سے کہیں کہ میں کوئی بالکل پہلا نبی نہیں ہوں اور نہ یہ قرآن پہلی آسمانی کتاب ہے کہ میرے اعلان نبوت اور آسمانی کتاب پیش کرنے پر تعجب اور حیرانگی ہو رہی ہے:

﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ ﴾ [الاحقاف: ۹]

﴿ إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَأَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴾ [النساء: ۱۶۳]

یہاں یقیناً ایک سچے نبی کی ہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے پہلے نبیوں اور جو وحی ان کی طرف نازل ہوئی نہ صرف ان کی تصدیق کرے بلکہ کما حقہ انکا ادب واحترام ملحوظ رکھے باقی جو خانہ ساز متنبی ہوتے ہیں انھیں صرف اپنی دکان چمکانا ہوتی ہے اس لیے دوسرے انبیاء کی بے ادبی سے بھی پرہیز نہیں کرتے جیسا کہ اپنے ملک میں قادیانی متنبی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ مگر ہمارے سچے پیغمبر سیدنا محمد ﷺ کی احادیث دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے اپنی امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ کسی طور پر بھی کسی نبی علیہ السلام کے ادب احترام کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیں بلکہ آپ نے ایسی تعریف سے بھی امت کو منع کیا جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم آتی ہو یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ اگر خود سچا ہوتا ہے تو دوسرے سچوں کی بھی تصدیق کرتا ہے باقی جھوٹے کی جب بنیاد ہی جھوٹ پر ہوتا ہے تو جب تک وہ کسی سچے انسان کی تکذیب نہ کر جب کہ تب تک اس کی جعلی دکانداری نہیں چلتی۔

③ ﴿ وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا ﴾

[المائدة: ۴۸]

یہاں بھی: ﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾

سے مراد گذشتہ کتب میں کیونکہ قرآن ان تمام صحف کی تعلیمات کا محافظ (مھیمن) ہے۔ صحیفہ کائنات کے مہیمن ہونے کے کیا معنیٰ؟ علاوہ ازیں اس آیت سے قبل آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں گذشتہ صحف ہی مراد ہیں ملاحظہ کیجیے۔

﴿ وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [ المائدہ : ٤٦ ]

جب ہر نبی پہلے نبی پر نازل شدہ کتاب کی تصدیق کرنے والا تھا تو پھر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اس سے مستثنیٰ کیوں کیا جائے؟

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾

[ البقرة : ١٣٦ ]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم فرمایا ہے کہ جو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس پر اور جو ابراہیم وغیرہ پر اور جو موسیٰ و عیسیٰ وغیرہ نبیوں کو دیا گیا، اس پر ایمان لاؤ (اس کی تصدیق کرو) یا کہو کہ ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

﴿وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ﴾ الخ ﴿وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى﴾

سے گذشتہ صحیفے مراد ہیں جواب یقیناً اثبات میں ہوگا پھر کیوں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کی تصدیق کا حکم فرما رہے ہیں؟ کیا اللہ کو معاذ اللہ یہ علم نہ تھا کہ وہ محرف ہو چکے ہیں؟ کچھ غور و فکر سے بھی کام لیں محض تقلید اور بیجا عقیدت مندی تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح معمولی فرق (لفظی یہی حکم جناب رسالت مآب ﷺ کو بھی دیا گیا ہے، دیکھیں:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾

[ البقرة : ١٣٦ ]

عجیب بات ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو اپنے رسول مقبول ﷺ اور مومنوں کو حکم فرماتے ہیں کہ پہلے صحیفوں کی تصدیق کرو مگر علامہ صاحب کا ارشاد ہے کہ نہیں وہ تو محرف ہو چکے تھے۔ ان کی تصدیق سے کوئی مطلب نہیں نکلتا کیا نعوذ باللہ علامہ صاحب اللہ تعالیٰ کو لقمہ دینے چاہتے ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

اس کے بعد ہمیں تو علامہ صاحب کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ کے رسول ﷺ صحیفہ فطرت (کائنات) کی تصدیق کرتے ہیں۔ صحیفہ کائنات کی تصدیق کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو "المعنی فی بطن الشاعر" کے مصداق ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ واقعی یہ کائنات موجود ہے؟ یہ مطلب تو کوئی دیوانہ لے تو اور بات ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی مخلوق ہے اسی کے حکم پر چلتی ہے، اگر یہ مطلب ہے اس میں آپ کی خصوصیت کون سی؟ اسے کیوں آپ کی خاص صفت بنا کر ذکر کیا گیا ہے؟ کیا مشرکین مکہ کا یہ عقیدہ نہ تھا؟

﴿ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِهَا لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ﴾ [العنکبوت: ٦٣]

﴿ قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ مَنۡ يُّخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَ يُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَيِّ وَ مَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴾ [یونس: ٣١]

یا کائنات کی تصدیق کا یہ مطلب ہے کہ آپ تصدیق فرماتے کہ یہ کائنات پیدا نہیں کی گئی بلکہ ایک عظیم الشان مقصد کے لیے بنائی گئی ہے تو اس میں بھی آپ کی منفرد حیثیت نہیں ہے بلکہ عام مومن بھی اس میں آپ کے شریک ہیں:

﴿اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَ يَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ [آل عمران: ١٩١۔ ١٩٠]

اس کے علاوہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لیے خاص طور پر تصدیق کی ضرورت پیش آتی اور اسے آپ کی امتیازی وصف ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ﴾ کے طور پر بیان کیا گیا ہو یہ تو ایک اندازہ تھا اور یہ کہ ایک عقلمند اس کائنات پر غور سے نظر ڈالنے کے بعد کہے گا کہ یہ کائنات بے مقصد بے نتیجہ وانجام نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کی خاص تصدیق کی کیا ضرورت نہیں۔

الغرض علامہ صاحب نے یہ جملہ ایسا معمل لکھا ہے کہ ہم تو صحیح طور پر اس کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر:

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ﴾ [الطلاق: ١]

خلاصہ کلام یہ کہ اس جگہ بھی مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ یا قرآن پہلی کتب کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ باقی اس کی تصدیق کا کیا مطلب اور کیا غرض وغایت ہے، اس کے متعلق پہلی دو آیات کی تشریح میں بیان کیا جا چکا ہے۔ واللہ اعلم

(۴) ص ۱۰ پر آپ ﷺ کی خانگی زندگی ...... کے عنوان کے تحت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بارے میں دو باتیں لکھی ہیں ① بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے نکاح اپنے اعزاء واقارب کی مرضی کے بغیر کیا ② بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے شادی پہلے شوہر کی وفات کے ایک ماہ بعد کی یہ دونوں باتیں بے ثبوت ہیں ان کا علامہ صاحب نے کوئی تاریخی حوالہ نہیں پیش کیا دراصل سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی آپ سے شادی سیدہ رضی اللہ عنہا کی ہی خواہش سے ہوئی تھی۔ تاہم اعزاء واقارب راضی تھے کوئی بھی اس سے ناراض نہ تھا۔ نبوت سے پہلے بھی جو مقام مرتبہ آپ کا لوگوں کے دلوں میں تھا وہ تمام بڑا تھا اور عرب کے خطہ میں کسی دوسرے کو یہ مقام ومرتبہ حاصل نہ تھا اس لیے اگر آپ ﷺ سیدہ صاحبہ سے شادی کے لیے تیار ہوئے ہوں گے اور سیدہ صاحبہ کے اعزاء سے آپ کا رشتہ مانگا ہوگا تو بغیر پس وپیش کے منظور کیا ہوگا اور سب اس بات پر راضی ہوئے ہوں گے اور واقعتاً راضی ہوئے بھی اعزاء کی ناراضگی کسی مستند تاریخی حوالہ میں نہیں ملتی البتہ کچھ تاریخی کتابوں کچھ روایت ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ ﷺ سے منظور کرنے اور سیدہ صاحبہ کے رشتہ لینے کے لیے آپ کے والد خویلد کو شراب پلا کر نشے میں ہاں کرائی گئی تھی مگر یہ تمام روایتیں سنداً ضعیف ہیں، ایسی ناقابل اعتبار اور کمزور روایات پر یہ افسانہ نہیں گھڑا جا سکتا کہ مثلاً آپ کے والد ناراض تھے پھر شراب پلا کر نشہ کی حالت میں راضی کیا گیا تھا ایسی باتوں کو صحیح روایات کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاذ اللہ اگر یہ موضوع روایات صحیح ہیں تو اس سے آپ کی ذات مقدسہ پر داغ پڑ جاتا ہے، حالانکہ آپ ﷺ اس قسم کے افعال (یعنی فریب وخیانت) کی باتوں سے نبوت سے پہلے ہی متنفر اور کئی منزلیں دور تھے آپ کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے ہی ایسی باتوں سے محفوظ رکھا باقی رہی بات بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کے اپنے شوہر کی وفات کے ایک ماہ بعد شادی کی یہ بھی بالکل بے دلیل اور بے ثبوت دعویٰ ہے علاوہ ازیں اس طرح کرنا اس وقت کے عرب کے رسم ورواج کے بھی خلاف تھا اس کے برخلاف بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا ہرگز جرأت نہ کرتی، یہ وہ رواج تھا کہ جس کا شوہر فوت ہو جاتا وہ ایک سال تک الگ تھلک رہتی تھی، لہٰذا بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا کس طرح اس رسم رواج کی برخلاف صرف ایک ماہ میں شادی کر لیتی۔ اس طرح تو عرب میں ایک طوفان بپا ہو جاتا یہ رسم تو آگے چل کر اسلام نے ختم کر دی لیکن آپ کی شادی بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا سے نبوت سے ۱۵ سال قبل ہوئی تھی۔ اس وقت تو اس رسم کی خلاف ورزی متصور بھی نہیں ہوسکتی۔ بہرحال یہ بات بھی صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

(۵) ص ۱۱ کے شروع میں لکھا ہے "اس کے بعد شاید کچھ دن بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا" یہ بھی مستند تاریخوں کے خلاف ہے سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے اس دن اسلام قبول کیا تھا جس دن آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان نبوت کیا تھا۔ دیکھیں مستند تاریخی کتب اور وہ کتب جو صحابہ کی معرفت کے بارے میں لکھی گئے ہیں ان میں کچھ اختلاف ہے۔ کہ مطلق اولیت کسی کو حاصل ہے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یا سیدنا

علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لیکن اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ آپ کے گھر میں ہی رہتے تھے اور آپ کے زیرِ تربیت تھے لہٰذا جو گھر کے دوسرے افراد آپ کے اعلان نبوت سے اسلام لائے تو ان کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اسلام لائے اور جو گھر سے باہر افراد تھے۔ ان میں سیدنا ابوبکر صدیق اعلان نبوت سے ہی اسلام لائے ''کچھ دن'' تو کیا چند منٹ بھی توقف نہیں کیا، لیکن یہ پتہ نہیں چل سکتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت اپنے گھر سے شروع کیا تھا یا باہر دوست واحباب سے اسی لیے اولیت میں اختلاف ہے باقی کچھ دن کے لیے توقف کے بعد یہ یا تو علامہ صاحب کی اپنی اختراع ہے یا شیعہ مصنف کی غلط بیانی اور جھوٹے افسانوں کو بنیاد بنا کر تحریر کر دیا ہے، سیدنا صدیق نبوت سے کافی پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق تھے سفر وحضر میں آپ کے ساتھ ہوتے تھے، اگر بحیرہ راہب کا قصہ صحیح ہے تو سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ اسی وقت ایمان لا چکے تھے۔ اگرچہ باقی سیدنا علی رضی اللہ عنہ تب ایمان لائے جب آپ نے اعلان نبوت کیا خیر یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں مگر سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نبوت سے پہلے رفاقت ایک مسلمہ حقیقت ہے اور سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے بلند اخلاق اعلیٰ کردار صداقت امانت وغیرہ کا بارہا مشاہدہ کر چکے تھے اور نبوت کے اعلان سے قبل ہی کافی متاثر تھے۔ لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت فرمائیں اور سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نبوت پر ایمان لانے میں ''کچھ دن'' کا توقف کریں اسلام کے دشمنوں روافض کے لیے تو یہ بڑی بات نہیں لیکن صحیح معنوں میں ایک مسلمان اور صحیح العقیدہ مومن یہ بات کسی طور تسلیم نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ احادیث میں کتنے ہی ایسے واقعے بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات کی کوئی واقعہ بیان کیا اللہ تعالیٰ کی کسی مہربانی اور عظیم نعمت کا ذکر کیا تو یک لخت سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی تصدیق کی اور ایک سیکنڈ بھی توقف نہیں کیا مثلاً واقعہ معراج سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت ابھی آپ سے ملے بھی نہ تھے پس پشت کفار مکہ نے آپ کو بتایا کہ آپ کے ساتھی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق) نے عجیب دعویٰ کیا ہے کہ ایک ہی رات اندر یہاں سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کر کے اسی رات واپس آ گئے ہیں۔ کیا آپ اس کی اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں؟ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا واقعتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کی ہے؟ کافروں نے جواب دیا ہاں تو سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر یقیناً سچ ہے کہ آپ یہ مکمل سیر کر کے آتے ہیں میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں، ایسی ہستی کے لیے یہ کہنا کہ اسلام قبول کرنے کے لیے کچھ دن توقف کیا قابل سماعت ہی نہیں چہ جائیکہ اسے سچا جان کر تحریر کیا جائے مذکورہ اختلاف کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے محققین نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے یعنی عورتوں میں سب سے پہلے سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے نابالغ مردوں میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بالغ مردوں میں سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے غلاموں میں سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا۔ یہ مسلک بالکل صحیح ہے اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیدہ

خدیجہ رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ یہ سب سابقین اولین میں شامل ہوں گے، باقی ان میں بھی اولیت کس کو حاصل ہے اس کا چونکہ واضح ثبوت نہیں اس لیے اسے چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں کیا ان میں اس آدمی کا علم ہمارے لیے اعتقاد لازمی ہے کہ کس کو مطلق اولیت حاصل ہے بہر حال ان بیکار اور فضول بحثوں میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔ (۲) اسی ص ۱۱ پر مذکورہ قطعہ کے بعد یہ عبارت ہے ''بہر حال رقیہ کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بعثت کے بعد ہوا تھا اس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا'' افسوس! تاریخ میں اس کے متعلق وضاحت موجود ہے مگر علامہ صاحب کہتے ہیں کہ ''اس کا ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا'' تاریخ کی ''کتاب البدایۃ والنہایۃ'' ج ۵ ص ۳۰۸ میں اس کے متعلق سب کچھ موجود ہے اس کا خلاصہ یہاں عرض رکھتا ہوں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں کا نکاح نبوت سے قبل ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہو چکا تھا، لیکن رخصتی ابھی عمل میں نہیں آئی تھی (شاید اس لیے کہ بچپن کا نکاح تھا) بہر حال اعلان نبوت کے بعد جب ابولہب کی مخالفانہ اور معاندانہ کاروائیاں بڑھ گئیں تو ان کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے:

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ الخ ﴾ نازل فرمائی اس کے بعد تو ابولہب غصہ میں سیخ پا ہو گیا اور اپنے دونوں بیٹوں کو حکم کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو (جن کی رخصتی ابھی عمل میں نہیں آئی تھی) طلاق دے دو اس کے بیٹوں نے باپ کا کہنا مانتے ہوئے آپ کی بنات مطہرات کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کرادی جو اس سے قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کی زوجہ مکرمہ مطہرہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے'' اس سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی بعثت مبارکہ سے قبل ہو چکی تھی۔ جب ایسے تاریخی حقائق سے بھی علامہ صاحب ناواقف ہیں تو پھر خوہ مخواہ دخل در معقولات کیوں کرتے ہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ ان معاملات کو چھیڑتے ہی نہیں۔ ''اسی طرح اسی صفحہ پر آپ کی دوسری بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے متعلق لکھا ہے'' بعثت کے وقت آپ کی عمر ۳ سال تھی یہ بات بھی مختلف فیہ ہے، کیونکہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بعثت سے پہلے ابولہب کے بیٹے سے ہو چکا تھا جیسا کہ البدایۃ والنہایہ کے حوالہ سے ابھی گزرا، لہٰذا اگر بعثت کے وقت آپ کی عمر ۳ سال تھی تو مطلب یہ ہو گا کہ آپ کا پہلا نکاح اس وقت ہوا جب آپ ایک یا دو سال کی تھیں، یہ بات عقل میں آنے والی ہی نہیں واللہ اعلم۔ پھر نیچے اسی صفحہ پر لکھا ہے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تقریباً ۲۵ سال کی عمر وفات ہوئی'' یہ بھی تاریخی غلطی ہے کیونکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے چھ ماہ بعد فوت ہوئیں یعنی ابھی سن ۱۱ ہجری بھی مکمل نہیں ہوا تھا، پتہ نہیں علامہ صاحب ایسی تاریخی غلطیاں کیسے کر رہے ہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ اعداد شمار کہاں سے لیے ہیں مستند تاریخی حوالہ تو کسی کا بھی پیش نہیں کیا (۷) اسی صفحہ ۱۱ پر تیسرے پیرائے میں لکھتے ہیں'' حضور کی بارہ ازواج میں سے (ماریہ قبطیہ سے ابراہیم

نامی بیٹے کے علاوہ) کوئی اولاد نہ ہونا تعجب خیز ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے ان شادیوں سے شہوت کی ضرورت کو پورا کرنا یا اولاد پیدا کرنا نہ تھا'' اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کی ان شادیوں سے کئی اعلیٰ مقاصد مقصود تھے مگر علامہ صاحب کے لکھنے کا رنگ و ڈھنگ صاف طور پر بتلاتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج سے جنسی تعلق یا تو بالکل ہی قائم نہیں کیا یا بالکل ہی کم یہ انتہائی سنگین جسارت ہے کیا علامہ صاحب سمجھتے ہیں کہ جنسی تعلق قائم کرنے سے ضرور بالضرور اولاد پیدا ہو؟ جب کہ تجربہ اور مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے، کتنے ہی لوگ مرد خواتین ایسے موجود ہیں جو عالم شباب میں ہی اور انھیں شادی کیے سال ہا سال گزر چکے ہیں لیکن انھیں کوئی بھی اولاد نہیں ہوئی بلکہ کتنے ہی یہ دل امید دل میں رکھے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جنسی تعلق قائم ہی نہیں کیا؟ قرآن کریم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پہلی زوجہ محترمہ سے اولاد نہ ہونے کا ذکر ہے حتیٰ کہ بڑھاپے تک بھی اولاد نہ ہوئی۔ بڑی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد دی (کتنی ہی سورتوں میں اس کا ذکر ہے) اسی طرح سیدنا زکریا علیہ السلام کا بھی سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں ذکر ہے کہ اسے بھی بڑھاپے تک اولاد نہیں ہوئی ایک دن اللہ تعالیٰ سے دعا کی مجیب الدعوات مالک جل علا نے دعا کو شرف قبولیت بخشا اور آپ کو بیٹے یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی، ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد نہ دینا چاہے تو عین عالم شباب میں بھی اولاد نہیں ہوتی اگر اللہ تعالیٰ کی دینے کی مرضی ہے تو بڑھاپے میں بھی اپنے بندوں کو اولاد مرحمت فرماتا ہے:

﴿ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴾ [الشوریٰ: ۴۹۔۵۰]

یہ اس لیے کہ اس دنیا میں عالم اسباب انسان کے ہاتھ اور اس کے بس میں صرف کوشش کرنا ہے۔ (ہر معاملہ اور ہر بات میں) باقی رہا نتیجہ یہ اس کے سپرد ہی نہیں بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی علیم وقدیر ذات کے ہاتھ میں ہے نکالے یا نہ نکالے اور کیا نتیجہ نکالے۔ لہٰذا شادی شدہ جوڑے اگر اولاد کا خیال کریں تو ان کے لیے صرف بساط کے مطابق کوشش کرنا ہے اور اس کے لیے ممکن اسباب عمل میں لا سکتے ہیں، باقی اس کے نتیجہ میں اولاد ہو یا نہ ہو یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے چاہے وہ پوری طرح جنسی تعلق قائم کرتے رہیں۔ بعینہٖ اسی طرح مسئلہ مبحوث فیہا کو سمجھیں۔ یعنی یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی نہ تھی کہ آپ کو دوسری ازواج مطہرات سے اولاد ہوتی اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوتی۔ اپنی حکمت کو وہ خوب جانتا ہے اور اپنی مرضی کا وہ خود مالک ہے اس پر کسی مخلوق کا زور قطعاً نہیں چل سکتا، کسی کو مجال نہیں کہ وہ اس سے پوچھے یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا۔

﴿ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ ﴾ [الانبیاء]

بہر حال جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ مرضی نہ تھی تو دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے اولاد نہ ہوئی، اس سے یہ سمجھنا کہ آپ نے جنسی تعلق قائم ہی نہ کیا یا بہت کم کیا یہ انتہائی نادانی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو صوری ومعنوی عیوب سے بالکل پاک اور محفوظ رکھا ہے یہ جو دیگر مردود میں کچھ خامیاں یا جسمانی عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان میں قوت مردانہ کم ہو جاتی ہے ان سے یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے (علیہم الصلوٰۃ والسلام) محفوظ ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کی احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تیس مردوں کی طاقت دی تھی بسا اوقات آپ اپنی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے ایک رات میں ہو کر آتے تھے جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں جنسی تعلق قائم کرنا عورت کے حقوق میں سے ایک حق ہے جو مرد پر اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے قوت زائل نہیں ہوتی تو اس کا ادا کرنا لازم ہے، کیا وہ ہستی جو انسانی حقوق کی محافظ تھی اس اتنی ازواج رکھنے کے بعد ان کے حقوق کو پامال کیا یا نظر انداز کیا؟ جو دیگر مقاصد تھے وہ دو تین ازواج سے پورے نہ ہو سکتے تھے کہ گیارہ نکاح کیے۔ اگر یہ اعلیٰ مقاصد ان شادیوں سے مقصود تھے لیکن جنہیں اپنی زوجیت میں لیا گیا ان کے واجبی حقوق بھی تو لازم تھے جنہیں نظر انداز کرنا قطعاً نامناسب تھا، لہٰذا اس طرح سوچنا اور یہ تصور دل میں بڑھانا سیدنا ونبینا صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت بڑا اتہام ہے۔ ہمیں علامہ صاحب سے سوئے ظنی نہیں بلکہ تھوڑا آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "حضور کی سیدہ عائشہ سے غیر معمولی محبت میں جنسی شہوت کا حصہ کم تھا" تعجب ہے علامہ صاحب کو بھی بڑی دور کی سوجھی ہے یہ خیال نہیں کہ کسی بزرگ ہستی۔ بعدازاں بزرگ توئی قصہ مختصر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیسا گھٹیا تصور رکھتا ہوں کہ جنسی تعلق روحانیت کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں تمام پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام بیویوں والے تھے کہ جنسی تعلق تو انسانی فطرت ہے اور اسلام بھی دین فطرت ہے صحیح فطرت کے قطعاً مخالف نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت کو غیر اسلامی قرار دیا "لا رهبانية فى الاسلام" (حدیث شریف) یہاں بھی علامہ صاحب نے وہی بات دہرائی ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اولاد نہ ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ علامہ صاحب نے یہ بے ہودہ خیال کیسے ذہن میں بٹھایا ہے کہ جنسی تعلق قائم کرنے سے ضرور بالضرور اولاد پیدا ہوگی، اگر اولاد پیدا نہ ہوئی اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنسی تعلق رکھا ہی نہیں گیا یا بہت کم رکھا گیا تھا کیا اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء کا کسی بات کے وجود آنے کے لیے ضروری ہونے کے حقیقت ذہن سے اتر گئی تھی یا اپنی زندگی میں ایسے مشاہدات نہیں کیے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اولاد نہ ہوئی اور وہ علیم وحکیم ہے۔ تو پھر کوئی بھی اس پر زبردستی نہیں کر سکتا کہ لازماً ایسا ہی کرے باقی اس کا سبب سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جنسی تعلق کا بالکل نہ ہونا سراسر غلط اور بے ہودہ ہے۔ علامہ صاحب دوسروں کے لیے تو فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں نادانی پر مشتمل ہیں لیکن کیا آپ کی یہ باتیں دانشمندی پر مشتمل ہیں؟

خودرا فضیحت دیگراں رانصیحت

اس جگہ علامہ صاحب نے ایک دوسری بھی عجیب غلطی کی تعجب تو یہ ہے کہ اعداد وشمار کرتے وقت بھی پوری طرح حساب سے کام نہیں لیا، علامہ صاحب فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ سے نکاح کے وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۲۰ سال تھی'' حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے صحیح بات یہ ہے کہ نکاح کے وقت آپ کی عمر چھ یا سات سال تھی اور رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۹ برس تھی اور ۹ برس آپ ﷺ کے ساتھ رہیں اور آپ ﷺ کی وفات حسرت آیات کے وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔ صحیح احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے مگر علامہ صاحب نے صحیح احادیث کی مخالفت کا پتہ نہیں کیوں ٹھیکہ لیا ہے لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی بات کی خود ہی تردید فرمائی ہے لکھا ہے'' بی بی صاحبہ ۸۵ سال کی عمر میں ۵۷ ہجری میں انتقال فرمایا'' انصاف سے غور فرمائیں کہ سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا سنہ ۵۷ ہجری میں انتقال کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدینہ میں آپ نے ۵۷ سال گزارے ۸۵ سے ۵۷ سال نکالیں تو باقی ۸ سال رہتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ہجرت کے وقت آپ کی عمر ۸ سال تھی اور یہ بھی بالکل ظاہر اور سب کے ہاں مسلم ہے کہ نکاح ہجرت سے ایک دو سال قبل ہوا نہ ہجرت کے بعد اور نہ ہی عین وقت ہجرت اس طرح حساب لگانے سے بالکل وہی جواب نکلتا ہے جو احادیث میں مبین ہے یعنی نکاح کے وقت سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۶ یا ۷ سال تھی یہاں، البتہ رخصتی ہجرت کے بعد ہوئی تھی اگر چہ یہ حقیقت عالم اسلام کے یہاں مسلم ہے کہ سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہجرت کے دو سال قبل ہوا تھا اگر اس امت مسلمہ کے اجماع کو نظر انداز کر کے علامہ صاحب یہ کہتے ہیں کہ نکاح ہی ہجرت کے بعد ہوا تو بھی آپ کی بات درست نہیں ٹھہرتی۔ اس لیے کہ اوپر کے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۸ برس کی تھی اور علامہ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''آپ ﷺ کے ۵۴ برس سے ۶۳ برس تک کے عرصہ میں ...... الخ'' اب اگر ۵۴ واں سال نکال کر حساب لگاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے ایک سال بعد آپ ﷺ کی شادی سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی تو ثابت ہوا کہ شادی کے وقت آپ کی عمر نو برس تھی مطلب یہ کہ اس طرح تو دس سال بھی آپ کی عمر نہیں ٹھہرتی لیکن اگر ۵۴ واں سال بھی اس میں شامل سمجھیں گے تو واضح ہوگا کہ ہجرت کے متصل بعد ہی آپ کی شادی سیدہ صاحبہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی نہ کہ بعد میں تو پھر علامہ صاحب کا یہ کہنا آپ ﷺ کے ساتھ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ۹ برس ساتھ گزارے کسی طور پر بھی درست نہ ہوگا بلکہ پھر آپ کے ساتھ دس برس بلکہ دو تین ماہ اوپر پھر اس صورت میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت عمر ۹ سال سے بھی کم ۸ سال یا اس سے کچھ اوپر بنے گی کیا علامہ صاحب اتنے معمولی حساب سے بھی غافل تھے؟ علاوہ ازیں ہجرت کے بعد نکاح کے قائل ہونے کی صورت میں خود علامہ کی درج ذیل عبارت جو ص ۱۳ پر ہے۔ مہمل بن جائے گی۔ ''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بہادر دوست کی بیٹی کو نکاح میں لا کر پوری عمر کی رفیق بنانا اور یہ بھی اس وقت جب اہل مکہ چودہ برس تک

آپ کو اذیت پہنچاتے رہے جن کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے اور ایسے حالات میں یہ ایک انتہائی درست قدم تھا جس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا'' اس عبارت کو مکرر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نکاح ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا تھا ورنہ یہ عبارت بالکل بے معنی بن جائے گی اور اس عبارت میں ایک عجیب بات یہ کہی گئی ہے کہ ''اہل مکہ چودہ برس تک آپ کو...... تعجب ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں ۱۳ برس رہے پھر چودہ برس کی اذیت کیا معنی رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں نبوت کی پہلی وحی کے بعد ہی اعلان نبوت نہیں کیا تھا بلکہ نبوت ملنے اور اعلان نبوت کے درمیان بھی وقفہ تھا اعلان تب کیا جب آپ کو دوبارہ ''یاایھا المدثر قم فانذر الخ'' کا امر ہوا اس طرح اذیت کا عرصہ اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر چودہ برس مکہ مکرمہ میں اذیت میں گزارے تو مطلب آپ کی عمر ۶۴ برس تھی، کیونکہ مکہ کے چودہ برس دس برس مدینہ منورہ کے اور چالیس سال نبوت سے پہلے حالانکہ علامہ صاحب آپ کی عمر ۶۳ برس تسلیم کر چکے ہیں، اسی طرح نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں بھی ۱۳ سال رہنا علامہ صاحب کے یہاں بھی مسلم ہے پھر یہ چودہ برس کا کیا مطلب رہا؟ آپ ﷺ کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم عمر میں شادی کرنا تو یہ کوئی اتنی تعجب خیز بات نہیں کہ جس نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے اس نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ جاندار چیزوں کے (انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں) رہنے سہنے اور طرز بود و باش پر جغرافیائی حالات بڑا اثر ہے۔ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ کچھ ممالک میں مرد و خواتین ہمارے ملک کے لوگوں سے کافی پہلے بالغ ہو جاتے ہیں خاص طور پر گرم ممالک میں (ہمارے ملک کی بنسبت) کافی پہلے لوگ بالغ ہو جاتے ہیں کافی عرصہ پہلے میں نے ''ڈان'' اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی امریکہ میں ایک نو سالہ لڑکی ماں بن گئی ہے۔ یہ حوالہ میں نے ایک نوٹ بک پر تحریر کر لیا تھا مگر فی الوقت وہ نوٹ بک دستیاب نہیں ہو سکی ورنہ وہ مکمل اقتباس یہاں بھی نقل کرتا۔ اس قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی ذہن میں آرہا ہے لیکن پوری طرح یاد نہیں بہر حال جب نو سال کی لڑکی نے بچہ جنم دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ عورت لامحالہ سال دو پہلے بالغ ہو چکی ہوگی جب آٹھ سال کی عمر میں بالغ ہونے والی لڑکیاں موجود ہیں تو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نو سال کی عمر میں رخصتی پر کیوں اظہار تعجب کیا جاتا ہے اور حقیقت کو کیوں ہدف تنقید و تشنیع بنایا جا رہا ہے یقیناً اس وقت (نو سال کی عمر میں) سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بالغہ ہو چکی تھیں اور بلوغت کے بعد شادی معیوب نہیں اور نہ ہی باعث تعجب بلکہ یہ فطرت کے عین مطابق ہے پھر اعتراض کیوں؟ واللہ اعلم

(۸) ص ۱۳۰ پر سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ذکر میں لکھا ہے۔ تقریباً ۲۰ سال کے بعد حبشہ سے مدینہ واپس آتے ہوئے دونوں کو قریش مکہ...... الخ تھوڑا آگے چل کر لکھا ہے۔ ''بچہ جنم دینے اور عدت گزارنے کے بعد سنہ ۴ ہجری میں آپ ﷺ نے اس مجاہدہ خاتون سے نکاح کیا'' کہ ۲۰ کا عدد علامہ صاحب کی تحریر میں بھی ہے یا

طباعت میں غلط چھپ گیا ہے، واللہ اعلم۔ اگر واقعتاً علامہ صاحب کی تحریر میں بھی اسی طرح ہے تو پھر آپ خود سوچیں کہ یہ ممکن بھی ہے؟ ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے پہلے شوہر کے ساتھ ہجرت آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد کی تھی اور آپ ﷺ اعلان نبوت کے بعد ۲۳ سال اس دنیا میں رہے لہٰذا اگر بیس سال کے بعد سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا حبشہ سے واپس آئیں ایک سال اہل مکہ کے یہاں قید رہیں تو پھر ۴ ہجری میں آپ ﷺ سے شادی ممکن ہی نہ رہی؟ اگر یہ طباعت کی غلطی ہے تو پھر آپ کو کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ شایع کرنا چاہیے تھا تاکہ ایسی فاش غلطیوں کا ازالہ ہو جائے۔

(۹) ص ۲۶ پر لکھا ہے۔ ''سورۂ احزاب مدنی سورۂ سنہ ۷ ہجری میں اس وقت نازل ہوئی جب کفار کی دشمنی عین شباب کو تھی'' یہ بھی کھلم کھلا غلطی ہے سورۃ احزاب جنگ احد کے متصل بعد نازل ہوئی اور یہ جنگ جمہور کے مسلک کے مطابق ۵ ہجری میں ہوئی۔ کچھ کا خیال ہے کہ سنہ ۴ ہجری میں ہوئی باقی سنہ ۷ تو کسی تاریخ نویس نے نہیں کہا علاوہ ازیں سنہ ۶ ہجری میں آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں ادائیگی عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے جو کہ مکہ والوں کے روکنے کے باعث حدیبیہ کے مقام سے ہی مدینہ واپس آگئے اور اسی حدیبیہ مقام میں ہی کفار سے صلح ہوگئی تھی اور اسی صلح نامہ کے مطابق آپ ﷺ سنہ ۷ ھ میں دوبارہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے اور عمرہ ادا کیا، لہٰذا ۷ ھ میں جنگ احزاب نہیں ہوسکتی کیونکہ ان سے صلح ہو چکی تھی البتہ سنہ ۷ ھ میں جنگ خیبر ہوئی جو کہ فتح ہوئی اور سنہ ۸ ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا پتہ نہیں، علامہ صاحب اس قسم کی غلطیاں کیسے کرتے ہیں۔ اسی طرح ص ۳۱ میں لکھتے ہیں ''جنگ تبوک سنہ ۱۰ ھ میں ہوئی اور صحابہ کی تعداد...... الخ یہ بھی تاریخی غلطی ہے تاریخ کے تمام مستند کتب اٹھا کر دیکھا معلوم ہوگا کہ جنگ تبوک سنہ ۹ ھ میں ہوئی تھی نہ کہ سنہ ۱۰ میں اسی صفحہ پر آگے لکھتا ''اتنا مال غنیمت حاصل ہوا کہ اس کا جلوس مدینہ کے بازاروں سے گزرتے گھنٹے لگ گئے'' معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب بھی افسانوی مبالغہ آرائی کے انتہائی شوقین ہیں۔ مہربانی فرما کر بتائیں کہ اس جلوس کا کس مستند تاریخ میں کتاب میں ذکر ہے؟ آخر بے دلیل و بے ثبوت بات کا کوئی وزن ہو گا تھوڑا آگے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ذکر میں لکھا ہے دوران خلافت مسلمانوں نے بائیس لاکھ مربع زمین پر قبضہ کیا (کہاں بائیس لاکھ مربع؟) چھتیس ہزار قلعے اور شہر بارہ سال کی مدت میں فتح کیے'' گذارش ہے کہ اس کا مصدر اور مآخذ کیا؟ اس طرح کی بے دلیل بے حوالہ اور بے ثبوت باتوں سے علامہ صاحب کے بارہ میں کوئی نیک شگون نہیں رہتا۔ کاش علامہ صاحب شیخ سعدی رحمہ اللہ کے اس شعر پر عمل پیرا ہوتے۔

تو گفت ندار کسے با تو کار ولیکن چوں گفتی دلیلش بیار

(۱۰) ص ۳۲ پر علامہ صاحب امریکا روس کے بارہ میں مدح سرائی میں عجیب طرح سے رطب اللسان نظر آتا ہے لکھا ہے۔ ''جس طرح کا کتاب کائنات پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے جو طاقت حاصل کی ہے اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قرآن ان سے چھین کر امریکہ و یورپ کے حوالہ کیا جا رہا ہے“

(( یاللعجب و لضیعة الادب۔ حبك الشی یعمی ویصم ))

[الحدیث عن علی رضی الله عنه]

کسی بھی چیز کی محبت انسان کو اس کے بارے میں اندھا اور بہرہ بنا دیتی اگر بالفرض تسلیم کیا جائے کہ ان (امریکا اور روس) نے بے انتہا قوت حاصل کی ہے تو اللہ کے لیے اتنا تو سوچیں ان کی یہ طاقت عملی طور پر بنی نوع انسان کی تباہی کا باعث تو نہیں بن رہی؟ ان قوموں کی ایجادات ایٹم بم ہائیڈروجن اور دیگر بے شمار بے انداز مہلک اور تباہ کن ایجادات کیا انسانی بہبود اور بنی آدم کی فلاح وترقی کا سامان ہیں؟ ان کی اس بے انتہا قوت کی ہلاکت خیزی کے علاوہ ان کی فکری اور ذہنی گمراہیوں نے جو:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴾ [الروم : ٤١]

کا منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ آخر کس سے مخفی ہے؟ کیا قرآن جیسی عظیم کتاب اور اعلیٰ درجہ کی وحی الٰہی روس (جو اللہ رب العالمین کے وجود کا ہی منکر ہے) اور امریکا (جو یہود نواز اور بالکل ایک غلط نظریے کی پیروی کر رہا ہے) کے سپرد کی گئی ہے کیا اللہ تعالیٰ معاذ اللہ ایسی بے انصافی فرمائے گا کہ اپنی کتاب ایسی قوم کے سپرد فرمائے جو اسے مانتی ہی نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ان گمراہیوں کے بارے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کے منکر ہونے کے باوجود ان کے ”تسخیر کائنات“ ”بے انتہا قوت“ حاصل ہونے کی وجہ سے قرآن کے حامل ہونے کے لائق سمجھا تو مسلمانوں کو) جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کے رسول اللہ ﷺ کو مانتے اور قیامت پر یقین رکھتے ہیں) کیوں قرآن کے حامل ہونے کے لائق نہ سمجھا؟ اگر مسلمان اپنے نصب العین پر پوری طرح عمل نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ بالکل ان کافروں سے بھی گئے گزرے ہیں کم از کم ایمان تو ان میں موجود ہے۔ (اگرچہ عملی کوتاہی ان میں ہے) لہٰذا اگر ان میں خامیاں ہیں تو خوبیاں بھی تو ہیں تو اس صورت میں ان سے قرآن چھین کر ایسے ملحدوں اور کافروں کے حوالہ کرنا جو خیر سے اس کی کتاب تو کیا اسے نازل فرمانے والے رب العالمین کو ہی نہیں مانتے انتہائی بے انصافی بلکہ بے عقلی ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایسی باتوں سے بالکل پاک ہے اور اس کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے ایسے بے عقلوں والے کام اس کی ذات والا صفات سے صادر ہونا ایک حقیقی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں مسلمان تمام کے تمام بے عمل اور خائن نہیں ہیں اگر علامہ صاحب ایسا سمجھتے ہیں کہ آج مسلمان میں بلکہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو قرآن کے بتائے ہوئے نصب العین پر عمل پیرا ہوں تو یہ آپ کی بھول اور غلطی ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں آدم شماری کے لحاظ سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو بد عمل ہیں بلکہ کچھ تو ایمان سے بھی خالی ہیں لیکن اس کے باوجود اس اقلیت کو نظر انداز کر کے اپنی کتاب اللہ تعالیٰ ایسی قوم کے حوالے کر

ے جو اسے مانتے ہی نہیں ایسی بات اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہے، لہٰذا ایسے کام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں علامہ صاحب نے بڑی جسارت کی ہے۔ تھوڑا سا آگے چل کر خود لکھا ہے۔ ان قوموں کا جب:

﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [الفاطر : ۱]

سے لگاؤ نہیں تو یہ آپس میں ہی لڑ کر تباہ ہو جائیں گی۔ جب علامہ صاحب کے مطابق ان ناخدا قوموں کا انجام بالآخر تباہی ہے تو قرآن کریم ایسی قوموں کے سپرد کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اگر عالمی غلبہ حاصل کیا تھا اور اس کے لیے اور اس کے لیے کوشش کی تھی تو اس میں ان کا مقصد قانون الٰہی کا نفاذ اور دین صرف اللہ ہی کا رہے اور انسان بہبود و بہتری اور بنی آدم کی ونجات جیسے ''اعلیٰ مقاصد مدنظر تھے لیکن ان قوموں امریکا وروس کی عالمی غلبہ کی مساعی نہ تو انسانی بہبود و فلاح کے لیے ہیں اور نہ اس لیے کہ اس دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند رہے۔ بلکہ ان کی ناپاک مساعی صرف اور صرف انسانی تباہی اور ہلاکت کے لیے ہی عمل میں آ رہی ہیں۔ کیا ایسی آدم خور قومیں اس قابل ہیں کہ ان کے حوالہ ایسا قرآن کیا جائے جو انسانیت کا سب بڑا خیر خواہ ہے کچھ تو انصاف کریں کچھ تو غور و فکر سے کام لیں۔

(۱۱) ص ۳۶ پر اللہ تعالیٰ کے متعلق تصورات کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''بے حساب رحم کرنے والا بے انتہا انعامات کرنے والا وغیرہ وغیرہ ایسے خیالات جو انسان نے اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور کیے ہیں الخ'' یا واقعتاً اللہ تعالیٰ کو بے حساب رحم کرنے والا اور بے انتہا انعامات کرنے والا تصور کرنا غلط اعتقاد ہے؟ قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ کے رحم اور اس کے انعامات سے بھرا پڑا ہے قرآن کریم کی ابتدائی سورۂ فاتحہ میں ہی:

﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ [الفاتحه : ۲۔۶]

آیات موجود ہیں پھر اس کا انکار؟ بے انتہا رحم کا ذکر تو اس آیت میں بھی ہے:

﴿ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الاعراف : ۱۵۶]

کیا اللہ تعالیٰ کی صفات کے انکار کے بعد اللہ تعالیٰ کا تصور محض ایک موہوم مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار تو کفر کے مترادف ہے یہاں ہمیں یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات انسانوں کی طرح نہیں ہیں، کیونکہ اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ [الشوری : ۱۱]

یہ تو علامہ صاحب نے ٹھیک لکھا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ انسان کی طرح بڑے کانوں سے سنتا ہے یہ غلط ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بے حد رحم کرنے اور بے انتہا انعام کرنے میں انسان سے آخر کون سی مشابہت

ہے؟ اگر ان صفات کے اثبات میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے مشابہت لازم آتی ہے تو قرآن میں جن آیات میں تمام صفات رؤف، رحمٰن، رحیم، حلیم، صبور، غفور وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان سے علامہ صاحب نکال ہی دے:

﴿ رَبَّنَآ اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ [الحشر : ١٠]

اسی صفحہ پر ﴿ لم يلد ﴾ کا معنی ﴿ لم يولد ﴾ کا کیا گیا ہے اور ﴿ لم يولد ﴾ کا معنی ﴿ لم يلد ﴾ کا کیا گیا ہے۔

(۱۲) ص ۴۰ کے شروع سطر نمبر ۳ میں یہ لکھا ہے ''انسان کی روح اور خدا کی روح کا ایک ہو جانا...... الخ'' کیا یہ ہدایت کا پیغام ہے جو علامہ صاحب ہمیں دینا چاہتے ہیں، کیا یہ اسی علامہ صاحب کے الفاظ ہیں جو صفحہ ۳۶ پر اللہ کے بے حساب رحم کرنے اور بے انتہا انعام کرنے پر اعتراض کر رہا تھا اور یہ کہا تھا کہ اللہ کو انسانوں کی طرح سمجھنا بالکل غلط ہے؟ آخر بے مثل بادشاہ اور

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الخلاص : ٤]

مالک کی روح سے خاکی انسان اور مخلوق کی روح ایک کیسے بنے گا؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی ملحدانہ بات اور ہو سکتی ہے؟ یہ عقیدہ ہندوانہ اور یونانی فلسفہ اور بیکار تصورات کا معجون مرکب ہے اور اس کے علاوہ ملحد صوفیا اور عمل سعی سے اپنے آپ کو آزاد سمجھنے والے گوشہ نشین خانقاہیت کو چلانے والوں کا مسکن ہے۔ علامہ صاحب اس میں کیسے پھنس گئے؟ کیا اس کفریہ عقیدہ کا ثبوت اور دلیل قرآن اور حدیث صحیح سے ملتا ہے؟ آخر اتنا طوفان علامہ صاحب جیسے آدمی کے ذہن میں کیسے آیا؟ اور قلم اس کی تحریر پر آمادہ کیسے ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا جو مطلب علامہ صاحب یہاں لے رہے ہیں۔ وہ سراسر غلط ہے بلکہ گمراہ کن ہے، اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا بیان قرآن و حدیث میں مفصل بیان کیا گیا ہے یہ آخرت میں ہوگا جب زمین و آسمان تبدیل ہو کر کوئی دوسری صورت اختیار کریں گے:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ ﴾ [ابراھیم : ٤٨]

لہٰذا اس مفصل بیان کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے ایک گمراہ کن عقیدہ یا نظریے کا اختراع کرنا کون سی قرآنی خدمت ہے اور کون سی ہدایت ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ اللہ کی ملاقات کی تفصیل علامہ صاحب کے خیال میں ایک ان ہونی بات ہے تو انسان کی روح کا اللہ کی روح سے ایک ہو جانا کیسے ممکن ہے؟ سچ ہے کہ:

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ [الحج : ٦٧]

آگے علامہ صاحب نے: ''ونفخت فيه من روحي'' کو دلیل کے طور پر پیش کیا حالانکہ اس کا مطلب علامہ صاحب سمجھے ہی نہیں، قرآن کریم میں بیشتر مقامات پر بیشتر چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے مثلاً:

﴿ طَهِّرَا بَيْتِيَ ﴾ [الحج : ۱۲۵]

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ۔نعوذ باللہ! کعبۃ اللہ کی چودیواری میں محصور ہے؟

﴿ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ﴾ [الشمس : ۱۳]

کیا اس اونٹنی پر ۔نعوذ باللہ! اللہ سوار ہوئے تھے؟ حالانکہ پہلی آیت کریمہ میں بیت کی نسبت اللہ کی طرف تعظیمی اور تشریعی ہے اور دوسری آیت میں ناقۃ کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ وہ اونٹنی محض اللہ تعالیٰ کی قدرت سے معجزانہ طور پر پیدا ہوئی تھی۔ (یعنی سیدنا صالح علیہ السلام کی اونٹنی اسی طرح من روحی بھی روح کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے کی گئی ہے کہ یہاں ملک اور قدرت کا اظہار مطلوب ہے یعنی ایسی روح جو اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اسی کی قدرت سے انسان میں پھونکی جاتی ہے لیکن اس کے برخلاف یہ سمجھنا کہ انسان اور اللہ کی روح الاعلیٰ ایک ہیں انتہائی ضلالت ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں ''ایک نا ایک دن یہ تمام اوصاف اور خصلتیں پیدا ہوں گی جو خدا میں ہیں'' علامہ صاحب بھی کرشمے دکھا رہے ہیں یک لخت انسان کو اللہ بنا دیا۔ علامہ صاحب کے کہنے کے مطابق ہی انسان میں اللہ کی روح ہے۔ اور انسان تو مختلف اقسام کے ہوتے ہیں کچھ مؤمن کچھ کافر کچھ نیک بد کچھ یہ کیا یہ سب اللہ سے ایک ہو جائیں گے یا ان میں فرق ہوگا؟ اگر فرق نہ ہو گا یہاں عمل اور سعی و کوشش کے کیا معنیٰ ہیں؟ اور اگر فرق ہو گا تو ان بدعمل لوگوں کے ارواح کہاں جائیں گے؟ ہے تو ان میں بھی اللہ کی روح نعوذ باللہ۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنی روح کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! عذاب دے گا؟ ''انسان'' جسم اور روح دونوں کا نام ہے اور قرآن میں ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے:

﴿ خَلَقَ الْإِنسَانَ ﴾ [الرحمن : ۳]

پھر اگر انسان میں اللہ کی روح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اپنی روح کا بھی خالق ہے یعنی اللہ کی روح بھی مخلوق ہے کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے؟ علامہ صاحب جو یہ کہتے ہیں کہ بالآخر انسان میں اللہ کے اوصاف وخصائل پیدا ہو جائیں گے تو یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اوصاف انسان میں اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا یا کہ خود انسان؟ اگر خود انسان ہی یہ اوصاف وخصائل اپنے اندر پیدا کرے گا تو انسان بھی خالق بن گیا پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہر چیز کا خالق ہونا صحیح نہ ہوا حالانکہ قرآن فرماتا ہے:

﴿ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [الرعد : ۱۶]

بلکہ کچھ ان کا خالق اللہ نہیں خود انسان ہوا۔ لہٰذا انسان مخلوق نہ ہوا بلکہ خالق بن گیا لیکن اس میں بھی ایک عجیب الجھن پیدا ہوتی ہے کہ مخلوق اپنے آپ کا خالق کیسے بن سکتا ہے؟ اس معمہ کا کوئی حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کہو گے کہ یہ اوصاف وخصائل اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی نے انسان میں پیدا فرمائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو اتنی بڑی قوت حاصل ہے ایک مخلوق اور خاکی پتلا میں ایسے اوصاف خصائل پیدا کر سکتا جو خود اس کی ذات

میں ہیں اور اس طرح یہ انسان اللہ کے ساتھ ایک ہو جائے گا۔ جب اتنی قوت کا وہ مالک ہے تو پھر قرآن کریم اور صحیح احادیث میں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیدار کا جو اثبات ہے ان سے انکار کیوں کیا جاتا ہے؟ اسے مستبعد اور ناممکن الوقوع کیوں تصور کیا جاتا ہے؟ کیا اللہ رب العالمین کا دیدار (جس کا قرآن اور حدیث میں ذکر ہے) انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا ہونے سے بھی مستعمد ہے؟ حالانکہ اس غلط اور گمراہ کن نظریہ کا کتاب عزیز میں اتا پتا بھی نہیں ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا بیان تو تمھیں ناممکن نظر آئے اور اپنا اختراعی اور بے بنیاد نظریہ تمھیں بالکل قرین عقل وقیاس سمجھ آئے عزم بالجرم کہہ رہے ہو کہ آخر ایسا ضرور ہوگا؟ احادیث تو بے شمار ہیں جو صحاح ستہ اور دیگر احادیث کی کتب میں موجود ہیں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا لیکن قرآن کریم کی یہ آیت بالکل وضاحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا اثبات کر رہی ہے:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة : ٢٢-٢٣]

مگر آپ بتائیں کہ آپ کے اس واہی اور بیہودہ عقیدہ کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل ہے؟ کیا علامہ صاحب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ثم معاذ اللہ کوئی جھیل ہے کہ اس میں یہاں وہاں کا پانی آ کے جمع ہو، اور اس طرح ایک ہو جائیں؟ علامہ صاحب نے اللہ تعالیٰ کی کیا ہی قدر کی ہے یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ہندوانہ اور یونانی ضلالت سے بھرے فلسفہ کی واہیات چن چن کر انھیں قرآن کی تشریح قرار دیا جا رہا ہے کیا یہ عقیدہ عام انسانوں کی بے عملی وبدعملی کا ممد ومعاون نہ ہوگا؟ یقیناً ہوگا کیونکہ جب وہ معلوم کریں گے کہ ایک دن بالآخر ہم اللہ تعالیٰ سے ایک ہو جائیں گے تو پھر یہ عمل وایمان کی پیہم جد و جہد کس کام کی؟ کیوں خواہ مخواہ نفس کو مشقت میں ڈالیں اور اعمال شاقہ برداشت کریں؟ بلکہ انھیں یہی سمجھ آئے گا کہ خوب نفسانی خواہشات کی تکمیل کریں اور عیش وعشرت بلاتفریق جائز ناجائز کی خوب داد دے اور اس طرح عمل کریں۔

بابر عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست گویا رند کے رند رہے

میرا یہ کہنا غلط نہیں ہے بلکہ علامہ صاحب کا جنت وجہنم کے بارے میں تصور بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ بہر حال اس نظریہ کی خوب پرچار کریں اور پھر بے عمل پیدا کرنے کے لیے مزید کسی ملحد کی کوشش کی کوئی خاص ضرورت نہ رہے گی۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

تھوڑا آگے چل کر "سورہ دہر" کی ان آیات:

﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ○ اِنَّا خَلَقْنَا

الْاِنسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [الدھر : ۱۔۲]

کا ترجمہ بالکل غلط کیا گیا اور یہ خیانت اپنے بے بنیاد اور بے دلیل نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ دوسری آیت آپ کے الفاظ:

﴿ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [الدھر : ۲]

کا دانستہ طور پر یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ ''آگے چل کر ہم اسے بڑا سننے اور لکھنے والا بنائیں گے۔'' (یعنی اسے یہ مرتبہ مزید ارتقاء کے بعد اصل ہوگا) ناظرین کرام! انصاف فرمائیں کہ اس ترجمہ میں کتنی بڑی خیانت کی گئی ہے اپنی طرف سے اس میں (اپنے مطلب برآوری کے لیے) اضافہ کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ جناب والا! ''آگے چل کر'' یہ الفاظ قرآن کے کس لفظ کا ترجمہ ہیں؟ پھر یہ بھی دیکھیں کہ آیت کریمہ میں لفظ ''جعلناہ'' ہے جو زمانہ ماضی کا صیغہ ہے۔ مگر علامہ صاحب ایک غلط اور اختراعی خیال کو ثابت کرنے کے لیے اس کا ترجمہ کیا ہے ''بنائیں گے'' جو زمانہ مستقبل ہے۔ کیا علامہ صاحب کو زمانہ مستقبل اور ماضی کا فرق معلوم نہیں تھا؟ اگر نہ تھا تو پھر قرآن جیسی مقدس کتاب کی ترجمانی کی کیا ضرورت تھی اور اگر فرق معلوم تھا تو پھر جان بوجھ کر زمانہ ماضی کا معنی زمانہ مستقبل میں کرنا یہ قابل نفرت خیانت نہیں ہے؟ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ ایسا ناروا سلوک؟

﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴾

[مریم : ۹۰]

دراصل اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان پر ایسا وقت گزر چکا ہے، جب وہ کوئی چیز بھی نہ تھا اس کے بعد اسے ایک ملے جلے پانی سے پیدا فرما کر سننے اور دیکھنے والا بنایا گیا۔ اس سے اس حقیقت پر دلیل مقصود تھی کہ جو ذات انسان کو عدم سے وجود بخش کر ایک بے شعور نطفہ سے اسے باشعور سننے اور دیکھنے والا بنانے پر قادر ہے اور اس قدرت کا ہر انسان ہمیشہ مشاہدہ کرتا رہتا ہے کیا یہ ہستی تعالیٰ وتقدس یہ قدرت نہیں رکھتی کہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ انسان بنائے اور اس گذشتہ زندگی کا حساب کتاب لے اور اس کے اعمال کے مطابق جزا وسزا دے؟

دیکھیں! اصل مطلب اور علامہ صاحب کے وہمی اور اختراعی طبع زاد مطلب میں کتنی تفاوت ہے۔

بین ره از کجاست تا بکجا!

علامہ صاحب کی مزید گل افشانی ملاحظہ کریں۔ ''پھر اس میں یہ بھی لیاقت رکھی گئی ہے کہ وہ (خدا کی طرح) بڑا سننے اور دیکھنے والا بن جائے، گویا اس آزمائش وابتلا کے بعد آئندہ زمانہ میں انسان کو یہ درجہ نصیب ہوگا کہ وہ اسی سمع وبصر کی وجہ سے اللہ کی طرح ہو جائے گا۔'' استغفر اللہ! زمانہ ماضی کے لفظ کا معنی زمانہ

مستقبل کا معنی بنا کر اس پر بنیاد کر کے ایک باطل اور گمراہ کن نظریہ لے کر علامہ صاحب اوپر کو چلے گئے۔

خشت اول چوں نہد معمار...... تا ثریا مے رود دیوار کج

علامہ صاحب کے عقیدت مندوں اللہ کے واسطہ یہ تو بتاؤ کہ ''اللہ کی طرح اس لفظ کا ترجمہ ہے قرآن کی مذکورہ آیت کے کس لفظ سے نکالا گیا ہے؟ کیا ان کفریہ الفاظ کی طرف آیت مذکورہ میں محض کوئی اشارہ بھی ہے؟ کیا تم سے اللہ تعالیٰ کے دربار میں باز پرس نہ ہو گی کہ اتنی اندھی تقلید! کہ میری کتاب مجید سے ناروا سلوک کیا جا رہا تھا پھر بھی تم آنکھیں بند کر کے اس پر سے چلے گئے۔ تعجب ہے کہ جب یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثل ہے جیسا کہ علامہ صاحب خود صفحہ ۳۶ پر تسلیم کرتے ہیں پھر انسان کے لیے یہ کیسے ممکن ہو گا کہ وہ اللہ کی طرح سمیع بصیر بن جائیں اس سے مل کر ایک ہو جائے اس صورت میں اللہ تعالیٰ بے مثل تو نہ ہوا خود سوچیں اس سے تو بے شمار لاتعداد اس کے مثل بن گئے۔ اللہ اکبر پھر ستم بالائے ستم یہ لکھا ہے: ''جیسے انجیل میں ہے'' افسوس! کہ علامہ صاحب ص ۹ پر گذشتہ صحف کے محرف ہونے کی وجہ سے ان کی تصدیق کے منکر ہیں اور یہاں ان محرف صحف میں سے ایک کو اپنے فضول دعویٰ کے اثبات کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا

صفحہ ۱۴۱ پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے ''اسی طرح مکمل طور پر سمیع اور بصیر انسان سے جو اس نے لاکھوں کروڑوں سالوں کے ارتقاء کے بعد پیدا کیا تھا'' اس میں بھی وہی مذکورہ نغمہ سرائی کی گئی ہے مزید اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ علامہ صاحب بھی ''ڈارون'' کے غلط اور بیہودہ نظریہ کا قائل اور معتقد ہے۔ حالانکہ ڈارون کا یہ نظریہ سرتاپا غلط بے بنیاد اور بے دلیل ہے علمی دنیا میں اس کی رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی وقعت نہیں۔ ہاں اتنی پردہ داری کی ہے کہ خدا نے انسان کو لاکھوں کروڑوں سالوں کے لیے ارتقاء کے پیدا کیا ہے یعنی دوٹوک الفاظ میں ڈارون کی حمایت نہیں کی کہ انسان خود بخود دان مفروضہ سے گزر کر اس منزل پر پہنچا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے کہ اس لیے کہ کہیں کوئی معتقد بدظن نہ ہو جائے۔ اگر عدل وانصاف سے سوچے کہ علامہ صاحب کے مذکورہ نظریات اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی، ہاں صرف ایک ذہنی اور موہوم تصور رہے گا جسے عملی اور واقعاتی دنیا میں کوئی دخل ہی نہیں اور نہ ہی اس سے کوئی تعلق ہے اور اس قسم کا تصور اللہ تعالیٰ کے بارہ میں حد درجہ گھٹیا تصور ہے۔ اسی پیرائے کے آخر میں ہے کہ ''کائنات مکمل طور پر تسخیر کرنے اور مکمل طور پر صاحب علم بننے سے ہو سکتی ہے (یعنی اللہ سے ملاقات) اس کا مطلب ہم ہیچ مندوں اس کے علاوہ کوئی دوسرا سمجھ میں نہیں آتا کہ ''خدا ہمہ اوست'' باوجود بے ہودہ ذہنیت رکھنے والوں کی طرح یک جان ہے اس سے جدا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا اس کائنات کی تسخیر ہو گئی تو گویا خود خدا کو معاذ اللہ گرفتار کر لیا گیا، یہی اس سے ملاقات ہے یا انسان جب (اللہ کی طرح) مکمل سمیع بصیر بن جائے گا تو

اللہ تعالیٰ سے ایک ہو جائے گا۔ یہی اس ملاقات ہے یہ عقیدہ علامہ صاحب اور اس کے حواریوں کو مبارک ہو ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں کہ اس عقیدہ اور یہ عقیدہ رکھنے والوں سے بیزار ہیں۔ تو اس عقیدہ اور یہ عقیدہ رکھنے والوں سے بیزار ہیں۔ اللھم اشھد!

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا یہ مطلب تو اس بے سند حدیث کے بھی خلاف ہے جو ص ۴۳ پر پیش کی گئی ہے:

(( کُنتُ کنزا مخفیا فاجبت ان اعرف فخلقت خلقا ))

اس لیے کہ اس میں بیان ہوا ہے کہ مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا کہ خود پہچانا جائے پھر اگر اس کائنات کی تسخیر اور انسان کے مکمل سمیع بصیر بننے سے ہی اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہو سکتی ہے (حالانکہ انسان میں اسی کائنات کا جز ہے) تو پھر یہ کہتے کا کیا مطلب ہوا کہ خود کو ظاہر کرنے کے لیے مخلوقات بنائیں؟ یعنی جب یہ کائنات (جس میں انسان بھی ہے) خدا ہیں تو پھر خود ظاہر کرنے کے لیے مخلوقات کو پیدا کرنا بالکل بے معنیٰ ہے اور یہ انتہائی مجمل فقرہ ہے خود ہی غور کریں۔ ہو سکتا ہے کوئی جاہل یہاں:

﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرہ: ۱۵٦]

یا ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾

کو اپنے غلط مطلب کے لیے پیش کرے اور یہ کہے کہ قرآن خود فرما رہا ہے کہ ایک دن تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے، یعنی اس سے مل کر پیوست ہو کر ایک ہو جاؤ گے یہ مطلب لینا اپنی جہالت اور بے علمی کا ثبوت دینے کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ کوئی...... تو نہیں کہ ادھر ادھر سے گھوم کر آ کر اسی جگہ جمع ہوں کچھ تو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ادب اور شان کا پاس اور لحاظ رکھنا چاہیے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا مطلب اس طرح ہے کہ جیسے کوئی کہے آج میں سلیم صاحب سے ملا ہوں پھر چند گھنٹے وہاں سے جا کر اِدھر اُدھر کے چکر لا کر پھر لوٹ کر سلیم صاحب کی طرف آیا تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ الفاظ کہنے والا لوٹ کر سلیم صاحب میں پیوست ہو کر ایک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا صاف مطلب (جو قرآن کریم اور سیدنا رسول اللہ ﷺ نے سمجھا ہے) یہ ہے کہ انسان کا اس زندگی کے بعد اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہونا اور اپنی پوری زندگی کا حساب کتاب دینا اور اسی اپنی زندگی میں کیے گئے اعمال کے مطابق نتائج سے دو چار ہونا بتائیں اس میں آخر کیا خرابی ہے اس میں کونسا یقین و اذعان ہے اور ایسا ایمان رکھنے میں کون سی الجھن پیش آتی ہے۔ الجھنیں اور بے شمار الجھنیں تو علامہ صاحب کے اس گورکھ دھندے سے پیش آتی ہیں ایسی پیش آتی ہیں کہ ان سے نکلنا مشکل نہیں بلکہ محال ہے۔ صفحہ ۴۲ پر یہ عبارت اپنی مثال آپ ہے۔ کیونکہ انسان کو اس عظیم الشان مرتبہ تک پہنچنے پر اسے خدائے عظیم کے مماثل اور انتہائی اقتدار کے لائق بنائے گا۔ کیا سمجھتے ہو؟ انسان میں اللہ کی مماثلت؟ واہ! ''یہ منہ اور مسور کی دال'' کیا یہ سب کچھ علامہ صاحب نے بیداری کے عالم میں لکھا ہے یا؟

کا کرشمہ ہے سچ تو یہ ہے کہ بار بار ایسی فضول اور جیسی باتوں یا شیخ چلی جیسے ہوائی باتوں کے بارے میں لکھنا قیمتی وقت کا ضیاع ہے مگر کیا کیا جائے کہ اس سلسلہ میں اچھی نیت لے کر (اللہ تعالیٰ میری نیت کو جانتا ہے) قلم اٹھایا ہے اب پیچھے ہٹنا مناسب نہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ۷۴]

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کے بارہ میں کسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے کوئی مثال گھڑ کر مثال بھی بیان نہ کریں یعنی ہم اپنی طرف سے کوئی مثال گھڑ کر ذہن نشین کرانا چاہیں تو اس کی بھی اجازت نہیں اس لیے کہ اس انسان بے مثل ذات والا صفات کے لیے اپنی طرف سے مثال بیان بھی کہاں کر سکتا ہے؟ لیکن اگر زبردست تمثیل کی کوشش کرے گا تو پرخطر راستہ پر گامزن ہو جائے گا۔ مگر علامہ صاحب کتنی جرأت سے کہتے ہیں کہ آگے چل کر انسان اللہ تعالیٰ کے مماثل بن جائے گا۔

مت کریں خدائی کا دعویٰ خدا کی قدرت ہے

صفحہ ۴۳ پر علامہ صاحب رقم طراز ہیں ''یہی خدا جس نے انسان کو اس لیے پیدا کیا تا کہ وہ ظاہر ہو کر خود اپنی مخلوق سے مل کر ایک ہو جائے گا تو پھر اس کائنات کے اس تماشہ اور ہنگامہ کو قائم رکھنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی......!! بار بار علامہ صاحب اس فرسودہ اور بے کار وہمی خیال کو دہرا رہے ہیں کہ اگر اس پوری ظاہر کائنات کا آخر انجام یہی ہے کہ انسان خدا سے مل کر ایک ہو جائے گا تو پھر اس پیہم عمل اور شب و روز کی جدو جہد اور زندگی کی گوناگوں کشمکش کی آخر کون سی ضرورت تھی؟ بھلا یہ خدا سے ملنے والے انسان جو مل کر ایک ہو جائیں گے وہ تو آئندہ زمانہ میں پتہ نہیں کب ہوں گے لیکن اس سے قبل ابتدائے کائنات سے اس مرضی اور موہوم مستقبل تک جو انسان انکا کیا بنایا کیا بنے گا یہ خدا سے مماثل ہونے کا شرف تو سید الاولین والآخرین ﷺ کو بھی حاصل نہ کر سکے کیونکہ مکمل تسخیر کائنات تو آپ کے ہاتھ پر نہ ہوئی کیا آپ بھی اللہ تعالیٰ سے واصل ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکیں گے؟ اور اگر آپ ﷺ فوت ہوتے ہی اللہ تعالیٰ سے مل کر ایک ہو گئے تو پھر مکمل تسخیر کائنات والوں کی ملاقات کا کوئی مطلب نہیں نکلتا اور اس کی کوئی معنی ہی نہیں بنتی۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی ایک سوال باقی رہتا ہے کہ جنھوں نے نیک اعمال نہ کیے کفر وانکار کا طریقہ اپنایا وہ کہاں گئے؟ کیا وہ بھی واصل باللہ ہو گئے ہوں گے، فی الحال حوالہ حوالات ہیں یا وہ کسی طور پر شرف حاصل نہ کر سکیں گے؟ اگر وہ بھی واصل ہو گئے یا ہوں گے تو پھر نیک صلحاء مؤمن ومتقی اور بدعمل کافر اللہ تعالیٰ کے منکر میں کیا فرق رہا اور اگر وصال سے محروم میں تو آخر وہ کہاں ہوں گے؟ آخر وہ بھی انسان ہیں اور انسان میں علامہ صاحب کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی روح ہے ان کے لیے جو بھی مستقبل علامہ صاحب تجویز کریں گے اس پر بحث ہو گی اور اس کے متعلق کئی سوالات اٹھیں گے جن کے جواب سے عاجز ہو کر علامہ صاحب اینڈ

کمپنی انصاری کی طرح یہ جواب دیں گے کہ بھائی یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ یہ انسانی عقل کی سرحدوں سے ماوراء ہے اس پر آنکھیں بند کر کے ایمان رکھنا ہے اور آمنا وصدقنا کہنا ہے اور بس مولانا آزاد نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ''ایک فلسفہ اور علم کلام کا ماہر پوری تخمین کی وادی میں غوطہ زن ہونے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو اکہ یہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔'' سچ ہے کہ قرآن وحدیث سے ہٹ کر جو ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے گا وہ انھیں سے حل تو نہیں کر سکتا لیکن انھیں مزید الجھا دیگا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے کتنا حقیقت افروز شعر کہا ہے:

علمے کہ نہ مأخوذ از مشکوٰۃ نبی است     واللہ کہ سیرابی ازان تشنہ بھی است

ان تمام باتوں سے قطع نظر اگر علامہ صاحب کا یہ نظریہ (اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے بارہ میں) صحیح ہے تو قرآن کریم میں جو جنت وجہنم کے بارہ میں بالتفصیل مختلف سورتوں میں مختلف اسلوب وانداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں یہ یہ نعمتیں اور لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرنے کی اشیاء ہوں گی صرف یہ مختصر الفاظ مبارک:

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ﴾ [زخرف: ۷۱]

ہی ان نعمتوں کے صحیح تصور پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں اور جہنم میں یہ یہ عذاب کے انواع ہوں گے کیا یہ سب فریب اور دھوکا ہے؟ یہ سب جھوٹ ہے کیا اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کے ذکر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع اور اعمال کے لیے لالچ دی ہے؟ کیا اصل حقیقت کے اظہار سے اللہ عزوجل تعالیٰ وتقدس خائف تھے کہ اس طرح کی (علامہ صاحب کے زعم کے مطابق)...... مخلوق کو ڈال دیا اور علامہ صاحب ہی آکر اس حقیقت کو واشگاف نہ کرتے تو۔ تیرہ صدیاں تو گزر چکیں ہیں لیکن آئندہ دنیا بھی معلوم کب تک اس دھوکہ و فریب میں بھٹکتی رہتی۔ اللہ کے بندے کچھ تو سوچو کہ اللہ جل وعلا مثل حی وقیوم غنی کو آخر کیا ضرورت پڑی کہ جنت کی ہی نعمتیں ذکر کر کے صالحین سے وعدہ فرما کر انھیں اپنی طرف راغب کیا قرآن فرماتا ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَٰلَمِينَ ﴾ [العنکبوت: ٦]

جب وہ رب تعالیٰ تمام جہانوں سے بے پرواہ اور بے نیاز ہے تو اسے کیا ضرورت پڑی تھی یہ لالچیں دینے کی اسی طرح بدعملوں، منکروں وکفار کو خالی دھمکیوں سے کیا حاصل؟

﴿ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴾ [الانساء: ۸۶]

یعنی اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی بھی سچی بات کرنے والا نہیں، لیکن علامہ صاحب کی مکمل تحریر کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید وفرقان حمید۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ صرف جھوٹ اور بے سروپا باتوں پر مشتمل ہے اگر یہ عقیدہ علامہ صاحب کا ہے تو ایسی کتاب کی لوگوں کو دعوت دے کر علامہ صاحب آخر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا خواہ ہر سچے مؤمن کا یہ ایمان ہے قرآن کا ایک ایک لفظ صداقت سے لبریز ہے۔ انسانیت کے لیے یہ

کتاب ہمیشہ کے لیے روشنی اور ہدایت ہے۔اس میں ذرہ برابر کوئی شک نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی بات ہے بے چین اور تذبذب کی وادی میں پھینک دے بلکہ یہ کتاب تو شک واضطراب،ضلالت و جہالت کے ظلمات سے نکال کر عرفان و ہدایت اور علم وحقیقت کے نور سے منور کرتی ہے،لیکن افسوس! ہم مسلمان اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب سمجھنے کے باوجود اس سے کئی منزلیں دور ہو چکے ہیں اور مزید بھی ہوتے جا رہے ہیں۔رب کریم تمام مسلمانوں کو راہ ہدایت نصیب فرمائے اور دنیا وآخرت کی کامیابی سے سرخرو فرمائے اللھم آمین!

راقم الحروف کو گونا گوں مصروفیتوں کے باوجود رسالہ ''پیغام ہدایت'' کے بارہ میں عرض کرنا تھا۔عرض کیا ہے کہیں طوالت وتفصیل سے کام لیا ہے کہیں مختصر اور ضروری وضاحت اور ناگزیر ارشادات پر اکتفا کیا ہے میرا ارادہ جیسا کہ ابتدا میں وضاحت کی تھی کہ بحث برائے بحث کا نہ تھا،نہ ہی میں خواہ مخواہ تنقید کا شائق ہوں مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے دیگر بھی اس سے بڑھ کر مفید نتیجہ خیز مصروفیات اور مشغولیات ہیں مگر ایسا رسالہ پڑھنے کے بعد میرے بس میں نہ رہا کہ شیطان اخنس کی طرح خاموش رہوں،اللہ تعالیٰ میری نیت کو بہتر جانتا ہے۔

یہاں جو کچھ لکھا ہے یہ بھی اسی کا اپنا فضل ہے اس لیے ہر حال میں اسی کا شکر ہے:

(( اللھم مالی من نعمة فمنك وحدك لاشريك لك فلك الحمد ولك الشكر يا ارحم الراحمين ))

اب یہ فرض ہے کہ اس کا انصاف کی نظر سے مطالعہ کرو بے جا حمایت اور حمیۃ الجاہلیہ سے گریز کرو،یقیناً اگر بے جا غلو اور افراط اور اندھا اعتقاد اور جامد تقلید سے اجتناب کر کے عدل انصاف کے دامن کو تھام کر میری گذارشات پر غور کرو گے تو تمھیں صحیح فیصلہ کرنے میں کوئی دقت اور پریشانی نہ ہوگی۔ان شاء اللہ العزیز

وماعلينا الاالبلاغ و آخردعونا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على خير خلقه محمد النبى الامى نبى الرحمة واله وأصحابه وازواجه وذرياته وأهل بيته أجمعين و بارك وسلم تسليما كثيرا

انا احقر العباد

محب اللہ شاہ عفا اللہ عنہ

۵ رجب ۱۳۹۸ھ

۱۲ جون ۱۹۷۸ء

المقالة السادسة

# التبصرۃ علی کتاب کما رائت

## جو میں نے دیکھا

''سید غلام مرتضیٰ'' جو جی، ایم، سید کے نام سے مشہور و معروف شخصیت تھیں۔ انھوں نے بھی کئی کتاب تحریر کیں اور نوجوان نسل کا ذہن ہی تبدیل کر دیا۔ ان کی کئی کتابوں پر اعتراضات اٹھے اور ان کی اکثر نظریات کو اسلام کے خلاف قرار دیا گیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس بھی ایک کتاب ''کما رائت'' آئی جس کا جواب بڑے ہی احسن انداز میں محترم جناب محمد موسیٰ صاحب نے دیا۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جب ان کا جواب پڑھا تو ان کو تحسین کا خط تحریر کیا جو کہ قابل اشاعت تھا اسی لیے افادہ عامہ کے تحت اس کو شایع کیا جا رہا ہے۔۔ ''الازہری''

❀❀❀

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حامداً ومصلياًومسلماً جليل القدر محترم المقام برادرم وعزيزم محمد موسى صاحب حفظ عليه الله وفقه لما يحبه ويرضاه !

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته : امّا بعد

آپ کا ارسال کردہ مقالہ بنام ''جو دیکھا ہے میں نے'' ملا اول سے آخر تک پڑھا، مقالہ بے حد پسند آیا جزاکم اللہ خیرا! فی الحقیقت جی ایم سید صاحب کی کتاب ''جس طرح دیکھا ہے میں نے'' پر وقیع اور بھرپور انداز سے تنقید اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے حصے میں مقدر فرمائی تھی۔ یہی اسلوب انداز ہے جسے صحیح معنی میں تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے آپ صدبار تحسین وآفرین کے مستحق ہیں اور آپ کو اس علمی اور دینی خدمت انجام دینے پر لاکھ لاکھ مبارک اللہ کرے آپ آئندہ بھی اسی طرح سلجھے ہوئے انداز میں دین حق اسلام کی خدمات بجالاتے رہیں۔ آمین

پیر صاحب سرہندی نے بھی اسی سلسلے میں خامہ فرسائی فرمائی تھی، میں نے ان کی یہ کتاب پڑھی بھی تھی لیکن افسوس کہ محترم سرہندی صاحب کی تنقید یا مدافعت بجائے اس کے کہ وہ جی۔ ایم سید کے بے جا الزامات اور ناروا جملوں کا مؤثر جواب دیتے خود راقم الحروف کے خیال میں جی۔ ایم سید اور اس کے ہم نواؤں کے مقاصد فاسدہ کی ترجمانی کی ہے کیونکہ ذاتیات پر اتر آنا یا مخالف کے مقابلے میں یا اس کے جملوں کے جواب میں بدگوئی اور بدزبانی سے کام لینا شکست خوردی کی واضح علامت ہے شیخ سعدی رحمہ اللہ ''گلستان'' میں فرماتے ہیں کہ:

اذا يئس الانسان طال لسانه      كسنور مغلوب يصول على الكلب

جب انسان دوسرے تمام وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی زبان دراز ہو جاتی ہے۔

یعنی بدزبانی پر اتر آتا ہے جیسا کہ ایک مغلوب بلا کتوں پر حملہ کرتا ہے۔

کیونکہ اس طرز عمل سے مخالف یہ تصور کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے حریف کے ترکش میں اب کوئی تیر باقی نہیں رہا جو مجھے مارے اس لیے اب وہ بدگوئی کی نچلی سطح پر اتر آیا ہے مطلب کہ محترم سرہندی صاحب کی تنقید سے جی۔ ایم سید کی خرافات کا تو کوئی بھی محققانہ جواب فراہم نہ ہوا بلکہ مخالفین کے ذہنوں پر یہ تاثر بیٹھ گیا کہ واقعی جی۔ ایم سید کے اعتراضات وقیع ہیں۔ جو مسلمانوں کے پاس ان کا معقول جواب ہی نہیں ہے اس لیے تو بدگوئی اور ذاتیات پر حملوں اور بیکار زبانی جمع خرچ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمیں محترم سرہندی صاحب کے مذہبی جذبے یا مذہبی جوش و خروش پر اعتراض نہیں ہے بلکہ یہ حربہ محمود و محبوب ہے بلکہ اس جذبے کو حد کے اندر نہ رکھنے کا افسوس ہے آپ نے بھی تو یہ کتاب اسی مذہبی جذبے اور دین حق کی مدافعت میں تحریر فرمائی ہے۔ البتہ آپ نے اس بارے میں مقرر حدود سے تجاوز نہ کیا ہوتا تو یہ جذبہ نہایت مفید اور لائق تحسین بن گیا ہوتا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان میں جو قوتیں رکھی ہیں۔ مثلاً غضبانی، شہوانی، عقلی وغیرہ تو شریعت اسلامی ان کو ختم نہیں کرانا چاہتی بلکہ ایسی رہنمائیاں کرنا چاہتی ہے اور ایسے اصول بتاتی ہے جو ان قوتوں کو ریگولیٹ کریں اور وہ اپنی مقررہ حدود سے تجاوز نہ کریں۔

کسی انسان کے جان و مال، عزت و آبرو، اہل و عیال، اعزاء واقرباء، دوست واحباب پر کوئی ناروا حملہ کرتا ہے تو یہ غضبانی قوت ہی ہے جس سے یہ آدمی کا کام لے کر اس کو استعمال کر کے ان مذکورہ اشیاء کی مدافعت کرتا ہے ورنہ اگر یہ قوت انسان میں نہ ہوتی تو یہ ساری بے جا تعدیں اور ناجائز اذیتیں اور غیر واجبی زیادتیاں دیکھتے ہوئے ان کو غیرت نہ آئے گی نہ ہی وہ ٹس سے مس ہوگا۔ نہایت غلیظ اور گندے الفاظ کانوں سے سنے گا تب بھی اس کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگے گی۔ لیکن یہ غضبانی قوت ہی ہے جو ایسے نازک وقت پر اس کے کام آتی ہے۔

یہاں اس قوت کو بھی بے لغام بے روک ٹوک چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اس کو حد کے اندر رکھنے کے لیے شرعی ہدایات کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ اس طرح قوت شہوانی کو بھی ختم کر دینا اسلامی شریعت کی منشاء ہرگز نہیں ہے۔ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ ہم کو شادی کی طاقت نہیں ہے اس لیے ہمیں خصی ہونے کی اجازت دی جائے کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دی؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قوت کو انسان میں خود رکھا ہے کہ اس کی منشاء یہ نہیں کہ اس کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اسی طریقے سے انسانی سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے اور جب تک اس کارگاہ حیات کو رب تعالیٰ چلاتا رہے گا تب تلک یہی نمونہ نسل وتناسل کا باقی رہے گا۔

یہاں اس قوت کو بھی حدود کے اندر رہنے کے لیے اسلامی شریعت نے رہنمائی کی ہے۔ قوت عقلیہ کی اہمیت، وزن اور قدر و قیمت اور اس کی اعلیٰ درجے کی خوبی اور اس کی افادیت کا کوئی بھی عقلمند انسان انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن عقل کا دائرہ بھی محسوسات تک محدود ہے انسان اپنے حواس خمسہ سے جو کچھ معلوم کرتا ہے عقل اسی سے نتائج اخذ کرتی ہے لیکن اگر اسی بے بہا خوبی (عقل) کو انسان مابعد الطبیعیات ماوراء المحسوسیات اور محض روحانیہ امور وغیرہا میں کام لائے گا تو اسے قدم قدم پر سوئے ٹھوکریں کھانے، اندھیرے میں تیر پھینکنے کے اور کچھ ایسے مسائل کو بجائے حل کرنے کے اور بھی زیادہ الجھا دے گا۔

چنانچہ پہلے زمانے کے فلاسفوں نے جو نظریات پیش کیے آج کی سائنٹفک تحقیقات اور سائنسی تجربات و مشاہدات نے ان کو ایک ہی وار میں رد کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ [ بنی اسرائیل : ۱۳۶ ]

جو بات تجھے معلوم نہیں ہے اس کے پیچھے مت لگو۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا مسائل میں قیاس آرائیاں محض اندھیرے میں تیر چلانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہماری آنکھ کو دیکھنے کے لیے درست اور صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی خارجی روشنی تھوڑی یا زیادہ۔ ضرور ہونی چاہیے ورنہ کوئی آدمی کتنا بھی تیز نظر ہو لیکن اگر اس کے ساتھ روشنی بالکل نہیں ہے تو وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے گا۔ اسی طرح عقل بھی ہماری اندرونی آنکھ ہے ایسے مسائل میں اسے وحی کی روشنی نہ ہوگی۔ تو وہ مطلق کام کرنے سے عاجز آجائے گی۔ اسی لیے قوت عقلیہ کو ریگولیٹ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ وحی کی روشنی ہو۔ بعینہ اسی طرح مذہبی جذبہ بھی ایک بڑی مفید قوت ہے اور فی نفسہ محمود ہے لیکن افسوس کہ ہم اس مفید اور محمود چیز کو بھی اپنے غلط رویہ اور شرعی پابندیوں سے پہلو تہی کرنے سے مذموم اور بیکار بنا دیا دیتے ہیں۔ اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ہم نادان دوست کی طرح بجائے اپنی محبوب چیز کو بچانے کے اس کی مزید حملوں کے لیے آماج گاہ بنا دیتے ہیں اور یہ کوئی دینی خدمت نہیں ہے۔

ہر مقصد، ہر تحریک، ہر کام اور ہر بات کے لیے تین امور کی ضرورت ہے۔

① وہ کام یا چیز فی نفسہ نیک ہو۔

② اس کام کے کرنے کا مقصد یا اس کے متعلق نیت میں اخلاص بھی ہو۔

③ اس کام کے انجام دینے کے لیے طریقہ کار بھی صحیح ہو۔

اگر پہلی دونوں باتیں تو موجود ہوں لیکن اگر تیسری بات (طریقہ کار کا صحیح ہونا) نہ ہوگی تو نتیجہ ہرگز صحیح اور مطلوبہ نہ نکلے گا۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ ''گلستان'' میں فرماتے ہیں کہ:

ترسم کہ نہ رسی بکعبہ اے اعرابی     کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

''مجھے ڈر ہے کہ تو کعبۃ اللہ تک نہ پہنچ سکے گا کیونکہ تو نے جو راستہ پکڑا ہے وہ کعبۃ اللہ کی طرف نہیں البتہ ترکستان کی طرف جاتا ہے!''

بہر حال کوئی بھی کام فی نفسہ کتنا بھی اچھا ہو اور اس کے کرنے والے کی نیت بھی اگرچہ خالص ہی ہو لیکن اگر اس کا طریقہ کار غلط ہے تو وہ کام یا تو انجام پذیر ہی نہیں ہوگا یا اس سے کوئی بھی مفید اور مطلوبہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔

سرہندی صاحب کا مذہبی جذبہ نہایت محمود ہے اس لیے کہ وہ اسلام کے مخالفین کے جواب کے لیے آمادہ ہوئے اور اس کی مدافعت کے لیے قلم اُٹھایا اور اس کی نیت پر ہم کوئی شک نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ یہ حسن ظن ہے کہ انہوں نے یہ خامہ فرسائی محض للہ فی اللہ سچے دین کی مدافعت کے لیے فرمائی لیکن افسوس کہ

اس جگہ پر بھی تیسری اہم بات یعنی طریقہ کار کا صحیح ہونا مفقود ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ جد و جہد کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔

کتاب وسنت نے ہماری زندگی کے تمام شعبہ جات میں رہنمائی فرمائی ہے دین حق کی تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے لیے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب میں وضاحت سے اصول بیان فرمائے ہیں۔ جس طرح قرآن کریم فرماتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل ۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور احسن وعظ کے ساتھ دعوت دے اور مجادلہ یا مناظرہ والی حالت میں بھی وہ طریقہ اختیار کو جو سب سے بہتر ہو۔''

سچے دین کی طرف دعوت کے لیے دو باتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

(الف) ایک تو اگر کسی ایسے آدمی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دینی ہے، جو خالی الذہن ہے یا دین حق کے برخلاف عمل پیرا ہے۔ لیکن اس وقت ضدی اور معاند نہیں ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ اصل حقیقت کے انکشاف کے بعد وہ اپنی اس مخالفت کو چھوڑ کے راہ حق پر آجائے گا تو اس صورت میں اس کو دین حق کی طرف دعوت دینے کے لیے دانائی سے کام لینا ہے۔ محل وقوع کو دیکھنا ہے جس کو دعوت دینی ہے اس کی حیثیت اور پوزیشن کو بھی خیال میں رکھنا ہے وہ کس قدر اپنی اس گمراہی میں راسخ اور پکا ہے اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر اس کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے راستے کی طرف دعوت دینی ہے اس کا نام ہے حکمت سے دعوت دینا اور اس دعوت میں جو الفاظ استعمال کرنے ہیں یا دعوت جو اسلوب و انداز ہو وہ بھی نہایت بہترین ہونا چاہیے اپنے وعظ میں کسی بھی ایسے لفظ یا عبادت کو کام میں نہ لایا جائے جو ان مدعو انسانوں کو بجائے کچھ سنجیدگی سے غور کرنے کے اس کے نفس کو ٹھیس پہنچنے کے سبب ہدایت سے دور کردے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

نفس ہر کس کم تراز فرعون نیست لیکن اوراعوں ماراعون نیست

یہی سبب ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ:

﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [الانعام: ۱۰۸]

''وہ لوگ مشرک جو معبودان باطلہ کو پکارتے ہیں (مسلمانو) تم ان کو بھی برا نہ بولو ان کو گالی نہ دو۔''

جب کہ مسلمانوں کو مشرکین سے بھی بدتمیزی کرنے سے منع فرمائی گئی ہے تو ان مسلمانوں کو جو اپنی

جہالت اور کسی دوسرے سبب سے حق سے دور ہو گئے ہیں کیسے گالی گلوچ کی اجازت مل سکتی ہے؟ بلکہ ان کو بھی راہ راست پر لانے کے لیے حکمت اور موعظۃ حسنہ سے کام لینا ہے۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَقُلْ لِعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [بنی اسرائیل]

''اور میرے بندوں کو فرمایئے کہ تبلیغ کے سلسلے میں وہ ایسے الفاظ یا دعوت الی اللہ میں نہیں ہونا چاہیے جو تہذیب کے خلاف ہو اور سننے والے کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہو۔''

مطلب کہ دین حق کی طرف دعوت کے لیے پہلا گر یہ ہے کہ وہ حکمت اور موعظہ حسنہ سے لبریز ہو۔

(ب) دین حق کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں کچھ ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو معاند، حددرجے کے ضدی اور حق سمجھنے کے باوجود بھی محض ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے۔ اپنے اس ضد وعناد کی وجہ سے بسا اوقات دین حق، داعی برحق اور اس کے متبعین پر ناروا حملے بھی کرتے ہیں ان کے شان میں گستاخانہ اور بیہودہ الفاظ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے نبٹنے کے لیے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے بلکہ فرمایا کہ:

﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [بنی اسرائیل : ۱۲۵]

اور ان سے مقابلہ یا مجادلہ ومناظرہ بھی س طرح کریں جو بہترین نمونے اور عمدہ اخلاق کا مظہر ہو۔ ظاہر ہے کہ جی۔ ایم سید صاحب بھی اس دوسرے زمرے میں شامل ہے کیونکہ وہ معاند بھی ہے اور ضد پر کمر بستہ بھی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسلام اور داعی اسلام حضرت محمد ﷺ پر بھی ناروا حملے کرتا رہا ہے۔ اس کی شان میں نہایت گستاخانہ اور بیہودہ الفاظ اپنی تصنیفات میں لکھنے کا عادی ہے۔ اس صورت میں اہل اسلام اہل علم اور صالح ودیندار افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کے ان حملوں کی مدافعت کریں۔ اس کی بے جا تنقیدوں کا معقول اور دندان شکن جواب دیں اور اسلام کی صداقت اور حقانیت کو اجاگر کریں۔ جی! ایم سید نے اپنی جاہلانہ تنقیدوں نے مناظرہ کا بازار گرم کررکھا ہے اسے اپنے احسن جوابات سے جو بلند اخلاق کے مظہر ہوں۔ جو تہذیب کے دائرے سے ایک بال جتنا بھی باہر نہ ہوں۔ اس کو ٹھنڈا کریں لیکن ان کو یہ ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ساری اخلاقی حدیں پھیلاند کر اس طرح کھڑے ہو جائیں جس طرح کا طریقہ جی ایم سید نے اختیار کیا ہے اگر ایسا کیا جائے گا تو پھر اس میں اور مدافعت کرنے والوں میں کیا فرق رہے گا؟

بارگاہ رسالت پر کفار نے کیا کیا حملے نہ کیے حضور اکرم ﷺ کے شان میں کیا کچھ نہ کہا گیا۔ شاعر ہے، کاہن ہے۔ اس پر کسی نے جادو کیا ہے خود جادوگر ہے اور مجنون ہے۔ لیکن قربان جاؤں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کے اوپر کہ ان تمام الزامات کا ایسا تو جواب دیا کہ اس سے بہترین جواب کا تصور بھی مشکل ہے۔ ان

کو ان بدگوئیوں کا جواب اسی رنگ میں ہرگز نہ دیا گیا، نہ ان سے زبان درازی کی گئی بلکہ ان تمام بے ہودگیوں کا جواب ایسا تو معقول، مسکت اور بہترین دیا گیا جو دشمنان اسلام بھی ایسی بلند اخلاقی کے بے اختیار مداح بن گئے ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرکیف جی۔ ایم سید اگر اخلاقی حدود سے تجاوز کر گیا تھا تو ہمیں تو اس کی تقلید نہیں کرنی تھی۔ خوشی اور رضا میں تو ہر کوئی اپنے آپ کو حدود کے اندر رکھتا ہے لیکن مردوہ ہے جو ایسے غیظ وغضب کے موقع پر بھی اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھے ایسی حرکت نہ کرے جو اس کے عظیم مقصد کے لیے مضر بنے۔ شیخ سعدی ''گلستان'' میں فرماتے ہیں کہ:

بلے مرد آن کس است ازروئے تحقیق　　　که چوں خشم آید باطل نہ گوید

یہاں ازروئے تحقیق مردوہ ہے کہ جب اسے غصہ بھی آئے تو بیہودہ بات زبان سے نہ نکالے۔ جی! ایم سید کے اس رویے پر غصہ آنا فطری بات ہے البتہ اس غیظ وغضب کو حدود سے تجاوز نہ کرنے دیا جائے۔

الحمدللہ اسی طرح آپ نے جو رول ادا کیا ہے اس کی تعریف کرنے کے سوا رہا نہیں جا سکتا۔ متعدد جگہوں پر جی۔ ایم سید کے اقتباسات ایسے تو غلیظ اور حدود سے گرے ہوئے ہیں جو دین اسلام سے محبت رکھنے والوں کو ان کے پڑھنے سے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ان کے بیان سے قلم قاصر ہے۔ اور انسان بالکل بے قابو ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور شاید اس کی زبان سے کچھ ناگوار الفاظ جی۔ ایم سید کے برخلاف نکل بھی جاتے ہوں لیکن میں وثوق سے کہتا ہوں۔ آفریں ہو آپ کے قلم کو کہ ایسے نازک اور سنگین موقع پر بھی آپ کے قلم نے کج روی اختیار نہیں کی بلکہ اس کی ان ناروا اور جاہلانہ تنقیدات کا جس متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا ہے یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء

آپ نے اپنی اس کتاب میں ''سندھ جی ساياہ'' پر تنقید لکھنے کا بھی اظہار کیا ہے، اس کتاب کے مطالعے کے بعد اب تو ہم بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں کہ کب ہماری نظریں اس بے بہا امید کہ جلد یہ کتاب منظر عام پر لائیں گے تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندے اس سے مستفید ہوں۔ یقین ہے کہ اس کتاب میں یہی اسلوب و انداز ہوگا اور وہی رنگ وروپ ہوگا۔ آخر میں آپ کو کتاب میں کچھ باتیں ہیں ان کے متعلق اپنی گذارشات پیش کرتا ہوں امید کہ ناگوار نہ گزریں گی۔

① صفحہ نمبر ۷۵ پر ''اسلام میں نصب العین اہمیت الخ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے ''اب یہ مقصد اگر انفرادی ملکیت کو تحفظ دینے سے پورا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو قائم رکھنا چاہیے، البتہ اگر ان مقاصد کے لیے نیشنلائزیشن کی ضرورت پڑے تو ایسا کرنے سے بھی گریز نہ کیا جائے۔''

میری گذارش: نیشنلائزیشن سے مراد اگر انفرادی ملکیت کو بالکلیہ ختم کرنا ہے بعینہ اس طرح جیسے سوشلزم اور کمیونزم میں ہے تو یہ بات غیر صحیح ہے۔ اسلام کی کتنی ہی بنیادی باتوں کا بنیاد انفرادی ملکیت پر ہے مثلاً زکوٰۃ

وغیرہ اس کے بعد ورثہ ترکہ کے مسائل (جو قرآن کریم میں موجود ہیں) اور وصیت وغیرہ یہ تمام انفرادی ملکیت پر مشتمل ہیں اگر انفرادی ملکیت بالکلیہ ختم کی جائے گی تو ان تمام مسائل کا کیا حشر ہوگا۔ اسی طرح زمین پر شرعی عشر وغیرہ بھی اسی انفرادی ملکیت پر بنیاد رکھتا ہے اگر وہ ختم تو یہ بھی ختم علاوہ ازیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آزمائش دونوں طرح سے مالی وجسمانی ہوتی ہے اگر انفرادی ملکیت ختم ہو جائے گی تو مالی اعتبار سے بندوں کی آزمائش کس طرح ہوگی؟

مزید یہ کہ انسان کی خوبیوں میں جس طرح بلند اخلاقی انکساری، حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہیں۔ اس طرح غریب نادار لوگوں کی مدد کرنا، سخاوت کرنا، خیر کے کاموں میں خرچ کرنا اپنے پرائے لوگوں سے لین دین، صدقات خیرات نفلیہ وغیرہ وغیرہ والی خوبیاں اسی انفرادی ملکیت سے وابستہ ہیں، اگر یہ ختم تو انسانی ذات سے یہ خوبیاں تو ہمیشہ ہمیشہ ختم ہو جائیں گی۔ حالانکہ ان خوبیوں کی دوست دشمن ہر کوئی تعریف کرتا ہے ایسے انسانوں کی ثنا سے سارے لوگ رطب اللسان رہتے ہیں، کیا اسلام ایسے نظام کو برداشت کرے گا کہ انسان سے یہ کمالات اور خوبیاں یکسر ختم کردے؟ البتہ اسلام نے اس انفرادی ملکیت پر کچھ پابندیاں لگائی ہیں اور ان کے حصول اور صرف وخرچ کرنے کے لیے رہنما اصول بھی بتلائے ہیں ان پر صحیح نمونے سے پیروی کرنے پر ایک اوسط معاشرہ وجود میں آجاتا ہے اس طرح نہ تو ایک طبقہ دولت اور ملکیت کے اعتبار سے بالکل بلندی پر چڑھ جاتا ہے اور نہ دوسرا طبقہ بالکل نادار وکنگال بن کر نچلی سطح کے درجے کو جا پہنچتا ہے۔ اصل فطرت کا تقاضا بھی یہ ہے۔ قرآن کریم میں جابجا یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ اونچ نیچ قدرتی ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود یہ نظام بنایا ہے اس لیے کہ دونوں عالی اور سافل طبقے والوں کی آزمائش کرے۔ جن ممالک نے مصنوعی ذرائع سے اس تفاوت ختم کرنا چاہا ان کا حشر کیا ہوا یہ روس وغیرہ ممالک کی اس وقت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے جس میں ہر بصیرت رکھنے والے انسان کے لیے عبرت کا سامان ہے تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

④ صفحہ نمبر ۶ ۷ لیکن طرز حکومت بابت آپ لکھتے ہیں (اب اگر یہ مقصد جمہوری طرز حکومت کے ذریعے پورا ہوسکتا ہے تو بہتر ہے الخ) اس کے لیے بھی عرض ہے کہ برابر اسلام طرز حکومت کے بارے میں کوئی خاص نظام متعین نہیں کیا ہے، لیکن خلافی نظام جو امت طرز حکومت کے بہترین افراد نے عمل میں لایا وہ ایسا بہترین نظام تھا کہ ان کا نظریہ پہلے کی تاریخ میں ملا اور نہ پچھلے دور میں جب تک خلافت وملوکیت میں تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس جیسا بہترین نظام اس آسمان اور زمین میں پہلے نہیں دیکھا تھا رہی جمہوریت تو اس کا تجزیہ اس وقت تک دنیا کرتی آئی ہے اور نتیجہ کیا نکلا ہے؟ ٹائین ٹائین فش؟ کیا ابھی بھی اس کو آزمانا چاہیے؟ آزمائی ہوئی چیز کو جو آزمائے سو بیوقوف نہیں تو کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ ایک وقت تھا کہ امریکہ نے فیصلہ کیا کہ آج کے

**المقالة السابعة**

# جنة المفقوده

## گم شدہ جنت

شاہ صاحب رحمہ اللہ کے پاس کسی نے ایک مقالہ ارسال کیا جس کی مقالہ نگار کوئی عورت تھی، اس نے اسلام پر چند اعتراضات کیے جو قرآن پاک کی صریح نص کے خلاف تھے۔ اس مقالہ میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کا دندان شکن جواب تحریر کیا ہے۔ ''الازہری''

❀❀❀

**المقالة السابعة**

# جنة المفقوده

## گم شدہ جنت

شاہ صاحب ﵀ کے پاس کسی نے ایک مقالہ ارسال کیا جس کی مقالہ نگار کوئی عورت تھی، اس نے اسلام پر چند اعتراضات کیے جو قرآن پاک کی صریح نص کے خلاف تھے۔ اس مقالہ میں شاہ صاحب ﵀ نے اس کا دندان شکن جواب تحریر کیا ہے۔ ''الازہری''

❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلیل القدر محترم المقام برادرم وعزیزم محترم منصور صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ : امابعد!

مکتوب اور مقالہ وصول پایے یادگیری کے لیے مہربانی! محترمہ مقالہ نگار اچھی تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہے جو بھی تحریر کیا ہے وہ بھی اکثر بجا اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اس مقالے کے تحریر کرنے کا محرک اور جذبہ نہایت قابل قدر محسوس ہو رہا ہے، تاہم کچھ باتیں اس میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے قطعاً اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ صحیح نہیں ہیں۔ نیچے میں ان کے بارے میں اپنی گذارشات پیش کر رہا ہوں۔

صفحہ نمبر ۱۵ پر تحریر ہے کہ ''دیوداسیوں'' کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انہوں نے مافوق الفطرت ہستیوں کے چھوڑا الخ، یہ دیوداسیاں بھی آب گل تھیں۔ تربیت یافتہ تھیں ان کے بارے میں عوام کا جو بھی عقیدہ تھا لیکن انہوں نے ان کو آسمان سے اترنے والی حوریں قرار نہیں دیا تھا، جو ان کو'' ان کے عقیدے کے مطابق ہی سہی'' یا مافوق الفطرت قرار دیا جائے۔ آج کل پیر پرست لوگ بھی ان کے ان پیروں اور بھلے لوگوں کے متعلق کس قدر غلو وافراط سے کام لیتے ہیں اور ان کے بارے میں ان کے جو بگڑے ہوئے عقائد ہیں ان کے کاموں کا پتا نہیں ہے البتہ وہ عوام اس طرح نہیں کہتے کہ یہ انسان آب وگل کی پیدائش نہ تھے، بلکہ آسمان سے کوئی مافوق الفطرت ہستی بن کر اس عالم رنگ وبو میں جلوہ افروز ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس جگہ پر یہ عبارت محترمہ مصنفہ اپنی طرف سے لکھ رہی ہے نہ کہ ان عوام کا عقیدہ بیان کر رہی ہے اگر عوام کا عقیدہ بیان کرنا مقصود تھا تو اس عبارت کا یہ انداز نہ ہوتا۔ بہرحال یہ ذکر وہاں اچھا نہیں لگتا۔ واللہ اعلم۔

اسی صفحہ پر پردے کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ اسلامی پردے میں چہرے کی کھڑکی کھلی رکھی جاسکتی ہے اور اس کے لیے فریضہ سورۂ نور رکوع نمبر ۸ میں ایک دوسری بھی آیت ہے:

﴿ وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾

[النور : ٦٠]

''وہ عورتیں جو بڑی عمر کے سبب بیٹھ گئی ہیں اور انھیں اب نکاح کی کوئی توقع نہیں ہے تو ان کو اجازت ہے اور ان پر گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کپڑے اتار دیں، البتہ اپنے سنگھار مثلاً زرق برق

چمکدار لباس وغیرہ کو ظاہر نہ کرتی ہوں، البتہ انھیں اجازت کے باوجود بھی وہ عمر رسیدہ عورتیں اس اجازت سے فائدہ نہ لیں بلکہ اپنے پردے کو قائم رکھیں تو ان کے لیے یہ بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے۔''

ظاہر ہے کہ ان کپڑوں کے اتارنے کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ایسی عمر رسیدہ عورتیں بدن کے سارے کپڑے اتار کر مادر زاد ننگی ہو کر چلیں کہ ان کو اجازت ہے حاشا وکلا۔ بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں جس طرح منہ وغیرہ ڈھانپ کر اور پردے کی پوری طرح پابندی کرتی تھیں اسی طرح اس بڑھاپے کی حالت میں پابندی ان کے لیے ضروری نہیں ہے، یعنی اس بڑھاپے کی حالت میں اگر وہ غیر محرم سے اپنا منہ نہ ڈھانپتیں تو بھی حرج نہیں ہے۔ یہ آیت کریمہ جوان عورتوں کے لیے منہ وغیرہ ڈھانپنے پر نص اور واضح برہان اور حجت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کتنے ہی دلائل ہیں مگر طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیے جا سکتے۔ عقل مندوں کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

فریضہ حج والی مثال بھی برمحل نہیں ہے اس لیے کہ حج کے احرام کے لیے بعینہ اس طرح عورتوں کو منہ ڈھانپنے سے روکا گیا ہے جس طرح مردوں کو شلوار قمیص، سلا ہوا کپڑا، عمامہ، ٹوپی اور موزے پہننے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیر احرام کی حالت میں مرد یہ سارے کپڑے اور لباس پہنتے تھے اس لیے احرام کی حالت میں ان کو زیب تن کرنے سے روکا گیا ہے، چنانچہ اس طرح عورتوں کو احرام کی حالت میں منہ کھولنے کا حکم ہے اس لیے کہ احرام اور عام حالات میں وہ اپنا منہ ڈھانپتی تھیں اگر یہ عورتیں پہلے ہی سے منہ کھول کر چلتی تھیں تو پھر احرام کی حالت میں ان کو ان کا کھولنے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ لہٰذا فریضہ حج کی مثال تو خود ہمارے اسی موقف کو تقویت پہنچاتی ہے نہ کہ اس کی تردید اور اس امر کے باوجود احرام میں منہ کھلا رکھنا ''بھی حدیث میں آیا ہے'' کہ جب صحابیات رضی اللہ عنہن کے سامنے کوئی اجنبی مرد آجاتا تھا وہ آگے گزر جاتا تھا تو پھر وہ اپنی چادر ہٹا دیتی تھیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کا یہ فعل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہ رہا ہوگا۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس فعل پر تقریر تھی۔ اب آپ اس سے سوچیں کہ کس حقیقت کا اثبات ہوتا ہے؟ کیا یہ حقیقت اس قدر مخفی ہے جو اس کی وضاحت ضروری ہو؟

آگے چل کر صفحہ نمبر ۱۹ پر بھی محترمہ صاحبہ نے پردے کے متعلق کچھ فرمایا ہے وہاں کچھ باتیں نہایت قیمتی ہیں، لیکن حجاب کی معنی سے حیا وشرم وغیرہ لینا اور اس پر حضرت آدم علیہ السلام کے ایک قصے سے دلیل لینا محل نظر ہے۔

**اولاً:** جو باتیں وحی سے تعلق رکھتی ہوں یا انبیائے کرام علیہم السلام سے متعلق ہوں اس کے لیے قرآن یا حدیث سے دلیل پیش کرنا ضروری ہے، حالانکہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کے متعلق جو (اس سلسلے میں) قصہ لکھا گیا ہے

وہ قرآن یا صحیح حدیث سے نقل کا محتاج ہے۔

ثانیا: حجاب کے معانی لغت کے اعتبار سے یا عرف کے لحاظ سے اگرچہ حیاء یا شرم ندامت وغیرہ ہو بھی مگر اس مسئلے میں اس کا معنی یہ کرنا میرے خیال میں صحیح نہیں۔ کیونکہ اس مسئلے میں ''حجاب'' کا لفظ قرآن کریم کی سورۂ احزاب کے ساتویں رکوع پارہ نمبر۲۲ سے ماخوذ ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ [الاحزاب: ۵۳]

الآیۃ سے ماخوذ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ (مسلمانو! آپ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے کوئی سامان طلب کرو تو حجاب کے پیچھے سے طلب کرو) یہ بالکل نمایاں ہے کہ اس جگہ پر حجاب کے معانی شرم وحیاء قطعاً نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنا کہ ''آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو حیا وشرم کی پیچھے سے طلب کرو۔'' یہ کوئی مطلب نہیں بلکہ معنی ہے پردے کے پیچھے لہٰذا جب یہ لفظ ''حجاب'' جہاں سے ماخوذ ہے اس جگہ پر جو اس کی معنی ہوگی وہی اس مسئلے کے متعلق ہر جگہ کرنی پڑے گی نہ کہ کوئی اور۔

ثالثاً: حیاء، شرم، ندامت اور دوسرے ایسے بہترین جذبوں اور قوتوں کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر کوئی نہ کوئی حکم دیا ہے۔ مزید بحث مسئلہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے حیادار اور پاکدامن عورتوں کو اپنے فطری حیا اور پاکدامنی کے ثبوت کے لیے یہ حکم دیا ہے کہ تم (یعنی عورتیں) باہر نکلتے وقت اس طرح نکلو:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ [الاحزاب: ۵۹]

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں کو فرمائیں کہ باہر نکلتے وقت اپنے سارے بدن پر چادر اوڑھ لیں (یعنی برقعہ کی طرح سارا بدن ڈھانپ دیں) اس طرح یہ بات قریب ہے کہ وہ عورتیں متعارف ہوں گی کہ وہ باحیاء اور پاکدامن عورتیں ہیں نہ کہ بے پردہ عورتیں اور اس طرح کوئی اندر کا بیمار سر پھرا ان کو اذیت نہ پہنچا سکے گا۔''

آگے چل کر فرمایا گیا کہ ان مؤمنات کو ان پابندیوں کے باوجود منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے نہ رہ اور ان باحیا عورتوں کو کوئی تکلیف دیں تو ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنوں کو مسلط کرے گا اور پھر وہ مدینہ میں بالکل تھوڑا وقت رہ سکیں گے۔ وہ ملعون ہیں اور جہاں ملیں گے ان کو شدت سے قتل کیا جائے گا (وہی سورت مبارک) حاصل کلام کہ آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حیاء دار عورت کی ظاہری علامت یہ مقرر فرمائی کہ وہ عورت باہر نکلتے وقت اپنے سارے بدن کو پوری طرح ڈھانپ کر پھر نکلے گی اس کے برعکس جو کھلے بدن ظاہری پردے کے علاوہ نکلے گی۔ وہ پاکدامن اور حیاء دار نہیں ہے۔ بلکہ بے پردہ آوارہ ہے جو عورتیں اسی طرح اپنے آپ کو بلا حجاب کھول کر چلتی ہیں وہی گناہ کی طرف دعوت دیتی ہیں اور

سارے فتنوں اور فسادوں کی وجہ بنتی ہیں۔ لہٰذا محترمہ نے جو کچھ اس سلسلے میں لکھا ہے وہ سب سونا ہے البتہ ان سب کے لحاظ اور اتباع کے بعد بھی اس پردے حجاب یا منہ سمیت سارا بدن ڈھانپنے سے مستغنی نہیں ہوسکتی آخر خالق اکبر سبحانہ وتعالیٰ سے زیادہ انسانی فطرت (مرد خواہ عورت) کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟

﴿ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴾ [الملك: ١٤]

حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ٹھیک ہے کچھ جنگوں میں عورتوں کی شرکت نظر آتی ہے لیکن ان عورتوں کی جو پابندی تھی اور جس طرح وہ اپنے آپ کا اجانب سے اجتناب کرتی تھیں وہ محققین کو آج ایک حسین خواب ہی محسوس ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہ باتیں کہاں؟ البتہ اس کے ہوتے ہوئے بھی عورتوں کی جنگوں میں شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی بلکہ ان عورتوں نے عرض کیا کہ مردوں کو جہاد کا موقع ملتا ہے اس طرح وہ ثواب واجر میں آگے بڑھ جاتے ہیں تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: کہ آپ (عورتوں) کا جہاد حج ہے۔ اسی طرح مسجد نبوی میں عورتیں نماز پڑھنے آتی تھیں لیکن ان شرائط اور پابندیوں سے جو صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان سب کا لحاظ رکھ کر پھر بھی اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کی نماز سب سے افضل اپنے گھر کے اندر والے کمرے میں ہے اس ارشاد مبارک سے کیا معلوم ہو رہا ہے؟ کچھ خاص اجتماعات مثلاً عیدین میں عورتوں کو آنے کا حکم تھا لیکن ان کو مردوں کے بالکل پیچھے رکھا گیا علیحدہ رہنے کا حکم تھا۔ افسوس: کہ ہم آج ان نبوی ارشادات وفرمودات پر گہری اور غور وتدبر والی نظر ڈالنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں ان پر سے ایسے ہی سرسری طور پر نظر گھمائے گزر جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ۔ معاذ اللہ۔ ہماری توجہ کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اور اس کا جتنا دکھ کیا جائے کم ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

③ صفحہ نمبر ١٦ ابن مسکویہ کی کتاب ''تجارت الامم'' کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو لکھا گیا ہے اس کے متعلق کہا نہیں جاسکتا کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ آیا اس کی سند صحیح ہے یا نہیں کیونکہ یہ کتاب ہمارے پاس نہیں ہے مولانا شبلی رحمہ اللہ نے اس کا حوالہ دیا ہے ''الفاروق'' میں صرف یہ بات اس واقعے کے ثبوت کے لیے کافی ہے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس قسم کے واقعات کے لیے چھان بین نہیں کی جاتی اور ایسے ہی کسی کتاب سے دیکھ کر نقل کیے جاتے ہیں۔ ابن مسکویہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان میں کافی وسائط ہیں پتا نہیں ہے کہ مصنف مذکور نے اپنی کتاب میں یہ وسائط ورواۃ ذکر بھی کیے ہیں یا نہیں اور اگر ذکر بھی کیے ہیں تو پتا نہیں ہے کہ اس واقعے کے سارے راوی ثقہ ہیں یا کچھ ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں ان باتوں کے معلوم ہونے کے علاوہ اس کے متعلق کوئی بھی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ فاللہ اعلم۔

④ صفحہ نمبر ١٨ پر چند سطور کی ایک عبارت ہے میں نے اس پورے اقتباس پر لکیریں ڈال دی ہیں۔ یہ اقتباس ''عورت پرستی'' مرد کے لیے شاید ازلی دہیج بن گئی ہے۔ سے چل کر چھٹی سطر کے ''اپنے جذبات پر خود

حاوی رہے خود پر جذبات کو حاوی نہ ہونے دے‘‘ پر ختم ہوتا ہے۔ اس اقتباس میں چند باتیں سنگین اعتراضات کی حامل ہیں۔

(الف) محترمہ فرماتی ہے کہ ’’عورت پرستی مرد کے لیے شاید ازلی دیج بن گئی ہے‘‘ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود۔ نعوذ باللہ! انسان کے شریر میں ’’عورت پرستی رکھی ہے‘‘ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن سورۂ ’’تین‘‘ پارہ ۳۰ میں فرماتا ہے:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴾ [التين : ٤]

’’ہم نے انسان کو بہترین انداز میں تخلیق کیا ہے۔‘‘

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان بچے کو صحیح اسلامی نظریات پر پیدا کرتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ یعنی ہر بچہ اصل میں بالکل صاف وشفاف طبیعت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ اس میں کوئی بھی برائی نہیں ہوتی مگر پھر اس رنگ وبو کے عالم میں پہنچنے جیسا ماحول اسے میسر آتا ہے وہ اس کے کسی خاص رنگ میں (گو کہ وہ رنگ اس کی اصلی فطرت کے سراسر خلاف ہو) رنگ جانے کا باعث بنتا ہے۔ ’’عورت پرستی‘‘ تو ایک بہت بڑی برائی اور سخت گمراہی ہے لیکن انسان فطرت میں اللہ تعالیٰ نے کوئی چھوٹی برائی نہیں رکھی ہے، البتہ نیکی اور بدی کا الہام یا اس کی سمجھ اور شعور اسے ضرور عنایت کیا ہے فرماتا ہے:

﴿ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴾ [الشمس : ٨]

’’انسانی نفس کو اللہ تعالیٰ نے بدی اور تقویٰ کا الہام یا سمجھ عطا فرمائی ہے۔‘‘

لہٰذا انسان کے متعلق اس طرح کہنا کہ ’’عورت پرستی اس کا ازلی دیج ہے‘‘ بالکل غلط ہے اور اللہ تعالیٰ پر افترا ہے...... حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے یہ محض دانت پیسنے اور اللہ کے نبی ﷺ کی شان میں نہایت گھناؤنا اور سنگین بہتان ہے۔

اس مقالے میں چند مقامات پر قرآنی آیات بھی بطور دلیل ذکر کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ مقالہ نگار قرآن مجید کی طرف بھی مراجعت کرتی رہتی ہے لیکن صد افسوس اس مسئلے میں اس نے قرآن مجید کی طرف بالکل مراجعت نہیں کی ہے، حالانکہ کتاب مقدس (قرآن کریم) میں حضرت آدم علیہ السلام کا احوال مبارک کتنی ہی سورتوں میں مذکور ہے۔ کہیں مختصر طور پر کہیں بالتفصیل اگر محترمہ ان سورتوں کی طرف رجوع کرتی تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ ایسی فاش اور سنگین غلطی کا ارتکاب نہ کرتی۔ ہمارے پاس قرآن مجید من وعن موجود ہے اس کی کسی بھی سورت میں محترمہ والی یہ دانت پیس موجود نہیں ہے اور نہ ہی کسی صحیح حدیث میں اس کا کوئی نام ونشان بھی موجود ہے، صحیح حدیث میں صرف اس طرح آیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے غلطی اور بھول ہوئی۔ جس کی

وجہ سے یہ (غلطی ونسیان) اس کی اولاد میں منتقل ہوئی ہے اور اگر حواء (انسان ذات کی ماں) حضرت آدم علیہ السلام کی نافرمانی (واللہ اعلم کس معاملے میں) نہ کرتی تو کوئی بھی عورت اس کے شوہر کی خیانت یا نافرمانی نہ کرتی۔ اس صحیح حدیث سے صرف یہ معلوم ہوا کہ ابوالبشر اور ام البشر علیہما السلام کی غلطیاں ان کی اولاد کی طرف بھی منتقل ہوگئیں، اس میں یہ تو قطعی نہیں ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام نے حضرت آدم علیہ السلام پر ضد باندھ کر اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کیا: ((سبحانك هذا بهتان عظيم)) باقی اس غلطی اور نسیان کے متعلق تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔ ہاں! اگر کسی عالم وفاضل محترم نے اس کہانی کو ذکر کیا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود عالم ہے۔ کتنے ہی عالم انبیائے کرام کے متعلق خرافات نقل کر کے انبیاء کرام جیسی عظیم شخصیات کے متعلق کئی ایسی باتیں اپنے کتابوں کی زینت بنا بیٹھے ہیں جو ان مقدس ہستیوں کے لیے نہایت بدنما داغ ہیں حالانکہ وہ بالکل جھوٹ ہیں مثلاً حضرت داوٗد علیہ السلام کے اوپر ایک آدمی کی منکوحہ عورت کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش (معاذ اللہ) قرآن عزیز اور صحیح حدیثوں کے علاوہ دوسرے علماء فضلاء کے متعلق ہمارے لیے آسان ہے کہ ہم انھیں خاص اس امر میں غلط جانیں مگر اللہ کے انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق ایسے سنگین الزاموں کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہیں۔ مسیحی دنیا کی کتابوں میں واضح طور پر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ وہ پہلی عورت ہی تھی جس نے ضد باندھ کر مرد کو گناہ پر آمادہ کیا معنی مرد کو گمراہ کرنے میں (مسیحوں کے نزدیک) عورت کا ہی ہاتھ تھا۔ اس وقت کے مسیحوں کو چھوڑ کر جب پہلے والے مسیحیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت سے ان کے پاس کی حیثیت ٹھیکری اور مٹی کے ڈھیلے سے زیادہ نہ تھی۔ جن اسلامی علماء نے اپنی کتابوں میں یہ افسانہ لکھا ہے، انہوں نے بھی ان سے بغیر چھان بین کے نقالی کی ہے غالباً محترمہ مقالہ نگار بھی ان کی کتابوں سے یہ بیہودہ قصہ نقل کیا ہے جیسا کہ پردے کے متعلق تھا۔ پہلے والے لوگوں کی ماری ہوئی مکھی کے اوپر مکھی مارنے کو ''تحقیق'' کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ پھر اسی خرافاتی کہانی کی نقالی پر اکتفاء کر کے تو اللہ کے نبی ابو البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوپر بے تحاشا ''عورت پرستی'' کا الزام لگا دیا یاللعجب! سوچیں تو سہی ''عورت پرستی'' اور ''بت پرستی'' میں کونسا فرق ہے؟ جب نعوذ باللہ! ایک نبی شرک جیسا سنگین جرم کا ارتکاب کر چکا تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے کون سی رہنمائی کرے گا انبیاء کرام تو شرک کو مٹانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے، پھر خود ہی شرک کا ارتکاب کیسے کریں گے۔ کیا محترمہ اسی فرضی من گھڑت اور بے بنیاد الزام کو تسلیم کرنے کے باوجود اس طرح لکھ سکتی ہے کہ پہلے مرد نے عورت کے کہنے پر اللہ کے منع کردہ کام کا ارتکاب کیا؟ یعنی محترمہ صاحبہ کے خیال کے موجب اسی کیچڑ (الزام) کی صحیح ترجمانی کے لیے انبیائے کرام پر ''عورت پرستی'' کی نعمت لگانے کے علاوہ ہو نہیں سکتی تھی۔

فان كنت لاتدرى فتلك مصيبة وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم

(ج) محترمہ کی یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف اپنے اس مقالے میں یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ عورت کا اور سیدھے راستے سے ہٹ کر بے راہ روی اختیار کرنے میں اکثر مرد کا ہاتھ ہے اور اس کو اس تباہی اور اخلاقی بربادی کی گہرائیوں میں گرانے کا ذمہ وار مرد ہی ہے۔ اکثر کر کے اس کی یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن دوسری طرف یہی وہ واہی من گھڑت قصہ لکھ کر یہ ثابت کر رہی ہے پہلے مرد کو عورت ہی نے بے راہ روی پر مجبور کیا اور عورت نے زور وضد باندھ کر مرد کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کر دیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متناقض ہیں۔ اب ہم محترمہ کی ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات کو صحیح قرار دیں؟ اب آئیں خود قرآن مجید سے حضرت آدم اور حواء علیہما السلام کے اصلی قصے کا جائزہ لیں؟ کتاب عزیز میں پہلی مرتبہ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کا ذکر سورۂ بقرہ کے ع ۴ پ ۱ میں آیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرہ: ۳۵]

ہم نے آدم علیہ السلام کو فرمایا کہ تو اور تیری رفیقہ حیات جنت میں رہو اور وہاں بلا تکلیف اور بنا کسی رکاوٹ کے جہاں سے چاہے تم خوب کھاؤ اور اس مخصوص درخت کے دونوں قریب بھی نہ جانا ورنہ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اس آیت سے ظاہر ہے یہ پہلا حکم بھی دونوں کو تھا اور اس کا مخاطب صرف آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نہ تھا۔ اس کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ﴾ [البقرہ: ۳۶]

''پھر اس جوڑے کو شیطان نے پھسلا دیا اور ان کو اس سے نکلوا دیا۔''

اس آیت کریمہ میں وضاحت ہے کہ شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ ڈال کر ان کو مذکورہ اقدام کے لیے آمادہ کیا یعنی ابلیس نے دونوں کو مستقل طور پر بہکایا نہ کہ ان میں سے کسی ایک کو اس کی مزید توضیح پھر سورۂ اعراف کے ع ۲ پ ۸ میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝ وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴾ [الاعراف: ۲۰۔۲۱]

''پھر ان دونوں کو ابلیس نے وسوسہ اندازی کی تاکہ وہ ان کی شرمگاہیں جو ان سے چھپی ہوئی تھیں وہ ان پر ظاہر کرے اور اپنے اسی وسوسے میں ان دونوں کو کہا کہ آپ دونوں کے رب نے تم کو فلاں درخت سے صرف اس لیے روکا ہے تاکہ اسے کھا کر کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے نہ بن جاؤ۔''

مزید ان کو اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ آگے پھر ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ ''پھر ابلیس نے دونوں کو دھوکے سے نیچے اتار دیا یعنی بلندی کی جس سطح پر وہ تھے وہاں سے نیچے اتار دیا یعنی ممنوع درخت کے قریب نہ جانے والے فرمان پر تعمیل والی اعلیٰ سطح سے نیچے اتار کر اس حکم سے انحرافی پر آمادہ کیا۔ قرآن حکیم کی کسی ایک سورۃ کی کسی ایک آیت میں بھی صریحاً نہ تو کجا اشارتاً بھی یہ بات نہیں ملتی کہ اسی انحرافی پر حواء علیہا السلام نے ہی حضرت آدم علیہ السلام کو آمادہ کیا تھا۔ پھر اس واضح قصے میں عورت ضد باندھ کر آدم علیہ السلام کو اپنی پرستش کے لیے تیار کرنے والی پتلی آخر کہاں سے آئے گی؟ کیا ماڈرن لکھاری خود اللہ تعالیٰ کو بھی لقمہ دینا چاہتے ہیں؟

﴿وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾ [بنی اسرائیل: ٤٤]

باقی یہ سوال کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انحرافی کیونکہ کی اس کا جواب اللہ کی توفیق سے نیچے عرض کرتا ہوں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا (جسم) تو خاکی تھا زمین سے ہی بنایا گیا تھا، لیکن اس خاکی جسم میں روح عالم بالا سے اس کے خالق مالک کے حکم سے ڈالی گئی تھی۔ جسم کی ضرورتیں اور تقاضائیں جدا ہیں تو روح کی خواہش اور مطالبات الگ جسم کو سکون اور راحت کھانے پینے اور دوسری نفسیانی لذات سے حاصل ہوتی ہے لیکن روح کو ان مادی اشیاء میں سے کسی کے بھی حصول سے تسکین اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ روح اور دلوں کو اطمینان صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق استوار کیے، اس کی ذات پاک سے مظبوط اور مستحکم رشتہ وناطہ قائم ہونے اس کے ذکر وفکر اور اس کے تقرب حاصل ہونے سے ہی مل سکتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق تو بموجب: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ خلافت ارضی سنبھالنے کے لیے ہوئی تھی اور اس کی مادی ضروریات اور تقاضوں کا کما حقہ پورا پورا انتظام زمین میں ہی کیا گیا تھا البتہ روح کی تسکین کا ان تمام ادیات میں کوئی بھی انتظام نہ تھا۔ اس کو تو تسلی اور دائمی اور تشفی اللہ کے قرب ہر وقت اس سے ہم کلامی کے شرف اور دائمی اللہ کے حضور میں باریابی سے ہو سکتی تھی۔ جسم بھی روح کے دم خم سے قائم ہے۔ روح نکل جائے تو جسم بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ روح نے جب اپنے مالک اللہ تعالیٰ کے امر سے اس مادی قفس میں قید ہونا قبول کیا تو کیا۔ البتہ اپنی لطافت، صفائی اور عالم بالا سے لائے گئے تقرب کی آرزو بھی اپنے ساتھ لے آیا لہٰذا اگر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جس طرح ہوئی ویسے ہی اسے اس دینا میں بھیجا جاتا تو ہر باشعور اور حساس آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت ابو البشر آدم علیہ السلام کے دل کی دنیا کا کیا حال ہو جاتا؟ لہٰذا اس وقت کے تقاضے کے موجب اسے جنت میں ہی ٹھہرایا گیا اس کے ساتھ اسے یہ بھی متنبہ کیا گیا کہ اگر اس مخصوص درخت سے کچھ تناول کیا تو یہاں نہیں رہ سکو گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تو ہر حکم میں بے شمار حکمتیں ہیں ہم نہ تو انھیں شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کام یا

حکمتوں کے متعلق کوئی مثال دے کر اس کی پوری حقیقت بیان کر سکتے ہیں لیکن صرف ذہن کو قریب کرنے کی خاطر ایک مثال عرض رکھتا ہوں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی اللہ کی قدرت اس کی غذاء کا انتظام اس کی ماں کے سینے میں مہیا فرماتا ہے۔ بچہ چونکہ اسی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہے لہٰذا اسی ماں کے ہی جسم میں اس نومولود بچے کی غذا کا انتظام کرنا عین فطرت کا تقاضا تھا کیونکہ ماں کی گود میں جو سکون اس بچے کو ملتا ہے وہ دوسری جگہ ہرگز نہیں مل سکتا۔ بچہ اپنی اسی غذا کی جگہ اور ذریعے سے اس قدر تو مانوس ہو جاتا ہے۔ جو جس قدر (مجھے علم ہے) کہ کچھ بچے ایسے بھی تھے جو ماں کے دودھ سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ رضاعت کی مدت (دوسال) گزر جانے کے بعد بھی اپنے زور پر ماں کا دودھ پی جاتے تھے اور ان کو روکنا مشکل تھا یعنی اگر انھیں روکا جاتا تھا تو وہ بے حال ہو جاتے، پھر تین سالوں کے بعد بھی باپ نے ان کو اِدھر اُدھر ماں سے دور لے جا کر آہستہ آہستہ ان سے یہ عادت چھڑائی۔ عام طور پر مائیں دودھ چھڑانے کے لیے اپنے پستانوں پر کوئی ایسی کڑوی چیز لگا دیتی تھیں تاکہ بچہ اس میں منہ ڈالے تو اسے کڑواہٹ محسوس ہو اور دو تین مرتبہ اس طرح کرنے سے وہ بچہ آخر کار خود بخود اس سے بیزار ہو کر اس کی جان چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام والے معاملے کو آپ اپنے ذہن کے قریب لا سکتے ہیں، یعنی ابو البشر علیہ السلام کا روح عالم بالا سے آیا تھا اس لیے حالت کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر اسے عالم بالا یعنی جنت میں ہی ٹھہرایا گیا لیکن وہاں سے نکال کر عالم ارضی کی مسند خلافت سنبھالنے کے لیے اس عالم رنگ و بو میں اسے لانے کے لیے ایسا ہی طریقہ اختیار کرنا تھا جس سے وہ خود ہی وہاں سے نکلنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

میری گذارش کو قارئین کرام مذکورہ مثال پر آسان سے مطبق کر سکتے ہیں۔ یہ تو تھی تمہید جو آگے آنے والی حقیقت کے بیان کے لیے ناگریز تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش اور اس کے متعلق تفصیل نیچے مذکور ہو رہی ہے انسان ذات کے باپ کو جنت میں روحانی، جسمانی، مادی، معنوی تمام سہولتیں میسر تھیں لیکن رب تعالیٰ کی اس وارننگ کہ فلاں درخت کے قریب گئے تو یہاں نہ رہ سکو گے۔ اس وجہ سے اسے یقین ہو گیا کہ میرا یہاں سے نکلنا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اور میری غلطی کی وجہ سے کسی بھی وقت میرا یہاں سے اخراج ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس بات کا ہر وقت ان کو اندیشہ ضرور ہوگا۔ انسانیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاصیت یہ بھی رکھی ہے کہ وہ ہر چیز جو دیکھتا ہے یا سنتا ہے یا کسی نہ کسی طرح اسے محسوس ہوتا ہے تو اس کی گہرائی میں جاتا ہے اور اس کی سطح سے نیچے اتر کر اس کی جڑ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور زندہ بھی ضرور کرے گا، تاہم اس کے زندہ ہو کر اٹھنے کی کیفیت دیکھنے کی تڑپ تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو عرض کیا کہ رب تعالیٰ مجھے دکھا کہ آپ مردے کس طرح زندہ کرو گے (اس کا ذکر سورۂ بقرہ ع ۳۵ پ ۳ میں ہے) بعینہ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو بھی یہ جستجو تھی اور بہت زیادہ تڑپ، امنگ اور آرزو تھی کہ کوئی

ایسا ذریعہ اور آئیڈیا ہاتھ آجائے کہ اسے کام میں لاکر اپنے متوقع تجربے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون ہوجاؤں۔ بس یہی وہ دہکتی آگ تھی جس پر ابلیس نے ہاتھ رکھا اور یہی وہ عزیز آرزو تھی جس سے دھوکے سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور جو ہونا تھا وہ ہوکر رہا۔ وہ اس طرح کہ ابلیس آدم اور حواء علیہما السلام کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ آپ کے رب نے اس درخت کے تناول سے صرف اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا اس جگہ پر ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اپنی سچائی کے ثبوت کے لیے اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھاکر انھیں باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے۔ اس بیان والی سورۂ اعراف کی آیت کریمہ پہلے گزر چکی۔ انسان کا دل رب تعالیٰ نے سادہ بنایا ہے۔ اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور بزرگی، کبریائی وعظمت کا احساس اور شعور تھا اور ہر آدمی جس (طرز) کا ہوتا ہے دوسرے کو بھی اس پر قیاس کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اٹھا کر یہ بات کی ہے، لہٰذا جیسا کہ خود صاف دل تھا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ شان کا احساس تھا، اس لیے خیال کیا کہ دوسرا بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نہیں اٹھائے گا۔ اس کا دل اسی آرزو سے لبریز تھا کہ اسے اللہ کا قرب اور رضا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاصل ہوجائے۔ اس لیے اس اولین جوڑے نے اس درخت سے تناول فرمایا۔ اور نتیجہ اس کے برخلاف پیش آگیا۔

توقع نہیں ہے ان پر اب عذاب ہی آئے گا اس لیے بغیر اللہ کے ارشاد کا انتظار کرنے کے ان سے روٹھ کر چلا گیا۔ یہ بات گناہ تو قطعی نہ تھی۔ البتہ بادیٔ النظر میں کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی اس پر کوئی تو قطعی نہ تھی۔ البتہ بادی النظر میں کوئی ایسی بات ہوئی تو ہوگی اس پر کوئی عتاب نازل ہونا چاہیے تھا لیکن انبیائے کرام علیہم السلام کو ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کے امر کا منتظر رہنا ہے۔ کسی معاملے میں اپنی طرف سے پیش قدمی کرنا اولیٰ اور مناسب نہیں ہے۔ (وضاحت) آدم کو جو وصیت کی تھی اس کی دو شقیں تھیں:

① اس مخصوص درخت کے قریب نہ جانا اگر قریب جاؤ گے تو خود پر ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

② یہ (ابلیس) تم دونوں کا دشمن ہے۔ دیکھو کہیں تم کو دھوکہ دے کر میرے حکم کی انحرافی پر آمادہ کر کے اس جنت سے نہ نکال دے۔

﴿ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ﴾ [طٰهٰ: ۱۱۷]

آدم کو تو پہلی شق کے متعلق کوئی بھی نسیان طاری نہ ہوا یہی سبب ہے کہ ابلیس نے ان کو کہا تمھارے رب نے تمھیں اس درخت سے اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ ہو جاؤ یا یہاں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ بن جاؤ۔ یعنی اس درخت کے قریب جانے کی شق تو سامنے تھی، لیکن دوسری شق جس میں انھیں واشگاف الفاظ میں سمجھایا گیا کہ یہ تم دونوں کا دشمن ہے یہ بات ان کی دلوں سے اتر گئی اور ابلیس کا اللہ کے عالی ہونے کی قسم اٹھانے پر انھیں اسے خیر خواہ ہونے کا یقین ہوگیا۔ اس لیے ان سے یہ لغزش وقوع پزیر ہوئی۔

جب قرآن کریم آدم کے اس فعل کو لغزش اور بھول کا نتیجہ بتا رہا ہے تو ان کو کہاں سے یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس نبی محترم اور ابوالبشر ﷺ کے اوپر عام گناہ بھی نہیں بلکہ ''عورت پرستی'' کا مرتکب اور گناہ گار قرار دے۔ ﴿ سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ ﴾ [النور : ١٦]

اگر بالفرض ہم نیچے اتر کر یہ تسلیم بھی کریں (حالانکہ وہ سراسر جھوٹ اور افتراء ہے) کہ آدم علیہ السلام نے اس فعل کا ارتکاب اپنی زوجہ محترمہ کے کہنے پر کیا تو بھی اس سے یہ ثابت ہوگا کہ نبی محترم نے اپنی زوجہ محترمہ کے مشورے پر عمل کیا۔ تو کیا اپنے گھر والوں کے نیک اور انسانی سمجھ کے مطابق معقول مشوروں پر عمل کرنا بھی گناہ ہے؟ بعض حضرات نے جن کو عورت کی حیثیت اور پوزیشن کم کرنے کو سوا روٹی بھی ہضم نہیں ہوتی انہوں نے تو سرور کائنات ﷺ پر ایک روایت گھڑ دی۔ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

((شاوروهن وخالفوهن)) ''عورتوں سے مشورہ اگر چہ لو البتہ مشورہ لینے کے بعد اس کے الٹ کام کرو۔'' حالانکہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۵ میں لکھتا ہے کہ: ''اصله لم اراه مرفوعا'' ''اس روایت کا مرفوع طور پر اصل کہیں بھی نہیں، مجھے دیکھنے میں نہیں آیا ہے یعنی نہ روایت نبی ﷺ کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں اس کا اصل کہیں بھی نہیں ملتا۔ ایسی بے اصل روایت کی کیا قیمت اور قدر ہے یہ بات ہر اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ مذکور مصنف مزید لکھتا ہے کہ: ''ويروى طاعة المرأة ندامة'' ''روایت کی گئی ہے کہ عورت کی تابعداری ندامت اور پشیمانی ہے۔'' پھر فرماتا ہے کہ: ''وهو ضعيف'' ''یہ روایت بھی ضعیف ہے۔'' ان ضعیف اور بے اصل روایتوں کے برعکس خود نبی ﷺ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے مشورے پر عمل فرمایا، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اب احرام کھول دو اور سر کے بال منڈواؤ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر عمل کرنے سے پس و پیش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم نے بیت اللہ کی زیارت ہی نہیں کی ہے نہ طواف کیا ہے۔ باقی سر کے بال کیسے منڈوائیں۔ آپ ﷺ بہت زیادہ کبیدہ خاطر ہوئے اپنی ازواج مطہرات کے پاس آئے ازواج مطہرات نے آپ ﷺ سے کبیدہ خاطر ہونے کا سبب پوچھا آپ ﷺ نے ساری بات سنی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میرے کہنے پر احرام نہیں کھول رہے نہ ہی سر کے بال منڈوا رہے ہیں۔ اس پر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے فرمایا کہ آپ باہر نکلیں کسی کو کچھ بھی نہ کہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر اپنے سر مبارک کو سنوار دیں دوسرے خود بخود آپ کی پیروی کریں گے۔ آپ ﷺ نے ان کے مشورے پر عمل فرمایا۔ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے پیچھے اس پر عمل کیا۔ اور اپنے سر کے بال منڈوا دیے۔ زیر بحث مسئلہ میں بھی (اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ فعل حواء علیہا السلام کے کہنے کے موجب عمل میں آیا) بعینہ یہی بات ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی زوجہ محترمہ کے مشورے میں اپنی عزیز اور پیاری آرزو اور امنگ کی تکمیل کا سامان نظر آیا اسی لیے اس پر عمل کیا لیکن بلا ارادہ اور بغیر الامی امر کے انحرافی

کی نیت کے یہ فعل رب تعالیٰ کے امر سے انحرافی پر مبنی تھا البتہ یہ غلطی ایسا گناہ تھی جس کی ترجمانی اور اس کے متعلق داستان گوئی کرنے کے لیے زبانی وسعتوں کے باوجود محترمہ صاحبہ کو ''عورت پرستی'' کے علاوہ دوسرے الفاظ نہ مل سکے:

سوخت عقل زحیرت کہ این چہ بو العجمی است

اس بات پر اس پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں کتنی ہی جگہوں پر آدم علیہ السلام کا احوال بیان فرمایا گیا ہے۔ ہر جگہ پر انسان کے اس فعل کے ارتکاب کا سبب ابلیس کا وسوسہ اور دھوکہ ہی مذکور ہے کہاں دونوں کی طرف ابلیس کے وسوسے کا ذکر تو کہاں صرف آدم ﷺ کی طرف اس کا وسوسہ ایک جگہ پر بھی گو اشارتاً ہی سہی۔ یہ ذکر نہیں آیا ہے کہ ابو البشر علیہ السلام کے اس الٰہی امر کی انحرافی میں اس کی زوجہ محترمہ صاحبہ کا ہاتھ تھا یا اس امر کی عدولی کا محرک یہ تھی اگر اصل سبب انسان ذات کی پہلی ماں تھی کتاب عزیز میں ضرور اس کا ذکر کسی ایک جگہ پر تو کرتا اگر چہ ''اشارتاً'' ہی سہی۔ کیونکہ اگر چہ انسان ذات کے اغواء میں بڑا ہاتھ شیطان کا ہی ہے۔ لیکن اس عالم رنگ و بو میں شیطان ہر انسان کے سامنے عیاناً نہیں آتا بلکہ وہ کسی محسوس مادی شے انسان یا کسی نہ کسی ٹھوس چیز کو واسطہ بناتا ہے۔ اپنے اغوا کے لیے اور اس مادی اور محسوس دنیا کے لحاظ سے اصلی سبب یہی جانا جاتا ہے اگر اس طرح نہ ہوتا تو کسی ملوث آدمی پر کوئی بھی گناہ نہ ہوتا کیونکہ کرنے والا تو شیطان ہے، لیکن قرآن کریم سبب اور گناہ کرنے والے انسانوں کا بھی ذکر کرتا ہے ان کو بھی گنہگار قرار دیتا ہے اور ان کے بھی بتاتا ہے۔ لہٰذا محسوسات کے لحاظ سے انسان ذات کی اولین ماں ہی اس فعل کے ارتکاب کا سبب تھی قرآن کریم ضرور اس طرف اشارہ کرتا۔ البتہ جب کہ قرآن کریم نے اس کی طرف کوئی ہی اشارہ نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ محترمہ کا یہ بیان ایک من گھڑت کہانی اور افسانہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا!

**آگے صفحہ نمبر ۱۹ پر** محترمہ صاحبہ رقم طراز ہے کہ: آدم کی اولاد سے پہلا جھگڑا ہابیل اور قابیل دو مردوں نے کیا عورتوں کے اوپر۔ میں حیران ہوں کہ محترمہ جیسی تعلیم یافتہ اور قرآن سے استفادہ کرنے والی کس طرح اتنی غلط بیانی والی سطح پر اتر آتی ہے۔ شاید جدت نگاری کا شوق اتنا نیچے اترنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ جب کہ قرآن مجید میں ہے تو اس کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر جھانکنا اتنے سارے بیہودہ مواد کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لیے کونسا واجبی سبب ہے؟ قرآن مجید کی سورۂ مائدہ کے پانچویں رکوع پارہ ۲ میں آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کا ذکر ہے اگر چہ کتاب مقدس نے ان کے نام نہیں دیے ہیں، البتہ قتل کے قصے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دونوں بیٹے ہابیل قابیل ہی تھے۔ یہ نام تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اگر مکابرہ کا دامن تھامتے ہوئے محترمہ قرآن کے اس قصے کے متعلق اس طرح کہنا چاہے گی کہ وہ دوسرے بیٹے تھے۔ تو ہابیل و قابیل تو اس صورت میں اسے اس خرافاتی قصے کو ثابت کرنے کے لیے وہ پاپڑ بیلنا پڑیں گے۔ جو اس کی

وسعت سے باہر ہوں گے کیونکہ قرآن و حدیث سے اس افسانہ کو ثابت کرنا محال ہے۔ سورۂ مائدہ کے مذکورہ رکوع میں آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے وہ اس طرح ہے:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾

[ المائدہ: ۲۷ ]

''ان پر پڑھ آدم دونوں بیٹوں کی خبر حق سے (اس طرح) جب دونوں بیٹوں نے اللہ کی راہ میں قربانی پیش کی پھر ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے سے (اس کی قربانی) قبول نہ کی گئی اس پر جس کی قربانی قبول نہ ہوئی دوسرے بھائی کو کہا کہ میں ضرور تجھے قتل کروں گا۔ اس بھائی نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ صرف متقیوں سے خیر کے کام قربانی وغیرہ قبول کرتا ہے!''

قرآن حکیم کا یہ بیان بالکل واضح ہے کہ ایک بھائی کا دوسرے بھائی کو قتل کرنے کا سبب عورت پر جھگڑا قطعاً نہ تھا۔ بلکہ اس کا سبب محض حسد تھا اور یہ حسد اس لیے پیدا ہوا کہ دونوں نے اللہ کی راہ میں قربانی دی ایک کی قبول ہوئی دوسرے کی قبول نہ ہوئی جس کی قبول نہ ہوئی اس کو حسد ہوا کہ اس کی قربانی قبول ہوئی میری کیوں نہ ہوئی۔ حالانکہ ہم دونوں ایک درجے کے بھائی ہیں اس نے حسد سے مغلوب ہو کر بھائی کو کہا کہ میں ضرور تجھے قتل کروں گا۔ دوسرے بھائی نے جواب دیا کہ بھائی اس میں میرا کونسا قصور ہے تیری قربانی کی عدم قبولیت کا سبب یہ ہے کہ تیرے دل میں تقویٰ کا فقدان ہے اور ادھر اللہ تعالیٰ خیر یا قربانی صرف متقی (اہل تقویٰ) سے ہی قبول فرماتا ہے آخر کار نفس پر شیطان غالب آ گیا۔ اس بھائی کے قتل کو اس پر آسان بنا دیا جس کی وجہ سے اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ حسد ہی وہ خرابی ہے جس کے سبب ابلیس دربارِ الٰہی سے دھتکارا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی انحرافی بھی حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کی وجہ سے کی تھی۔ آگے چل کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں نے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کتنے سال جدا رکھا اور ان کا والد علیہ السلام اس فراق میں رو رو کر آنکھوں سے نابینا ہو گئے۔ یہ کام بھی بھائیوں نے محض حسد کی بنا پر کیا تھا۔ جیسا کہ سورۂ یوسف میں بیان کیا گیا ہے۔ مقصد سب سے اول جو بڑا گناہ وجود میں آیا وہ حسد تھا اور اس حسد ہی نے اتنے سارے نقصان کرائے ہیں۔ خلاصہ کلام کہ ہابیل وقابیل والے قصے میں بھی عورت سے جھگڑے کا کوئی بھی ثبوت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ سب کچھ موجود ہے جو ہماری دین و دنیا، دنیا و عقبیٰ کی بھلائی و بہبودی ہے اور گذشتہ اقوام کے متعلق تو شافی اور وافی بیان ملتا ہے اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر سے بھٹکنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ شاید محترمہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ یہ قصہ فلاں وفلاں کتاب میں مرقوم ہے لیکن اس طرح کہنا حق سے لوگوں کو دور رکھنا ہے اور یہ سراسر غلط ہے سچ اور صحیح یہ ہے کہ لوگوں کو حق سے شناسا کرایا جائے اور حق صرف

اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ کے رسول اکرم ﷺ کی حدیثیں ہیں۔ تیسری چیز کو حق کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ عقلمندوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔

صفحہ نمبر۲۱ پر ایک عبارت ہے جو ''اور کوئی مانے یا نہ مانے لیکن میں'' اسے شروع ہوکر ''عورت بنا مرد کے ماں بن سکتی ہے'' پر ختم ہوتی ہے۔

میری گذارش یہ ہے کہ محترمہ کی مراد ان الفاظ ''عورت بنا مرد کے ماں بن سکتی ہے'' سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ ہوسکتا ہے۔ تو بات صحیح ہے لیکن اس صورت میں عورت منفرد نہیں ہے، بلکہ صرف مرد سے بھی اللہ مخلوق پیدا کرسکتا ہے اور بالفعل پیدا کی بھی ہے۔ سورۂ نساء پارہ ۴ شروع شروع والی آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ [النساء: ۱]

''اے انسانو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان (انسان) سے پیدا کیا اور اس ایک جان سے اس کی بیوی کو پیدا کیا۔''

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ یعنی اللہ اگر چاہے تو وہ ضرور مرد سے بھی انسانی تخلیق کا سلسلہ جاری کرسکتا ہے۔ مگر اس رب العالمین نے اپنی حکمت بالغہ کے موجب اس اولین جوڑے کے بعد انسانی نسل مرد اور عورت کے اختلاط سے ہی چلاتا رہا، بلکہ ذوالجلال والاکرام کو یہ بھی قدرت ہے کہ بنا ماں باپ کے بھی انسانی تخلیق کو جاری رکھ سکتا ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو بنا ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ بہر حال اللہ کی قدرت میں کوئی کلام نہیں ہے وہ رب ہر چیز پر قادر ہے۔ البتہ اگر محترمہ مقالہ نگار کی مراد یہ ہے کہ عورت اللہ کی خاص قدرت کے علاوہ بنا مرد کے ماں بن سکتی ہے تو یہ بات قطعی غلط ہے۔ اللہ کی سنت جاریہ کے موجب جس طرح مرد اولاد کے لیے عورت کی طرف محتاج ہے اسی طرح عورت بھی اس سلسلے میں یقیناً مرد کی طرف محتاج ہے۔ اس طرح نہ ہوتا تو شادی بیاہ کے لپھڑے ازدواجی زندگی کی گتھیاں اور میل ملاپ کا شوق اور رغبت بالکل بے معنی رہ جاتے۔ آج اگر کوئی مرد ایسے ہی خاموش ہوکر بیٹھ جائے اور یہ خیال رکھے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے حواء پیدا کی تو وہ مجھ سے بھی انسانی تخلیق کرسکتا ہے۔ لہٰذا مجھے شادی خانہ آبادی کی کوئی ضرورت نہیں ہے یا اگر کوئی عورت سر پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے اور یہ خیال آئے کہ جب کہ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بغیر باپ کے کی تو مجھے شوہر کی کون سی ضرورت ہے خود بخود مجھ سے اولاد ہوگی اب آپ ازروئے انصاف بتائیں کہ ایسے مرد اور عورت کے متعلق دنیا بھر کے انسانوں کا کونسا فتویٰ ہوگا؟ کیا ان کے بارے میں

احمق، دیوانے، عقل کے اندھوں کے علاوہ کوئی اور لفظ چسپاں اور موزوں بھی ہو سکتا ہے؟ آج کل جو غیر فطری طریقہ نکلا ہے۔ اس میں ابھی مرد اور عورت دونوں کے مادہ تولید کو کسی نہ کسی ذریعے سے خارج کر کے پھر رحم میں ڈالا جاتا ہے۔ صرف عورت کے مادے کو کافی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ نئی سائنٹفیکٹ تحقیقات کے مطابق ماں کے رحم میں حمل قرار لینے کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے مرد کے مادہ تولید سے جرثومے بڑھ کر عورت کے مادے میں جو بیضہ ہوتا ہے اس میں داخل ہو جاتا ہے کیا مطلب؟ جواب صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ نسل و تناسل مرد و عورت کے اختلاط سے ہی چلایا ہے اس لیے ماں کے رحم میں بھی یہ مرد کا جرثومہ عورت کے بیضہ میں داخل ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ سورۂ الم سجدہ پارہ ۲۱ ع ۱ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [السجدہ: ۸]

''پہلے انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کے بعد اس کی نسل اس کے بے وقعت و کمزور پانی سے چلایا۔''

اس سے واضح ہوا کہ آدم اور حواء علیہما السلام کی تخلیق کے بعد انسانی نسل مرد کے نطفے سے ہی چلتی رہی ہے، لہٰذا اللہ کی سنت جاریہ کے برخلاف کسی کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ مرد و عورت کے اختلاط کے علاوہ ان میں سے کسی ایک سے انسانی نسل چلا سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ [البقرۃ: ۲۲۳]

تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ کھیتی میں بیج لگانے والا بیج لگاتا ہے۔

پھر اس سے پودے بنتے ہیں۔ لہٰذا عورت کو کھیتی سے تشبیہ دینے سے صاف معلوم ہوا کہ ان میں مرد ہی بیج (مادہ تولید) ڈالتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عورت کسی بھی ذات یا کسی بھی قبیلے سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو مگر اولاد باپ کی طرف ہی منسوب ہوتی ہے۔ مزید برآں آج بھی اگر کسی گھر میں کنواری عورت کو حمل ہو جائے تو برائے کرم بتایا جائے کہ اس عورت کا حشر کیا ہوگا؟ دنیا اس کے متعلق کیسے ریمارک پاس کرے گی؟ خود محترمہ مقالہ نگار اس عورت کے متعلق اپنے دل میں کس جذبے کو جگہ دے گی؟ کیا یہی کہہ کر دنیا کو مطمئن کرنے کی سعی کرے گی کہ عورت مرد کی طرف محتاج نہیں ہے یہ بغیر مرد کے بھی ماں بن سکتی ہے۔ اس لیے یہ بھی بنا مرد کے ماں بنی ہے؟ کیا یہ نومولود بچہ جائز تصور ہوگا یا ناجائز اور حرامی؟ اس نومولود کی معاشرے میں حیثیت کیسی ہوگی؟ کیا ان سوالات کے جوابوں کے لیے مجھے کوئی زحمت اٹھانے کی بھی ضرورت ہے؟ افسوس! حقائق سے اغماض اور چشم پوشی کے نتیجے نہایت مشکل نکلتے ہیں۔ رہا مریم علیہا السلام کی مثال وہ تو اسی زیر بحث مسئلے میں بالکل غیر متعلق ہے اس لیے کہ یہ بات محض اللہ کی قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔ اور اس میں کوئی بھی بحث نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت غیر محدود ہے۔ اللہ کی قدرت کو پابندیوں یا خاص حدود میں ہرگز جکڑا نہیں جا سکتا وہ جو

چاہتا ہے کرتا ہے لہٰذا اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا کہ عورت ماں بننے میں مرد کی محتاج نہیں ہے۔ عقل کا دیوالیہ نکالنا ہے۔ خود حضرت مریم علیہا السلام بھی جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اسے اولاد کی خوش خبری دی تو فرمایا:

﴿ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴾ [مریم: ۲۰]

''مجھے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھے نہ تو حلال طریقے سے کسی مرد نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ میں کوئی فاحشہ عورت ہوں؟''

اس پر جبرائیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسے ہی تیرے رب نے فرمایا ہے وہ فرماتا ہے کہ میرے لیے یہ آسان ہے اور ہم نے اس مولود مسعود کو اپنی قدرت کی نشانی بنانا ہے۔ (وہی سورت وہی رکوع) اللہ تعالیٰ کی ارسال کی ہوئی۔ اس خوش خبری کے باوجود جب مریم بتول علیہا السلام کے وضع حمل کا وقت قریب آیا تو آنے والے طوفان کا تصور کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے!

﴿ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ [مریم: ۲۳]

''اے کاش میں اس واقعہ سے پہلے ہی مر جاتی اور لوگ مجھے بھلا دیتے۔''

سوچنے کی بات ہے کہ محترمہ و معظمہ بی بی صاحبہ ایسی تمنا کیوں کر رہی ہے؟ اس کا جواب صرف اور صرف یہ ہی ہو سکتا ہے کہ محترمہ خاتون بتول کو معلوم تھا کہ اولاد کے متعلق اللہ کی سنت جاریہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے مرد و عورت کا اختلاط اب اگر اس سنت جاریہ کے برخلاف محض اللہ کی قدرت سے بھی اولاد ہو رہی ہے تو دوسری دنیا کو آخر میں کس طرح اپنی عصمت اور پاک دامنی کا یقین دلا سکوں گی اور اسی نتیجے میں جس طوفان بدتمیزی کو اسے منہ دینا تھا۔ اس کا تو تصور ہی سوہان روح تھا۔ ورنہ اگر محترمہ مقالہ نگار کے مفروضہ کے مطابق عورت بنا مرد کے ماں بن سکتی ہے اور عوام و خواص اس حقیقت سے آگاہ ہوتے تو کس چیز کا خوف کونسا اندیشہ؟ بلکہ محترمہ خاتون بتول کی مذکورہ تمنا کے لیے بھی کوئی سبب نہ تھا اور نہ ہی اس کے اوپر سے برائی کے داغ کو رفع کرنے کے لیے قدرت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام (جو چند دنوں کے نومولود تھے) کو بولنے کی ضرورت پڑتی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اولین جوڑے آدم و حواء کے بعد سواء مریم بتول علیہا السلام کے واقع کی اور کوئی بھی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی کہ کوئی عورت مرد کے مساس۔ جائز ناجائز کے علاوہ ماں بنی ہو۔ خلاصہ کلام بنا مرد کے عورت کے ماں بننے والی بات کا تعلق اللہ کی قدرت سے تو اس میں نہ بحث ہے نہ سوال نہ اعتراض بلکہ ﴿آمنا وصدقنا﴾ کہیں گے۔ باقی خاص اللہ کی بغیر بغیر مرد کے ماں بننے والی بات محترمہ مقالہ نگار کا محض مفروضہ اور اس کی جدت پسند طبع کا اختراع ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا بنا مرد کے ماں بننا بیشک اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا شاہکار ہے لیکن ہم اس پر تبھی اعتبار کرتے ہیں۔ جب واقعہ

اللہ کی قطعی وحی (قرآن کریم) نے بیان فرمایا ہے ورنہ کون اس بات پر اعتبار کرتا۔ یہودیوں اور کچھ ملحدانہ ذہن وخیال رکھنے والوں کا آج بھی اس پاکدامن اور برگزیدہ خاتون علیہا السلام یا اس کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو سنگین ریمارک ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ لیکن الحمدللہ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اس لیے ہم کو اللہ کے کلام پاک پر ایمان ہے اور اس کے خلاف جو بھی بدگو اور بیہودہ بکواس کرتے ہیں ان کو کافر اور ملحد کہتے ہیں۔

" والله يقول الحق وهو يهدى السبيل وهو اعلم باالصواب اللهم ارناالحق حقا وارزقنا اتباعه وارناالباطل باطلاًوارزقنا اجتنابه ولا تجعله علينا مبشراً واجعلنا للمتقين اماما فاالحمدلله الذى بنعمة تتم الصالحات وآخر دعواناان الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ خيرخلقه سيدنا محمد وآله وسلم"

احقر العباد
محبّ اللہ شاہ عفااللہ عنہ
16-08-1411ھ
11-03-1991

❁❁❁❁

# الدين النصيحة

## گذارش بندہ حقیر پر تقصیر مع مخلصانہ نصیحت نفیس

## بجناب محترم مولانا حافظ محمد ادریس

محترم جناب سید ابو القاسم محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ نے ۱۹۹۲ میں ایک دفعہ جمعۃ المبارک ادا کیا اس وقت قلعہ والی مسجد کے خطیب جمعیت اہل حدیث حیدر آباد کے امیر محترم حافظ محمد ادریس شہید رحمہ اللہ (ان شاء اللہ) تھے انہوں نے خطبہ جمعہ کے بعد نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ جھراً پڑھی اور پھر نماز جمعہ کے بعد کسی جماعتی کی نماز جنازہ پڑھائی اور قرات اور ادعیہ ماثورہ کو جھراً پڑھا یہ دونوں باتیں شاہ صاحب رحمہ اللہ کے موقف کے خلاف تھیں لہٰذا انہوں نے ایک مقالہ لکھ کر امیر محترم کی طرف ارسال کیا اور نصیحت فرمائی کہ آپ اپنے موقف پر نظر ثانی کریں۔ (الازہری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذى ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله وكفى به بمصالح عباده خبيرا بصيرا والصلوٰة والسلام على سيدنا محمد النبى الامى الذى أرسله الله الى الناس كافة بشيرا ونذيرا۔ فبلغ الرسالة وأدى الامانة ونصح الامة وكفى به للثقلين سرا جا منيرا۔ وعلى آله واصحابه الذين نصحوا لله ورسوله وبلغوا رسالة النبى صلى الله عليه وسلم الى من جاؤا من بعد هم بتمام الصدق وكمال الا مانة حتى لم يتركوا شيئا وان كان قطميرا فجز اهم الله عنا۔ معاشر المسلمين أحسن الجزاء وحشرنا فى زمرتهم يوم لا ينفع مال ولا بنون وكان يوما على الكافرين عسيرا۔ اما بعد :

یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ جماعت اہل حدیث جس کا طرہ امتیاز تحقیق و تدقیق تھا اور سطح سے اتر کر بات کی تہہ تک پہنچنا ان کا شیوہ تھا وہی مبارک جماعت ہمارے اس عصر میں تحقیق کی طرف جانے کی زحمت اٹھانا پسند نہیں کرتی اور اکثر و بیشتر اوقات جس عالم و رہنما سے ان کو عقیدت مندی ہوتی ہے اس کی سوفی صد باتوں کو صحیح سمجھ کر اس کے پیچھے آنکھ بند کر کے چل پڑتے ہیں اور اگر ان کو اس کے مقابلہ میں کوئی صحیح دلیل پیش کی جاتی ہے تو سنا ان سنا کر دیتے ہیں اور یہی تصور کرتے ہیں کہ بس جو فلاں نے کہا وہ حق ہے بلکہ مثل وحی ہے اور اس کی بات قطعاً غلط نہیں ہو سکتی۔ میرے سامنے اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اب ہمت بھی نہیں پڑتی کہ کسی کو کلمہ حق کہا جائے۔ لیکن آپ محترم سے راقم الحروف کو ایک گونہ قلبی تعلق ہے اور لِلّٰہ فی اللہ محبت ہے اس لیے اس اللہ کے رسول اکرم ﷺ کے ارشاد مبارک "الدين النصيحة (اخرجه مسلم عن تميم بن اوس الدارى رضى الله عنه) کے تحت دل نے مجبور کیا کہ یہ چند اوراق جناب کی خدمت عالیہ میں تحریر کر کے پیش کروں امید ہے کہ آپ محترم بھی میرے اس جذبہ کو مد نظر رکھ کر ان اوراق کو تدبر و تامل اور بنظر انصاف اور ٹھنڈے دل سے مطالعہ فرمائیں گے اور اگر میری کوئی بات طبع نازک پر ناگوار گذرے تو اس کا برا نہ منائیں۔ واللہ میرا اس سے کوئی خاص غرض و مفاد وابستہ نہیں ہے۔

(اللهم ارنا الحق حقاً وار زقنا اتباعه و ارنا البا طل با طلا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله علينا ملتبسا واجعلنا للمتقين اما ما)

مؤرخہ ۲۵۔۴۔۱۴۱۳ھ مطابق ۹۲۔۱۰۔۲۳م قلعہ والی مسجد میں راقم الحروف نے آپ محترم کا خطبہ بھی سنا

اور نماز جمعہ بھی ادا کی، دو باتیں ایسی نظر آئیں کہ دل نے مجبور کیا کہ یہ گذارشات خدمت میں پیش کروں، پہلی بات بھی میری تحقیق موجب صحیح نہیں اور سنت کے مطابق نہیں لیکن اس پر مجھے لکھنے کا خیال نہ آیا لیکن جب نماز جنازہ آپ کے ساتھ اداء کی تو وہ بات سامنے آئی کہ مجھ سے رہا نہ گیا اور یہ خامہ فرسائی شروع کر دی۔ لہٰذا اب دونوں باتیں آپ محترم کے سامنے پیش خدمت کر رہا ہوں:

① آپ محترم نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھی لیکن میں پورے وثوق سے باادب عرض کروں گا کہ یہ سراسر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔

دلائل درج ذیل ہیں:

صحیحین کی احادیث متفقہ طور صحیح ہیں اس لیے ان احادیث کی سندیں نہیں لکھوں گا۔

امام محدثین امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابا بکر وعمر رضی اللہ عنھما کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمد للہ رب العالمین.))

''اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور شیخین رحمہما اللہ نماز میں قراۃ ان الفاظ یعنی الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے اور یہ نص ہے اس بات پر آپ ﷺ اور شیخین رحمہما اللہ قرأۃ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے بعض افاضل نے امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید میں اس حدیث صحیح وصریح کا یہ جواب دیا ہے کہ اس حدیث میں الحمد للہ رب العالمین سے مراد سورۂ فاتحہ ہے کیونکہ صحیح حدیث میں فاتحہ کا نام ''الحمد للہ رب العالمین'' بھی آیا ہے لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قرأۃ سورۂ فاتحہ سے شروع فرماتے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان الفاظ سے شروع فرماتے۔

الجواب یہ صحیح ہے کہ سورۂ فاتحہ کا نام ''الحمد للہ رب العالمین'' صحیح حدیث میں وارد ہے لیکن یہاں اس حدیث میں اس سے سورۂ فاتحہ مراد لینا بہ چند وجوہ ممنوع ہے۔ یہ چند وجوہ میں نے اپنی کتاب ''تحصیل المعلاۃ'' میں تفصیل کے ساتھ درج کی ہیں جو عربی میں خاص اس مسئلہ پر راقم الحروف نے تالیف کیا ہے۔ اس جگہ طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک وجہ درج کرتا ہوں جو صحیح السند حدیث ہے۔ ثابت اور اس بات کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے کہ اس جگہ مراد یہی ہے کہ قرأت ان الفاظ (یعنی الحمد للہ رب العالمین) بلا جہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سے ہی فرماتے تھے۔

⑪: امام ابو یعلیٰ الموصلی اپنی مسند میں فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد( ھو ابن المثنی) نامحمد بن جعفرنا شعبة عن قتادة عن انس رضی اللہ عنه صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وخلف ابی بکر

وعمرو عثمان لم يكونوا يستفتحون القرأة بسم الله الرحمن الرحيم قال شعبة فقلت لقتادة اسمعتهٗ من انس قال نعم ونحن سالناه عنه.))

اس حدیث کی سند اصح الاسانید میں سے ہے اور اس میں بنص صریح یہ بیان ہے کہ آپ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہ قرأۃ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہیں کرتے تھے۔ راوی وہی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور با قاعدہ الحدیث یفسر بعضہ بعضا مسند ابی یعلی کی یہ صحیح السند حدیث صحیح بخاری والی حدیث کی وضاحت کر دیتی ہے کہ وہاں بھی مراد قرأۃ کی شروعات ان الفاظ ''الحمد للہ رب العالمین'' سے کیا کرتے تھے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ لیکن انصاف مطلوب ہے اور تعصب واعتساف سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی روایت امام ابویعلیٰ اسی مسند میں اپنے ایک دوسرے شیخ سے بھی لائے ہیں۔

((حدثنا احمد ( هو ابن ابراهيم الدورقى كما صرح به الحافظ ابن حجر فِيْ النكت) نا ابو داؤد( هو الطيالسى) قال انبأنا شعبة عن قتادة عن انس رضى الله عنه قال صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلف ابى بكر وخلف عمر وخلف عثمان فلم ))

المسند ابی یعلی ج۳، ص ۱۶۰، رقم الحدیث ۳۲۳۳.

يكونوا يستفتحون القرأة ببسم الله الرحمن الرحيم قال شعبة فقلت لقتادة اسمعته من انس قال نعم سألناه عنه.))

اور یہی حدیث امام احمد رحمہ اللہ کے فرزند امام عبداللہ بھی مسند کے زیادات میں ابو داؤد طیالسی کے طریق سے لائے ہیں۔ اسی طرح امام اسماعیل بھی اس حدیث کو لائے ہیں (ابو داؤد طیالسی کے طریق سے اور اسی طرح ابونعیم اصفہانی بھی اس حدیث کو اپنی مستخرج میں لائے ہیں ابو داؤد طیالسی کے طریق سے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے النکت میں ذکر کیا ہے۔

⑬: امام مسلم بن الحجاج رحمہ اللہ اپنی صحیح میں فرماتے ہیں:

((باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة حدثنا محمد بن المثنىٰ وابن بشار كلاهما عن غندر هو محمد بن جعفر قال ابن المثنىٰ ثنا محمد بن جعفر قال ثنا شعبه قال سمعت قتادة يحدث عن انس قال صليت مع رسول اللهصلى الله عليه وسلم وابى بكر وعمر وعثمان رضى الله عنهم فلم اسمع احدا منهم يقرأ بسم الله الرحمن الرحيم.))

آگے پھر فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد بن المثنیٰ قال ثنا ابوداؤد قال ثنا شعبة فی هذا الاسناد وزاد فقلت لقتادة اسمعت من انس قال نعم ونحن سألناه عنه .))

اس جگہ صحیح مسلم کی حدیث کی سند ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض فضلاء نے امام مسلم کی ایک حدیث میں ایک علت پیش فرمائی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس لیے میں نے بمع سند یہ حدیث ذکر کی ہے اور اس کی سند میں وہ علت بالکل نہیں ہے اور سند صحیح ہے۔ اس حدیث سے بھی واضح طور پر معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور خلفاء ثلاثہ راشدین رضی اللہ عنہم :

المسند لابی یعلی الموصلی، ج۳، ص ۱۰۶، رقم الحدیث : ۲۹۹۶.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے، اس لیے حضرت انس خادم رسول اللہ ﷺ قرأة کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سن نہ سکے۔ بعض افاضل عصر یہ نے اس طرح گلِ افشانی کی ہے کہ عدم سماع سے عدم جہر لازم نہیں آتا ہوسکتا ہے کہ آدمی امام سے دور ہو اور اس کی آواز سن نہ سکے لہٰذا اس صحیح حدیث سے بسملہ کا عدم جہر ثابت نہیں ہوتا۔

لیکن یہ احتمال درست نہیں۔ اس کے درست نہ ہونے کے وجوہ ایسی واضح ہیں کہ ہر منصف مزاج اہل علم تھوڑے سے غور وفکر سے ان کے بطلان کی وجوہ کو پا سکتا ہے۔

یہ درست اس لیے نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی جس نے آپ کی خدمت دس سال کی۔ سفر وحضر میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے، یعنی یہ صحابی خادم رسول ﷺ اپنی طویل صحبت کے باوصف یہ بھی نہ سن سکا کہ آپ ﷺ بسم اللہ الرحمٰن الرحمٰن جہراً پڑھتے تھے یا نہیں یا وہ ہمیشہ دانستہ بالکل دیر سے نماز کے لیے آتے اور بالکل آخری صفوں میں کھڑے ہوتے جس کی وجہ سے وہ بسم اللہ سن نہ سکے اور لطف یہ کہ الحمد للہ رب العالمین تو سن لیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ سن سکا فیا للعجب وضیعة الادب"

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین ثلاثہ کے ساتھ بھی ایک طویل عرصہ گزار چکے ہیں اور اس طویل مدت میں بھی وہ ان خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں سن سکے صرف الحمد للہ رب العالمین ہی سن سکے اس بات میں کہاں تک معقولیت ہے وہ آں محترم خود سوچیں ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی۔

بہر حال اس احتمال کا فساد وبطلان اظہر من الشمس ہے ہاں اگر کسی کو نظر نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔

⑭ : ((حدثنا عبدالله حدثنی ابی ثنا وکیع ثنا شعبة عن قتادة عن انس قال صلیت خلف رسول الله صلی الله علیه وسلم وخلف ابی بکر وعمر وعثمان کانوا لا یجهرون بسم الله الرحمن الرحیم.)) [ المسند للامام احمد:

ج ۲، ص ۱۷۹]

اس حدیث کی سند کے رواۃ "عن آخرهم حفاظ ثقات واثبات" ہیں اور یہ سند بھی اصح الاسانید میں سے ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور خلفاء ثلاثہ ابوبکر، عمر وعثمان رضی اللہ عنہم نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہر سے نہیں پڑھتے تھے۔

⑮: ((اخبرنا ابو طاهرنا ابوبكر نا ابو سعيد الاشج نا ابن ادريس سمعت سعيد ابن ابی عروبة عن قتادة عن انس بن مالك رضی الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم ولا ابوبكر ولا عمر ولا عثمان رضی الله عنه.))

اور یہ ہی حدیث امام نسائی بھی اپنی مجتبیٰ میں لائے ہیں اور سند میں سعید بن ابی عروبہ کے ساتھ شعبہ کو بھی ملایا ہے جس سے قتادہ کی تدلیس کا شبہ رفع ہو جاتا ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔

((صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وابی بكر وعمر وعثمان رضی الله عنه فلم اسمع احداً منهم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم.))

اس کے بعد چند اور احادیث بھی ذکر فرمائی ہیں جن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قتادہ کی متابعت کرنے والے دوسرے ثقات رواۃ کا ذکر ہے۔

لیجئے جناب! یہاں "لم اسمع" کے ساتھ جہر کی نفی بھی آ گئی۔ کیا اب بھی "لم اسمع" کے متعلق وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہنے پر اصرار کیا جائے گا؟ اس حدیث کے رواۃ بھی سب کے سب ثقہ وثبت ہیں۔

⑯: ((حدثنا عبدالله حدثنی ابی ثنا الاحوص ابن جواب ثنا عمار بن زريق عن الاعمش عن شعبة عن ثابت عن انس رضی الله عنه قال صليت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ومع ابی بكر ومع

الصحيح لابن خزيمة مطبوعه: ج ۱، ص ۲۵۰.

(( عمر فلم يجهروا بسم الله الرحمن الرحيم.)) [1]

یہ حدیث امام ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں احوص بن جواب کے طریق سے ذکر کی ہے۔

امام نسائی اپنی مجتبیٰ میں فرماتے ہیں:

((اخبرنا محمد بن علی بن الحسن بن شقيق قال سمعت ابی يقول اخبرنا ابو

[1] المسند للامام احمد: ج ۲، ص ۲٦٤.

حمزة .( هو محمد بن ميمون السكرى المروزى) عن منصور بن زاذان عن انس بن مالك رضى الله عنه قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يسمعنا قرأة بسم الله الرحمن الرحيم وصلى بنا ابوبكر وعمر فلم نسمعها منهما.))

یہ حدیث بھی صحیح الاسناد ہے اور اس کے سب رجال ثقات ہیں اور اس پر امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی ترک الجہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا باب منعقد فرمایا ہے۔

⑲: ((اخبرنا ابو طاهر الفقيه انبأ ابوبكر محمد ابن الحسين القطان ثنا على بن الحسن الهلالى ثنا عبدالله بن الوليد ( هو العدنى) عن سفيان عن خالد الحذاء عن ابى نعامة الحنفى عن انس بن مالك رضى الله عنه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم و ابوبكر وعمر لا يقرؤن يعنى لا يجهرون بسم الله الرحمن الرحيم.)) [1]

آگے امام بیہقی فرماتے ہیں کہ امام سفیان ثوری سے حسین بن حفص نے بھی یہ روایت کی ہے اور اس میں یہ کہا" لا يجهرون" اور" لا يقرؤن "نہیں کہا۔ اس حدیث کی سند بھی حسن ہے باقی بعض علماء نے جو اس حدیث کے متعلق اضطراب کی علت پیش کی ہے وہ قطعاً صحیح نہیں اس میں چونکہ تفصیل زیادہ ہے اس لیے اس جگہ اس کا ذکر کرنا مناسب نظر نہیں

آتا اگر کسی اہل علم کو اس کے متعلق شرح صدر کے ساتھ تحقیق مطلوب ہو تو وہ میری کتاب "تحصیل المعلاۃ" عربی کی طرف مراجعت فرمالے۔ ان شاء اللہ العزیز اس کے سارے شکوک رفع ہو جائیں گے۔

⑳: امام طبرانی اپنی معجم کبیر میں فرماتے ہیں:

(( حدثنا عبدالله بن وهيب الغزى ثنا محمد ابن السرى ثنا معتمر بن سليمان عن ابيه عن الحسن عن انس رضى الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يُسر بسم الله الرحمن الرحيم وابو بكر وعمر رضى الله عنهما.))

علامہ ہیثمی مجمع الزوائد: ج۲، ص۱۰۸ میں فرماتے ہیں :(رجاله موثقون) اس روایت کے سب رجال موثق ہیں اور یہ سند حسن ہے۔ اس حدیث میں بھی صراحت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سراً پڑھا کرتے تھے۔

⑱: امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] السنن الكبرىٰ: ج۲، ص۵۲.

(( وقال لی محمد بن المثنی نا عبدالوهاب ( هو ابن عبدالمجيد الثقفی) سمع ابا نعامة ( هو قيس بن عباية) عن قيس بن عباد عن عبدالله( هو ابن المغفل) بمثله (ای بمثل حديث عبد الله بن المغفل المتقدم ولفظه " صليت خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلف ابی بكر وعمر فلم اسمع احدا منهم يقرأ بسم الله الرحمن الرحيم۔ وقال البخاری ايضا وقال لی محمد نا عبدالله عن قيس بن عباية الزمانی سمع عبدالله)) (يعنی ابن المغفل رضی الله عنه). ❶

اس روایت کی سند بھی صحیح ہے اس حدیث سے معلوم ہوا حضرت عبداللہ بن المغفل رضی اللہ عنہ بھی آنحضرت ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے عدم الجہر بسم اللہ نقل کر رہا ہے۔

(۲۶): حافظ ابن حجر اپنی کتاب "النکت" میں فرماتے ہیں کہ امام اسماعیلی "مسند زید بن ابی انیسة" میں اس تک (یعنی زید بن ابی انیسہ تک) صحیح سند سے روایت بیان کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ:

((عن عمرو بن مرة عن نافع بن جبير بن مطعم عن ابيه قال صلينا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوٰة يجهر فيها بالقرأة فلما صف الناس كبر رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال اللهم انی اعوذبك من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه ثم قرأ بفاتحة الكتاب ولم يجهر بسم الله الرحمن الرحيم.))

اس حدیث کی سند بھی صحیح ہے اور اس میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ حدیث صحیح مسلم، موطا مالک، امام بخاری جزء القرأة، ابوداؤد، نسائی، امام احمد مسند میں، امام ابن خزیمہ اپنی صحیح میں ابوعوانہ وغیرہم نے روایت کی ہے۔ اس جگہ ہم یہ روایت امام نسائی کی مجتبیٰ سے نقل کررہے ہیں۔ اس پر امام نسائی اس طرح باب باندھتے ہیں:

((ترك قرأة بسم الله الرحمن الرحيم فی فاتحة الكتاب" اخبرنا قتيبة عن مالك عن العلاء ابن عبدالرحمن انه سمع ابا السائب مولیٰ هشام بن زهرة يقول سمعت اباهريرة رضی الله عنه يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من صلى صلوٰة لم يقرأ فيها بام القرآن فهی خداج هی خداج غير تمام

❶ تاريخ كبير: ج ٤،ق ٢،ص ٤٤١، ٤٤٢.

فقلت يا اباهريرة انى احيانا اكون وراء الامام فغمز ذراعى فقال اقرأ بها يا فارسى فى نفسك فانى سمعت رسول الله صلى الله عليه يقول يقول الله عزوجل قسمت الصلوٰة بينى وبين عبدى نصفين فنصفها لى ونصفها لعبدى ولعبدى ما سأل قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اقرؤا يقول العبد الحمد لله رب العالمين يقول الله عزوجل حمدنى عبدى يقول العبد الرحمن الرحيم يقول الله عزوجل اثنى على عبدى يقول عبدى مالك يوم الدين يقول الله عزوجل مجدنى عبدى يقول العبد اياك نعبدواياك نستعين، فهذه الآية بينى وبين عبدى ولعبدى ما سأل يقول العبد اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضآلين فهؤلاء لعبدى ولعبدى ما سأل .))

پس یہ حدیث صحیح اس بات میں صریح ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے ورنہ آپ ﷺ سورۂ فاتحہ کی تقسیم میں اولاً ضرور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ذکر کرتے اور اس پر اتفاق ہے کہ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور آپ ﷺ نے " اياك نعبد واياك نستعين" کو آیت قرار دیا جیسا کہ متن حدیث میں مذکور ہے اور اخیر میں فرمایا: "فهؤلاءِ" جو اسم اشارہ کے جمع کا صیغہ ہے اور اسے قطعاً ویقیناً آیات ہی مراد ہیں یعنی " اهدنا الصراط المستقيم" سے لے کر اخیر تک تین آیتیں ہیں ایک "اهدنا الصراط المستقيم" دوسری "صراط الذين انعمت عليهم" اور تیسری "غير المغضوب عليهم ولا الضآلين" اور میرے پاس لائبریری میں چند قرآن کریم کے نسخے ہیں مخطوط بھی مطبوع بھی جن میں "صراط الذين انعمت عليهم" پر آیت کا نشان لگا ہوا ہے اگر "اهدنا الصراط المستقيم" سے لے کر آخر تک دو آیتیں ہوتیں جیسا کہ جہراً بسملہ کے قائلین کا خیال ہے تو آپ ﷺ "هؤلاء" نہ فرماتے بلکہ ہاتان یا اس کے مثل کوئی لفظ فرماتے یعنی جمع کا صیغہ ہرگز استعمال نہ کرتے اور پھر ان حضرات کے موقف پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح تو اللہ اور بندے کے درمیان آیات نصفاً نصفاً نہیں بنتیں حالانکہ حدیث کا متن اس پر گواہ عدل ہے کہ یہ تنصیف آیات کے لحاظ سے ہے۔

لہٰذا ان حضرات کے مؤقف کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لیے تو تین آیتیں ہوئیں الحمد لله رب العالمين، الرحمن الرحيم، مالك يوم الدين بلکہ ان حضرات کے مسلک کے مطابق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ملا کر چار آیتیں بنتی ہیں اور ایک آیت اياك نعبدو اياك نستعين مشترک ہوئی اور بندہ کے لیے صرف دو آیتیں رہ گئیں۔ تو یہ نصف کیسے ہوا پھر اس کے ساتھ یہ سوال بھی بجا طور پر سامنے آتا ہے کہ جب

بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہی تھی تو آپ ﷺ نے اس کو آخر چھوڑا کیوں؟ کیا اس سے آپ کی ذات پر الزام نہیں آتا؟

پھر جب خود اللہ کے رسول علیہ السلام نے بھی بسملہ کو فاتحہ کی آیت شمار نہیں کیا تو آپ کون ہوتے ہیں اس میں اس کا اضافہ کرنے والے؟

شاید کوئی علم حدیث سے ناواقف یہ کہے کہ سنن کبریٰ دارقطنی وغیرہ میں اس حدیث میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر ہے تو اس کے بارہ میں یہ گذارش ہے کہ اس کی سند میں ابن سمعان متروک و متہم راوی ہے لہٰذا یہ روایت قطعاً مقبول نہیں خود امام دارقطنی وغیرہ نے یہ تصریح فرما دی ہے کہ یہ زیادتی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ابن سمعان کی کارستانی ہے اور وہ متروک و متہم ہے اس کے سوائے اور ساری روایات صحیحہ میں اس زیادتی کا ذکر نہیں ہے۔

بہرحال جب صحیح حدیث کے بموجب بسملہ فاتحہ کی آیت نہیں ہے تو فاتحہ کو جہراً پڑھتے ہوئے بسملہ کا جہراً پڑھنا بھی ضروری نہیں رہا یہ بسملہ استعاذہ وغیرہ کی طرح ہے جو سراً پڑھے جاتے ہیں کیونکہ یہ فاتحہ کی آیات نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کریم کی آیت مستقلہ ضرور اور یقینی و حتمی ہے لیکن کسی سورت کی بھی جز نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے دو سورتوں میں فصل کے لیے اور سورت کی ابتدا میں تیمن و تبرک کے لیے نازل ہوئی تھی۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ایک سورۂ جس میں تیس ۳۰ آیتیں ہیں یعنی سورت الملک" پارہ ۲۹ اس نے ایک آدمی کے لیے سفارش کی اور وہ بخش دیا گیا اور وہ عذاب قبر سے روکنے والی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورت کا جز ہے تو سورت ملک کی آیتیں اکتیس ۳۱ بنتی ہیں۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے تیس آیتیں کیسے قرار دیں۔

باقی رہا سورت توبہ میں اس کا نہ لکھا جانا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ایسا ہوا ہے اس کی حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں لیکن اس تفصیل کی یہاں جگہ گنجائش نہیں شائقین کو میری کتاب "تحصیل المعلاۃ" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس صحیح حدیث پر جو کہ صحیح مسلم کی بھی ہے۔ بعض علماء نے کچھ اعتراضات کئے ہیں یا اس میں کوئی علت نکالی ہے لیکن کوئی بھی ان میں سے علت قادحہ پیش نہیں کر سکا تفصیل "تحصیل المعلاۃ" میں ملے گی۔ بڑے سے بڑے ناقدین فن جیسے امام ابو زرعہ رازی وغیرہ نے بھی اس کی تصحیح فرمائی ہے۔ (کما ذکرہ الترمذی فی علل الکبیر) اس حدیث سے بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ بسملہ جہراً نہیں پڑھنی چاہیے۔

۲۳: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث امام احمد رحمہ اللہ المسند میں فرماتے ہیں:

(( حدثنا عبداللہ حدثنی ابنی ثنا و کیع عن نافع بن عمرو ابو عامر ثنا نافع عن

ابی ملیکة عن بعض ازواج النبی صلی الله علیه وسلم قال ابو عامر قال نافع اراها حفصة انها سئلت عن قرأة رسول الله صلی الله علیه وسلم فقالت انکم لا تستطیعونها قال فقیل لها اخبرینا بها قال فقرأت قرأة ترسلت فیها قال ابو عامر قال نافع فحکی لنا ابن ابی ملیکة الحمد لله رب العالمین ثم قطع الرحمن الرحیم، ثم قطع مالك یوم الدین.)) [1]

اس حدیث کے رجال بھی سب کے سب ثقات ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "النکت" میں فرماتے ہیں کہ یہ اسناد صحیح ہے اس صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے۔ اگر کہا جائے کہ اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام احمد وغیرہ نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

((انها( ای ام سلمة رضی الله عنها) سئلت عن قرأة رسول الله صلی الله علیه وسلم فقالت: کان یقطع قرأته آیة آیةبسم الله الرحمن الرحیم، الحمد لله رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالك یوم الدین.))

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں ابن جریج) جو تیسرے مرتبہ کا مدلس ہے (کما فی طبقات المدلس لابن حجر رحمہ اللہ) اور امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریج کی تدلیس شر التدلیس ہے۔ ایسے رواۃ کی جب تک سماع یا تحدیث کی تصریح نہ کریں ان کی روایت مقبول نہیں ہوتی۔ یہ روایت ایک یا دو کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی بہت سی کتب میں موجود لیکن ایک جگہ پر بھی ابن جریج نے سماع کی تصریح نہیں کی لہٰذا یہ سند ضعیف ہوئی اور جب سند ضعیف ہوئی تو حدیث بھی ضعیف ہوگئی لہٰذا مسترد ونامقبول ہوئی۔

پھر لطف کی بات یہ ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اسی حدیث کو امام حاکم مستدرک میں ایک دوسرے طریق سے ابن جریج سے روایت کرتے ہیں لیکن اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں۔ امام حاکم فرماتے ہیں:

((حدثنا ابو الولید الفقیه وابوبکر بن قریش وابو عمرو بن عبدوس المقرئ قالوا ثنا الحسن ابن سفیان ثنا علی بن حجر بن ایاس السعدی ثنا یحی بن سعید القرشی عن ابن جریج عن عبدالله بن ابی ملیکة عن ام سلمةرضی الله عنها قالت ان النبی صلی الله علیه وسلم کان یقطع قرأته آیةً آیةً الحمد لله رب العالمین ثم یقف الرحمن الرحیم ثم یقف وکانت ام سلمة تقرأها ملك

[1] المسند: ج٦،ص٢٨٨.

یوم الدین.))

دیکھیے اس حدیث میں بھی ابن جریج کی تدلیس کے سوائے اور کوئی علت نہیں لیکن اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں۔ اب اگر انصاف مطلوب ہے تو اس روایت کو ترجیح ہونی چاہیے گو اس میں بھی تدلیس ابن جریج کی طرف سے ہے لیکن یہ روایت اس سند سے اس صحیح حدیث حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا والی سے متفق ہو جاتی ہے اور دوسری احادیث صحیحہ جن میں عدم جہر بسملہ کی تصریح ہے ان سے بھی متفق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہی راجح ہونی چاہیے اگر آپ ابن جریج کی تدلیس کی وجہ سے اس روایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر بتایئے پہلی روایت کے قبول پر اصرار کیوں؟ اس میں بھی تو ابن جریج کی تدلیس ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ دوسری احادیث صحیحہ کے بھی قطعی طور پر مخالف ہے۔

بہر کیف یہ روایت سنداً ضعیف ہے لہٰذا اس کو معرض استدلال میں پیش کرنے اور اس کو مذکورہ صحیح حدیث کے معارض بنانے کی کوئی اہل علم ہرگز جرأت نہیں کرسکتا اِلاّ یہ کہ تجاہل عارفانہ کرے یا بے جا ہٹ دھرمی پر مصر ہو۔ ان دلائل واضحہ اور صحیحہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ نماز میں اللہ کے رسول مقبول ﷺ کی سنت مستمرہ اور خلفاء راشدین مہدیین ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی سنت مستمرہ یہی تھی کہ وہ نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے۔

یہ دلائل صرف ایک صحابی انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نہیں بلکہ ان کے علاوہ عبداللہ بن مغفل، جبیر بن مطعم، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہیں اور سب کی سب مرفوع اور صحیح ہیں لہٰذا ان احادیث صحیحہ سے اعراض کر کے آنحضرت ﷺ کی سنت صحیحہ اور مستمرہ کو ترک کر کے علی الدوام بسملہ جہر سے پڑھنا اہل حدیث جماعت کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔

لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی جب تک کہ قائلین بجہر البسملۃ کے دلائل کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس لیے اب ان کے دلائل کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کا انصاف و تحقیق سے جائزہ پیش کیا جاتا ہے اجمالاً یہ گذارش ہے کہ مخالفین جو دلائل احادیث سے پیش کرتے ہیں ان میں سے جو مسئلہ زیر بحث پر صریح دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک حدیث بھی سنداً صحیح نہیں ہے بلکہ موضوع و منکر اور کچھ شدید ضعیف اور جو ایک یا دو صحیح السند ہیں وہ مسئلہ زیر بحث پر نہ نص ہیں نہ صریح دلیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی فتاویٰ: جلد ۲۲، صفحہ ۴۱۶ میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ الدرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ میں فرماتے ہیں کہ امام دار قطنی رحمہ اللہ جب مصر میں تشریف لائے تو انہیں الجہر بالبسملہ کی روایات جمع کرنے کی گذارش کی گئی۔

تو امام موصوف نے یہ روایات جمع کر دیں تب ان سے کہا گیا کہ کیا اس مجموعہ میں کوئی صحیح چیز بھی ہے؟ تو امام والا مقام نے جواب میں فرمایا:

((امّا عن النبی صلی الله علیه وسلم فلا واما عن الصحابة فمنه صحیح ومنه ضعیف.))

''یعنی آنحضرت ﷺ سے اس سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں، البتہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض آثار صحیحہ ہیں اور بعض ضعیف آپ نے دیکھا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ جیسا چوٹی کا محدث جن کے علم حدیث کا اندازہ لگانا ہو تو ان کی کتاب ''العلل'' مطالعہ فرمائیں وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے جہراً بالبسملۃ کی کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اب ایسے امام کی شہادت کو آپ مسترد فرما دیں تو آپ کی مرضی۔

اس کے بعد یہ گذارش ہے کہ بہت سی ضعاف و منکرات و موضوعہ روایات کا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الدرایہ میں اور علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے ''التعليق المغنی علی السنن للدارقطنی'' میں اچھی طرح پوسٹ مارٹم کیا ہے اور ان کے ضعف نکارت و وضع کی توضیح فرما دی ہے۔

لہٰذا ان کا ذکر بے فائدہ تطویل کا باعث ہو گا اس لیے ان کے ذکر سے اعراض کرتا ہوں تھوڑی سی منکر روایتیں ان سے بھی رہ گئیں ہیں جو میں نے ''تحصیل المعلاۃ'' میں ذکر کی ہیں اور ان کی اسنادی حیثیت کو بحمد اللہ واضح کر دیا ہے اس جگہ میں صرف وہ روایتیں لکھوں گا جن سے عام طور پر ہمارے علماء و فضلاء عصریہ استدلال کرتے ہیں۔

:...... امام نسائی، ابن خزیمہ الدارقطنی وغیرہم نے نعیم المجمر کی طریق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((قال (ای نعیم المجمر) صلیت وراء ابی هریرة رضی الله عنه فقرأ بسم الله الرحمن الرحیم ثم قرأ بام القرآن حتی بلغ غیر المغضوب علیهم ولا الضآلین فقال آمین! فقال الناس آمین ویقول کلما سجد الله اکبر فاذا قام من الجلوس فی الاثنتین قال الله اکبر واذا سلم قال والذی نفسی بیده انی لأشبهکم صلوٰة برسول الله صلی الله علیه وسلم.))

اس حدیث کی سند بلا شبہ صحیح ہے لیکن اس کے سیاق میں اتنے احتمالات ہیں کہ اس کو زیر بحث مسئلہ پر ہرگز ہرگز نص نہیں بنایا جا سکتا لیکن ان تفصیلات کی جگہ تحصیل المعلاۃ ہے نہ کہ یہ مختصر کتابچہ پھر روایت میں ہے کہ ''ثم قرأ بام القرآن'' اور یہ وضاحتاً بتا رہا ہے کہ راوی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو فاتحہ کی آیت قرار نہیں دیا ورنہ اس طرح فرماتے کہ:

((ثم قرأ بام القرآن فاستفتح ببسم الله الرحمن الرحیم.))

غور فرمایئے اور یہ بات آپ کے مسلک کے خلاف ہے کیونکہ آپ بسملہ کو ام القرآن کی جز یا آیت ہی

قرار دے رہے ہیں۔ پھر یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں آپ سے مرفوع محض اس لیے بنا رہے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

((انی لا شبھکم صلوٰۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.))

لیکن اولاً تو یہ الفاظ ضروری نہیں کہ نماز کے ہر جز کے متعلق فرمایا ہو بلکہ اکثر کے متعلق اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے ہر جز میں مشابہت مراد ہے تب بھی اسے اس روایت کا رفع بطور اشارہ کنایہ اور ایماء کے باب سے ہے۔ اور ہم نے جو روایات ذکر کی ہیں وہ سب کی سب صریح طور پر مرفوع بھی ہیں اور عدم جہر پر نص صریح ہیں اور یہ شرعاً، عرفاً، اصولاً بالکل غلط ہے کہ ایک بات جو اشارۃً وکنایۃً معلوم ہو اس کو اس بات پر مقدم کیا جائے جو نصاً وصراحتاً صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے پھر یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ:

((انی لاشبھکم صلوٰۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)) سے مراد نماز میں انتقالات کی تکبیریں ہوں کیوں کہ اسی عہد میں بعض ائمہ نے نماز میں رفع وخفض میں تکبیرات کہنی چھوڑ دی تھیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ مطرف بن عبداللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سجدہ میں جاتے تب بھی تکبیر کہتے اور اس سے سر اٹھاتے تو بھی تکبیر کہتے اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تب بھی تکبیر کہتے جب نماز پوری کی تو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اس نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ نے) مجھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یاد دلا دی۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز میں ہر خفض ورفع میں تکبیرات کہتے تھے۔

وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملا اور اس کے متعلق تعجب سے دریافت کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

((اولیس تلك صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا ام لك.))

اگر اس عہد کے لوگوں نے ان انتقالات میں تکبیریں کہنی چھوڑ نہ دی ہوتیں تو عکرمہ تعجب سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کیوں دریافت کرتے۔ جو چیز عام ہوتی ہے اس کے متعلق پوچھنا تو کجا اس پر تعجب بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی بات کی طرف ((انی لا شبھکم صلوٰۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.)) میں اشارہ فرمایا ہو اور اس احتمال کو یہ روایت بھی تقویت دیتی ہے جو امام عبدالرزاق اپنے مصنف میں لائے ہیں:

((قال عبدالرزاق عن ابن جریج قال اخبرنا ابن شھاب عن ابی بکر بن

عبدالرحمن بن الحارث بن هشام انه سمع ابا هريرة رضى الله عنه يقول كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا قام الى الصلوٰة يكبر حين يقوم ويكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده حين يرفع صلبه من الركعة ثم يقول وهو قائم ربنا لك الحمد ثم يكبر حين يهوى ساجدا ثم يكبر حين يرفع رأسه ثم يفعل ذلك فى الصلوٰة كلها حتى يقضيها ويكبر حين يقوم من المثنى بعد الجلوس ثم يقول ابوهريرة رضى الله عنه انى لا شبهكم صلوٰة برسول الله صلى الله عليه وسلم.))

اور اس روایت کی اسناد صحیح ہے لہٰذا اس احتمال قوی کی موجودگی میں (خصوصاً جب خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث اس کی مؤید بھی ہو) تو بلا وجہ اس پر اصرار کرنا کہ ان کے ان الفاظ:
((انى لا شبهكم صلوٰة برسول الله صلى الله عليه وسلم.)) سے مراد مشابہت من کل الوجوہ ہے۔ محض بے جا ضد و مسلکی حمیت نہیں تو اور کیا ہے۔

بہرصورت ان احتمالات کے قطع نظر یہ روایت اشارۃً وایماء مرفوع ہے اور اس لیے بسملہ کا جہر بھی اشارہ وکنایہ یا ایماء پر مبنی ہے۔ لہٰذا یہ کتنا ظلم عظیم ہے کہ ان سب احادیث مبارکہ جو سب کی سب صحیح بھی ہیں۔ حقیقتاً مرفوع بھی اور عدم جہر بسملہ پر نص صریح بھی ہیں ان پر ایسی روایت کو مقدم کیا جائے جو نہ تو صراحتاً مرفوع ہے۔ اور نہ ہی مسئلہ زیر بحث پر صراحتاً دلالت کرتی ہے یہ تو کسی مکتب فکر و کسی مسلک کا اصول نہیں ہے کہ نص صریح کو چھوڑ کر ایک محتمل واشارہ یا ایماء سے مسئلہ بتانے والی روایت کو مقدم کیا جائے۔ اگر اس قسم کی جرأت مقلدین حضرات کرتے ہیں تو اہل حدیث حضرات ان پر تنقیدات کی بارش کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر خود اپنے مسلک کا پاس ولحاظ ہو تو ان سب مسلمہ اصول کو بالائے طاق رکھ کر وہی کچھ کیا جا رہا ہے جس پر انہیں اغیار پر اعتراض ہے۔

((فياللعجب خود رافضيحت ديگراں رانصيحت فانا لله وانا اليه راجعون.))

❶:....... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھی اس اثر کی سند بھی صحیح ہے۔ لیکن اس کے سیاق میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو استمرار پر دلالت کرتا ہو بلکہ یہ ایک واقعتاً عین ہے جو کبھی ایک مرتبہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے تعلیم کے لیے جہراً بسملہ پڑھی۔ جیسا کہ صحیح سند سے سنن دارقطنی وغیرہ میں حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما "سبحانك اللهم وبحمدك ......الخ (دعاء استفتاح) پڑھی تھی اور روایت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں۔ "يسمعنا ذالك ويعلمنا." یعنی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ یہ دعائے استفتاح ہمیں سناتے تھے اور اس سے مقصد ہمیں تعلیم دینا تھا۔ پھر کیا

وجہ ہے کہ آپ حضرات دعائے استفتاح کو جہراً پڑھنا اپنا مستمر معمول نہیں بناتے؟ اسی طرح ایک صحیح حدیث حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا صفحات میں گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ قرأۃ سے قبل ((اللھم انی اعوذبك من الشیطان الرجیم.)) الخ جہراً پڑھا۔

حالانکہ استعاذہ قرأۃ سے قبل جہراً پڑھنا کسی کا مسلک نہیں، لیکن آپ اہلحدیث حضرات سے بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استعاذہ جہراً پڑھا ہے تو آپ اتباع سنت کی مدعیان حضرات کیوں ہمیشہ استعاذہ جہراً نہیں پڑھتے؟ یہ عجیب تماشہ ہے کہ اپ خود تو غیر صریح روایت سے بھی جہراً بسملہ وہ بھی علی الدوام ثابت فرما رہے ہیں اور اسی پر عمل پیرا ہیں۔ حالانکہ اس میں اصل مسئلہ کی صراحت تک نہیں چہ جائیکہ اس سے دوام ثابت کیا جائے۔ ازراہ عنایت آں محترم ہمیں بھی مستفید فرمائیں کہ اس روایت سے عربیت کے کس قانون سے آپ دوام ثابت فرما رہے ہیں؟ لیکن حدیث میں صراحتاً موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرأت سے قبل استعاذہ پڑھا اور بسملہ کے متعلق متعدد احادیث صحیحہ صریحہ میں استمرار کے صیغوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم بسملہ جہراً نہیں پڑھا کرتے تھے مگر آپ حضرات ان صحیحہ صریحہ اور منصوصہ احادیث کو ایسا نظر انداز کئے بیٹھے ہیں کہ گویا احادیث صحیحہ کا وجود ہی نہیں۔

السنن للدارقطنی مع التعلیق المغنی طبع مدینہ منورہ: ج۱،ص ۳۰۱.

اس طرز عمل کا نام آپ ہی تجویز فرمائیں۔ ہم اگر کہیں گے تو شکایت ہوگی۔ بہر صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر صحیح السند ہونے کے باوجود ایک واقعہ عین ہے جو تعلیم کے لیے پیش آیا تھا نہ کہ ان کی یہ سنت مستمرہ تھی ان کی اور دو خلفاء راشدین رضی اللہ عنہما کی سنت مستمرہ تو وہ تھی جو احادیث صحیحہ میں بیان ہو چکی۔ واللہ اعلم!

...... حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ آئے اور نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھی اس پر مہاجرین وانصار ہر طرف سے اس پر معترض ہوئے، لہٰذا بعد میں جب نماز پڑھائی تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہرا پڑھا۔ یہ روایت سنن دارقطنی، سنن کبریٰ، بیہقی اور امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الام وغیرہ میں مروی ہے اور میں نے اس سے بے تحاشا استدلال کرتے ہوئے اہلحدیث خطیبوں کو بھی اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اور انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ آج کل کے علماء اہلحدیث حدیث کے علوم سے اس قدر بے پرواہ ہو گئے ہیں کہ وہ اتنی زحمت اٹھانے پر بھی تیار نہیں کہ کسی روایت کے متعلق اس سے دلیل لینے سے قبل اس کی سنداً ومتناً روایۃً ودرایۃً تحقیق تو کرلیں یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں اور دلیل لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔

جب ہمارے اہلحدیث خطباء کی یہ حالت ہے تو پھر عوام کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس روایت کے متعلق تفصیل

تو میری کتاب تحصیل المعلاۃ میں ہے اس جگہ صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ روایت سنداً بھی ضعیف ہے تو متناً بھی مضطرب اور اضطراب بھی ایسا کہ کوئی محدث اس کے اضطراب کو رفع نہیں کر سکتا سند میں رواۃ ضعیف ہیں اور متن پر کافی اعتراضات وخدشات وارد ہیں شائقین تفصیل کو تحصیل المعلاۃ کا مطالعہ کرنا چاہئے تعجب تو یہ ہے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھنے پر تو مہاجرین وانصار کے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی، لیکن یہ مہاجرین وانصار کہاں گئے تھے جب خلفاء ثلاثہ راشدین کو رات ودن میں کم از کم تین مرتبہ نماز میں بسملہ کے عدم جہر کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے لیکن ان پر نکیر نہ کی اور نہ ان کو اس نقصان پر ٹوکا کیا یہ سب مہاجرین وانصار ان سے ڈرتے تھے، اس لیے کلمہ حق کہہ نہ سکے؟ حالانکہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو تو ایک عورت بھی حق کا کلمہ کہہ دیتی تھی۔ یہ سب باتیں دلیل نہیں اس بات پر یہ واقعہ منکرہ وموضوعہ ہے۔ یہ تھے وہ مشہور دلائل جو آج کل کے اہلحدیث پیش کرتے رہتے ہیں اس لیے اس جگہ صرف ان کے ذکر پر اکتفا کی ہے ورنہ روایات اور بھی ہیں جو سب کی سب اپنی کتاب تحصیل المعلاۃ میں ذکر کی ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وتوفیق سے ان پر بالاستیفاء کلام کیا ہے، ایک منصف مزاج کے لیے ان شاء اللہ اس کا مطالعہ شرح صدر کا باعث ہوگا۔

چند علماء نے بھی اس کے مطالعہ کے بعد اپنے سابق مسئلہ سے رجوع فرمالیا اگر آپ محترم کے پاس اپنے موجودہ مسلک پر کوئی صحیح السند غیر معلول اور اپنے مدعا پر نص صریح حدیث موجود ہو تو ازراہ عنایت ہمیں اس سے ضرور مستفید فرمایا جائے اگر نہیں ہے تو راقم الحروف آپ محترم کو صدق دل سے دعوت دیتا ہے کہ آپ اس موجودہ عمل سے رجوع فرما کر آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح وصریح ثابتہ اور مستمرہ سنت پر عمل پیرا ہوجائیں۔ باقی یہ جواب کہ کیا کریں اب تک اس پر عمل رہا ہے اب اس سے رجوع کیسے کریں یا عام اہل حدیث افراد کا رجحان چونکہ اس طرح ہے لہٰذا اس سے رجوع بہت مشکل ہے سو جہاں تک میرا حسن ظن آں محترم سے ہے میں تو ایسے جواب کی آپ کی ذات سے توقع نہیں رکھتا۔ اگر (اللہ نہ کرے پھر کہتا ہوں اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو) اس قسم کا جواب غیر متوقع آں محترم کی جانب سے ملا تو پھر انا للہ وانا الیہ راجعون کے پڑھنے کے سوائے اور کیا کیا جا سکتا ہے: واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

(۲) دوسری بات آپ محترم نے نماز جنازہ کی امامت کروائی اس میں فاتحہ جہراً پڑھا حالانکہ نسائی شریف میں صحیح سند سے مروی ہے کہ صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد فاتحہ مخافتہ پڑھا جائے یعنی اس کا اسرار کیا جائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ

انہوں نے فاتحہ جھراً پڑھا لیکن ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ اس لیے کیا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی (یعنی نماز جنازہ میں فاتحہ پڑھنا) مشروع ومسنون ہے۔ یہ بعینہ اسی طرح ہے کہ حضرت فاروق وعثمان رضی اللہ عنہما نے دعاء استفتاح تعلیم کے لیے جہراً پڑھی لیکن اس سے اس دعاء کا مستمراً پڑھنا ثابت نہ ہوا اور نہ ہوسکتا ہے پھر عجیب بات یہ ہوئی کہ درود بھی جہراً پڑھا اور میت کے لیے دعاء بھی جہراً پڑھی۔

حدیث میں یہ ضرور آتا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ پر آپ ﷺ نے دعاء پڑھی کہ راوی نے آپ سے سن کر تمنا کی کہ یہ دعاء مجھ پر پڑھی گئی ہوتی:۔ لیکن یہ بھی تعلیم کے لیے تھا مستمرہ سنت نہ تھی مستمرہ سنت وہ ہے جو پہلے ہم ذکر کر کے آئے ہیں یعنی مخافتہ پھر اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ صحیح حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے امام کے علاوہ مقتدی بھی اس میت کے لیے دعا کریں۔ جیسا کہ بعض صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جس میت پر چالیس موحد مسلمان نماز جنازہ پڑھیں اور آپ ﷺ اس کے لیے اللہ کی جناب میں مغفرت کی دعاء کریں اور سفارش کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء کو شرف قبولیت بخشتا ہے اور اس میت کی مغفرت کر دیتا ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ مقتدین بھی اس میت کے لیے مغفرت وغیرہ کی دعاء کریں کیونکہ صیغہ جمع (یشفعون) کا وارد ہے۔ لیکن واللہ میں سچ کہتا ہوں کہ آپ محترم نے جب دعائیں پڑھنی شروع کیں تو میں نے انتہائی کوشش کی کہ کم از کم اللھمّ اغفر لحینا ومیتنا الخ ہی پڑھ لوں اور بے حد عجلت سے بھی کام لیا لیکن سچ پوچھیے کہ میں اب تک مطمئن نہیں ہوں کہ میں نے اس میت پر دعاء اچھی طرح پڑھ لی۔ پھر بتائیے کہ ایسی اقتداء سے اس میت کو ہمارے طرف سے کیا فائدہ ہوا؟ اور ہمیں اس پر نماز جنازہ ادا کرنے کا کیا اجر وثواب ملا اس لیے کہ ہم اس کے لیے اچھی طرح سے اور تسلی بخش طور پر تو دعاء کر بھی نہ سکے پھر اس اقتداء سے فائدہ؟ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ آپ ہی یہ کام انجام دے دیتے دوسروں کو خواہ مخواہ کھڑے ہونے کی دعوت نہ دیتے۔ یا پھر آپ حنفیوں کے مسلک کے مطابق قائل ہیں کہ پیچھے اقتداء کرنے والے بالکلیہ خاموش رہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا یہ مسلک ہوگا۔ یا پھر آپ اس بات کے قائل ہیں کہ ادعیہ کے پڑھنے کے وقت پیچھے والے مقتدین صرف آمین کرتے رہیں۔ لیکن اس پر آپ کے پاس کوئی دلیل کتاب وسنت سے موجود نہیں بلکہ "یشفعون" والی روایت صاف اس پر دلالت کرتی ہے کہ مقتدین کو بھی میت کے لیے دعاء مغفرت کرنی ہے۔

اب آپ ہی فرمائیں ان حالات میں ہم آپ کے پیچھے نماز جنازہ ادا کریں تو کس طرح ادا کریں کیونکہ ہمیں تو آپ کے جھراً کی وجہ سے اطمنان سے اور تسلی بخش طور پر کچھ بھی پڑھنے کا مشکل ہے موقع ملتا ہے۔ اگر آپ

کو فاتحہ جہراً پر اصرار ہے (حالانکہ یہ بھی سنت مستمرہ کے خلاف ہے) تب بھی کم ازکم میت کے لیے جو دعائیں کریں وہ تو آہستہ پڑھیں تاکہ آپ کے پیچھے اقتداء کرنے والے کم ازکم ایک دعا تو پڑھ لیں تاکہ وہ بھی اس میت کے شافعین میں شامل ہو جائیں اور انہیں بھی اس نماز جنازہ میں شرکت کی وجہ سے اجر وثواب تو ملے۔
میں ان سطور پر اپنی گذارشات کو ختم کرتا ہوں۔

وما علینا الا البلاغ المبین۔

مراد ما نصیحت بود گفتیم　　　حوالت تا خدا ، کردیم ، رفتیم (سعدی رحمہ اللہ)

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبين رحمة للعالمين سيد نا محمد وآله وأز واجه أصحابه أجمعين۔

واناا حقر العباد
محب اللہ شاہ عفی اللہ عنہ

❀❀❀❀

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹- جے ماڈل ٹاؤن - لاہور
نمبر ........................

انتہائی نادر ونایاب مقالات اور علمی رسائل کو پہلی بار یکجا کر کے منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔

# مقالاتِ راشدیہ

جلد پنجم 5

عنقریب طلب فرمائیں

نعمانی کتب خانہ
حق سٹریٹ
اردو بازار لاہور
0334-4229127

- رفع الاختلاف عن مسائل الخلاف
- تحقیق الدعاء رفع الیدین
- نماز کی مسنون دعائیں
- عظمت انسانی
- أربعین أحادیث
- حجة الوداع
- رفع الیدین کے بارے میں چند شبہات کا ازالہ
- الضرب الشدید علی القول السدید فی اثبات التقلید
- مکانة أبی حنیفة عند الائمة
- مولانا الہڈیو کی کتاب پر تبصرہ

اس کتاب کے ہر مقالہ میں انداز بیان اتنا دلنشیں اور عمدہ ہے کہ اہل ذوق کا مطالعہ شروع کر کے آخر تک چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا۔

ہر بات باحوالہ اور اہل علم اور عوام سب کے لیے یکساں مفید اور متلاشیان حق کے لیے نشان منزل ہے۔

# یادداشت

# یادداشت

## ''مقالات راشدیہ'' اور صاحب مقالات

صوبہ سندھ کے راشدی خاندان کو علم و ادراک اور تقویٰ و صالحیت میں خاص شہرت حاصل ہے۔ کئی پشتوں سے اس خاندان کے مختلف ارکان تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے میدان میں جلوہ افروز ہیں اور حالات کی روشنی میں بہترین کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ ماضی قریب میں اس دودمانِ عالی قدر بھائیوں (سیّد محب اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ اور سیّد بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ) نے جو علمی تگ وتاز کی اسے تاریخ خدمت دین کے زرّین باب کی حیثیت حاصل ہے

ان سطور میں سید محبّ اللہ شاہ راشدیؒ کی ایک کتاب "مقالاتِ راشدیہ" کا تعارف کرانا مقصود ہے، لیکن اس سے پہلے چند الفاظ میں خود صاحب کتاب متعلق عرض کرنا ضروری ہے۔

سید محبّ اللہ شاہ راشدی جنھیں "صاحب العلم السادس" کہا جاتا تھا، ۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو پیر جو گوٹھ (ضلع حیدرآباد) میں پیدا ہوئے اور فضل وکمال کے بلند مرتبے تک پہنچے ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

انہوں نے عربی، اردو، سندھی، تینوں زبانوں میں لکھا اور خوب لکھا ۔ وہ قدیم وجدید پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور اپنے نقطہ نظر کی دلنشین الفاظ میں وضاحت کرتے تھے۔ عمر بھر ان کا قلم بھی صفحاتِ قرطاس پر رواں رہا اور زبان بھی نہایت صفائی کے ساتھ کلمہ حق کا اعلان کرتی رہی ۔ دوسرے الفاظ میں کہنا چاہیے کہ وہ گفتار اور تحریر دونوں کے غازی تھے۔ اعلانِ صداقت میں نہ کبھی زبان میں لغزش آئی اور نہ قلم کسی مصلحت کا شکار ہوا۔

اعلائے کلمۂ حق ان کا شیوہ اور ابطال باطل ان کا پیشہ تھا۔ وہ برصغیر کے عظیم رکن تھے۔ مقالاتِ راشدیہ کا زیر نظر مجموعہ ان کی حق گوئی کا بہت بڑا مظہر ہے۔ اس پر پروفیسر مولابخش محمدی رحمہ اللہ نے بڑا جان دار مقدمہ تحریر فرمایا اور جمع و تدوین اور ترتیب کا فریضہ محترم المقام مولانا افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ نے انجام دیا۔

اتنی بڑی کتاب کی پروف ریڈنگ اور تصحیح ایک اہم مسئلہ تھا، اس میں مولانا افتخار احمد الازہری حفظہ اللہ کے تدریسی ادارے جامعہ بحر العلوم السلفیہ کے لائق احترام اساتذہ نے ان کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مصنف کو جنت الفردوس نصیب فرمائے اور مرتب اور ناشر کو اس خدمت علمی پر جزائے خیر سے نوازے، آمین۔

محمد اسحاق بھٹی
لاہور


نعمانی کتب خانہ

حق سٹریٹ اردو بازار لاہور
042 37321865

E-Mail: nomania2000@hotmail.com

M 38


Zia ur Rehman 0321-4167895